مجھے روٹھنے نہ دینا

نگہت عبداللہ

مجھے ڈھونڈنے دنیا

گرمیوں کی رات تھی قدرے ٹھنڈی اور پُرسکون سی۔

دن بھر کی گرمی اور حبس کے بعد شام میں ہوا نے کچھ اٹکھیلیاں شروع کی تھیں۔ موتیا اور رات کی رانی کو چھو کر جب آنگن کا رُخ کرتی تو پوری فضا مہکی ہوئی سی لگتی تھی۔ ربیعہ نے سرِ شام ہی کلثوم اور ہُما کے ساتھ مل کر آنگن میں چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ پھر لائن سے چارپائیاں بچھا کر ان پر کھیس بچھا دیے تھے۔ روزانہ کی طرح یہ کام کرتے ہوئے ان تینوں بہنوں نے آپس میں چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی چھڑکاؤ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکا تھا۔ ایک دوسرے سے نظریں چُرائے بس خاموشی سے ہر کام ہو گیا۔

اور تو اور امّاں بھی خاموش تھیں۔ نہ کوئی ہدایت، نہ سرزنش۔ برآمدے میں رکھے تخت پوش پر بیٹھیں، جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔ ان کی آنکھیں ایک ہی نکتے پر مرکوز۔ اور چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال تھا۔ کسی کسی وقت ایک طویل سانس آہ کی صورت میں ان کے ہونٹوں سے خارج ہوتا تو چارپائیوں پر کھیس بچھاتے اس کے ہاتھ وہیں رُک جاتے اور وہ دُزدیدہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھنے لگتی۔

چھوٹی آپا گرمی کے باوجود کمرے میں بند تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو امّاں انہیں آواز پر آواز دیے جاتیں لیکن اس وقت تو جیسے وہ انہیں پکارتے ہوئے بھی ڈر رہی تھیں۔ گو کہ امّاں قصوروار نہیں تھیں اور قصوروار تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جب کبھی ایسی کوئی بات ہوتی، چھوٹی آپا کا موڈ بگڑتا اور ہر ایک اپنے آپ کو ان کا مجرم تصور کرنے لگتا تھا۔

"کاش۔۔۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس گھر کے اور خاص کر چھوٹی آپا کے دلدّر سمیٹ لیتی۔"

دن میں کتنی بار اس نے اس انداز سے سوچا تھا۔ اب بھی کھلے آسمان پر دُور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ پھر اس کی نظریں ستاروں کے جھرمٹ پر جم گئیں۔ جو ایک دوسرے کے بے حد قریب ہو کر جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کچھ شریر سا انداز تھا۔ جلتے بجھتے جیسے آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہوں۔ روزانہ ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرانے لگتے تھے اور اُن کے درمیان جب وہ چاند کا تصور کرتی تو ایک چہرہ نمودار ہو کر کتنے سہانے خواب اس کی پلکوں پر اتار آتا۔ پھر بقیہ تمام رات وہ ان خوابوں کی سرزمین پر اس کا ہاتھ تھامے بہت دُور تک نکل جاتی تھی۔

اور خواب تو وہ اب بھی سجانا چاہتی تھی، ہر طرف سے بے نیاز ہو کر کچھ دیر کو حقیقی زندگی کی تلخیاں بھلا کر چاہتی تھی، کچھ سہانے خواب ہی سجا لے۔ لیکن دل اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کوئی اچھی بات سوچی ہی نہ گئی۔ ستاروں کے جھرمٹ سے سفر کرتی ہوئی اس کی نظریں اپنے آنگن کا طواف کرنے لگیں۔

کچن کے دروازے کے پاس پیڈسٹل فین رکھا تھا اور اس کے سامنے سب سے پہلے ابا میاں کی چارپائی تھی

اُن سے کچھ فاصلے پر کلثوم اور ہما۔ پھر وہ خود تھی۔ اماں کی چارپائی سرہانے کی طرف تھی۔ اور چھوٹی آپا برآمدے میں تخت پوش پر سو رہی تھیں۔ پچھلے سال جب بڑی آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی تو اماں کے پیروں کے پاس ان کی چارپائی بچھا کرتی تھی۔ اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ ابھی تو رات کا پہلا پہر تھا اور سب سو رہے تھے۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی کروٹ بدل کر زبردستی آنکھیں بند کر لیں۔

ابا میاں یعنی اکرام علی ایک سرکاری ملازم تھے۔ نہایت شریف، ایماندار اور خدا کی رضا میں راضی رہنے والے۔ کبھی کوئی شکوہ ان کی زبان سے نکلتے نہیں سُنا گیا۔ ہمیشہ شکر کا کلمہ پڑھتے نظر آئے۔

نھیں تو اماں بھی تقریباً ان ہی کی طرح لیکن کہیں کہیں مقدر سے شاکی نظر آتی تھیں۔ قدرت نے ان کی جھولی میں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں ڈال دیں تو بیٹے کی آرزو میں شکوہ تو ان کے لب پر آنا ہی تھا۔ اب تک حسرت سے کہتیں۔

"کیا تھا جو اللہ میاں ایک بیٹا دے دیتا۔ بڑھاپے کا سہارا تو ہو جاتا۔ بیٹیاں تو آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ اپنے اپنے نصیب کا دانہ چُگیں گی اور اُڑ جائیں گی۔"

اور دوسرا شکوہ انہیں اپنی غریبی سے تھا۔ لیکن یہ شکوہ ان کے لبوں پر شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ بظاہر وہ مطمئن ہی نظر آتی تھیں۔ ابا میاں کی بندھی ٹکی معمولی سی تنخواہ اور گھر میں پانچ بیٹیاں جو ککڑی کی بیل کی طرح دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور اسی حساب سے مہنگائی بھی۔ اس کمر توڑ مہنگائی کے دور میں جس طرح اماں گھر کا خرچ چلاتی تھیں، یہ ان کا ہی کمال تھا اور اس بات کے ابا میاں بھی معترف تھے۔ کیونکہ وہ تو تنخواہ اماں کے ہاتھ پر رکھ کر بری الذمہ ہو جاتے تھے لیکن انہیں احساس ضرور تھا کہ اس معمولی سی رقم میں پورا مہینہ چلانا کس قدر مشکل کام ہے اور پھر لڑکیاں بھی سب پڑھنے والی تھیں۔

اماں ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو ہر وقت تنخواہ کی کمی اور مہنگائی کی زیادتی کا رونا رو کر گھر کا سکون برباد کرتی ہیں۔ انہوں نے اولاد کے سامنے کبھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ان کی شخصیت میں بردباری تھی اور خودداری اس حد تک کہ مہینے کے آخری دنوں میں چٹنی روٹی پر گذارا کر لیتیں لیکن کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ نہ کبھی حالات سے تنگ آ کر ابا میاں کو ان کی کم مائیگی کا طعنہ دیا۔

ان تمام باتوں کے ساتھ شاید ان کے اندر کہیں خوشحال اور آسودہ زندگی کی خواہش ضرور تھی جس کا اظہار انہوں نے یوں تو کبھی نہیں کیا لیکن جب بڑی آپا کے لیے پیام آنے شروع ہوئے تو ان کی دبی خواہش اس طرح سامنے آئی کہ وہ ہر آنے والے پیغام کو بڑی سہولت سے رد کرتی گئیں۔

"نیک بخت۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟" ایک دن ابا میاں نے پوچھ ہی لیا۔

"میں تو بس اتنا چاہتی ہوں اکرام علی کہ میری بیٹی اچھے کھاتے پیتے گھر میں بیاہی جائے۔" اماں کی صاف گوئی پر ابا میاں کتنی ہی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"دیکھو ناں اکرام علی۔" اماں کہنے لگیں۔ "ہم نے تو جو بُری بھلی گذارنی تھی، گذار لی، اب کم از کم بیٹیوں کے لیے تو اچھا سوچیں۔ اس گھر میں ہم نے اپنی بچیوں کو دیا ہی کیا ہے سوائے تعلیم کے۔ نہ اچھا پہنایا، نہ اچھا کھلایا تو کیا ان کی خواہش نہ ہو گی اچھا پہننے اور اچھا کھانے کی۔"

"اُن کے نصیب میں اگر اچھا پہننا اور اچھا کھانا لکھا ہو گا تو ضرور ملے گا، تم کیوں فکر کرتی ہو؟" ابا انہیں رسان سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے فکر کرنی ہے۔" اماں اپنی بات پر زور دے کر بولیں۔ "میں اپنی بیٹی کو کسی کلرک سے بیاہ کر اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ اس کے نصیب میں ہو گا تو وہ کلرک منیجر بن جائے گا یا کسی مل کا مالک۔ نہیں اکرام علی، اپنی ساری زندگی تو کبھی سر اور کبھی پاؤں ڈھانپنے کے چکر میں گزر گئی۔ اب بیٹیوں کے ساتھ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"تم یہی کہو گے کہ کہیں بیٹیوں کی عمریں نہ نکل جائیں۔ تو بے شک نکل جائیں۔ یہاں دال روٹی کھا کر چین کی نیند تو سوتی ہیں۔ اگر دوسرے گھر میں بھی یہی حالات رہے تو چین کی نیند بھی نہیں ملے گی۔ ابھی اکیلی جان ہیں، کوئی فکر کوئی تردد نہیں۔ اگلے گھر میں ایسے حالات ہوئے تو سو بکھیڑے ہوں گے۔ اپنی کم اور گھر کی فکر زیادہ۔ اور جب بچے ہوں گے تو ان کے لیے جان مارتے ہوئے ضرور سوچیں گی کہ ہمیں ساری زندگی میں ملا ہی کیا۔ ماں باپ کے گھر بھی ہر چیز کو ترستے رہے اور یہاں بھی کچھ نہ ملا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے۔" ابا میاں کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولے تھے۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں اب تک بڑی کے لیے جتنے پیغام آئے ہیں، وہ سب موزوں اور مناسب تھے۔ جاوید، خالد، قاسم۔ کیا بُرائی تھی ان سب میں؟ پڑھے لکھے، نیک اور سب سے بڑی بات کہ شریف خاندانوں سے تھے۔"

"میں مانتی ہوں، یہ سب خوبیاں تھیں ان میں لیکن جو خوبی میں چاہتی ہوں، وہ کسی میں نہیں تھی۔" اماں ہاتھ اُٹھا کر فیصلہ کُن لہجے میں کہتیں۔

"گویا پیسے کو تم خوبی مانتی ہو۔" ابا میاں ہنستے ہوئے بولے تھے۔

"ہاں۔" اماں نے بالکل بُرا نہیں منایا۔ "تم خواہ مذاق اڑاؤ یا کچھ بھی کہو، میرے نزدیک یہ بڑی خوبی ہے اور سُن لو، میں بیٹی وہیں بیاہوں گی جس میں یہ خوبی ہو گی۔"

"نیک بخت، اِس گھر کی کرتا دھرتا تم ہو۔" ابا میاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ "سیاہ و سفید کی مالک ہو جو مناسب سمجھو کرو لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ صرف اس ایک خوبی کو دیکھتے ہوئے بقیہ باتوں کو نظر انداز مت کر دینا۔"

"فکر مت کرو اکرام علی، دیکھ بھال کر ہی کروں گی۔" اماں نے خود مطمئن ہو کر ابا میاں کو بھی اطمینان دلا دیا تھا۔ "میری بیٹیاں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہیں۔ پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ گھرداری کا سلیقہ بھی ہے۔ اور پھر خدا کی ذات سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ اب جبکہ اس گھر میں پتھر آنے ہی لگے ہیں تو مجھے یقین ہے کبھی کوئی ایسا پتھر بھی ضرور آئے گا جو ہر لحاظ سے میری بیٹی کے لیے موزوں ہو گا۔"

بڑی آپا پہلوٹھی کی اولاد تھیں۔ خاصی خوش شکل۔ درمیانے قد کے ساتھ جسم سڈول تھا۔ مزاج میں ٹھہراؤ بلکہ بہت حد تک کم سخن کہی جا سکتی تھیں۔ بس ایک دھیمی مُسکان جو ہر دم ان کے ہونٹوں پر سجی رہتی۔ پچھلے سال انہوں نے بی۔ اے کیا تھا۔ اس کے بعد گھرداری میں مصروف تھیں۔ گو کہ ان کے لیے پیغام تو اسی وقت آنا شروع ہو گئے تھے جب وہ بی۔ اے میں پڑھ رہی تھیں۔

لیکن۔

کیونکہ کوئی اماں کے معیار پر پورا نہیں اُترا تھا اس لیے پہلے اُن کی پڑھائی کا بہانہ کر کے ٹالتی رہیں پھر جب یہ عذر بھی نہیں رہا تو سہولت سے منع کرتی رہیں مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا یعنی اماں کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گذشتہ سال بوا (جو رشتے کروانے کا کام کرتی تھیں) عاصم بیگ کا پیغام لائیں، جو ہر لحاظ سے اماں کے معیار کے مطابق تھا۔

عاصم بیگ ایک بینک میں منیجر تھے۔ کنبہ بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس ایک ماں اور ایک چھوٹا بھائی۔ گھر بھی ذاتی تھا۔ اور زندگی کی مزید سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ اماں کی سوچ بہت اونچی نہیں تھی۔ بس بیٹی خوشحال ہو اور معمولی معمولی چیزوں کو ترسنا نہ پڑے۔ اس لحاظ سے عاصم بیگ نہایت مناسب لگے۔

انہوں نے ابا میاں سے مشورہ کیا اور کچھ چھان بین کے بعد ہامی بھر لی۔ یہاں قسمت نے اماں کا ساتھ دیا یا پھر بڑی آپا ہی قسمت کی دھنی نکلیں کہ عاصم بیگ کی والدہ انہیں دیکھتے ہی اُن پر ایسی لٹو ہوئیں کہ تین کپڑوں میں انہیں بیاہ کر لے جانے پر تیار تھیں لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اماں انہیں تین کپڑوں میں رُخصت کر دیتیں۔ ساری زندگی جو جمع کیا تھا، اس میں سے بڑی آپا کا حصہ نکال کر اپنی حیثیت کے مطابق انہیں رخصت کیا۔

ان کے مستقبل کی طرف سے تو اماں نے پہلے ہی اپنا اطمینان کر لیا تھا پھر جب کچھ دنوں میں انہوں نے بڑی آپا کا رنگ روپ دیکھا جو ان کی آسودگی کا غماز تھا۔ تو انہیں اطمینان ہو گیا۔

پھر چھوٹی آپا تھیں۔ شکل و صورت ان کی بھی اچھی تھی۔ اور رنگت باقی تمام بہنوں سے صاف۔ اس پر گھنے سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی ان کی کمر پر ناگن کی طرح لہرایا کرتی۔ قد بھی اونچا تھا۔ لیکن ایک خامی جس نے ان کی خوبصورت شخصیت کو داغدار کر دیا تھا۔ وہ ان کی ایک ٹانگ کا نقص تھا۔ بچپن میں سڑک پار کرتے ہوئے کہیں

سائیکل رکشہ نے انہیں ٹکر ماردی تھی، جس سے ان کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں کی لاپرواہی کہ ہڈی صحیح جگہ جمائے بغیر پلاسٹر چڑھادیا جس سے ان کی چال میں تھوڑا 'لنگ' آگیا تھا۔

شروع میں بلکہ زندگی کے بہت سارے سالوں میں چھوٹی آپا نے اپنے اس عیب کو کوئی اہمیت نہیں دی حالانکہ بچپن میں آس پڑوس کے بچے انہیں 'لنگڑی' کہہ کر چھیڑا بھی کرتے تھے۔ ایک بار وہ دل برداشتہ ہوکر بہت روئی تھیں لیکن ابامیاں نے اتنی نرمی سے انہیں سمجھایا کہ پھر کبھی انہوں نے کسی کے چھیڑنے پر بُرا نہیں منایا۔

ویسے بھی وہ غیر معمولی ذہین تھیں۔ پڑھائی میں سب سے آگے۔ ہمیشہ ہر کلاس میں اوّل آتی رہیں اور میٹرک سے تو ان کی باقاعدہ پوزیشن چلی آرہی تھی۔ اسی سال انہوں نے بی۔ایس۔سی کیا تھا۔ وہ آگے بھی پڑھنا چاہتی تھیں اور ان کی ذہانت اور تعلیمی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ابامیاں کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ آگے پڑھ لیں لیکن ایک تو ماموں اجازت نہیں دیتے تھے، دوسرے امّاں بھی راضی نہیں ہوئیں اور امّاں سے اختلاف تو اس گھر کا کوئی فرد بھی نہیں کرتا تھا۔ یوں چھوٹی آپا گھرداری میں لگ گئیں۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ لیکن جس روز چھوٹی آپا کو دیکھنے کچھ خواتین آئیں اور انہوں نے محض ان کے پیر کے نقص کی وجہ سے انہیں رَد کیا، اس روز سے چھوٹی آپا کا مزاج بدل گیا۔ وہ جو ہر ایک کا مذاق اب تک بڑے ضبط سے سہتی آئی تھیں، اس مقام پر شاید ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور پھر ایسا ایک بار نہیں، بار بار ہوا، بارہا اپنے ٹھکرائے جانے کی پھانس دل میں ایسی چبھی کہ وہ ہنستی مسکراتی چھوٹی آپا جانے کہاں جا سوئی تھیں کہ پھر ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ گوکہ امّاں ایسے موقعوں پر اس قسم کے جملے بولا کرتی تھیں۔

"میری صوفیہ کے لیے کیا کمی ہے، دیکھنا کس شان سے بیاہوں گی۔ یہ سب عقل کے اندھے' انہیں اندازہ ہی نہیں کہ میری بیٹی کتنی بھگوان ہے۔"

اور چھوٹی آپا نادان نہیں تھیں جانتی تھیں یہ سب دل بہلاوے کی باتیں ہیں اور امّاں جیسے بچپن میں انہیں ایسی باتوں سے بہلا لیا کرتی تھیں۔ سمجھتی تھیں اب بھی وہ بہل جائیں گی اور بہلنا تو دُور کی بات چھوٹی آپا تو تھے سے اُکھڑ جاتیں۔ زندگی میں کبھی امّاں کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اب تو ایسی ایسی باتیں سُنا جاتیں کہ امّاں حیران پریشان پورا منہ کھولے ان کی طرف دیکھے جاتیں۔

اور چھوٹی آپا اسی پر بس نہیں کرتی تھیں۔ پہلے خوب بولتیں، اس کے بعد اسی حساب سے اُن کا رونا شروع ہوجاتا اور آخر میں چادر اوڑھ کر جو لیٹتیں تو پھر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی انہیں اٹھانے کی۔ اور آج جو گھر میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور رات کا کھانا کھاتے ہی سب اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ دوپہر میں بوا کچھ خواتین کو لے کر آگئی تھیں۔ انہوں نے چھوٹی آپا کو دیکھا اور بظاہر پسند بھی کیا لیکن جب چھوٹی آپا ان کے سامنے سے چلتی ہوئی کمرے سے نکلیں تو خواتین کی نظریں دروازے تک ان کا تعاقب کرتی گئی تھیں۔ پھر انہوں نے بوا کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "کیوں بی بی، ہمیں پہلے سے آگاہ کیوں نہ کیا کہ لڑکی لنگڑی ہے۔"

بوا اپنی جگہ چور سی بنی نظریں چُرا گئیں۔ اور امّاں خوامخواہ گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے چھوٹی آپا کے ساتھ ہونے والے حادثے کو دہرانے لگی تھیں۔

پھر جس طرح وہ خواتین ناک بھوں چڑھاتی ہوئی گئیں۔ اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دوبارہ نہیں آئیں گی اور غنیمت ہوا کہ آج امّاں نے چھوٹی آپا کو بہلانے کی خاطر اپنے مخصوص جملے نہیں بولے بس ایک دم سے خاموش ہوگئی تھیں۔ اور چھوٹی آپا نے بھی چپ چاپ چادر میں پناہ لی تھی۔

اور تیسرے نمبر پر وہ تھی یعنی ربیعہ اکرام علی۔ گوکہ شکل وصورت اور عادات واطوار میں باقی بہنوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ بس کہیں کہیں تھوڑا فرق نظر آتا تھا۔ اور یہی فرق اسے باقیوں میں ممتاز بھی کرتا تھا۔ سروقد اور سُرخی مائل گندمی رنگت میں ایک خاص کشش تھی۔ چہرے پر نرمی تھی اور آنکھوں میں سنجیدگی اور شاید اس کے علاوہ بھی کوئی اور بات ضرور تھی جو اسے پہلی غیر ارادی نظر کے بعد ارادی۔ نظر کا حقدار ٹھہراتی تھی کیونکہ سب بہنیں سال دو سال کے فرق سے تعلیمی میدان میں تھیں۔ بڑی آپا بی۔اے کرکے نکلیں تو چھوٹی آپا بی۔ایس۔سی میں آگئیں۔ اور چھوٹی آپا —— فارغ ہوئیں تو آپ وہ بی۔اے میں تھی۔

پڑھائی میں بس نارمل تھی۔ امتحان سر پر ہوتے تو جی جان سے محنت کرتی اور فرسٹ ڈویژن لے آتی۔ چھوٹی آپا کی طرح بہت زیادہ ذہین نہیں تھی۔

اس کی ایک الگ تھلگ سی عادت یہ تھی کہ وہ اکثر بیٹھے بٹھائے کھو جایا کرتی تھی۔ کہیں تتلی دیکھی تب کہیں پھول کھلا تب، کبھی کوئی بچہ۔ غرض جو چیز اسے اچھی لگتی یا متاثر کرتی تھی اسے دیکھتے ہی وہ کھو جاتی تھی۔ نظریں اس چیز پر مرکوز کیے (پتا نہیں ذہن ساتھ دیتا تھا کہ نہیں) وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں رہتی تھی۔ کچھ تنہائی پسند بھی تھی اور تنہائیوں میں سوچنا اچھا لگتا تھا۔ اور گذشتہ سال تک تو اس کی سوچیں گھر کے افراد تک ہی محدود تھیں۔ نرم دلی کے باعث گھر کے مسائل کو سمجھتی اور ان پر کُڑھتی بھی تھی۔ خاص طور پر چھوٹی آپا کے بدلتے رویّے نے اسے بہت دُکھ پہنچایا تھا۔ وہ چھوٹی آپا کو قصوروار نہیں سمجھتی تھی، جو لوگ ذمّہ دار تھے، اُسے ان پر افسوس ہوتا تھا اور گذشتہ سال تک اس کی سوچیں بس اس حد تک محدود تھیں۔

پھر اچانک ان میں ایک اور رنگ شامل ہوگیا۔ کچھ شوخ سا رنگ، پہلے دل کے دروازوں پر دستک دی اور پھر ایوانوں میں جا بسا۔ وہ حیران تھی اور پریشان بھی کہ اس کے ساتھ یہ حادثہ کیونکر ہوا۔ ابامیاں، امّاں یا کسی کو بھی پتا چلا تو سب کیا سوچیں گے کہ اس گھر میں وہ کوئی نرالی تو نہیں بڑی ہوئی، اس سے پہلے دو لڑکیاں اور بھی اس عمر کو پہنچ چکی ہیں اور ان کے ساتھ تو کبھی کوئی بات منسوب نہیں ہوئی اور وہ۔

اپنے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ڈرنے لگتی تھی کہ اگر جو کبھی کسی نے اس کی آنکھوں میں اس چہرے کا عکس پالیا تو کیا ہوگا؟" وہ ایک چہرہ جو پہلی نظر میں اسے اچھا لگا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اسے دیکھتے ہی وہ کھو سی گئی تھی یوں کہ گردوپیش کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔

وہ چہرہ ثاقب حسن کا تھا۔

ثاقب حسن اس کی دوست انیلا کا بھائی تھا۔ انیلا اسی سال کسی دوسرے شہر سے مائیگریٹ ہوکر اس کے کالج میں آئی تھی اور شاید راستوں سے ناآشنائی کی بنا پر ثاقب حسن اسے کالج سے لینے آیا تھا۔ وہ اس وقت کالج گیٹ سے نکل رہی تھی کہ بلا ارادہ اس کی نظر ثاقب حسن کی طرف اٹھ گئی تھی اور پھر اسے اپنے اطراف کی خبر نہ تھی۔

بنا پلکیں جھپکائے وہ اس یونانی دیوتاؤں کا سا حسن رکھنے والے شخص کو دیکھے گئی تھی۔ اس میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا، بس پتا نہیں کیسے وہ بے بس ہو جایا کرتی تھی۔ اسے تو یہ خیال بھی کبھی نہیں آیا کہ جو حرکت اس سے سرزد ہو رہی ہے، وہ غلط ہے۔ یہ خیال تو بہت بعد میں آتا تھا۔ بہرحال اس روز ثاقب حسن نے پہلی غیر ارادی نظر کے بعد ارادی نظر اس پر ڈالی تھی جس کی وہ حقدار تھی اور اسے یوں اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ مسکرایا بھی تھا لیکن وہ اپنے آپ میں کہاں تھی جو اس کے مسکرانے کا بُرا مانتی یا جھینپ جاتی۔ وہ تو اس وقت تک اسی طرح کھڑی رہی جب تک ثاقب حسن انیلا کو لے کر چلا نہ گیا۔

پھر اکثر ایسا ہونے لگا۔ شروع شروع میں دونوں دُور ہی دُور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ اور اس کے بعد فاصلے سمٹنے لگے۔ اور اب تو دونوں یک جان دو قالب تھے۔ وہ بڑے اعتماد سے اس کے سنگ کالج سے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ طے کرتی تھی۔ اس دوران انیلا جان بوجھ کر کہیں پیچھے رہ جاتی تھی۔ پہلے پہل اس راستے کی ہمسفری نے اسے بزدل بنادیا تھا۔ ہر وقت ایک دھڑکا۔

کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔

کہیں کوئی آشنا چہرہ اچانک سامنے نہ آجائے؟

کہیں جو بات اب تک راز ہے سرِعام آکر اسے رُسوا نہ کردے؟

پھر شاید یہ اس کی محبت کا اعجاز تھا کہ سب دھڑکے، اندیشے اور خدشے کہیں پس منظر میں چلے گئے اور وہ جو بزدل تھی، ایک دم بہادر بن گئی۔ "جو ہوگا دیکھا جائے گا"۔ اور یہ سبق یقیناً اسی نے سکھایا تھا جو مرد تھا اور جسے رُسوا ہونے کا کوئی خدشہ بھی نہیں تھا۔

اس کے بعد چوتھے نمبر پر کلثوم تھی اور اس کے بعد ثمنا۔ یہ دونوں کیونکہ ابھی لڑکپن کی حدود میں تھیں اس لیے خاصی لاابالی، نٹ کھٹ اور شرارتی تھیں۔ اس گھر کی خاموش فضاؤں میں اگر کوئی ہلچل مچتی تو کلثوم اور ثمنا کی وجہ سے۔ ہر بات سے بے نیاز دونوں کا زیادہ وقت باتیں کرنے اور سب کو ہنسانے میں گزرتا تھا کبھی کبھی اماں ٹوکتی بھی تھیں کہ اتنا زیادہ نہ ہنسا کرو لیکن ابا میاں ان کی طرف داری کرتے ہوئے اماں کو منع کرتے۔

"نیک بخت مت منع کیا کرو انہیں۔ ان ہی کے دم سے تو اس گھر میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔"

دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ ثاقب حسن روزانہ کی طرح مایوس اور نامراد گھر میں داخل ہوا تو فوری طور پر کسی کا سامنا کرنے کے بجائے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پنکھا فل اسپیڈ سے کھول کر اُس نے پہلے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا پھر قمیص کے بٹن کھولتا ہوا پلنگ پر سیدھا لیٹ گیا۔ پورا بدن جو پسینے سے بھیگا ہوا تھا، اس پر پنکھے کی ہوا اے۔سی کا کام کرنے لگی۔ آنکھیں بند کیں تو کچھ دیر کو واقعی اپنی اوقات بھول گیا یوں لگا جیسے کسی عالیشان بنگلے کے یخ بستہ بیڈروم میں محوِ خواب ہو۔

وہ تو جب پسینہ خشک ہوا اور پنکھے کی ہوا معمول کے مطابق کچھ گرم سی محسوس ہونے لگی تب اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اپنے اطراف نظریں دوڑائیں پھر طویل سانس لیتے ہوئے تکیہ اونچا کیا اور نیم دراز ہوتے ہوئے سوچنے لگا۔

"پتا نہیں یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اب تو اماں اور ابا کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے کتنی آس سے۔۔۔ دیکھتے ہیں وہ دونوں جیسے ابھی میں انہیں نوکری مل جانے کی نوید دوں گا۔"

چھ مہینے پہلے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور اس کے فوراً بعد سے ہی وہ جاب کی تگ ودو میں لگ گیا تھا لیکن ابھی تک کہیں بات نہیں بنی تھی۔ گھر کا سب سے بڑا لڑکا ہونے کے ناتے ساری ذمہ داریاں اس پر تھیں۔ اور سب اسی سے آس لگائے بیٹھے تھے اور کوئی ایک فرد تو تھا نہیں۔ ابا جو ریٹائر ہو چکے تھے۔ اماں، تین بہنیں اور ایک بھائی۔ جب سے ابا ریٹائر ہوئے تھے، گھر کے حالات کافی خراب ہو چکے تھے۔ آمدنی کے نام پر صرف اُن کی پینشن تھی اور اتنی رقم میں گھر کی گاڑی چلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھی۔ اماں نے فوراً ہی مشین سنبھال لی، بڑی دونوں بہنیں پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ رہیں۔ البتہ انیلا کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار نہ ہوئی۔ پھر عاقب تھا جو ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا۔ ایک طرح سے مسائل کا بارِ گراں اور وسائل کچھ بھی نہیں تھے۔ پھر بہنیں بھی شادی کی عمروں کو پہنچ چکی تھیں۔ اور یہ سب اسی کو کرنا تھا۔

یہ سارے مسائل دیکھتے ہوئے وہ چاہتا تھا کوئی اچھی جاب ملے جو اس کے سارے مسائل کو پل میں نہیں تو رفتہ رفتہ ضرور حل کر دے اور ایسی نوکری جس کی معمولی سی تنخواہ میں پورا مہینہ چلنا بھی مشکل نظر آتا اگر ملتی بھی تھی تو اس نے قبول نہیں کی۔ اور پھر جب سے ربیعہ اس کی زندگی میں آئی تھی، تب سے وہ اپنے بارے میں بھی سوچنے لگا تھا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ بہنوں کے فرض ـــــــ سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی وہ اپنے لیے کچھ کر سکے گا۔ اور ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں پتا نہیں کتنا وقت لگے۔ سال، دو سال یا اس سے بھی زیادہ ۔ اور کیا اتنا عرصہ ربیعہ اس کا انتظار کر سکے گی؟"

یہ خیال آج اچانک ہی اسے آیا تھا۔ اس وقت جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا اور اب پھر وہ اسی نہج پر سوچنے لگا۔

ربیعہ اس کی محبت تھی۔ اور وہ اُس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد سے جلد نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑا ہو بلکہ بہنوں کی ذمہ داریوں سے بھی فارغ ہو جائے اور یہاں رہ کر تو یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ اتنی کم مدت میں وہ یہ سب کر لے۔

"کیوں نہ میں کہیں باہر نکلنے کی کوشش کروں۔ مڈل ایسٹ یا کہیں اور۔" اس نے سوچا اور اس سوچ کے ساتھ ہی ٹوٹتی آس پھر سے بندھنے لگی تھی۔

باہر جا کر تو جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں الٰہ دین کا چراغ آ جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے گھروں کی جگہ بڑے محل تعمیر ہو جاتے ہیں۔ یقیناً میں بھی ایک سال میں اپنے سارے مسائل سے نکل کر ربیعہ کے لیے ایک بڑا سا گھر لوں اور ایک سال کوئی اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا، پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔ میں ربیعہ سے کہوں گا۔

"بھائی۔" وہ جانے کیا کچھ سوچے جا رہا تھا کہ انیلا نے دروازے میں جھانک کر اُسے پکارا۔ وہ چونکا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اماں کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔" انیلا نے کہا تو وہ طویل سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس کے ساتھ ہی کمرے تک آیا۔ دستر خوان پر سب لوگ بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" اماں سالن کا ڈونگا اس کے آگے رکھتی ہوئی بولیں۔

"میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"کچھ کام بنا؟" اماں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کام بنتا تو سیدھا اپنے کمرے میں کیوں چلا جاتا۔ پہلے تمہیں اطلاع نہ دیتا۔" اس کا جواب ابا نے دیا تو اماں بُرا مانتے ہوئے بولیں۔

"ضروری تو نہیں ہے۔ پہلے مجھے اطلاع کرتا۔ آخر تھکا ہوا آیا تھا۔ کچھ دیر آرام کرتے لیٹ گیا ہوگا۔"

"بس کریں اماں۔" اس نے ٹوک دیا۔ "ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر کام بنتا تو میں تھکا ہوا ہونے کے باوجود پہلے آپ کو اطلاع دیتا۔"

"چلیں بھائی۔ پہلے کھانا کھائیں۔" شکیلہ نے اس کی پلیٹ میں روٹی رکھی۔ پھر اماں اور ابا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "کم از کم کھانا تو آرام سے کھانے دیں، یہ ساری باتیں آپ بعد میں بھی کر سکتی ہیں۔"

شکیلہ کے ٹوکنے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ اس کے بعد ابا چھوٹے کمرے میں چلے گئے۔ شکیلہ اور نبیلہ برتن سمیٹنے لگیں۔ انیلا نے فرش صاف کر کے سونے کے لیے نیچے دری بچھا دی اور وہ اماں کے ساتھ ان کی چارپائی پر آ بیٹھا۔

گو کہ کھانے کے بعد اُس پر بھی سُستی سوار ہو گئی تھی۔ اور دل چاہ رہا تھا، چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن محض اس خیال سے اماں کے پاس بیٹھ گیا کہ انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر سکے کہ یہاں نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہ وہ کہیں باہر نکل جائے اور جتنی بھاگ دوڑ وہ یہاں نوکری حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے اتنی بھاگ دوڑ اور کوشش باہر جانے کے لیے کرے، اس میں ان سب کا فائدہ ہے۔

ابھی وہ بات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ شکیلہ اور نبیلہ بھی فارغ ہو کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔ اور جس انداز سے وہ بیٹھیں، اس سے وہ سمجھ گیا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہیں، اس لیے وہ اپنی بات روک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھائی۔ ایک دن آپ اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے۔" شکیلہ اسے متوجہ پا کر کہنے لگی۔ "وہی جس کے بارے میں آپ بتا رہے تھے کہ اس کی اپنی کنسٹرکشن کی فرم ہے۔ پتا نہیں کیا نام لے رہے تھے اس کا۔"

"شہروز احمد۔" اس نے کہا۔

"ہاں وہی۔ تو میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ آپ ان کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی جگہ خالی ہو اور اگر نہیں بھی ہوگی تو وہ آپ کے لیے۔" باقی بات اُس نے خود ہی مکمل نہ کی کہ بھائی خود ہی سمجھ جائے گا۔

"ہاں۔" اُس نے گہری سانس کے دوران 'ہاں' کہتے ہوئے شکیلہ کی بات کاٹ دی پھر اماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اماں۔ میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟ کیا سوچ رہے ہو؟" اماں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"میں سوچ رہا ہوں۔ یہاں مارے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہیں باہر نکلنے کی کوشش کروں۔"

پھر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔

"دیکھیں ناں امّاں۔ یہاں نوکری کرنے سے کیا ملے گا؟۔ بارہ پندرہ سو روپے یا پھر زیادہ سے زیادہ ہزار ایک سو" "تو بیٹا۔ آمدنی کا کچھ ذریعہ تو ہو جائے گا ناں۔"

"امّاں۔ ہمیں اب صرف دو وقت روٹی کی فکر نہیں کرنی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے مسائ
شکیلہ، نبیلہ پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر بیٹھی ہیں۔ کل کو انیلا بھی فارغ ہو جائے گی تو کیا ہمیں ان کی شاد
کرنی۔ اور پھر گھر کی حالت آپ دیکھ رہی ہیں۔ اس گھر میں کوئی اچھا رشتہ تو آنے سے رہا جبکہ میں
گھر ٹھیک ٹھاک کر کے بہنوں کو اچھی جگہ بیاہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے اماں کہ میں باہر جا کر
کروں۔ آپ نہیں جانتیں وہاں کی محنت مزدوری سے جتنا پیسہ ملتا ہے، اتنا تو یہاں کی افسری سے بھی
اس نے اچانک جس مسئلے کو چھیڑ دیا تھا، اس سے امّاں بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"دیکھیں ناں امّاں۔ یہی دو چار سال ہیں۔ وہ اگر میں نے یہاں گنوا دیے تو ہمارا کوئی ایک مس
نہیں ہوگا۔ شکیلہ کی عمر دو چار سال بعد آپ کی سوچ میں کتنی ہوگی؟۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" امّاں پُرسوچ انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولیں۔ "لیکن بیٹا، باہر نکلنے کے ل
کچھ روپیہ چاہیے ہوگا۔"

"چاہیے تو ضرور لیکن اسے آپ مسئلہ نہ بنائیں۔ کہیں سے بھی قرض لے لیتے ہیں، کچھ آپ، کچھ مہ
امّاں میں دو مہینے میں لوٹا دوں گا۔"

امّاں کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔ "پھر آپ اجازت دے رہی ہیں۔ میں کوشش کروں؟"

"کیا کوشش کرو گے؟"

"کسی بھی ایجنسی سے رابطہ کروں گا۔ وہ پندرہ بیس ہزار لے کر مجھے باہر بھیج دیں گے۔" قد
توقف کے بعد کہنے لگا۔ "یہاں سے وہ جس کام کے لیے بھیجیں گے، چلا جاؤں گا۔ وہاں جا کر میر
طور پر کوشش کر کے مزید اچھا کام تلاش کر لوں گا۔"

"بھائی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں امّاں۔" نبیلہ نے اس کی تائید کی۔

"جیسے تم مناسب سمجھو بیٹا۔ مگر اصل مسئلہ تو پندرہ بیس ہزار کا ہے۔" امّاں شش و پنج کی کیف
تھیں۔

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے امّاں۔ آپ جس سے بھی میرے باہر جانے کا کہہ کر قرض لیں گی، وہ ا
کرے گا۔ آپ بڑے ماموں سے کہیں یا چچا جان سے اور جو کمی بیشی ہوگی، وہ میں اپنے دوستوں
کر لوں گا۔ واپسی کی بالکل فکر نہ کریں میں دو مہینے میں سب کی رقم لوٹا دوں گا۔"

"میں تمہارے ابّا سے بات کروں گی۔"

"صرف بات نہیں امّاں، انہیں قائل بھی کرنا ہے اور یہ کام صرف آپ کر سکتی ہیں۔" امّاں نے ا
سر ہلا دیا۔

"بس تو طے ہو گیا کہ مجھے باہر جانا ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی طرف
ہوئے وہ اپنے اندر ایک نیا عزم ایک نیا حوصلہ پیدا کر چکا تھا۔

وہ خواتین جو چھوٹی آپا کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی گئی تھیں۔ وہ پھر آگئیں۔ امّاں کو حیرت
لیکن ظاہر نہیں ہونے دی۔ اسی طرح عزت سے بٹھایا اور بیٹھتے ہی ایک خاتون کہنے لگیں۔

"ہمیں لڑکی تو اسی دن پسند آگئی تھی۔ بس ذرا ہم آپس میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ا
اظہار نہیں کیا۔"

امّاں نے تحمل سے ان کی باتیں سُنیں اور پھر لڑکے کی بابت معلوم کیا جب انہوں نے یہ بتایا کہ لڑ
ٹیوٹ کمپنی میں اسٹور کیپر ہے تو امّاں نے ان ہی کا جواب لوٹا دیا۔

"میں اپنے میاں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گی۔"

"بہن مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ کل گھر آ کر لڑکے کو دیکھ لیں اور بات پکی کر لیں۔"

"نہیں بی بی، یہ عمر بھر کا معاملہ ہے۔ اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے بات نہیں بنے گی میں اطمینان
سے اپنے میاں سے مشورہ کر لوں پھر کوئی جواب دے سکوں گی۔" امّاں نے سہولت سے انہیں سمجھا دیا۔
جب وہ خواتین دوبارہ آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ تو امّاں مسلسل منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی تھیں۔

وہ سب بہنیں حیران تھیں کہ یہ امّاں کو کیا ہو گیا ہے حالانکہ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کتنی فکر مند رہتی
ب چھوٹی آپا کی طرف سے اور اب جب ان کا مسئلہ حل ہو رہا ہے تو بجائے خوش ہونے کے منہ پھلائے پھر
ن ہیں۔

کلثوم اور ہما کچھ دیر تک تو امّاں کا موڈ دیکھتے ہوئے خاموش رہیں لیکن زیادہ دیر تک ان سے برداشت
یں ہوا۔ چھوٹی آپا کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے دبی دبی مسکراہٹ ہونٹوں پر مچلی پھر بے ساختہ ہنسی
ے دوران دونوں نے گانا شروع کر دیا۔

ے بنّو رانی دُلہنیا بنے گی !
گورے ہاتھوں میں مہندی رچے گی

"ارے"۔ ربیعہ نے ان دونوں کو روکنا چاہا۔ لیکن جب چھوٹی آپا پر نظر پڑی تو اس نے اپنا ارادہ ملتوی
ردیا کیونکہ چھوٹی آپا بظاہر ان دونوں کو گھور رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر بکھرے اَن گنت رنگ اس بات
ے عکاس تھے کہ انہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے۔ اس نے چھوٹی آپا کے چہرے پر پھیلی قوس و قزح کو دلچسپی سے
یھا۔ پھر عادت کے مطابق جانے کہاں کھو گئی۔ نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں سا اور ذہن کہیں اور بھٹک
ہا تھا۔

اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی سے ایک ایک کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔
پھر قدرے اونچی آواز میں ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ بند کرو یہ سب۔"

"امّاں، خوشی کا موقع ہے۔" کلثوم نے کہا تو امّاں کو مزید غصہ آگیا۔

"خوشی کا موقع۔ کیسی خوشی؟ کہاں کی خوشی؟ کیا ہوا ہے اِس گھر میں؟ کیا تمہارے بادا کی کوئی لاٹری نکل
آئی ہے۔"

"امّاں۔ یہ سب تو چھوٹی آپا کے لیے۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے امّاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا چاہا لیکن
ان کی گھورتی نظروں کے سامنے اس کی زبان بند ہو گئی۔

"چلو اُٹھو تم سب یہاں سے۔ رات کے کھانے کی فکر ہے کہ نہیں۔" امّاں نے سب کو اُٹھا دیا۔ "ربیعہ
سالن چڑھا دو اور تم آٹا گوندھ کر روٹی پکاؤ۔" وہ خاموشی سے اُٹھی اور چھوٹی دونوں کو اپنے ساتھ آنے کا
اشارہ کیا تو وہ دونوں بُرا سا منہ بناتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑیں۔

رات میں وہ حسب عادت ستاروں کے جُھرمٹ میں اس مانوس چہرے کی شوخیاں دیکھتے ہوئے
خوابوں کی سرزمین پر بھٹکنے لگی تھی۔ جب امّاں کی آواز نے اسے حقیقت کی دُنیا میں لا کھینچا۔ وہ ابّا میاں کی
چارپائی کے پاس کھڑی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔

"سو گئے کیا اکرام علی؟"

"اوں۔ نہیں تو۔"

ابّا میاں نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور امّاں ان کے پاس بیٹھتی ہوئی یوں بیٹیوں کی
طرف دیکھنے لگیں جیسے اندازہ کر رہی ہوں کہ سب سو گئی ہیں یا نہیں۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔
امّاں اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ابّا میاں سے کہنے لگیں۔

"آج پھر وہ عورتیں آئی تھیں۔ اپنی صوفیہ کے لیے۔"
"کیا کہہ رہی تھیں؟" ابا میاں کے لہجے میں بے صبری تھی۔
"کہہ رہی تھیں ہمیں لڑکی پسند ہے۔ اب آپ لڑکے کو دیکھ کر بات پکی کر لیں۔"
"چلو۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب تم۔"
"لیکن اکرام علی۔" ابا میاں کی بات پوری ہونے سے پہلے امّاں بول اٹھیں۔ "ہمیں لڑکا دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"تو کیا بغیر دیکھے ہی۔؟"
"نہیں۔ بلکہ میں یہاں صوفیہ کی شادی نہیں کروں گی؟"
"کیوں؟"
"لڑکا کسی پرائیویٹ کمپنی میں اسٹور کیپر ہے۔ نہ ذاتی گھر اور نہ ہی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ ہے جبکہ گھر کے افراد بھی ماشاءاللہ اچھے خاصے ہیں۔ ایسے حالات میں تو میری بیٹی۔"
"نیک بخت۔" ابا میاں نے ٹوک دیا۔ "اللہ پر بھروسا رکھو، حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ہو سکتا ہے تمہاری بیٹی بھاگوان ہو جو اس گھر میں جاتے ہی۔"
"نہیں اکرام علی۔ بیٹیوں کے نصیب کھول کر نہیں دیکھے ہم نے اور اگر مجھے اپنی بیٹی کے بھاگوان ہونے کا پختہ یقین ہو، تب بھی میں یہ رسک نہیں لے سکتی اور جہاں تک اللہ پر بھروسا کرنے کی بات ہے تو اسی پر بھروسا ہے جب ہی تو میں نے امید کا دامن تھام رکھا ہے کہ جس طرح بڑی کی شادی اچھے گھر میں ہوئی اسی طرح باقیوں کی بھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس بھروسے پہ آنکھیں بند کر کے کنویں میں چھلانگ لگا دوں کہ اللہ بچا لے گا تو یہ مجھ سے نہیں ہو گا کیونکہ یہ بھروسا نہیں حماقت ہے۔ اللہ کہے گا، میں نے تمہیں عقل نہیں دی تھی۔"
"تم غلط نہیں کہہ رہیں لیکن تمہیں صوفیہ کے پیر کا نقص نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اس کے لیے دامن پھیلا رہا ہے تو انکار مت کرو۔" ابا بھی زور دے کر بولے کہ شاید امّاں نرم ہو جائیں۔
"کیسی باتیں کر رہے ہو اکرام علی؟ ایک معمولی سا نقص ہی تو ہے، کون سا خدانخواستہ میری بیٹی لولی لنگڑی ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔
"اس میں اگر عیب ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ایرا غیرا اس کا ہاتھ مانگے میں اسے ہی تھما دوں۔ میں اس کے لیے بھی اسی طرح سوچتی اور چاہتی ہوں جو بڑی کے لیے چاہا۔ اور ذرا ایمانداری سے بتاؤ، کیا بڑی کو آسودہ حال دیکھ کر کیا تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟"
"کیوں نہیں، اسے دیکھ کر تو آنکھوں میں اور سینے میں ٹھنڈک اتر آتی ہے۔"
"بس تو باقیوں کی طرف سے بھی میں اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھنا چاہتی ہوں۔" امّاں کے فیصلہ کن انداز پر ابا میاں خاموش ہو رہے۔
"میں کل ہی بوا کو بلوا کر انہیں منع کروا بھیجوں گی اور بوا سے بھی صاف صاف کہہ دوں گی کہ رشتے لانے ہیں تو اچھے گھروں کے لائے ورنہ اپنے گھر بیٹھی رہے۔ ایسے گھر میں بیٹی بیاہنے سے بہتر ہے میں بیٹی کو اپنے گھر بٹھائے رکھوں، آگے کی سو پریشانیوں سے یہ ایک پریشانی غنیمت ہے۔" پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔ "ایسی کوئی عمر نہیں نکلی جا رہی ہیں لڑکیوں کی، اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر ہی دے گا۔"
"ہاں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔" ابا میاں دوبارہ لیٹتے ہوئے بولے تو امّاں اپنی چارپائی کی طرف چلی گئیں نے امّاں کو اپنی چارپائی پر بیٹھتے اور پھر لیٹتے محسوس کیا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے پلکوں کے در کھول دیے۔ کھلے آسمان پر ستارے اسی جگہ جگمگا رہے تھے اور عین نظروں کے سامنے وہی ستاروں کا جھرمٹ اس میں سے جھانکتا وہی مانوس چہرہ لیکن اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ اسے چھوٹی آپا کے چہرے پر پھیلے قوس و قزح کے رنگ یاد آنے لگے اور اس نے سوچا۔

"صبح جب چھوٹی آپا کو معلوم ہو گا کہ امّاں نے ان کے لیے آیا ہوا پیغام رد کر دیا ہے تو پتا نہیں ان کے احساسات کیا ہوں گے؟"
"گو کہ امّاں غلط نہیں سوچ رہیں۔ ہر ماں کی طرح ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ بیٹیاں خوشحال گھروں میں جائیں لیکن اس خواہش کو جس طرح انہوں نے اپنے آپ پر طاری کر لیا ہے، وہ یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔ اتنی مشکل سے تو کسی نے چھوٹی آپا کے لیے ہامی بھری ہے اور امّاں اسے بھی اپنی خواہش کی نذر کر رہی ہیں کم از کم چھوٹی آپا سے تو پوچھ لیتیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے چھوٹی آپا ہر قسم کے حالات میں گزارا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ اور چھوٹی آپا ہی کیا ایسا حوصلہ تو ہر لڑکی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتی ہے۔"
اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی اور اپنے لیے سوچتے ہوئے ثاقب حسن کا خیال آیا تو اچانک دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ان دھڑکنوں میں کوئی خوشگوار سا احساس نہیں جاگا تھا بلکہ ایک انجانا خوف اور خوف میں دھڑکا کہ ثاقب حسن بھی تو حالات کا شکار اور بے شمار مسائل میں گھرا ہوا شخص ہے۔ وہ امّاں کے معیار پر کیونکر پورا اترے گا۔
"میرے خدا۔" اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ "میں تو ثاقب حسن کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اور جو امّاں نے اسے رد کر دیا تو میں کیا کروں گی؟" بہت دیر تک وہ اسی انداز سے سوچتی رہی اور آخر میں اس طرح اپنے آپ کو بہلایا۔
"وہ جاب کی کوشش کر تو رہا ہے اور جب تک چھوٹی آپا کی شادی ہو تب تک ہو سکتا ہے وہ کسی قابل ہو چکا ہو۔"
صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اٹھی۔ نماز سے فارغ ہو کر امّاں کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر ناشتا کرنے کے بعد کالج چلی گئی۔ رات کی سوچوں نے اسے خاصا پژمردہ کر دیا تھا۔ پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگا اور پھر آج انیلا بھی نہیں آئی تھی، جس سے وہ کچھ مایوس ہو گئی تھی۔
اس نے سوچا تھا انیلا کو لینے کے بہانے ثاقب حسن آئے گا تو وہ اسے حالات بتلاتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دے گی اور اب ثاقب کے آنے کی امید بھی کم تھی۔ اس نے بہت بے دلی سے پیریڈز اٹینڈ کیے اور آخری پیریڈ تو چھوڑ ہی دیا۔ کچھ دیر یونہی لائبریری میں بیٹھی اس کے بعد گھر جانے کا ارادہ کر کے اٹھ گئی۔
کالج گیٹ سے نکلی تو سامنے ہی ثاقب حسن کھڑا نظر آیا جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔
"میرا خیال تھا آج تم نہیں آؤ گے۔" وہ اس کے قریب پہنچتے ہی کہنے لگی۔
"کیوں؟" وہ مسکرایا۔
"انیلا جو نہیں آئی۔"
"بیوقوف لڑکی۔ انیلا کا تو صرف بہانہ ہوتا ہے ورنہ۔" وہ شوخی سے بولا۔
"اچھا چلو۔" وہ اس کی شوخ نظروں کی تاب نہ لا کر بولی اور اس سے پہلے ہی قدم آگے بڑھا دیے۔
"سنو۔" وہ اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ چلو۔"
"چل تو رہی ہوں۔"
"نہیں۔ میرا مطلب ہے کسی ایسی جگہ جہاں کچھ دیر بیٹھ کر ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔" وہ ایک دم قدم روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ فوراً بولا۔
"میں سمجھتا ہوں یہ مناسب بات نہیں ہے لیکن مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" اور کچھ ضروری باتیں تو اسے بھی کرنی تھیں۔ پھر بھی وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"چلو اگر تمہارا دل آمادہ نہیں ہوتا تو نہ سہی۔" وہ اسے سوچ میں دیکھ کر مصالحانہ انداز میں بولا۔
"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر وہ مخصوص ماحول کی پروردہ لڑکی دل میں کچھ ڈر، کچھ خوف لیے کچھ جھجکتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"قریب ہی ایک پارک تھا۔ اور اس وقت وہاں زیادہ لوگ بھی نہیں تھے۔ وہ اسے لے کر اسی میں داخل ہوگیا۔ اور کنارے رکھی بینچ پر بیٹھے تو کچھ دیر تک دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش رہے تھے۔

"تمہیں کوئی ضروری بات کہنی تھی۔" آخر اس نے خود ہی پہل کی کیونکہ وہ زیادہ دیر تک یہاں رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہتی تھی جلد وہ اپنی اپنی بات کہہ کر وہاں سے اُٹھ جائیں۔

"ہاں۔" وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہاں جاب تلاش کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اب میں باہر جانے کی سوچ رہا ہوں بلکہ آج سے میں نے کوشش بھی شروع کر دی ہے۔"

"تو کیا تم چلے جاؤ گے؟" اس کے سادگی سے پوچھنے پر وہ ہنس پڑا۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں ربیعہ۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"دیکھو ناں، اگر میں یہاں رہا تو اپنی ذمہ داریوں سے نکلنے کے لیے مجھے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ اور اتنی طویل مدت تم میرا انتظار کرنے کا اقرار کر بھی لو تو میرا خیال ہے تمہارے والدین کبھی بھی تمہارے اقرار کا بھرم رہنے نہیں دیں گے۔" اس کے خاموشی سے سر جھکانے پر کہنے لگا۔

"اسی لیے میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال لگیں گے۔ میں بہنوں کی شادیوں سے فارغ ہو جاؤں گا اور دو سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ اتنی مدت تو تم میرا انتظار کر سکتی ہو ناں؟"

"میں تو ایک عمر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔" وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

"لیکن ابھی تم نے خود کہا ناں۔ کہ میرے والدین انتظار نہیں کریں گے۔ اور یہ حقیقت ہے ثاقب حسن کہ امّاں چھوٹی آپا کی شادی کرتے ہی میری فکر میں لگ جائیں گی۔ اور ہمارے گھر کا ماحول ہمیں بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ابا میاں نے تمام اختیارات امّاں کو سونپ رکھے ہیں اور امّاں جو مناسب سمجھتی ہیں، کرتی ہیں۔ بڑی آپا کی شادی ہوئی امّاں نے اشارے کنائے میں بھی ان کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح چھوٹی آپا کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اور میں ان سے الگ تو نہیں ہوں۔ یقیناً میرے بارے میں بھی وہ خود ہی فیصلہ کریں گی۔"

"اس کا مطلب ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور تمہارا طلبگار بن کر سامنے آجائے، میں ابھی اپنی امّاں کو تمہارے گھر بھیج دوں۔"

"نہیں۔" وہ فوراً بول پڑی۔

"کیوں؟" وہ متعجب ہوا۔ اور وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کیسے اس سے کہے اور پتا نہیں اپنی بات سمجھا بھی سکے گی یا نہیں۔

"بتاؤ ناں ربیعہ، کیا بات ہے؟" وہ اسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"سنو ثاقب حسن، کوئی غلط رائے قائم مت کرنا۔ اصل میں امّاں اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان گھروں میں کرنا چاہتی ہیں جو خوشحال ہوں اور جن میں بہت زیادہ مسائل نہ ہوں۔ ابھی کل ہی امّاں نے چھوٹی آپا کے لیے آیا ہوا پرپوزل محض اس لیے ریجیکٹ کر دیا ہے کہ لڑکا اسٹور کیپر تھا۔ اور اس کے کاندھوں پر گھریلو ذمہ داریوں کا بار بھی تھا۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ شش و پنج کی سی کیفیت میں بولا۔

"یہی کہ ایسے حالات میں جب کہ ابھی تم اپنے پیروں پر بھی کھڑے نہیں ہوئے، اپنے گھر والوں کو بھیجو گے تو امّاں نہیں مانیں گی۔ اور ایک بار اگر انکار ہو گیا تو دوبارہ گنجائش نہیں رہے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟" وہ ذرا سا سر اونچا کر کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔"

'ہاں' کی صورت اس کے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی پھر فوراً ہی وہ ہونٹ بھینچ گیا تھا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

ثاقب حسن کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں اُتر آئی تھیں اور پیشانی پر لکیروں کا ہلکا ہلکا جال بنتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ کوئی غلط رائے مت قائم کرنا۔ اصل میں امّاں صرف ماں بن کر سوچتی ہیں اور شاید اپنی پوری زندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہی انہوں نے بیٹیوں کے لیے اس انداز سے سوچنا شروع کیا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ اگر کسی بیٹی کو خوشحال گھرانہ نہ ملا تو وہ اُسے ساری زندگی اپنے پاس بٹھائے رکھیں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"امّاں ہی کیا، میں سمجھتی ہوں ہر ماں اپنی بیٹیوں کے لیے ایسی خواہش رکھتی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر مائیں، بیٹیوں کی بڑھتی ہوئی عمر سے گھبرا کر اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور جیسا بھی بَر ملے' اسے بیٹی کا نصیب سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں' لیکن امّاں ذرا مختلف ہیں، میرا خیال ہے، وہ کبھی بھی اپنی خواہش کا گلا نہیں گھونٹیں گی۔"

اُس کی ساری بات سُن کر بھی وہ خاموش بیٹھا رہا تو وہ اُلجھ گئی۔

"تم کچھ کہو گے نہیں؟" وہ اُس کی مضبوط کلائی پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے بولی تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا کہوں؟"

"میری اتنی ساری باتوں کے جواب میں کچھ بھی۔"

"ربیعہ۔" وہ اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈال کر بولا۔ "تم میری محبت ہو۔ زندگی کی طویل شاہراہ پر میں تمہارے بنا چلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے اچھا کیا جو اپنی امّاں کے خیالات سے مجھے آگاہ کر دیا۔ اب میں اپنی کوششیں مزید تیز کر دوں گا۔ اور انشاء اللہ بہت جلد کسی مقام تک پہنچ کر' ان کے سامنے آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی ناں؟"

اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگا۔

"بہرحال تم اپنے دل کو اندیشوں کی آماجگاہ مت بناؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو تمہاری چھوٹی آپا کی شادی ہونی ہے۔ اُمید ہے اس وقت تک میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ بس تم میری طرف سے دل میں کوئی بات مت لانا۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا رہوں گا۔ اور تم بھی ربیعہ' اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ تمہیں پانے کے لیے اگر مجھے جان سے بھی گزرنا پڑا تو گزر جاؤں گا۔"

"پلیز۔" اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ "ایسی باتیں مت کرو۔"

"دیکھو رونے کی کوشش مت کرنا۔ جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، اُن میں پانی نہیں اُترنا چاہیئے ورنہ۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پلکیں جھپکا جھپکا کر سارا پانی اپنے اندر اُتار گئی۔

"گڈ۔ محبتوں کے دیپ کبھی بُجھنے مت دینا۔" وہ ہلکے سے مُسکرائی پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اب چلو۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"چلو۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "سنو۔ اب میں روزانہ تم سے ملنے نہیں آسکوں گا۔"

"کیوں؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"بیوقوف لڑکی بھاگ دوڑ کروں گا تو کام بنے گا ناں' البتہ جس دن فارغ ہوں گا، آجاؤں گا۔ تم میری کامیابی کے لیے دُعا کرنا۔" اس نے سر ہلایا۔ اور اپنے روٹ کی بس دیکھ کر جلدی سے اُسے خُدا حافظ کہتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔

گھر میں داخل ہوئی تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ تپتے آنگن اور برآمدے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے آنگن تیز قدموں سے پار کیا' پھر برآمدے میں رُک کر اس غیر معمولی خاموشی کا سبب جاننے کی کوشش

کرنے لگی۔

فطری طور پر پہلے اپنے بارے میں خیال آیا کہ کہیں وہ معمول سے بہت زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گئی یا پھر کسی نے اُسے ثاقب حسن کے ساتھ دیکھ تو نہیں لیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرہ جو پہلے ہی دھوپ کی شدت سے تپ رہا تھا۔ اَب اس میں سے گرم گرم بھاپ نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ہتھیلیوں سے چہرہ تھپتھپایا اور بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی۔ دھوپ میں سے آنے کی وجہ سے پہلی نظر میں اسے کمرے کے اندر صاف نظر نہیں آیا البتہ ٹھنڈک کا احساس ضرور ہوا، جو وہ فوراً کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ کندھے سے بیگ اتار کر یونہی چارپائی پر ڈال دیا اور پھر چادر اُتارتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

"آج بہت دیر کر دی ہے؟" امّاں نے یونہی پوچھ لیا تھا لیکن اُس کے دل میں چور تھا، اس لیے گڑبڑا گئی بمشکل لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ کچھ نوٹس بنانے تھے۔ اس کے لیے لائبریری میں بیٹھ گئی۔ پھر بس بھی دیر سے ملی۔"

"اچھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔" امّاں نے مطمئن سی ہو کر کہا۔

"آپ لوگوں نے کھا لیا؟"

"ہم نے تو کھا لیا لیکن تمہاری چھوٹی آپا نے نہیں کھایا۔"

"کہاں ہیں چھوٹی آپا؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"اسٹور میں بند ہے۔" امّاں نے کہا تو وہ ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"خیریت اماں؟۔ چھوٹی آپا اسٹور میں کیوں بند ہیں؟"

"دماغ خراب ہے اُس کا۔ سمجھتی ہے میں اس کی دشمن ہوں۔" پھر فوراً اس موضوع سے ہٹتے ہوئے بولیں۔ "چلو جاؤ تم جا کر کھاؤ۔ اس سے بھی پوچھ لینا، کھائے تو ٹھیک ورنہ اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

وہ پوچھنا چاہتی تھی چھوٹی آپا کا موڈ کس بات پر خراب ہوا ہے اور یہ کہ وہ اماں کو اپنا دشمن کیوں سمجھ رہی ہیں، لیکن اماں نے جس طرح اس بات کو وہیں ختم کر دیا تھا، اس سے وہ سمجھ گئی کہ اس سلسلے میں کچھ پوچھنا اماں کو سخت ناگوار گزرے گا۔ اس لیے خاموشی سے اپنے شوز اُتارنے لگی پھر پیروں میں چپل ڈال کر کمرے سے نکل آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا نکالنے سے پہلے اس نے اسٹور کا دروازہ کھٹکھٹایا دوسری طرف بالکل خاموشی رہی۔ بار بار کھٹکھٹانے کے بعد وہ پکارنے لگی۔

"چھوٹی آپا۔ دروازہ کھولیں۔"

"کیوں؟" چھوٹی آپا کا ضدی لہجہ کاٹ دار تھا۔

"کھولیں ناں۔" اس نے منت کی۔

"نہیں کھولتی، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ چھوٹی آپا کے غصّے کو جانتی تھی پھر بھی وہاں سے نہیں ہٹی۔

"ٹھیک ہے، مت کھولیں۔ میں بھی یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور قدرے اُونچی آواز میں بڑبڑانے لگی تاکہ وہ بھی سُن لیں۔

"ایک تو پہلے ہی اتنی دھوپ میں سے آ رہی ہوں۔ اُوپر سے یہاں گرمی میں سڑنا پڑ رہا ہے۔ بھوک بھی اتنی لگ رہی ہے لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی جب تک چھوٹی آپا نہیں کھائیں گی۔" اسٹور کے اندر آہٹ سی محسوس ہونے لگی، تو اس نے فوراً گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی ساتھ ہی چھوٹی آپا کی جھنجھلاہٹ۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔

"اٹھو یہاں سے اندر جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"کیوں؟"

"امّاں کا موڈ ٹھیک نہیں ہے شاید۔ خوامخواہ ڈانٹ رہی ہیں۔"

"تمہیں کس بات پہ ڈانٹا ہے؟"

"آپ کو بھی ڈانٹا ہے؟" وہ انجان بن کر سادگی سے پوچھنے لگی۔

"نہیں خیر۔ مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔" چھوٹی آپا نظریں چُراتی ہوئی بولیں۔

"پھر آپ اسٹور میں کیوں بند تھیں؟" وہ جان کر پوچھنے لگی۔

"ایسے ہی۔ اچھا تم اٹھو، جا کر کھانا کھاؤ۔"

"اکیلے مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔ ذرا سی دیر کیا ہوئی، کسی نے انتظار ہی نہیں کیا۔"

"میں نے نہیں کھایا ابھی تک۔" چھوٹی آپا نے کہا تو وہ خوشی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"سچ۔ آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟"

"ہاں۔" چھوٹی آپا کا شگفتہ لہجہ اس کے دل میں ترازو ہو گیا۔ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ اندر چلیں، میں کھانا لے کر آتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ کھانا لے کر بڑے کمرے میں آئی تو چھوٹی آپا وہاں موجود نہیں تھیں۔ امّاں نے چھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اُدھر چلی گئی۔ چھوٹی آپا دری پر چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اُس نے ٹرے ان کے سامنے رکھی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

"یہ دال روٹی ٹرے میں سجا کر لانے کی کیا ضرورت تھی، ایسے ہی اُٹھا لاتیں۔" چھوٹی آپا نے کہا تو اسے بے ساختہ ہنسی آئی۔ جسے ہونٹوں کے اندر روکتی ہوئی بولی۔

"ایسے کیسے اٹھا لاتی؟"

"روٹی کے اوپر دال رکھتیں اور لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیتیں۔"

"چھوٹی آپا کیسی بات کر رہی ہیں؟" وہ افسوس سے بولی۔

"غلط تو نہیں کہہ رہی۔ جو حالات ہمارے ہیں کہ سفید پوشی کا بھرم بھی نہیں رکھا جاتا تو ایسے حالات کا شکار لوگ تو اسی طرح کھاتے ہیں۔"

"میں مانتی ہوں ہمارے حالات بہت اچھے نہیں ہیں لیکن۔"

"لیکن کو چھوڑو ربیعہ۔" چھوٹی آپا اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑیں۔ "جب شکستہ حالات کو تسلیم کر رہی ہو تو لیکن کہہ کر حقائق سے نظریں چرانے کی کوشش مت کرو اماں کی طرح۔"

"اماں کی طرح۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" چھوٹی آپا کے لہجے میں طنز اور تلخی ایک ساتھ سمٹ آئی۔

"اِس صدیوں پُرانے چھوٹے سے کھنڈر نما گھر میں امّاں کی ساری زندگی چٹنی پیستے اور دال گھوٹتے گزر گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ہم متوسط طبقے کے بہت عام سے لوگ ہیں۔ اس لیے تو ہمارے لیے محلوں کے خواب دیکھتی ہیں۔ انہیں بتاؤ ربیعہ کہ دال روٹی یا چٹنی ٹرے میں سجا کر کھانے سے ہم بڑے آدمی نہیں کہلائیں گے۔ ہماری حیثیت بڑھ نہیں جائے گی۔"

"چھوٹی آپا ٹرے میں رکھ کر کھانا حیثیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ کھانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اس سے پڑھے لکھے اور اَن پڑھ کی تمیز ہوتی ہے۔ اگر ہم ہتھیلی پر روٹی رکھ کر کھانا شروع کر دیں تو کون کہے گا کہ ہم نے اسکول کالج کا منہ بھی دیکھا ہے اور جہاں تک حالات کی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں اتنے بُرے بھی نہیں ہیں، اللہ کا شکر ہے ہم بہت سوں سے اچھے ہیں۔"

"ہونہہ۔ اچھے۔" چھوٹی آپا خاصی متنفر نظر آ رہی تھیں۔

"کیوں؟ کیا کبھی آپ نے امّاں کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھا ہے؟ کبھی تعلیم رُکی ہماری؟ جب اور جس وقت فیس یا کتابوں کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت پڑی، امّاں نے بغیر سوال جواب کیے ہماری ہتھیلی پر رکھ دیے اور بڑی آپا کی شادی پر بھی کسی سے لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سب کچھ امّاں اور ابا نے

ہی کیا ناں؟ پھر آپ کیوں اپنے آپ کو اتنا کمتر سمجھ رہی ہیں اور چھوٹی آپا سفید پوشی کا بھرم تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ امّاں نے اگر ایسا کیا تو کیا بُرا کیا اور آپ کیا سمجھتی ہیں کہ یہ بھرم رکھنا بہت آسان ہے۔ نہیں بلکہ تن من سب مارنا پڑتا ہے۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔" آپ نے تو یہ کہہ کر مذاق اُڑا لیا کہ امّاں کی ساری زندگی چٹنی پیستے یا دال گھوٹتے گزر گئی۔ لیکن ذرا امّاں سے تو پوچھیں کہ یہ کام کرتے ہوئے انہیں کن مراحل سے گزرنا پڑا۔"

"کیوں چٹنی پیسنا بہت مشکل کام ہے کیا؟" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"نہیں چٹنی پیسنا مشکل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ جو بندے کی خواہشات پستی ہیں، وہ یقیناً تکلیف کا باعث ہیں اور امّاں کیونکہ بار بار یہ تکلیف سہہ چکی ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتیں کہ ہم اس تکلیف کو محسوس بھی کریں۔" وہ بہت خوبصورتی سے اصل موضوع کی طرف آگئی۔

"آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ امّاں میری یا آپ کی دشمن ہیں۔ یہ تو اُن کی محبت ہے کہ وہ ہمیں ان حالات سے نکالنا چاہتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ جو تکلیفیں انہوں نے اٹھائیں، وہ ہم بھی اٹھائیں اور ایسا تو ہر ماں سوچتی ہے۔ آپ ان کی محبت پر شبہ مت کریں چھوٹی آپا۔ ماں کی محبت بے لوث و بے غرض ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں تو ہمارے لیے بہتر اور خوشحال زندگی کی خواہش میں ان کی کیا غرض ہو سکتی ہے۔ صرف اتنی کہ وہ ہمیں خوش اور مطمئن دیکھ کر خود بھی مطمئن ہونا چاہتی ہیں ورنہ ان کے ہاتھ کیا آئے گا؟ بڑے گھر کی خواہش ہے تو ہمارے لیے، اچھا پہننے اور اچھا کھانے کی آرزو بھی ہمارے لیے ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے لیے تو نہیں چاہ رہیں۔"

پھر وہ امّاں کی بات، جو وہ ابّا میاں سے پوچھ رہی تھیں، وہ چھوٹی آپا سے پوچھنے لگی۔

"ایمانداری سے بتائیں، بڑی آپا کو دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟ کس طرح ٹھاٹ سے رہتی ہیں اور کس شان سے آتی ہیں۔ ان کے چہرے پر سُرخی یوں چھلکتی ہے کہ چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں خون باہر نہ چھلکنے لگے۔ ہونٹ ہیں کہ ہر دم مسکرانے پر آمادہ۔ یہ ساری خوشیاں یہ صحت کی دولت انہیں آسودہ اور خوشحال گھر نے ہی دی ہے ناں؟ انہیں چادر چھوٹی ہونے کی پریشانی نہیں ہے کہ سر ڈھانپیں گی تو پیر کُھل جائیں گے اور پیر ڈھانپنے سے سر اور امّاں ہمیں بھی ان ہی کی طرح دیکھنا چاہتی ہیں۔"

"میں تمہاری باتوں کو جھٹلاؤں گی نہیں ربیعہ لیکن میرے لیے اس انداز سے سوچنا اور ایسی خواہش رکھنا سراسر حماقت ہے۔" چھوٹی آپا آخری نوالہ منہ میں ڈال کر رومال سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بولیں۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں تم لوگوں کی طرح مکمل نہیں ہوں۔ میرے پیر میں نقص ہے۔ میں چلتے ہوئے لنگڑاتی ہوں اور اس دور میں بڑے گھروں میں رہنے والا کوئی ایسا جی دار پیدا نہیں ہوا جو مجھ جیسی لنگڑی کو خوشی سے بیاہ لے جائے۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ چھوٹی آپا کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے بولی۔" آپ لنگڑی نہیں ہیں۔ اپنے پیروں پر چلتی ہیں۔ بس ذرا سا۔"

"مجھے بہلاؤ مت ربیعہ، میں اچھی طرح جانتی ہوں، کہنے والے مجھے 'لنگڑی' کہتے ہیں۔"

"کہنے والے اندھے ہیں۔" ربیعہ تیزی سے بولی۔

"بہرحال تم امّاں کو سمجھاؤ میرے لیے اونچے خواب نہ دیکھیں۔ آج بوا کو بُلا کر انہوں نے پرویز کے گھر والوں کو انکار کہلوا کر سخت غلطی کی ہے۔"

گو کہ وہ خود یہی سوچ رہی تھی کہ امّاں کو بنا سوچے اتنی جلدی انکار نہیں کہلوانا چاہیے تھا پھر بھی چھوٹی آپا کے سامنے امّاں کی طرفداری کرنے لگی تاکہ امّاں کی طرف سے اُن کا دل صاف ہو جائے۔

"امّاں نے جو کیا اچھا کیا۔ ان کی نظر میں ہم سب ایک جیسی ہیں اور وہ سب کے لیے ایک طرح سے ہی سوچیں گی۔ سمجھیں آپ۔" وہ ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔" میں برتن رکھ کر آ رہی ہوں، پھر دونوں یہیں سوئیں

گے۔" چھوٹی آپا خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

شام میں بڑی آپا اور دولہا بھائی آگئے تو گھر کی خاموش فضا میں خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ بڑی آپا نے بہت زیادہ آنا جانا نہیں رکھا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے مہینے میں ایک آدھ بار آجاتیں، وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔ بہنیں شکایت کرتیں اور خفا ہوتیں کہ اگر رہنا نہیں ہے تو کم از کم صبح سے تو آیا کریں۔ دن بھر ہمارے ساتھ رہیں ۔۔ اور امّاں رُکنے پر اصرار کرتی رہ جاتیں لیکن بڑی آپا مسکراتے ہوئے سہولت سے سمجھاتیں امّی (اُن کی ساس) اکیلی ہوتی ہیں۔ میں اگر یہاں رُک گئی تو انہیں کام کاج میں خاصی پریشانی ہوگی۔"

"آخر آپ کے جانے سے پہلے بھی تو وہ اکیلی ہوتی تھیں۔" کلثوم کو بہت شوق تھا کسی دن بڑی آپا رات میں رُکیں۔ اس لیے وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی۔

"اس وقت وہ مجبور تھیں اور اب جبکہ وہ میری عادی ہو چکی ہیں تو مجھے اس طرح انہیں چھوڑ کر یہاں نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔"

چھوٹی آپا کا خیال تھا بڑی آپا ان کے سامنے محض عذر تراشتی ہیں۔

"مجھے تو لگتا ہے دولہا بھائی یا اُن کی ساس نے انہیں یہاں رہنے اور زیادہ آنے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔"

لیکن چھوٹی آپا کا خیال صحیح نہیں تھا۔ ان کی سسرال کی طرف سے اُن پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اصل میں بڑی آپا اپنے میکے کا بھرم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں اگر ایک دن بھی یہاں رُک گئیں تو اماں کو صرف ایک وقت کے کھانے کے لیے کتنا اہتمام کرنا پڑے گا اور اس سے گھر کے بجٹ پر جو اثر پڑے گا، اس کا احساس بڑی آپا کو اچھی طرح تھا۔ اس لیے وہ سب کی خفگیاں مسکرا کر سہہ جاتی تھیں۔ اور دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کرتیں لیکن کبھی ان کا وعدہ ایفا نہیں ہوا تھا۔

اِن دنوں بڑی آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ نئے مہمان کی آمد تھی اور اس وقت وہ عاصم کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھیں ۔۔ امّاں سے انہیں بلکہ عاصم بیگ کو بھی کوئی بات کرنی تھی، اس لیے کچھ دیر کے لیے اِدھر رُک گئے تھے۔

"امّاں۔ سہیل، عاصم کے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔" جس وقت وہ چائے لے کر آئی، بڑی آپا امّاں سے کہہ رہی تھیں۔" میں کئی بار عاصم کے ساتھ ان کے گھر جا چکی ہوں۔ ماشاء اللہ گھرانہ بھی اچھا ہے۔ سہیل کی والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی لڑکی میری نظر میں ہو تو ۔۔ اور عاصم کا کہنا ہے کہ صوفیہ مناسب رہے گی۔"

امّاں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرے میں رکھی سموسوں کی پلیٹ اٹھا کر عاصم بھائی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"لو بیٹا۔ یہ کھاؤ۔" عاصم بھائی نے پلیٹ اُن کے ہاتھ سے لے کر بڑی آپا کی طرف بڑھا دی۔

"امّاں۔ ہم اس وقت اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔" بڑی آپا کہنے لگیں۔" ہم ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر سیدھا سہیل کے ہاں جائیں گے۔ میں اُس کی والدہ کو یہاں کا پتا بتا دوں گی اور ہو سکتا ہے کل کسی وقت وہ آجائیں۔"

"کیا کرتا ہے سہیل؟" امّاں نے بظاہر سرسری انداز سے پوچھا۔

"اس کا اپنا بزنس ہے گارمنٹ کا۔ اور ابھی حال ہی میں اس نے ایک چھوٹی سی فیکٹری بھی لگائی ہے۔" عاصم بھائی سہیل کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔" بہت محنتی لڑکا ہے۔ اُمید ہے آگے بہت ترقی کرے گا۔ گھر میں ماں باپ کے علاوہ دو بہنیں ہیں۔ بہنیں منگنی شدہ ہیں اور ویسے بھی بہنوں کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔ اس کے والد خود بزنس مین ہیں۔"

اور امّاں کو کیا چاہیے تھا، اندر ہی اندر بے حد اطمینان محسوس کیا لیکن بیٹی داماد پر یوں ظاہر کیا جیسے سوچ میں پڑ گئی ہوں۔

"اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔ ابھی ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔" عاصم بھائی اُٹھتے ہوئے بولے۔ "آپ کو اس لیے بتا دیا کہ آپ ان کی آمد سے بے خبر نہ رہیں۔"

"اچھا کیا بیٹا جو چلے آئے۔ میں تمہارے ابا میاں سے بھی ذکر کر دوں گی۔" پھر وہ سب بہنیں انہیں چھوڑنے باہر تک آئیں۔ اس کے بعد معمول کے کاموں میں لگ گئیں۔

اگلے دن سہیل کی والدہ اور ساتھ میں ان کی بہنیں بھی آئیں۔ اس وقت چھوٹی آپا بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں اور اتفاق سے وہ تینوں بھی سیدھی وہیں چلی آئیں اور اب جبکہ وہ اس کمرے میں داخل ہو ہی چکی تھیں تو اماں کو انہیں وہیں بٹھانا پڑا۔

"یہ صوفیہ ہے۔؟" سہیل کی والدہ بیٹھتے ہی چھوٹی آپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ اماں نے اثبات میں سر ہلایا پھر چھوٹی آپا کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

اور ساری گڑبڑ یہیں ہو جاتی تھی۔ جب چھوٹی آپا قدرے لنگڑا کر چلتی ہوئی سامنے سے گزر جاتیں اور دیکھنے والے جو ان کی صورت دیکھ کر یقیناً یہ سوچتے کہ یہی ہے وہ گوہرِ نایاب جس کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ایک دم مایوس ہو جاتے تھے۔ سہیل کی والدہ اور بہنوں کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ پہلے ان کے چہرے چمکنے لگے تھے پھر ایک دم بجھ گئے" اور وہ رشتے کی بات کرنے کے بجائے اماں سے چھوٹی آپا کے ساتھ ہونے والے حادثے کی تفصیلات معلوم کر کے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کچھ دیر بیٹھیں، چائے آ رہی ہے۔" اماں نے کہا تو وہ کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل آئیں اور اتفاق تھا کہ اسی وقت ربیعہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے نکلی۔ یہ چھوٹا سا آنگن جو موتیا اور رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتا تھا۔ وہاں شام اتر رہی تھی۔ اور سلونی شاموں کا حسن چرائے وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی اچانک سامنے آ کر بجھے ہوئے چہروں پہ روشنی بکھیر گئی تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" سہیل کی والدہ پلٹ کر اماں سے پوچھنے لگیں۔

"میری بیٹی ہے تیسرے نمبر کی۔" اماں نادان نہیں تھیں۔ جان گئیں کہ وہ اتنے اشتیاق سے ربیعہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟ لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ چھوٹی آپا کو نظرانداز کر کے ربیعہ کی بات کی جائے۔ اس لیے کچھ ناگواری سے ربیعہ کا تعارف کرایا۔

"ذرا اِسے پاس بلائیں۔" خاتون نے اصرار کیا تو اماں نے اسے آواز دے ڈالی اور اسے کیونکہ صورتحال کا اندازہ نہیں تھا، اس لیے تیز قدموں سے چلتی ہوئی ان کی طرف آئی۔

"ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے۔" خاتون نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا پھر اماں سے کہنے لگیں۔ "مجھے خوشی ہے کہ ہمیں اس گھر سے مایوس نہیں جانا پڑا ہمیں اپنے سہیل کے لیے آپ کی یہ بیٹی پسند آئی ہے۔ اور ہم کل پھر آئیں گے۔"

اُسے ایک دم دھچکا سا لگا۔ حیران ہو کر اماں کی طرف دیکھا پھر فوراً اندر کی راہ لی۔

سہیل کی والدہ اور بہنوں کا دل تو یہ چاہ رہا تھا اسی وقت دوبارہ بیٹھ کر اماں سے تفصیلی بات کر لیں لیکن کیونکہ پہلے ضروری کام کا بہانہ کر کے اُٹھ چکی تھیں، اس لیے اب محض اپنی بات رکھنے کی خاطر کل فرصت سے آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ اماں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے ان کا سر نفی میں ہلتا چلا گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اپنی آنکھوں میں پانی کو جمع ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔ ذہن الگ ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سوچنے کی کوشش بھی کی تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

بس ایک خیال "اماں نے اگر ہامی بھر لی تو کیا ہو گا؟" اسے بری طرح پریشان کر رہا تھا۔ دل کو دھڑکا تو پہلے ہی لگا رہتا تھا، اب تو بے شمار خدشوں اور اندیشوں نے جیسے حملہ کر دیا تھا۔ اماں کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت تو وہ اپنے اندر کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتی تھی اور پھر اماں نے کون سا اس کی مرضی معلوم کرنی تھی۔ وہ یوں سرِعام رو بھی نہیں سکتی تھی۔ جبکہ آنکھوں میں جمع پانی چھلکنے کو بے تاب تھا۔

وہ بہت خاموشی سے اسٹور میں چلی آئی اور اپنا بکس کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے کے بہانے پورا سر

اندر دے کر سارے آنسو بہا ڈالے لیکن دل کا بوجھ پھر بھی کم نہیں ہوا۔

"آپی کہاں چلی گئی ہیں؟" کلثوم اسے آواز دے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور پورا چہرہ صاف کیا پھر باہر نکل آئی۔ ڈر تھا کہیں اماں سے سامنا نہ ہو جائے، اس لیے سیدھا کچن کا رخ کیا۔ کلثوم وہیں موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"کہاں تھیں آپ؟"

"اسٹور میں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "تمہیں کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ جو یہ چاول صاف کر رہی تھیں، انہیں ابھی بھگونا ہے یا۔"

"تم ہٹو، میں کر لوں گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔"

کلثوم کی پُرخلوص پیشکش کو اس نے رد کر دیا اور پھر اسے کچن سے نکال کر ہی دم لیا۔ اصل میں وہ اس وقت بالکل تنہا رہنا چاہ رہی تھی اور کمرے۔ برآمدے یا آنگن میں ایسا ممکن نہیں تھا، وہ جہاں بھی بیٹھتی، کوئی نہ کوئی ضرور اس کے پاس آ بیٹھتا۔ اس لیے کھانا پکانے کے بہانے کچن میں پناہ ڈھونڈی۔ ابھی تک وہ شاک میں تھی، اس لیے صرف منفی سوچیں ہی ذہن میں گھر کر رہی تھیں۔

"اگر ایسا نہ ہوا۔ اور اگر ایسا ہو گیا تب۔؟" بس اسی قسم کی باتیں تھیں جو دل کو دہلائے دے رہی تھیں۔

کھانا تیار ہو گیا، اس کے بعد بھی وہ کچن سے نہیں نکلی۔ وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی تو ایک دم ہی ثاقب حسن کا خیال آیا۔ ساتھ ہی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ اس مختصر سے عرصے میں وہ اسے بہت عزیز ہو گیا تھا۔ اتنا کہ اس سے دوری کا خیال ہی جان پر بنائے دے رہا تھا۔

"تمہاری قسم ثاقب حسن، تمہارے بنا میں جی نہیں پاؤں گی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا، پھر سوچنے لگی کہ کل ہی اس سے ملنے کی کوشش کرے گی۔ اور ثاقب حسن کا خیال کیا آیا کہ ذہن آپ ہی آپ بیدار ہو گیا۔ دل کو ڈھارس بندھی، کچھ حوصلہ بھی ہوا اور وہ آنے والے خطرے سے نمٹنے کا سوچنے لگی۔

اگلے دن کالج سے لوٹی تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کچھ ڈری ہوئی سی دبے پاؤں چلتی کمرے میں آئی تو چھوٹی آپا کو اماں کے مقابل کھڑے دیکھا، وہ کہہ رہی تھیں۔

"میرے لیے آیا ہوا پرویز کا پروپوزل آپ نے ریجیکٹ کر دیا، میں خاموش رہی اور اب سہیل کا گھرانہ جو آپ کی خواہش کے عین مطابق خاصا خوشحال ہے، وہ اگر میرے بجائے ربیعہ کا ہاتھ مانگ رہے ہیں تو آپ نے کیوں انکار کیا؟"

"تمہاری وجہ سے۔" چھوٹی آپا کے چلا کر بولنے کے باوجود اماں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟ کیوں؟ میری وجہ سے کیوں؟"

"ربیعہ تم سے چھوٹی ہے اور جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی، میں اس کی نہیں کر سکتی۔"

"اس طرح تو اماں۔ میرے ساتھ ساتھ باقی لڑکیاں بھی اس دہلیز پہ بیٹھی رہیں گی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" اماں نے تنبیہہ انداز اختیار کیا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے اس عیب کی بدولت کوئی اچھا رشتہ میرے لیے آ ہی نہیں سکتا۔ پھر آپ میری وجہ سے دوسری بیٹیوں کو کیوں بٹھائے رکھنا چاہتی ہیں؟"

"صوفیہ۔" اماں نے ٹوکا۔ "یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ میرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں لیکن آپ کی حقائق سے چشم پوشی نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج آپ نے سہیل کے گھر والوں کو مایوس لوٹا کر اچھا نہیں کیا۔ میں نہ سہی، ربیعہ سہی۔ اور پھر ربیعہ پہ ہی بس نہیں ہے اس کے بعد دو اور بھی موجود ہیں، آپ خود سوچیں اگر آپ مجھ میں ہی اٹکی رہیں تو باقیوں کا کیا ہو گا؟"

"صوفیہ۔ میں نے کبھی تم لوگوں کو ایسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں دی۔" اماں سختی سے بولیں۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کا۔" چھوٹی آپا کسی طرح بھی اپنی آواز پر کنٹرول نہیں کر پا

رہی تھیں۔" لیکن آپ سن لیں امّاں۔ اب میرے لیے کسی کو بُلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بار بار لوگوں کے سامنے تماشا نہیں بن سکتی۔"

"بیٹیا۔" امّاں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ چھوٹی آپا پیر پٹختی ہوئی ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔ اور پھر دروازہ بھی بند کر لیا۔ اور وہ جو اس ساری گفتگو کے دوران اسی طرح کھڑی تھی، بہت آہستہ قدموں سے آگے بڑھی، کندھے سے بیگ اُتار کر ٹیبل پر رکھا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے امّاں کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ انہیں چھوٹی آپا کی بدتمیزی نے رنج پہنچایا ہے۔ اس کا دل چاہا وہ ان کی دلجوئی کی خاطر کچھ کہے لیکن اس سے پہلے ہی امّاں کہنے لگیں۔

"وہ چھوٹی دونوں وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا رہی ہیں۔ تم بھی وہیں چلی جاؤ۔ یا پھر یہاں لا کر کھا لو۔"

"آپ نے کھا لیا؟"

"نہیں۔ اور مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی امّاں نے تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اب وہ اس سے کوئی بات نہیں کریں گی۔ اس لیے چپ چاپ وہاں سے اُٹھ آئی۔

کلثوم اور ہما کھانے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اور اب بیٹھی سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ہما نے پیڑھی اس کی طرف کھسکا دی جس پر بیٹھتے ہی وہ اس سارے ہنگامے کا پس منظر پوچھنے لگی تو کلثوم نے مختصراً یوں بتایا کہ سہیل کی والدہ اور بہنیں آپ کے لیے آئی تھیں۔ امّاں سے بہت اصرار کیا لیکن امّاں کسی طرح نہیں مانیں۔ صاف انکار کر دیا اور ان کے جانے کے بعد چھوٹی آپا امّاں سے اُلجھنے لگیں۔ یہ سب تو وہ خود بھی جان چکی تھی اس لیے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے لیے پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

"چھوٹی آپا ٹھیک کہتی ہیں، امّاں کو انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" کلثوم اپنی رائے دینے لگی۔ "اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔"

"مجھے تو ان خواتین پر ترس آ رہا ہے، اتنی مایوس ہو کر گئی ہیں۔" ہما تاسّف سے بولی۔

"اچھا چلو، اب تم دونوں اندر جاؤ۔" اس نے ٹوک دیا۔ "ورنہ امّاں پتا نہیں کیا سمجھیں۔"

"کیا سمجھیں گی؟"

"یہی کہ ہم ضرور ان کے خلاف محاذ بنا رہے ہیں۔" اس نے کہا تو وہ دونوں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر جب وہ تنہا رہ گئی تو اس سارے واقعے کو نئے سرے سے سوچنے لگی۔ ایک طرح سے اُسے اطمینان ہی ہوا، کہ خطرہ آپ ہی آپ ٹل گیا ہے۔ کل سے وہ بہت پریشان تھی اور اپنی پریشانی سے ثاقب حسن کو بھی آگاہ نہیں کر سکی تھی۔ لیکن وہ چاہتی تھی جلد سے جلد اس سے مل کر ساری صورتحال اس پر واضح کر دے کہ آج تو امّاں نے انکار کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ وہ چھوٹی آپا کے یا سب کے مجبور کرنے پر اپنی بات پر قائم نہ رہ سکیں اور چھوٹی آپا سے پہلے اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگیں۔

"میں کل ہی انیلا سے کہوں گی کہ ثاقب حسن سے کہے جتنی جلد ہو سکے مجھ سے ملے۔" اُس نے سوچا اور کھانے کے برتن رکھ کر اندر چلی آئی۔

پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا، شام میں بڑی آپا آئیں۔ انہوں نے بھی امّاں سے وہی باتیں کیں، جو چھوٹی آپا نے کہی تھیں، فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی آپا چلّا چلّا کر بات کر رہی تھیں اور بڑی آپا نے آرام سے امّاں کو سمجھانے کی کوشش کی اور پھر ابا میاں بھی بڑی آپا کے ساتھ مل گئے تھے۔ یوں امّاں نے ہتھیار ڈال دیے۔

انسان خواہ کتنی ہی تدابیر آزما لے، اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتے ہوئے کتنی ہی کوششیں کر ڈالے، ہوتا وہی ہے جو اُوپر والے نے اس کے مقدّر میں لکھا ہوتا ہے۔ اور اس نے ہر کام کے ہونے کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ ثاقب حسن کی قسمت میں بھی جانے کیا تھا کہ اتنی کوششوں اور جدوجہد کے بعد بھی اس کا کام نہیں بن رہا

تھا۔ مختلف ایجنسیوں کے چکر لگاتے لگاتے وہ تھک گیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے پہلے ہی مرحلے پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا بلکہ بہت حوصلہ افزا جواب ملتے۔ کچھ مراحل وہ طے بھی کر لیتا۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوتا کہ عین وقت پر اس کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ یقیناً سارا کھیل پیسے کا تھا کہ جس آسامی پر وہ باہر جانے والا ہوتا، کوئی دوسرا اس سے زیادہ پیسے ادا کر کے اس کا حق مار جاتا اور اس کا نام آئندہ کی لسٹ میں چلا جاتا۔ وہ تھکا ضرور تھا لیکن مایوس نہیں ہوا تھا۔ جب ہی تو نئے سرے سے اُمید کا دامن تھام کر صبح شام ایجنسی کے چکر لگانے لگتا تھا۔ اسی چکر میں وہ کئی دن سے ربیعہ کے پاس بھی نہیں جا سکا تھا۔ ویسے بھی وہ چاہتا تھا کوئی خوشخبری ہی لے کر اس کے پاس جائے۔

لیکن جب انیلا نے ربیعہ کا پیغام دیا کہ وہ ملنا چاہتی ہے تو وہ رُک نہیں سکا۔ اگلے دن ہی اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اسی پارک کے مخصوص گوشے میں جب اس کے برابر بیٹھا تو بغور دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ کچھ پریشان سی ہے۔

"کیا بات ہے؟" ثاقب نے بے قراری سے پوچھا اور جواب میں اس کی پلکوں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گود میں رکھی فائل پر چمکنے لگے۔

"ربیعہ۔" وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ "مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا میرے نہ آنے سے پریشان ہو گئی ہو؟"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میں۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا اور باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ یہ صورتحال اسے مزید پریشان کر گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا، کیسے اُسے چُپ کرائے۔ کچھ دیر تک اس کے ہلتے وجود کو دیکھتا رہا، پھر جب برداشت نہیں ہوا تو کہنے لگا۔

"ربیعہ پلیز۔ بس کرو، روک لو اپنے آنسو، مجھے بے حد دُکھ ہو رہا ہے۔" وہ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی، اُس نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور جب وہ چہرہ صاف کر کے اپنے آپ کو بولنے کے قابل بنا سکی تو پوچھنے لگی۔

"تمہاری کوششیں کہاں تک کامیاب ہوئیں؟"

"میری کوششیں ابھی تک جاری ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کام ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ شاید کچھ آزمائشیں ابھی باقی ہیں یا پھر میرے نصیب میں۔" اُس کے اترتے چہرے پر نظر پڑی تو بات وہیں چھوڑ کر حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم فکر مت کرو۔ انشاءاللہ جلد ہی کوئی صورت نکل آئے گی۔"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو کیونکہ میں حالات سے نہیں لڑ سکتی۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ پھر اسی طرح ساری صورتحال کہہ سُنائی، اور آخر میں جب یہ بتایا کہ امّاں چھوٹی آپا کے بجائے اس کے لیے سوچنے لگی ہیں، تو وہ بے چین ہو گیا۔

"ربیعہ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یقین کرو میں یہ ساری جدوجہد صرف تمہارے لیے کر رہا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں لیکن۔"

"جانتی ہو تو حالات سے لڑنے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑا۔

"تم نہیں جانتے ثاقب۔ امّاں نے شروع سے اپنے اور ہمارے درمیان ایک فاصلہ رکھا ہے۔ ایک حد جس سے بڑھنے کی اجازت انہوں نے ہمیں کبھی نہیں دی۔ انہوں نے تو کبھی کسی معمولی سی بات میں بھی ہماری رائے لینی ضروری نہیں سمجھی، اور جو تم حالات سے لڑنے کی بات کرتے ہو، تو یہ تو جب ہو جب امّاں مجھ سے پوچھیں کہ تم کیا چاہتی ہو؟ اور میں کسی بھی طوفان کی پروا کیے بغیر، سارے حوصلے مجتمع کر کے تمہارا نام لے دوں، لیکن یہاں تو یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ امّاں اپنا فیصلہ سُنا دیتی ہیں اور ہم ماننے پر مجبور۔"

"اگر ایسی بات تھی ربیعہ تو۔ تو تم نے میری محبت کی پذیرائی کیوں کی؟ اپنے حالات جانتے ہوئے بھی مجھے۔؟"

"پلیز ثاقب حسن۔" وہ پھر رو پڑی۔ "اب خدا کے لیے یہ مت کہہ دینا کہ میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں اور یہیں سے اپنے قدم واپس موڑ لوں۔"

"بیوقوف لڑکی۔ میں تمہیں ایسا مشورہ دے سکتا ہوں جبکہ میں خود ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا ہوں جہاں سے واپسی کے راستے بے نشان ہو چکے ہیں۔ تم میری اوّلین محبت ہو رابی اور میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یقین کرو اگر تم نے مجبور ہو کر بھی راستہ بدلا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا بولا۔

"تم تو بس اتنا کرو کہ اپنے سارے آنسو پونچھ ڈالو۔" وہ بے اختیار اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی اور جب اس کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا واسطہ اتنی بزدل لڑکی سے پڑ رہا ہے۔ بہرحال تم اندیشوں میں جان مت گھلاؤ۔ کہ تمہاری جان میری امانت ہے۔"

"لیکن ثاقی۔"

"اوں ہوں۔ کوئی مایوسی کی بات نہیں ہوگی۔" اُس نے ٹوک دیا۔ گو کہ اندر ہی اندر وہ خود بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا لیکن اس پر ظاہر کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی کیفیت چھپا کر وہ اُسے اندیشوں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ یقین رکھو کہ تمہارا میرا سنجوگ آسمانوں پہ لکھا ہے۔ ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی میں کسی طرح بھی تمہارا ہاتھ مانگنے کے قابل نہیں ہو سکا ہوں۔ پھر بھی اس یقین کے ساتھ یہ ہاتھ تھام رہا ہوں کہ اسے کسی دوسرے ہاتھ میں کبھی نہیں جانے دوں گا۔" اُس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔ "میں آج ہی امّاں کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔"

"کیا؟" اس کے ہونٹ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔

"کوشش تو کر لینے دو۔" وہ رسان سے بولا۔ "اگر اس طرح بات نہ بنی تو کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ تم بہرحال ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ تمہاری مجبوری جان لینے کے بعد حالات کا مقابلہ میں خود کروں گا۔ سمجھیں تم۔"

اس نے چُپ چاپ سر جُھکا دیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟" وہ اس کے جُھکے ہوئے سر کو دیکھتا ہوا بولا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ربیعہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میرے اتنا سمجھانے پر بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر اس طرح ہمت ہارو گی تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ کیا تمہیں میرا یقین نہیں ہے؟"

"ہے تمہارا یقین۔"

"بس تو اسی یقین کا دامن تھامے رکھو۔ اور اب ذرا سا مُسکراؤ تاکہ میرے ساتھ ساتھ اطراف میں پھیلے پھولوں کو بھی اپنی قسمت پہ رشک آنے لگے۔"

"کیا مطلب؟"

"بے چارے کب سے تمہیں آزردہ دیکھ کر مرجھائے جا رہے ہیں میری طرح۔ ذرا سا مُسکرا دو گی تو کِھل اُٹھیں گے۔"

"تمہاری طرح۔" وہ فوراً بولی اور بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اس کی والہانہ نظروں سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو کافی دیر ہو گئی۔"

"چلو۔" وہ اٹھ کر اس کے ہمقدم ہو گیا۔ پھر جب وہ اپنے روٹ کی بس میں سوار ہو گئی تب وہ اپنی بس کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا خیال تھا ثاقب حسن اس کے اور خود اپنے حالات کو سمجھتے ہوئے اپنی والدہ کو اس کے ہاں نہیں بھیجے گا۔ اور وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ جب تک کسی قابل نہ ہو جائے ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے لیکن دوسری طرف یہ خوف بھی تھا کہ اماں اسے بٹھائے نہیں رکھیں گی۔ ایک طرح سے وہ دو متضاد کیفیات میں گھری ہوئی تھی۔ ثاقب

والدہ کا انتظار بھی تھا اور یہ بھی چاہ رہی تھی کہ وہ نہ آئیں۔

کالج سے آنے کے بعد کھانا کھاتے ہی وہ سو جایا کرتی تھی لیکن اس روز اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ پوری دوپہر سوچتے ہوئے اور اس دھڑکے میں گزر گئی کہ جانے کیا ہونے والا ہے؟ سہ پہر ڈھلتے ہی ایک ایک کر کے سب اٹھنے لگے اور وہ ابھی کچن میں آ کر چائے بنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ثاقب کی والدہ آ گئیں۔ ان کے ساتھ انیلا تھی۔ اس نے وہیں کھڑے رہ کر انہیں ہما کے ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

اس کا دل اچانک ہی بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کہیں کوئی خوشگوار احساس نہیں جاگا تھا اور نہ اُمید کی کوئی ہلکی سی کرن ہی جگمگائی تھی۔ بس ایک خوف جیسے جدائیاں مقدر ہونے جا رہی ہوں۔

"میرے خدا۔" بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بے شمار دُعائیں مانگ ڈالیں۔

"آپی۔" کلثوم اس کے پاس آ کر کہنے لگی۔ "آپ چائے بنا رہی ہیں؟"

"ہاں۔" وہ ہاں کی صورت سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اندر کچھ مہمان آئے ہیں، ان کے لیے بھی بنا لیں۔"

"کون ہیں؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنی۔

"میرا خیال ہے کوئی رشتے وغیرہ کا چکر ہے۔ اور ہاں خاتون کے ساتھ جو ایک لڑکی ہے، وہ بتا رہی تھی آپ کے ساتھ پڑھتی ہے۔"

"اچھا۔" وہ رُخ موڑ کر ٹرے میں کپ رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "کیا نام ہے؟"

"پتا نہیں۔ آپ چائے لے کر جائیں گی تو دیکھ لیجیے گا۔"

"چائے میں لے جاؤں؟"

"ہاں۔ امّاں نے تو یہی کہا ہے، آپ کے ہاتھ بھجوا دوں۔" کلثوم شرارت سے مُسکرائی تو وہ اُسے گھور کر رہ گئی۔ پھر ٹی پاٹ میں چائے دم کر کے ٹرے میں رکھی اور دوپٹہ کھول کر سلیقے سے اوڑھنے لگی۔

"ذرا سا گھونگھٹ بھی نکال لیجیے۔" کلثوم نے چھیڑا۔

"بکو مت۔" وہ ٹرے اُٹھا کر اندر چلی گئی۔ انیلا کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ شرارت سے دیکھے اور جواب میں اس کے ہونٹوں پر ٹھہری مُسکراہٹ مچل کر کوئی راز عیاں نہ کر دے۔ بہت آہستہ آواز میں اُس کی والدہ کو سلام کیا۔

"جیتی رہو۔" انہوں نے دعا دی اور پھر امّاں سے پوچھنے لگیں۔ "یہ ہے آپ کی بیٹی ربیعہ؟"

"جی ہاں۔"

"ماشاء اللہ۔ انیلا بہت تعریف کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ہے بھی تعریف کے قابل۔ میں بہت دنوں سے آنا چاہ رہی تھی لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی رہی۔"

"ہاں۔ کام تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔" امّاں نے کہا اور اسے وہاں سے جلنے کا اشارہ کیا تو وہ چائے ان کے آگے رکھ کر وہاں سے چلی آئی۔ کچن میں آئی تو چھوٹی آپا سے سامنا ہو گیا۔ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ اگر ثاقب حسن کا معاملہ نہ ہوتا تو اس وقت وہ چھوٹی آپا کے سامنے دبا دبا سا احتجاج ضرور کرتی لیکن اب نظریں چُراتی ہوئی ان کی طرف سے ذرا سا رُخ موڑ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"کون آیا ہے؟" چھوٹی آپا اس سے پوچھنے لگیں۔

"میری دوست ہے انیلا۔ اپنی والدہ کو لے کر آئی ہے۔"

"خیریت؟ میرا مطلب ہے یونہی یا کسی خاص مقصد سے؟" چھوٹی آپا نے بہت عام سے لہجے میں پوچھا اس کے باوجود وہ فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔

"اس کا مطلب ہے کسی خاص مقصد سے آئی ہے؟" چھوٹی آپا اس کے خاموش رہنے پہ کہنے لگیں۔ "کیا کرتا

ہے اس کا بھائی؟"

"چھوٹی آپا۔ پلیز میں یہ سب نہیں جانتی۔"

"ارے۔ تو کیا اس نے پہلے تمہاری رائے نہیں لی تھی؟"

"ہماری رائے کی اہمیت ہے؟" وہ الٹا انہی سے پوچھنے لگی۔

"اس گھر میں نہیں ہے اہمیت اور دوسرے اس بات کو کیا جانیں جب تک ہم خود۔" چھوٹی آپا کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ کیونکہ انیلا وہیں آگئی تھی۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے انیلا کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا پھر چھوٹی آپا سے اس کا تعارف کروانے لگی۔

"یہ انیلا ہے اور انیلا یہ میری چھوٹی آپا ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" انیلا نے کہا تو جواب میں چھوٹی آپا نے بھی یہی جملہ دہرا دیا۔

"تم یہاں کیوں چلی آئیں؟" وہ انیلا سے پوچھنے لگی۔

"بڑوں کی باتوں میں مجھے اپنا وجود بہت عجیب سا لگ رہا تھا اس لیے اٹھ آئی۔"

"ربیعہ اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" چھوٹی آپا نے کہا تو وہ اسے لے کر چھوٹے کمرے میں آگئی۔

"کیا رہا؟" تنہائی ملتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"ابھی تو تمہاری اماں میرے بھائی کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہیں۔"

"اماں کا موڈ کیسا ہے؟"

"بظاہر تو خوشگوار ہی نظر آرہا ہے۔ ویسے تمہیں خدشہ کس بات کا ہے؟ میرا بھائی کسی سے کم تو نہیں ہے۔ ایسا بانکا سجیلا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔"

اب وہ اس سے کیا کہتی کہ اماں کو بانکا سجیلا نہیں پیسے والا چاہیے۔ بس طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"ویسے ربیعہ۔" انیلا رازداری سے کہنے لگی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ آج اچانک ثاقب بھائی کو کیا ہوا کہاں تو کہتے تھے بہنوں سے فارغ ہو کر اپنے بارے میں سوچوں گا اور اب ایک دم ہی اماں کے سر ہو گئے کہ آج ہی ربیعہ کے گھر چلی جائیں۔ اماں نے کہا بھی پہلے تم کسی کام سے لگ جاؤ پھر۔ لیکن وہ مانے ہی نہیں۔"

"سنو۔" اس نے بھی رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ "اماں سے کیا کہا ہے کہ ثاقب کیا کرتا ہے؟"

"یہی کہ عنقریب باہر جانے والے ہیں۔"

"اماں مطمئن ہو گئی تھیں؟"

"پتا نہیں کیونکہ انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیوں، کیا انہیں باہر جانے پر اعتراض ہو گا؟" وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ انیلا کی اماں اسے پکارنے لگیں۔

"میرا خیال ہے، اماں جانے کو تیار ہیں۔" انیلا اٹھتی ہوئی بولی۔ "کل کالج میں تفصیل سے بات کریں گے"

"ربیعہ۔" اماں نے آواز دی تو وہ انیلا کو لے کر بڑے کمرے میں آگئی۔ جہاں اس کی اماں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ اس نے درزیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔

ثاقب کی والدہ کے چہرے پر مایوسی اور افسردگی اس نے صاف طور پر محسوس کر لی تھی اور جان گئی کہ اماں نے ان کی بات سنی ضرور ہے لیکن آس کا کوئی دیا ان کی جھولی میں نہیں ڈالا۔ جب ہی تو وہ اس قدر مایوس اور ملول نظر آرہی تھیں۔

"اچھا بہن ہم چلتے ہیں۔" ثاقب کی والدہ نے اماں سے اجازت چاہی پھر بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا "خوش رہو بیٹی، اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔"

وہ انہیں دروازے تک چھوڑنے کی غرض سے انیلا کے ساتھ چلنے لگی تو اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا پورا وجود جیسے منجمد ہو گیا۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ پلٹ کر اماں کی طرف دیکھ سکے۔ بس خاموش کھڑی انیلا اور اس کی اماں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"تم جانتی ہو ان کے بیٹے کو؟" اسے اپنے عقب سے اماں کی آواز سنائی دی ان کے سرد لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ اندر تک کانپ گئی۔

"نہیں تو۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"پھر یہ یہاں تک کیسے آئیں؟"

"وہ۔ انیلا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔

"انیلا نے ذکر تو کیا ہو گا تم سے؟" اماں جانے کیا معلوم کرنا چاہتی تھیں۔

"جی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں کیا بتاتی اماں؟" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو اماں اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر وہیں بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"رو مت۔ آنسو بہا کر سمجھتی ہو اپنی غلطی پر پردہ ڈال لو گی۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"کچھ کیا ہے جب ہی تو یہ لڑکی اپنی ماں کو لے کر آئی ہے ورنہ تم سے پہلے بھی اس گھر کی دو لڑکیاں کالجوں میں پڑھ چکی ہیں۔ ان کے لیے تو کوئی اس طرح نہیں آیا۔"

"تو اس میں میری کیا خطا ہے؟ میں نے تو انیلا سے نہیں کہا تھا کہ میرے گھر آؤ۔" وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی تو اماں کتنی دیر تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہیں، جیسے اندازہ کر رہی ہوں کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔

اور وہ اماں کے اس طرح دیکھنے سے مزید سہم گئی۔ پہلو بدلتے ہوئے راہِ فرار ڈھونڈنے لگی۔

"جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو۔" اماں نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی اور ایسا انداز اختیار کیا، جیسے اس کی بات کا یقین کر لیا ہو۔ وہ فوراً ان کے پاس سے اٹھ گئی۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تو ابا میاں آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔ اور آنگن سے گزر کر باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اتنے سے فاصلے نے ہی اس کے وجود میں مسافتوں کی تھکن اتار دی تھی۔ اس وقت ذہن کچھ اور سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ بس اماں کا خوف تھا جس نے دل کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے آنکھوں نے بھی چاہا کہ اپنے اندر ٹھہرا سارا پانی بہا ڈالیں لیکن اس نے بمشکل تمام آنکھوں کے گرد حفاظتی بند باندھے اور دوپٹے ہی سے چہرہ صاف کرتی ہوئی باتھ روم سے نکلی تو کچن میں چلی گئی۔ چھوٹی آپا ابھی تک یہیں موجود تھیں۔ نیچے والا چولہا جل رہا تھا شاید ان کا وہیں بیٹھ کر روٹی پکانے کا ارادہ تھا۔

"ہٹیں چھوٹی آپا۔ روٹی میں پکا دیتی ہوں۔" رونے سے اس کی آواز متاثر ہوئی تھی، جب ہی چھوٹی آپا فوراً سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ آنکھوں میں اترے گلابی ڈورے بھی چغلی کھا رہے تھے۔ چھوٹی آپا فوری طور پر کچھ نہیں بولیں، نہ ہی اپنی جگہ سے ہٹیں۔ بس خاموشی سے دوسری پیڑھی اس کی طرف کھسکا دی۔ وہ بیٹھ گئی تو چھوٹی آپا نے توا چولہے پر رکھا اور شیلف پر سے آٹے کا برتن اتار کر اپنے قریب رکھ لیا۔

"میں پکا دیتی ہوں۔" اس نے پھر کہا۔

"نہیں۔ میں پکا لوں گی۔" چھوٹی آپا نے آٹے کا پیڑا بنایا پھر بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے بظاہر سرسری انداز سے پوچھنے لگیں۔

"رو رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے اعتراف کیا۔

"کیوں؟" اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں تو اس نے گھٹنوں ہی سے انہیں رگڑ ڈالا پھر آہستہ آواز میں بولی۔

"چھوٹی آپا۔ اگر انیلا اپنے بھائی کا پروپوزل لے کر آئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"کیا واقعی تمہارا قصور نہیں ہے؟" چھوٹی آپا نے ایک دم اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لے لیا تو وہ گڑبڑا کر

بولی۔

"کیا مطلب؟"

"کیا ثاقب حسن ہی انیلا کا بھائی ہے؟"

"کیا؟" چھوٹی آپا کے منہ سے ثاقب حسن کا نام سن کر کتنی دیر تک وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔

"بتاؤ ناں؟" چھوٹی آپا کے پوچھنے پر وہ چونک گئی۔

"آپ کیسے جانتی ہیں ثاقب حسن کو؟"

"جانتی تو نہیں بس نام سے واقف ہوں۔ اب تم پوچھوگی کیسے؟ تو وہ ایسے میری بہن کہ ایک دن چاول چنتے ہوئے تمہاری انگلی چاولوں کی سطح پر بار بار ایک ہی انداز سے حرکت کر رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو ثاقب حسن، لکھا نظر آیا اور پھر اس نام کی چمک میں نے تمہاری آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔" وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گئی۔ اقرار کرنا بھی مشکل لگ رہا تھا اور جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ بس سر جھکانے پر اکتفا کیا۔

"سنا ہے ایسے معاملے میں کسی ہمراز کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے پھر تم نے اتنی رازداری کیسے برت لی؟"

"میں ڈرتی تھی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم خوفزدہ ہو۔ خیر اب یہ بتاؤ، اماں نے انہیں کیا جواب دیا؟"

"پتا نہیں یہ تو صبح انیلا سے معلوم ہوگا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی: "مجھے ذرا بھی امید نہیں ہے کہ اماں اس رشتے پر ہامی بھریں گی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ثاقب حسن کوئی جاب نہیں کر رہا البتہ باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور آپ تو جانتی ہیں اماں۔"

"ہاں، میں اماں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔" چھوٹی آپا فوراً بول پڑیں۔

"لیکن تم ربیعہ، اس سلسلے میں خاموش مت رہو۔ اگر واقعی ثاقب حسن سے محبت کرتی ہو تو اماں سے بات کرو۔"

"میں۔" وہ اپنی طرف اشارہ کیے چھوٹی آپا کی طرف یوں دیکھنے لگی۔ جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو جب کہ چھوٹی آپا اطمینان سے بولیں۔

"ہاں تم۔ صاف صاف اماں سے کہہ دو کہ ثاقب حسن کے سوا کسی سے شادی نہیں کروگی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں چھوٹی آپا آپ؟ اماں تو میرا گلا دبا دیں گی۔"

"تو کیا اس کے بغیر اطمینان سے رہ لوگی؟"

"اطمینان سے۔؟ میں تو پتا نہیں جی بھی پاؤں گی کہ نہیں۔" اس کی آنکھوں کی سطح پھر گیلی ہونے لگی۔

"ربیعہ۔" چھوٹی آپا نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اتنی بزدلی کا مظاہرہ کر کے اپنے لیے مشکلات مت خریدو۔ بس اپنے اندر تھوڑا سا حوصلہ پیدا کرلو۔ ایک بار اماں سے کہہ دو۔"

"چھوٹی آپا۔ میں سب کر سکتی ہوں لیکن اماں کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی۔ مر کر بھی نہیں۔ اور ابھی ان کے پوچھنے پر میں صاف انکار بھی کر چکی ہوں کہ میں انیلا کے کسی بھائی کو نہیں جانتی۔" چھوٹی آپا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

"اچھا پہلے تم صبح انیلا سے معلوم کرو کہ اماں نے انہیں کیا جواب دیا ہے پھر میں کچھ کروں گی۔"

"چھوٹی آپا پلیز۔ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں بولیں گی۔"

"کیوں؟" وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اماں آگئیں۔ باری باری دونوں کو دیکھا پھر کہنے لگیں۔

"یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں روٹی پکا رہی تھی۔ ربیعہ یونہی میرے پاس آبیٹھی۔" چھوٹی آپا۔ ان کے کھردرے لہجے کا نوٹس لیے بغیر اطمینان سے بولی۔

"اگر پک گئی ہو تو دسترخوان بچھا دو۔" ان کے کہنے پر ربیعہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ حسبِ معمول اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ کلثوم اور ہما کا شاید کوئی ٹیسٹ وغیرہ تھا۔ وہ اس کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا اسٹڈی کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ بظاہر نظریں صفحات پر جمی تھیں لیکن ذہن بھٹک رہا تھا۔ کبھی ثاقب حسن کی باتیں۔

"تمہارا میرا سنجوگ آسمانوں پر لکھا ہے، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔"

"ذرا سا مسکرا دو کہ پھولوں کے ساتھ ساتھ میرے دل کی کلی بھی کھل اٹھے۔"

اس کے ہونٹوں پر ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا تھا کہ اماں کی باتیں۔

"تم ان کے بیٹے کو جانتی ہو؟"

"کچھ کیا ہوگا جب ہی تو یہ لڑکی اپنی ماں کو لے کر یہاں تک آئی ہے۔ ورنہ تم سے پہلے بھی اس گھر کی دو لڑکیاں کالجوں میں پڑھ چکی ہیں۔"

"میرے خدا۔" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کی تھیں کہ ثاقب حسن کی والدہ کا مایوس چہرہ تصور میں اتر آیا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا اور ہلکا ہلکا درد اٹھنے لگا۔ بند پلکوں کے اندر پانی یوں مچلا کہ کناروں کو بھگو گیا۔

وہ گرد و پیش سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ اور اندر کی آوازوں میں کھو کر باہر کی آہٹیں محسوس ہی نہ کر سکی تھی۔ وہ تو جب کندھے پر دباؤ محسوس ہوا تو گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اماں سر پر کھڑی تھیں۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔

"جاؤ جا کر سو جاؤ۔" اماں کا سرد لہجہ حکمیہ تھا۔ اس نے فوراً کتاب بند کر دی اور ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ باہر آئی تو چھوٹی آپا، ابا میاں کے پاس بیٹھی جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔

"ربیعہ۔ اتنی جلدی سو رہی ہو؟" چھوٹی آپا وہیں سے پکار کر پوچھنے لگی۔

"ہاں نیند آرہی ہے۔" اس نے کہا اور چادر سر تک اوڑھ لی۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ نیند بالکل نہیں آرہی تھی، چادر میں چھپی تو پھر وہی ساری باتیں جو اندر بیٹھ کر سوچ رہی تھی، ایک بار پھر ذہن پر دستک دینے لگیں۔ جنہیں سوچتے اور ان میں الجھتے الجھتے جانے کتنی رات بیت گئی۔

جب ہر طرف خاموشی کا احساس ہوا تو اس نے منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ سب پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں ستارے بھرے آسمان پر بھٹکنے لگیں۔ آج وہ ستاروں کا جھرمٹ کہیں نہیں تھا جس کے درمیان چاند کا تصور کرتی تو ایک مانوس چہرہ روشن ہو جایا کرتا تھا۔ شوخ اور شریر سا۔

"ثاقب حسن!" دل نے پکارا۔ "تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم تو بس اتنا کرو کہ اپنے دل سے سارے خدشے، سارے اندیشے نکال باہر کرو۔" اسے لگا جیسے وہ کہیں آس پاس کھڑا کہہ رہا ہے۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"میرا یقین کرو۔ میں تمہارا ہاتھ کسی اور ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔"

اسے ثاقب حسن کا یقین تھا۔ پھر بھی دل اندیشوں کی قید سے آزاد نہیں ہوا۔ اسی طرح سوچتے اور تصور میں اس سے باتیں کرتے ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح وہ معمول کے مطابق اٹھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اماں کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا اور پھر اندر چلی گئی۔

کالج یونیفارم پر استری کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جاتے ہی انیلا سے پوچھے گی۔ اماں نے کیا جواب دیا تھا؟ اور یہ کہ دوبارہ وہ کب اس کے گھر آئے گی؟ استری کا بٹن بند کر کے پلٹی تو اماں دروازے سے داخل ہوتی نظر آئیں۔ وہ بے حد خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم آج سے کالج نہیں جاؤ گی۔" وہی رات والا لہجہ تھا اماں کا۔ ٹھہرا ہوا ہونے کے باوجود بے حد سرد اور چبھتا

ہواسا۔ وہ احتجاج کے طور پر ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ اماں نے بس یہی ایک جملہ کہا اور واپس چلی گئیں اور وہ تو جیسے اپنے سارے احساسات سمیت منجمد ہوگئی تھی۔

ثاقب حسن گو کہ بہت زیادہ پُرامید نہیں تھا پھر بھی اندر کہیں ہلکی سی اُمید کی کرن "شاید قسمت مہربان ہوجائے" نے اسے سہارا دیا ہوا تھا لیکن جب اماں اور انیلا، ربیعہ کے گھر سے مایوس لوٹیں اور بتایا کہ ربیعہ کی والدہ نے صاف منع کردیا ہے تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اگر وہ سوچ کر جواب دینے کا کہتیں تب تو شاید وہ آس کی ڈور تھامے رکھتا لیکن یہاں تو صاف منع کرکے آئندہ کے لیے گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بات تو اسے ربیعہ نے بھی سمجھا دی تھی لیکن وہ کیا کرتا، حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اسے فوری قدم اٹھانا پڑا۔

وہ رات جو ربیعہ پر بھاری تھی، اُس نے بھی اسی طرح گزاری۔ اور صبح ناشتا کرتے ہی وہ نکل گیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اسی وقت ربیعہ سے ملے گا اور پھر دونوں بیٹھ کر کوئی نیا راستہ سوچیں گے لیکن یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ربیعہ کالج نہیں آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر یہ انتظار جیسے اس کا مقدر ہوگیا۔ پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ صبح اور دوپہر کے وقت اس کے راستے پر نظریں جھکائے کھڑا رہتا اور وہ جیسے راستہ بھول گئی تھی۔

وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اسے اپنے آپ سے بڑھ کر عزیز ہوگئی تھی اور اب اس سے دُوری کسی طرح بھی برداشت نہیں ہورہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ پہلے یہی سوچا تھا کہ اس سے مل کر اسی میں حوصلہ پیدا کرے گا کہ وہ خود اپنے گھر والوں کو راضی کرے لیکن جب اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو وہ مایوسیوں میں گھرنے لگا۔

کئی بار سوچا انیلا کو اس کے گھر بھیجے لیکن یہاں اماں رکاوٹ بن گئیں۔

"ہم غریب ضرور ہیں لیکن ہماری بھی عزت ہے۔ میں کسی طرح انیلا کو اس کے گھر نہیں جانے دوں گی۔"

"اماں۔ میری زندگی کا سوال ہے۔" وہ عاجزی سے بولا تھا۔

"اور میری 'انا' کا۔" اماں نے اَنا کا مسئلہ بنا کر اس کی بات ماننے سے صاف انکار کردیا۔

"میں کیا کروں؟" وہ پاگل ہونے لگا۔ اپنے آپ سے بے گانہ ہوگیا بھول گیا کہ ان دنوں وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے کیا کوششیں کررہا تھا۔ ہر کام وہیں رہ گیا۔ بس ربیعہ کا خیال تھا۔ اس کے دید کی خواہش لیے روزانہ اسی راستے پر جا کھڑا ہوتا جہاں سے کبھی وہ اسے آتی ہوئی نظر آتی تھی۔ گھنٹوں گزر جاتے۔ وہ کتنی لڑکیوں پر ربیعہ کا گمان کرکے لپکتا اور پھر مایوس لوٹتا تھا۔ اسے اس کا خیال بھی تھا کہ پتا نہیں اس پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر اس کے گھر والوں نے یونہی تو نہیں اس کا کالج چھڑوا دیا ہوگا۔ یقیناً کوئی بات ہوگی۔

"کہیں اس کی شادی تو نہیں ہورہی؟" اس دن اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس خیال نے اسے بے چین کردیا اور وہ اُونچا پورا مرد اماں کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح رو دیا۔

"اماں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"پھر تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟" اماں اس کے رونے سے پریشان ہوگئیں۔

"آپ اس کے گھر جاکر بات کریں۔ ان سے کہیں بے شک ابھی شادی نہ کریں لیکن میرے کسی قابل ہونے کا انتظار تو کرلیں۔"

"بیٹا۔ ہم کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔" اماں اس کا سر سہلاتے ہوئے سمجھانے لگیں۔ "تم نے تو جی کو روگ لگا کر ساری کوششیں ترک کردی ہیں۔ اب بھلا بتاؤ تو تم کسی قابل کس طرح ہوسکتے ہو۔ سارا وقت کمرے میں بند ہوکر تو تم کچھ نہیں کرسکتے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"اچھے رشتے اتنی جلدی نہیں ملتے اور پھر جس طرح اس کی والدہ چاہتی ہیں اس کے لیے تو میرا خیال ہے انہیں لمبا عرصہ انتظار کرنا پڑے گا تو بیٹا اس عرصے میں تم کیوں نہیں کسی قابل ہوجاتے۔ جب کچھ بن جاؤ گے تو میں تمہاری

ماطر پھر اس کے گھر چلی جاؤں گی۔"

"لیکن اماں۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔"

"اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس طرح حوصلہ ہار کر خود اپنا نقصان کروگے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب تک اس کے ملنے کا یقین نہ ہو، میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"اگر نصیب میں ہوگی تو ضرور ملے گی خواہ درمیان میں کتنی ہی رکاوٹیں کھڑی کیوں نہ ہوجائیں لیکن بیٹا کچھ کرو ضرور س طرح دنیا تیاگ کر مت بیٹھ جاؤ۔" اُس کے خاموش رہنے پر وہ کہنے لگیں۔

"انہوں نے انکار صرف اس لیے کیا ہے کہ تم کچھ نہیں کررہے۔ اور میں زیادہ اصرار بھی نہیں کرسکی۔ ہاں اگر تمہارے پاس کوئی معمولی سی نوکری بھی ہوتی، تب بھی میں انہیں قائل کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ خود ہی سوچو، اگر تمہاری بہنوں کے لیے کسی بے کار آدمی کا رشتہ آجائے تو کیا ہم منظور کرلیں گے؟۔ نہیں نا۔ تو ہمیں انہیں الزام دینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"اماں۔ آپ بھی ایسے کہہ رہی ہیں۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔ جذبات سے نکل کر ذرا ہوش سے کام لو۔ یہ جو وقت تم برباد کررہے ہو، ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہیں آئے گا۔ ہمارا نہیں تو اسی لڑکی کا خیال کرو۔ وہ بہت زیادہ عرصہ تمہارے انتظار میں نہیں بیٹھی رہے گی۔"

اماں غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ بیڈ پر سیدھا لیٹا تو اماں کی باتوں کو سوچنے لگا۔ دل اور ذہن نے ان کی باتوں کو جھٹلایا نہیں۔ پھر بھی وہ پہلے اُس کے ملنے کا یقین چاہتا تھا۔

"ربیعہ۔ ربیعہ۔ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟" وہ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپتے ہوئے شکستگی سے بڑبڑایا۔

"تمہاری قسم۔ جب تک یہ یقین نہ ہو کہ میری ساری جدوجہد اور محنت کے بعد تم انعام کی صورت ملوگی، میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ کم از کم تم ہی یہ یقین بخش دو۔ کہہ دو کہ تم میرا انتظار کروگی۔" اس کی آنکھوں کا پانی ہتھیلیوں کو نم کرنے لگا۔

"چہ۔ چہ۔ ثاقب حسن، مرد ہوکر روتے ہو؟" دل نے ٹوکا۔

"پھر میں کیا کروں؟" بے بسی سے بڑبڑایا۔

"کوئی اور راستہ سوچو۔"

"اور راستہ؟" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا۔ پھر واقعی وہ ایک نیا راستہ تلاش کررہا تھا۔ تیسرا راستہ جس کے اختتام پر ان دونوں کی منزل ایک ہو۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ سوچتا رہا، الجھتا رہا۔ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچا تو قدرے مطمئن ہونے لگا تھا۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ اس کی حالت ثاقب حسن سے مختلف نہیں تھی۔ ویسی ہی بے چینی ویسا ہی اضطراب۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے؟ سارا دن اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھتی تاکہ پریشان خیالات سے نجات ملے لیکن اس کا خیال کسی وقت جاتا ہی نہیں تھا اور اس کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ سب کے سامنے اپنے آپ کو نارمل بھی پوز کرنا تھا۔ یوں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

صرف چھوٹی آپا اس کی کیفیت کو سمجھتی تھیں، لیکن وہ بھی کچھ کرنے سے قاصر تھیں۔ بس اندر ہی اندر کڑھتیں یا پھر کسی وقت اُسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ وہ ان کی ساری باتیں خاموشی سے سن لیتی اور جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہتی تھی۔

اُس روز اماں بڑی آپا کے بلانے پر اُن کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کلثوم اور ہما بھی اسکول گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں بس وہ اور چھوٹی آپا تھیں۔ چھوٹی آپا موقع دیکھتے ہی پھر اسے سمجھانے لگیں۔

"دیکھو تم جس آگ میں چپ چاپ سُلگ رہی ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

وہ حسبِ عادت خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس طرح مت دیکھا کرو ربیعہ، مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔" اس نے پلکیں جھکالیں تو چھوٹی آپا نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"میرے خدا۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے ربیعہ؟ خدا کے لیے کچھ بولو۔"

"کیا بولوں؟" وہ بے بس نظر آنے لگی۔

"کچھ بھی۔ اچھا ایسا کرو جو کچھ تمہارے دل میں ہے سب کہہ ڈالو۔"

"آپ جانتی تو ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ چھوٹی آپا اس کے رونے سے پریشان تو ہوئیں لیکن چپ نہیں کرایا۔ سوچا شاید اسی طرح دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ کافی دیر بعد جب وہ خود ہی چپ ہوگئی تو بولی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔ میں آپ کو بتاؤں چھوٹی آپا، میں نے جان بوجھ کر اس راستے پر قدم نہیں رکھا تھا۔ ثاقب حسن پتا نہیں کیسے اچانک ہی میری نظروں کے سامنے آگیا۔ اور آپ تو جانتی ہیں میری عادت کو کسی بھی اچھی چیز کو دیکھ کر اس پر سے نظریں ہٹانا بھول جاتی ہوں اور پھر ثاقب حسن تو یونانی دیوتاؤں کا سا حسن رکھتا ہے۔ میں کیسے اسے نظر انداز کردیتی۔

وہ بار بار میرے سامنے آنے لگا اور میری سمجھ میں نہیں آتا اسے مجھ میں کیا نظر آیا جو میری طرف لپکا تھا۔ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔ کاش وہی مجھے نظر انداز کردیتا تو آج میں ان حالوں کو نہ پہنچتی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"اب یہ جاننے کے بعد کہ اسے پانا تو دُور کی بات میں اسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گی، میرا دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ چھوٹی آپا، مجھے کسی پل قرار نہیں آتا۔ میں اس کے خیال سے جتنا دامن بچانے کی کوشش کرتی ہوں، وہ اتنا زیادہ مجھ پہ حاوی ہوتا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں کبھی بھی اسے بُھلا نہیں پاؤں گی۔ امّاں نے اچھا نہیں کیا اور وہ کیا سمجھتی ہیں اس چار دیواری میں مقید ہوکر میں اس کا خیال چھوڑ دوں گی۔ نہیں، اس کا خیال تو میری نس نس میں سمایا ہے۔ وہ میری ہر سانس میں مہکتا ہے۔" اس کے آنسو پھر تواتر سے بہنے لگے۔

"لوگ کہتے ہیں کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ شاید ٹھیک کہتے ہوں۔ وہ میرے بغیر زندہ ہوگا اور میں اس کے بغیر زندہ ہوں لیکن چھوٹی آپا۔ میں زندہ نہیں ہوں، زندہ لاش ہوں۔ میرے اندر ساری خواہشیں، ساری آرزوئیں مرگئی ہیں۔ میرے احساسات بھی میرا ساتھ نہیں دیتے۔ پھر بھلا میں کیسے زندہ ہوں؟ بتائیں، کیا میں آپ کو زندہ نظر آتی ہوں۔"

"ربیعہ۔" چھوٹی آپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔ "تم بہت بزدل ہو۔ زندگی میں تو اس سے کہیں زیادہ کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور تم پہلے ہی قدم پر حوصلہ ہار گئیں۔"

"میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"یا تو اماں سے صاف صاف کہہ دو کہ ثاقب حسن نہیں تو کوئی بھی نہیں، یا پھر اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اس طرح جو تم چپ چاپ اندر ہی اندر جل رہی ہو، یہ انتہائی بزدلی اور احمقانہ پن ہے۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ نہ امّاں کے سامنے ایسی کوئی بات کرسکتی ہوں اور نہ ہی اس کا خیال دل سے نکل سکتا ہے۔"

"تو پھر مجھے امّاں سے بات کرنے دو، ان کے خیال میں، میں بدتمیز اور بدلحاظ تو ہو ہی چکی ہوں، تمہاری خاطر ایک بار پھر یہ الزام سہہ لوں گی۔"

"اب آپ کیا بات کریں گی؟" وہ مایوسی سے بولی۔ "امّاں نے ثاقب حسن کے گھر والوں کو مایوس تو لوٹا ہی دیا ہے۔ اب وہ دوبارہ کیسے آئیں گے بھلا؟"

چھوٹی آپا سر ہلاتے ہوئے جانے کیا سوچنے لگیں۔ کافی دیر بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"تم ایک کام کرو۔ کسی بھی طرح ثاقب حسن کو یہ پیغام بھیجو کہ وہ اپنی امّاں کو دوبارہ بھیجے۔ آگے میں سنبھال لوں گی۔"

"میں کیسے اسے پیغام بھیج سکتی ہوں، آپ دیکھ رہی ہیں امّاں نے میرا گھر سے نکلنا ہی بند کردیا ہے۔"

چھوٹی آپا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

"اچھا۔ یہ کام بھی میں ہی کرتی ہوں۔"

"آپ کیا کریں گی؟" وہ حیران و پریشان ہوکر بولی۔

"تمہارے کالج جاکر انیلا سے ملوں گی۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن چھوڑو۔ میں کل ہی امّاں سے کوئی بھی بہانہ کرکے تمہارے کالج جاؤں گی۔" پھر اس کا ہاتھ تھپکتی ہوئی بولیں۔ "مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اور پلیز تم بھی اپنے اندر ذرا سی ہمت پیدا کرلو، ایسا نہ ہو تمہاری بزدلی میرے سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دے۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"خبردار۔" چھوٹی آپا نے آنکھیں دکھائیں۔ "بالکل بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور سنو بلا خوف و خطر ان خوابوں کو آواز دے ڈالو جو تم نے سجائے ہوں گے۔ اور میں ان کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے دعاگو تو ہوں ہی کل کوشش بھی کروں گی۔"

اُس کی نظروں میں ثاقب حسن کا سراپا آسمایا۔ دراز قامت، سرخی مائل سفید رنگت، براؤن بال اور بڑی بڑی براؤن آنکھیں۔ جن میں اس کے دل کی ہر بات واضح طور پہ تحریر ہوجایا کرتی ہے۔ دل اُداس ہو تو آنکھوں کے دیپ بُجھے ہوئے سے۔ دل شوخی و شرارت پر آمادہ ہو تو آنکھیں ہنستی ہوئی سی لگتی تھیں۔ اس نے محبتوں کے رنگ پہلی بار ان ہی آنکھوں میں تو دیکھے تھے۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

کوئی گھنٹہ بھر بعد چھوٹی آپا واپس آئیں۔ اُس وقت وہ کچن میں تھی۔ اُن کی آواز سن کر دل چاہا بھاگتی ہوئی اندر جائے اور اُن سے ساری تفصیل پوچھ ڈالے۔ لیکن امّاں کا خیال کرکے وہ وہیں رُکی رہی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی آپا خود ہی پانی پینے کے بہانے آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ مجسّم سوال بن گئی۔

"انیلا بیماری کے باعث ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔" انہوں نے بلا تمہید ایک ہی جملے میں ساری صورتِ حال واضح کردی۔

"اب کیا ہوگا؟" وہ پھر مایوس ہونے لگی۔

"ہوگا کیا۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ اُس کے بعد پھر چلی جاؤں گی۔" چھوٹی آپا نے اطمینان سے جواب دیا تو وہ بس اُن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"اب خدا کے لیے تم مایوس ہوکر اندر ہی اندر جلنے مت لگنا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" چھوٹی آپا نے ہلکے سے ڈانٹا تو وہ سر ہلانے لگی۔

پھر بس دو دن ہی وہ چھوٹی آپا کے اطمینان دلانے پر قدرے مطمئن رہی تھی کہ تیسرے دن ایک خاتون نے آکر اُس کا یہ تھوڑا سا اطمینان بھی چھین لیا۔ ان کا حلیہ اور چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہیں۔ اُن کا لباس سادہ مگر بیش قیمت تھا اور وہ آئی بھی لمبی سی گاڑی پر تھیں۔ امّاں انہیں دیکھ کر خاصی مرعوب ہوئیں۔ اور پہلی بار انہیں اپنا گھر بہت معمولی لگا۔ بوکھلاہٹ میں اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگیں جیسے انہیں بٹھانے کے لیے کوئی بھی جگہ مناسب نہ لگ رہی ہو۔

"یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" خاتون برآمدے میں رکھے تخت پوش پر خود ہی بیٹھ گئیں۔ اُن کا نرم لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ بہت دھیمے مزاج کی عورت ہیں۔

"آپ ۔ ؟" امّاں اُن کی آمد کا مقصد جاننا چاہتی تھیں۔ بس اسی قدر کہہ سکیں۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں، تو میں اپنے بارے میں بتاؤں۔" خاتون نے کہا۔ تو امّاں اُن کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"میں بیگم احمد حسن ہوں۔" وہ کہنے لگیں۔ "میرے شوہر کا تقریباً تین سال قبل انتقال ہوا تھا، اُس وقت شہروز ایم بی اے کر کے لوٹا تھا۔" لمحہ بھر کو رُک کر کہنے لگیں۔ "شہروز میرا سب سے بڑا بیٹا ہے اور میں اسی کے لیے یہاں آئی ہوں۔"

"اِس گھر کا پتا آپ کو کس نے دیا ؟" امّاں پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"خاص طور سے آپ کے گھر کا پتا کسی نے نہیں دیا۔" انہوں نے بُردباری سے جواب دیا۔ "میں نے غالباً کسی گھر یا کسی تقریب میں آپ کی بچیوں کا ذکر سُنا تھا کہ ماشاءاللہ بہت نیک اور سلیقہ شعار ہیں۔ مجھے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش تھی، اس لیے میں نے اپنے طور پر خود آپ کا گھر تلاش کیا۔" امّاں کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگیں۔

"اِکرام علی آپ کے شوہر کا ہی نام ہے ناں۔"

"جی ہاں۔"

"بس تو میں اِکرام علی صاحب کا گھر پوچھتے ہوئے یہاں تک آئی ہوں۔"

"آپ چائے پئیں گی یا ۔ ؟" امّاں طویل سانس لینے کے بعد پوچھنے لگیں۔

"چائے اس شرط پر پیوں گی کہ آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گی۔" اُنہوں نے مُسکرا کر کہا۔

"بہن ۔ یہ سب تو مقدر کی باتیں ہیں۔" امّاں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اندر چلی گئیں۔ ربیعہ اور چھوٹی آپا ایک ہی جگہ بیٹھی تھیں۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا، چائے کے لیے کس سے کہیں۔ باہر جو خاتون اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ وہ حیثیت میں امّاں کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھیں۔

امّاں نے اپنی بیٹیوں کے لیے خوشحال گھرانوں کی خواہش ضرور پال رکھی تھی، لیکن اُن کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی امیر زادے کا رشتہ بھی آسکتا ہے۔ پہلے سہیل کے رشتے کو وہ صرف اس لیے رَد کر چکی تھیں کہ انہوں نے چھوٹی آپا کے بجائے ربیعہ کو پسند کر لیا تھا۔ اور اب جبکہ سب نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی، کہ صوفیہ یا ربیعہ میں سے جس کی بھی بات بن جائے، اُسی کی شادی کر دیں، تو ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، ان دونوں میں سے کِسے اُن کے سامنے بھیجیں ؟ گو کہ ماں ہونے کے ناتے اُن کی خواہش تھی کہ صوفیہ بڑی ہے، پہلے اس کی شادی ہو۔ لیکن یہ خدشہ کہ پیر کے نقص کی وجہ سے وہ رَد کر دی جائے گی، انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ ربیعہ کو اُن کے سامنے بھیجیں۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے آواز ربیعہ کو ہی دی لیکن پھر کچھ سوچ کر دونوں کو ہی باہر آنے کے لیے کہا۔

"کیا بات ہے امّاں ؟" چھوٹی آپا نے پوچھا۔ لیکن امّاں کوئی جواب دیے بغیر وہیں سے پلٹ آئیں، اور ابھی دوبارہ اُن خاتون کے سامنے تخت پوش پر بیٹھی ہی تھیں کہ ان کے پیچھے چھوٹی آپا اور ربیعہ آگئیں۔ ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ امّاں کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے، اس لیے اپنی دُھن میں چلی آئیں لیکن جب اُن خاتون پر نظر پڑی تو دونوں ٹھٹک کر رُک گئیں۔

"آؤ بیٹی ۔ آؤ ۔ رُک کیوں گئیں ؟" خاتون نے شفقت سے کہا تو دونوں امّاں کی طرف دیکھنے لگیں۔

"میرا خیال ہے، پہلے چائے بنا لو۔" امّاں نے کسی ایک کو مخاطب کر کے نہیں کہا تھا، اس لیے دونوں کچن کی طرف چلی گئیں۔ اور امّاں دزدیدہ نظروں سے بیگم احمد حسن کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگیں جو

اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں پھر وہ ایک دم امّاں کی طرف متوجہ ہوئیں، تو امّاں نے فوراً نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

"وہ جو بائیں طرف آپ کی بچی جا رہی ہے، اُس کا کیا نام ہے ؟" امّاں نے پلٹ کر دیکھا پھر آہستہ آواز میں بولیں۔

"ربیعہ۔"

"ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے۔ اور یقیناً میرے شہروز کے ساتھ خوب سجے گی۔" امّاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو کہنے لگیں۔ "آپ کل ہی اکرام صاحب کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔"

پھر وہ امّاں کو اپنے گھر کا پتا سمجھانے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں چائے لے کر آئیں، تو انہوں نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور چائے کے دوران یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔

اُن کے جانے کے بعد کلثوم انگلش کی کتاب لے کر چھوٹی آپا کے پاس آبیٹھی۔ وہ اُسے پڑھانے میں لگ گئیں۔ ربیعہ کو امّاں نے رات کے کھانے کے لیے کہا تو وہ اُٹھ کر کچن میں آگئی۔ اُس کا ذہن اچانک ہی مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ وہ اجنبی خاتون جو ابھی کچھ دیر پہلے آئی تھیں، اُنہیں دیکھ کر اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ کسی خاص مقصد سے آئی ہوں گی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کس کے لیے آئی ہیں ؟۔ کیونکہ وہ اُس سے اور چھوٹی آپا سے ایک ہی لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

"کاش چھوٹی آپا کی بات بن جائے۔" وہ سوچنے لگی۔ "دُنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ دیکھنے میں تو خاصی مہربان نظر آئی تھیں۔ ہو سکتا ہے اُنہوں نے چھوٹی آپا کو پسند کر لیا ہو۔" پھر وہ کتنی دیر تک چھوٹی آپا کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

ابا میاں آئے تو امّاں انہیں لے کر اندر چلی گئیں۔ وہ یقیناً انہیں اُن خاتون کی آمد کے بارے میں بتا رہی ہوں گی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اتنی رازداری برت رہی تھیں۔ اُس کی طرح چھوٹی آپا بھی کچھ اُلجھن میں تھیں۔ لیکن اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئیں۔ انہیں ربیعہ کا خیال تھا اور وہ سوچ رہی تھیں، اگر امّاں نے یہاں ہامی بھر لی تو پھر ثاقب حسن والے معاملے کا کیا ہوگا ؟ اسی لیے انہوں نے ربیعہ کے سامنے اس خاتون کا ذکر نہیں چھیڑا کہ کہیں وہ ابھی سے اندیشوں میں نہ گھر جائے۔

اگلے دن امّاں کی سرگرمیاں کچھ پُراسراری تھیں۔ ابا میاں کے آفس جانے کے بعد انہیں بیٹھے بیٹھے بڑی آپا یاد آنے لگیں۔ اور وہ اُسی وقت اُٹھ کر اُن کی طرف چل دیں۔ وہاں سے واپس آئیں، تو کچھ بوکھلائی ہوئی سی تھیں کبھی اپنا بکس کھولتیں اور کبھی ابا میاں کا۔ پھر ابا میاں بھی معمول سے بہت پہلے آفس سے آگئے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اور امّاں کہیں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنے میں بڑی آپا اور عاصم بھائی بھی آگئے۔ پھر وہ چاروں مل کر پتا نہیں کہاں چلے گئے۔

اُن کی واپسی اس وقت ہوئی جب شام گہری ہو کر رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ امّاں آئی تو بے حد خوش تھیں۔ اُن کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ابا میاں البتہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"چھوٹی آپا ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟" وہ سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں ۔ میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" چھوٹی آپا نے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر کہنے لگیں۔ "ایک دو دن صبر کرو۔ امّاں خود ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیں گی۔"

لیکن اُنہیں دو دن صبر نہیں کرنا پڑا۔ اگلے دن ہی امّاں چھوٹی آپا کو اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگیں۔

"رات ہم نے ربیعہ کی بات طے کر دی ہے۔ پرسوں جو بیگم احمد حسن آئی تھیں، اُن کے بیٹے کے ساتھ۔" فوری طور پر چھوٹی آپا کچھ بول ہی نہ سکیں۔ بس حیرت سے اُن کے ہونٹ نیم وا ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ امّاں تفصیلات بتاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اُسی دن وہ ربیعہ کو پسند کر کے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ رات ہم اُن ہی کی طرف

گئے تھے۔ ماشاءاللہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ شہروز احمد اُن کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور اس ناتے گھر کی زیادہ تر ذمہ داریاں اُن ہی کے کاندھوں پر ہیں۔ لیکن پیسے کی فراوانی نے ذمے داریوں کو بوجھ نہیں بنایا ہوا اور پھر گھر کے افراد بہت زیادہ نہیں ہیں۔ کل چار بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن شادی شدہ ہیں پھر شہروز احمد اُن کے بعد مہروز اور اس سے چھوٹی ایک بہن ہے۔" امّاں خاصے اطمینان سے تفصیل بتا رہی تھیں۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے امّاں۔ لیکن آپ پہلے ربیعہ سے تو پوچھ لیں۔" چھوٹی آپا بمشکل بول پائیں۔

"ربیعہ سے پوچھ لوں۔۔؟" امّاں نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"ہاں امّاں۔ آپ کو اُس سے پوچھنا چاہیے۔" چھوٹی آپا نے پوری قوت سے کہا۔

"کیوں؟ کیا میں اُس کی دشمن ہوں؟۔ اندھے کنوئیں میں پھینک دوں گی اسے؟" امّاں کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "بڑی کی شادی کی، اُس سے پوچھا؟۔ تمہارے لیے سوچتے ہوئے کبھی تم سے پوچھا؟ پھر وہ کیا آسمان سے اُتری ہے جو پہلے اُس کی رائے لوں؟"

"امّاں۔ آپ سمجھ نہیں رہیں۔" چھوٹی آپا اُلجھ کر بولیں۔

"بس بی بی۔ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش بھی مت کرو۔ میں نے تمہیں ساری بات اس لیے بتائی ہے کہ آج وہ لوگ ربیعہ کو انگوٹھی پہنانے آ رہے ہیں۔ تم ذرا چھوٹی دونوں کے ساتھ مل کر گھر ٹھیک ٹھاک کر لو۔"

اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امّاں پھر بول پڑیں۔

"ابھی کچھ دیر میں تمہاری بڑی آپا بھی آنے والی ہوں گی۔ پھر اُن کے ساتھ مل کر شام کے کھانے یا ناشتے وغیرہ کا جو بھی انتظام کرنا ہو، کر لینا۔" اُس کے ساتھ ہی امّاں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟۔"

"میں تمہارے ماموں جی کی طرف جا رہی ہوں۔ انہیں بھی شام کی دعوت دے آؤں ورنہ کہیں گے بالا ہی بالا سب کر لیا۔"

"اور تایا جی۔۔؟۔"

"انہیں ہم رات ہی کہتے ہوئے آئے تھے، وہ آ جائیں گے۔" امّاں عجلت میں کہتی ہوئی چلی گئیں اور چھوٹی آپا نے اس ساری صورتِ حال کو ابھی نئے سرے سے سوچنا شروع کیا ہی تھا، کہ ربیعہ دبے پاؤں اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی اور قدرے دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا چھوٹی آپا؟۔ یہ امّاں کہاں چلی گئی ہیں؟۔" وہ متجسس سی ہو کر بولی۔

"ماموں جی کے گھر۔" چھوٹی آپا طویل سانس لیتے ہوئے بولیں پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور چپ چاپ اُس کی طرف دیکھے گئیں۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟" وہ اُلجھ کر پوچھنے لگی۔

"ربیعہ۔ تمہاری قسمت تمہارا ساتھ نہیں دے رہی۔"

"کیا مطلب؟۔" وہ بالکل نہیں سمجھی۔

"دیکھو میری بات تحمل سے سُننا اور پلیز رونا مت۔" چھوٹی آپا اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولیں۔ "اُس دن جو خاتون آئی تھیں، امّاں اور ابا میاں نے ان کے بیٹے کے ساتھ تمہاری بات طے کر دی ہے۔"

"کیا۔۔؟۔" اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں ربیعہ۔ اور آج شام وہ باقاعدہ تمہیں اپنا پابند کرنے آ رہے ہیں۔"

"نہیں چھوٹی آپا۔" وہ رونے لگی۔

"رومت ربیعہ۔ رونے سے حالات بدل تو نہیں جائیں گے۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا۔" وہ رونے کے سبب اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

"ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری خاطر امّاں سے لڑوں گی۔ لیکن لڑنے کا وقت کہاں ہے۔ یہ ساری باتیں ایک دم ہی طے ہو گئیں۔ اگر درمیان میں کچھ دن ہوتے، تب میں بات کر سکتی تھی۔ اب اگر میں کوئی بات

کروں گی، تو امّاں سمجھیں گی، میں تمہاری راہ میں رکاوٹ بن رہی ہوں جب کہ میں نے خود انہیں اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ میری وجہ سے دوسری بیٹیوں کو نہ بٹھائے رکھیں۔"

وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"میری بہن، اب مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مُقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔"

"لیکن۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ برآمدے سے آتی بڑی آپا کی آواز سُن کر گھبرا کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم جلدی سے اسٹور میں چلی جاؤ۔"

چھوٹی آپا نے کہا تو وہ فوراً اُٹھ کر چلی آئی۔ اسٹور کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

کھو دینے کے احساس نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دل اَنگ مچل مچل کر احتجاج کرنے لگا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟۔ اور اُسی کے ساتھ ہی کیوں ہوا؟۔ کتنے حسین خواب سجائے تھے اُس نے۔ کبھی سوتے میں اور کبھی جاگتی آنکھوں۔ وہ خواب سارے اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور اب جب کہ تلخ حقیقت نے اُسے بیدار کر دیا تھا تو ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اس کی روح میں اُتری جا رہی تھیں۔ جن کی چبھن آنکھوں میں بھی اُتری ہوئی تھی۔

"ثاقب حسن۔" وہ بے آواز صدائیں دینے لگی۔ "تم نے کہا تھا، جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں اُن میں پانی نہیں اُترنا چاہیے، ورنہ دیپ بُجھ جاتے ہیں۔ یہ دیپ بُجھنے سے پہلے کہیں سے آ جاؤ۔ کہیں سے آ جاؤ ثاقب حسن۔ کہیں سے آ جاؤ۔" وہ دوہری ہو کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور کہیں سسکیوں کی آواز باہر نہ جائے، منہ پر ہاتھ رکھ کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"ربیعہ۔" دروازے کے قریب اُسے چھوٹی آپا کی آواز سُنائی دی پہلے اپنا وہم لگا لیکن جب غور کیا تو وہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے کر اُسے پکار رہی تھیں۔

"ربیعہ پلیز، اب باہر نکلو۔ بڑی آپا بھی تمہارا پوچھ رہی ہیں۔" اُس نے جلدی سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ چھوٹی آپا اُسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ شدتِ گریہ سے آنکھیں سُرخ ہونے کے ساتھ سوج بھی گئی تھیں۔

"یہ کیا حالت بنالی ہے؟۔"

اُس کی آنکھیں پھر پانیوں سے بھر گئیں۔

"خُدا کے لیے بس کرو۔" چھوٹی آپا نے ٹوک دیا۔ "چلو جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ امّاں بھی بس آنے والی ہوں گی۔ اور سنو اسی طرح مت بڑی آپا کے سامنے چلی جانا۔" وہ کچھ نہیں بولی، پلٹ کر برآمدے کی طرف کا دروازہ کھولا اور وہیں سے نکل کر باتھ روم میں چلی گئی۔

کتنی دیر تک آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ پھر صابن سے منہ دھو کر باہر نکل آئی۔ کمرے میں آئی تو بڑی اور چھوٹی آپا مل کر شام کا پروگرام طے کر رہی تھیں۔ اُس پر نظر پڑی تو بڑی آپا ہلکے سے مُسکرائیں۔ اور اُس نے کیونکہ چہرہ صاف نہیں کیا تھا، اس لیے بہانے سے تولیہ اُٹھا کر منہ چھپا لیا۔ بڑی آپا نے اس کی اس حرکت کو شرم پر معمور کیا اور زور سے ہنس پڑیں۔

"بہت لکی ہو تم ربیعہ۔ شہروز احمد بلکہ ان کے پورے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ میں سچ مچ بہت متاثر ہوں۔" بڑی آپا نے پہلے اُس سے کہا پھر چھوٹی آپا کو ان کے گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں بتانے لگیں اُس نے موقع غنیمت جانا اور چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔ ویسے بھی اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر شام تک کا وقت اُس نے اکیلے کمرے میں گزارا۔ کلثوم اور ہما گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا کچن میں گھسی شام کے لیے پتا نہیں کیا کچھ تیار کر رہی تھیں۔ ابا میاں بھی اسی

وقت آگئے تھے۔ اماں خود بھی بوکھلا رہی تھیں اور انہیں بھی بوکھلائے دے رہی تھیں۔ سب کیونکہ بے حد مصروف تھے، اس لیے کسی نے اُس کی روتی روتی آنکھوں پر غور نہیں کیا۔

وہ اکیلے کمرے میں بیٹھی بس اپنے آپ پر کڑھتی رہی تھی۔ اور اب تو ذہن بھی ڈھنگ سے کام نہیں کر رہا تھا۔ شاید وہ تھک گئی تھی یا پھر حالات سے شکست مان لی تھی۔ ایک بار چھوٹی آپا کمرے میں آئیں تو وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ انہیں اُسے دیکھ کر واقعی دکھ ہوا لیکن وہ کچھ کرنے سے قاصر تھیں اور اب تو تسلی کے دو بول بھی نہ کہہ سکیں۔ بس اتنا کہا۔

"ربیعہ لیٹ جاؤ۔ بلکہ ہو سکے تو سو جاؤ۔" اُس نے خاموشی سے اُن کی بات مان لی۔ تکیہ سیدھا کر کے لیٹی اور چادر سر تک اوڑھ لی۔ رونے کی وجہ سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، ذرا سی جھپکیں تو بند ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر نیند بھی مہربان ہو گئی۔

جانے کتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔ خود سے اُٹھی بھی نہیں۔ بڑی آپا نے آ کر اٹھایا تھا۔ وہ کتنی دیر تک خاموش نظروں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

"اٹھ کر نہا لو۔ تمہاری تیاری میں بھی کچھ وقت لگے گا۔" انہوں نے کہا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھر میں چہل پہل کا احساس ہوا تو یاد آیا کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دل میں ہلکا ہلکا سا درد اٹھنے لگا۔ آنکھوں میں نمی اُترنے لگی جسے چھپانے کی خاطر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم باتھ روم میں جاؤ۔ میں تمہارے کپڑے وہیں پہنچا دوں گی۔" بڑی آپا نے کہا تو وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل آئی۔ بڑے کمرے سے ماموں جی اور تایا جی کی بیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رُکے بغیر سیدھی چلی گئی۔ جب نہا کر آئی تب سب لڑکیوں نے اُسے گھیر لیا۔

اُسی وقت اماں اس کے کپڑے اور زیور، جو کچھ دیر پہلے بیگم احمد حسن نے بھجوائے تھے، لے کر آ گئیں۔ اور لڑکیوں کو ہدایت کی کہ جلدی اسے تیار کر دو۔" پھر وہ خاموش تماشائی بنی اپنی آرزوؤں کو فنا ہوتے دیکھتی رہی تھی۔

شام ابھی پوری طرح نہیں ڈھلی تھی کہ بیگم احمد حسن اپنے کچھ خاص عزیزوں کے ساتھ آ گئیں۔ مردوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ اور خواتین بڑے کمرے میں آ گئیں۔ کچھ دیر بعد بڑی آپا نے اُسے لے جا کر بیگم احمد حسن کے پہلو میں بٹھایا تو شہروز احمد کی بہنیں لپک کر اُس کی طرف آ گئیں۔ اور بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر آہستہ ان کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو کہہ رہی تھیں۔

"امی۔ آپ کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔"

سب اُس کی تعریف کر رہے تھے اور اس کے قریب بیٹھی بیگم احمد حسن تو اُس پر نثار ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر ثاقب حسن کا خیال درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اپنی اتنی تعریف پر یقیناً تھوڑی مغرور ہوتی اور قسمت پر شاکر بھی۔ لیکن اب تو اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ تعریفی جملے، نہ والہانہ انداز۔ اس کے برعکس وہ سوچ رہی تھی۔ کاش اس میں اچھی لگنے والی کوئی بات ہی نہ ہوتی اور بیگم احمد حسن اوّل روز ہی اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی چلی جاتیں لیکن وہ کیا کرتی کہ نہ صرف دیکھنے میں اچھی لگتی تھی بلکہ دل میں بھی گھر کر جاتی تھی۔

پھر بیگم احمد حسن نے اماں کی اجازت لے کر خود ہی اُسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اُس کے بعد وہ بس کچھ دیر ہی وہاں بیٹھی تھی۔ بڑی آپا کسی کام سے وہاں آئیں تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُن ہی کے سہارے چلتی ہوئی چھوٹے کمرے میں آ گئی۔

"میں تمہیں وہاں سے اُٹھانے تو نہیں آئی تھی۔" بڑی آپا کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"میں تھک گئی تھی۔" اُس نے عذر تراشا۔

"ارے اتنی سی دیر میں اور شادی کے دن کیا کرو گی جو گھنٹوں بیٹھنا پڑے گا؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ اُن کی طرف سے رُخ موڑ کر زیور اُتارنے لگی۔

"ابھی مت اُتارو۔" بڑی آپا نے روکا۔ "ہو سکتا ہے جانے سے پہلے تمہاری ساس، نندیں تمہارے پاس آئیں۔"

"بس بڑی آپا۔ اب یہاں کسی کو مت آنے دیجیے گا۔"

"بھئی۔ اب تم اُن کی امانت ہو۔ ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟" اُن کی بات پر اس کا ذہن بھٹک گیا۔

"تم میری امانت ہو۔ اور میں تمہارا ہاتھ کسی اور ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔" کتنے مان سے کہا تھا اُس نے جو بہت کم عرصے میں اُسے بہت زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ بڑی آپا اُسے خاموش دیکھ کر چلی گئیں اور وہ ان آوازوں کی بازگشت سُننے کو تنہا رہ گئی۔ اُسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ جس طرح کھڑی تھی، اُسی طرح وہیں بیٹھ گئی۔ سر سے آنچل ڈھلک کر کندھے پر آ رُکا تھا۔ اور جو زیور اتار رہی تھی تو فقط ایک کان کی بالی ہاتھ میں تھی۔

کتنی دیر گزر گئی۔ وہ ایک ہی نکتے پر نظریں مرکوز کیے گم صم سی بیٹھی تھی۔ باہر سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اب شاید جانے کی تیاری کر رہے تھے اور جانے سے پہلے اُس کی ساس اور نندیں اس کے پاس آ گئیں۔

"اچھا بھابی۔ ہم جا رہے ہیں۔" اُس کی چھوٹی نند نے شوخی سے اسے مخاطب کیا۔ تو وہ چونکی اور دوپٹہ کھینچ کر سر پر اوڑھ لیا۔

"چھپنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہروز بھائی ہمارے ساتھ نہیں آئے۔"

"مت تنگ کرو۔" امی نے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر قدرے جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ "اچھا بیٹی، اب چلتے ہیں۔"

"یہ بھی بتا دیجیے، بہت جلد انہیں لینے آئیں گے۔" اس کی نند ندا خاصی شوخ لگ رہی تھی۔

"انشاءاللہ۔" امی (اس کی ساس) نے کہا۔ اور دونوں بیٹیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"زیادہ دن نہیں ہیں۔ اگلے مہینے آج ہی کی تاریخ کو دوبارہ آئیں گے۔" ندا جاتے جاتے بھی کہتی گئی۔ اور اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔

"میرے خدا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی کیوں ہو رہا ہے؟" اُس نے سوچا اور دل دُکھ سے بھر گیا پھر وہ اٹھ کر اسٹور میں چلی گئی۔ زیور اُتار کر کپڑے تبدیل کیے اور جب باہر نکلی تو اُس کی کزنز اسے دیکھ کر چیخ پڑیں۔

"یہ کیا کیا؟ ہم نے تو ابھی ڈھنگ سے تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔" وہ کیا کہتی۔ خاموش ہی رہی۔

"عجیب لڑکی ہو، تمہاری جگہ میں ہوتی تو کوئی کہتا بھی تو چینج نہ کرتی۔" عاصمہ کی بات پر اتنے دُکھ کے باوجود اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"تھینکس گاڈ۔ ہونٹوں نے کچھ حرکت تو کی ورنہ میں تو سمجھی تھی، دونوں نے ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"کن دونوں نے؟" وہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔ اور سب لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ پہلے تو وہ سمجھی نہیں، پھر جب غور کیا تو اپنی غائب دماغی پر دل ہی دل میں نادم ہوئی اور اپنے آپ کو سرزنش بھی کی۔ کہ کم از کم سب کے سامنے تو بھرم رہنا ہی چاہیے۔

سب لڑکیاں اُس کے سُسرال والوں کی تعریف کرتے ہوئے بار بار اُسے خوش نصیب کہہ رہی تھیں اور اُس نے گھٹنوں پر پیشانی ٹکاتے ہوئے سوچا۔ اگر یہ خوش نصیبی ہے تو پتا نہیں بدنصیبی کیا ہو گی؟

وہ وقت کو روکنا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی دن طویل سے طویل تر ہو جائیں لیکن لمحے مسلسل اُس کی گرفت سے پھسلتے جا رہے تھے۔ اندر کہیں شدید خواہش کے ساتھ ہلکی سی آس کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے، کوئی ایسی

بات جیسے بنیاد بنا کر شہروز احمد کی امی کسی دن آکر کہہ دیں ہم سے غلطی ہوئی، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی بھی نہیں لگ سکتا؛ آخر دنیا میں ایسا ہوتا تو ہے کہ عین وقت پر بھی لوگ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو رہا، جب کہ میرے ساتھ تو ایک کہانی بھی منسوب ہے۔ ثاقب حسن کی کہانی۔

اب اُسے کون سمجھاتا کہ اکثر جو باتیں ہم چاہتے ہیں کہ ہو جائیں وہ نہیں ہوتیں اور جو ہم نہیں چاہتے، وہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ نہ وقت کو روک سکی اور نہ دن طویل ہو سکے اور آخری معجزے کی آس بھی اُس وقت ٹوٹ گئی جب وہ شہروز احمد کے سنگ چلتی ہوئی بابل کا آنگن پار کر آئی۔

اُس نے تو ابھی کتابِ زندگی کے اس باب کو بند بھی نہیں کیا تھا جو ثاقب حسن سے منسوب تھا اور ایک مشرقی لڑکی ہونے کے ناتے شہروز احمد کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہنے کا کوئی عہد کر کے اپنے آپ کو بہلایا تھا۔ وہ آخری وقت تک حقیقت سے نظریں چراتی رہی تھی۔

شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ بھیانک خواب۔ اور جب آنکھ کھُلے گی تو سب کچھ اُس کی خواہش کے مطابق ہو گا۔ لیکن کچھ بھی اُس کی خواہش کے مطابق نہیں ہوا۔

سجی سنوری حجلۂ عروسی میں جب وہ تنہا رہ گئی تو احساس ہوا کہ خواب تو وہ تھا جو اُس نے پہلے دیکھا تھا اور حقیقت یہ ہے۔ ایک زخم خوردہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آٹھہری۔

دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شاید ٹھہر سا گیا تھا۔ اور آنکھیں تو گذشتہ کئی روز سے خشک ہو چکی تھیں۔ اس وقت ذہن بھی خالی تھا۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی خیال۔ بس کچھ تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ تکیے کے سہارے کمر سیدھی کرنا ہی چاہتی تھی کہ دروازے سے باہر آہٹ سُن کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھُلنے اور پھر بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی سویا ہوا ذہن اور ٹھہرا ہوا دل بیدار ہونے لگا۔ پھر قدموں کی آواز گو کہ کارپٹ پر واضح نہیں ہو رہی تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ اپنی طرف بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ربیعہ۔" آنے والے نے اُسے پکارا نہیں تھا بلکہ اُسی انداز سے اُس کا نام لیا جیسے اپنی یادداشت کا امتحان مطلوب ہو۔ پھر بھی اُس کے وجود میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی اور وہ ان کی اگلی کسی بات کا انتظار کرنے لگی۔

کتنے ہی لمحے یونہی چپ چاپ سرک گئے۔ پھر وہ کہنے لگے۔

"ان اوّلیں لمحوں میں غالباً رونمائی کی بات ہوتی ہے اور دینے والا یقیناً اپنی رفیقِ سفر کے لیے ایسی چیز منتخب کرتا ہے جو اُس کے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ اور لینے والا بھی یہ توقع ضرور رکھتا ہو گا کہ کوئی ایسی چیز ہو، جو اچانک ہی اُسے بے پناہ خوشیوں کا احساس بخش دے۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے اور اس کے اندر تو ویسے بھی کوئی ہلچل نہیں مچی تھی اور اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے نہ معلوم سناٹے اس کے اندر گھر کرتے جا رہے ہوں۔

"ربیعہ بیگم۔ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے والی چیز ضرور منتخب کرتا اگر جو۔ خیر چھوڑیں۔" انہوں نے اُس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا پھر جیب سے ایک لفافہ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے

"البتہ آپ کو بے پناہ خوشی سے ہمکنار کرنے والا تحفہ ضرور ہے میرے پاس۔ یہ لیجیے۔"

اُس نے فوراً ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس ذرا سی پلکیں اٹھا کر اُن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیجیے ربیعہ۔ یہ آپ کے لیے ہے۔" اُس نے لفافہ لے کر چاہا کہ اُسے کنارے رکھ دے لیکن وہ کہنے لگے۔

"اگر آپ اسے اسی وقت دیکھ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔" اپنی بات کہہ کر وہ رُخ موڑ کر قدرے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔ اُس نے کچھ جھجکتے ہوئے سر اونچا کیا اور نظروں کا زاویہ بدل کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف پُشت کیے کھڑے تھے۔ وہ اُلجھنے لگی۔

پتا نہیں۔ یہ سب کیا ہے؟" اُس نے سوچا اور یوں ہی اُلجھتے ہوئے لفافہ کھول کر اُس کے اندر سے نکال لیا۔ تہہ شدہ کاغذ کھولنے سے پہلے ایک بار پھر اُن کی طرف دیکھا وہ اسی طرح کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اگلے پل گہرا دھواں اُس کے آس پاس پھیلنے لگا۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے وہ کاغذ کھول کر دیکھنے لگی۔ اُسے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔

"ربیعہ میری زندگی!

ہم دونوں کے درمیان کبھی خط و کتابت تو ہوئی نہیں تھی اس لیے یقیناً میری تحریر تمہارے لیے اجانی ہوئی۔ بھئی میں ہوں ثاقب حسن۔"

ثاقب حسن۔ اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور سارے احساسات ایک ساتھ پیدا ہو گئے۔ آنکھوں میں غیر یقینی سمٹ آئی، دل جو کچھ دیر پہلے تک ٹھہرا ہوا تھا، اس زور سے دھڑکا کہ شبہ ہوا اُس کی آواز قدرے فاصلے پر کھڑے شہروز احمد نے بھی سُنی ہو گی۔ جب ہی وہ فوراً ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ پھر اُن کی پُشت سے ٹکرا کر نظریں دوبارہ کاغذ پر دوڑنے لگیں۔ آگے لکھا تھا۔

تم حیران ہو رہی ہو۔ ہاں یہ حیرت کی بات تو ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔

میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تم میری امانت ہو اور میں تمہارا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔ تو اب بھی تم اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ ہاں تم شہروز احمد کے پاس میری امانت ہو۔ نہیں سمجھیں بیوقوف لڑکی، میں سمجھاتا ہوں۔

"میں نے اماں اور انیلا کو تمہارے گھر بھیجا تھا لیکن وہی ہوا جس کا تمہیں ڈر تھا یعنی تمہاری اماں نے صاف انکار کر دیا۔ اُس دن مجھے بے حد دُکھ ہوا اور یہ خیال کہ اب میں تمہیں کبھی نہیں پا سکوں گا۔ مجھے زندگی سے دُور لے جانے لگا۔ اور میں سارے حوصلے ہار کر صرف گھر کا ہو رہا۔ مجھے لگا جیسے اب میری زندگی میں کوئی مقصد نہ رہ گیا ہو۔ مجھے کسی پل قرار نہیں تھا۔ تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں تم نے کالج چھوڑ دیا۔ کتنے دن تک تو میں بس تمہاری راہ دیکھتا رہا تھا۔ پھر ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک دن میں اماں کے سامنے رو پڑا۔ کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے میرے اندر حوصلہ پیدا کرنا چاہا لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک تمہارے ملنے کی اُمید نہ ہو گی، میں کچھ نہیں کر سکوں گا اور یہ حقیقت ہے کہ تمہارے ملنے کی آس کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اماں کا خیال تھا کہ مجھے دوبارہ بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور میں نے سوچا ایسا نہ ہو، میں جدوجہد ہی کرتا رہوں اور اس عرصے میں تم کسی اور کی ہو جاؤ اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، جب میں کسی قابل ہو جاؤں خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ کیوں نہ لگے جب واپس آؤں تو تم میری منتظر ہو اور ایسا کوئی عہد تم نے میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ربیعہ بلکہ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اندھیرے میں نہیں رکھا تھا۔ بہرحال میں نے سوچا اگر تم اپنے والدین کے گھر رہیں تو کبھی بھی میرا انتظار نہیں کر سکو گی۔ اس لیے میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔

تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟۔ اگر نہیں تو میں تمہیں بتاؤں کہ شہروز احمد میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ دوست کم محسن۔ ایک بار پہلے بھی یہ مجھ پر احسان کر چکے ہیں، خیر اُس کی تفصیل تو بعد میں کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت ان کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر تمہیں اپنایا۔ تم اس وقت تک میری امانت کے طور پر ان کے گھر رہو گی جب تک کہ میں تمہاری والدہ کے معیار کے مطابق بڑا آدمی بن کر نہ لوٹ آؤں۔ گو کہ شہروز احمد اس بات کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن میں نے بڑی مشکل سے انہیں آمادہ کیا۔ تمہیں ان کے گھر کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ تم اطمینان سے رہنا اور نہ صرف میرے حوالے سے خواب سجانا بلکہ آس کے دیپ بھی جلا رکھنا۔

تم اور بھی بہت کچھ جاننا چاہو گی تو اُس کے لیے صبح کا انتظار کرو۔ صبح میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اس وقت اتنی ـــــ باتیں بتا دینی یوں ضروری سمجھیں کہ کہیں تم شہروز احمد کے رویے سے پریشان

نہ ہو جاؤ۔ ویسے شہروز کا اصرار بھی تھا کہ میں تمہیں اتنا ضرور بتا دوں کہ ان سے تمہارا نکاح ضرور ہوا ہے لیکن تم اُن کی بیوی نہیں ہو۔ باقی باتیں صبح کریں گے۔

تمہارا ثاقب"

خط پڑھنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ گو کہ اُس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

شہروز احمد ہلکے سے کھنکارے تو وہ چونک گئی۔ اُسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرتے ہوئے خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈالا اور کچھ ڈرتے ڈرتے ذرا سی گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ اور سامنے بیٹھا شخص کوئی عام سا شخص نہیں تھا۔ کوئی ایسی بات اس میں تھی جس نے اس کے احساسات پر برف کی تہیں جما دیں۔ اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے کھو سی گئی۔

جانے اُس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ جب بھی کوئی منفرد شے نظر آئی، وہ کھو گئی۔ کبھی ایسے مقام پر اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہزار کوشش کرتی کہ نظروں کا زاویہ بدل لے یا پلکیں جھپکا لے لیکن کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ شہروز احمد اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ کوئی میگزین ہاتھ میں لیے، اُسی میں مگن تھے لیکن جب پیشانی پر بے نام سی تپش محسوس ہوئی تو فوراً سر اونچا کر کے دیکھا اور اُسے یوں کھوئے کھوئے انداز میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر جانے کیا سمجھے۔ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔

"یقین کریں اس سارے قصّے میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو سرے سے مان ہی نہیں رہا تھا لیکن ثاقب۔"

"ہاں ثاقب۔" وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ سر کو ہلکے سے جھٹکا دیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

"میں شاید مزید اس سلسلے میں کچھ نہ کہہ سکوں۔" انہوں نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور سُلگانے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے، تو کہنے لگے۔

"آپ کے دائیں طرف ڈریسنگ روم ہے اور اُدھر باتھ روم۔ اس طرف میرا اسٹڈی روم ہے۔ میں اُدھر میں جا رہا ہوں۔ آپ ریلیکس ہو جائیں۔" پھر جاتے جاتے کہنے لگے۔ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا کوئی اور بات ہو تو میرا دروازہ ناک کر دیجیے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بہت خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اور جب انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تو اُس نے طویل سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کیا۔ پھر فوراً مسہری سے اتر آئی۔ ڈریسنگ روم میں جا کر پہلے زیور اتارے پھر ڈریس چینج کر کے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

وہاں سے نکلی تو باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر جب کمرے میں آئی، تو پہلے یہ اطمینان کیا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا پھر بیڈ پر لیٹ گئی۔ نیند نہیں آ رہی تھی اور کچھ فریش بھی ہو گئی تھی اس لیے اس ساری صورتحال کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی خاطر پہلے ثاقب حسن کا خط نکال کر دوبارہ اطمینان سے پڑھنے لگی۔ اب کچھ کچھ باتیں اُس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ پھر بھی کچھ اُلجھنیں ضرور چھوڑ گئیں جنہیں سُلجھاتے سُلجھاتے وہ تھک گئی تو اپنے آپ کو اطمینان دلایا۔

"صبح ثاقب حسن آئے گا تو اُس سے پوچھ لوں گی۔"

"کیا واقعی وہ صبح آئے گا؟"

صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اُٹھی۔ حسب عادت پہلے نماز پڑھی۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سامنے وسیع لان تھا جس میں مختلف اقسام کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ کنارے لگی باڑھ میں رنگین قمقمے ابھی تک جگمگا رہے تھے۔ لیکن صبح کے اُجالے میں اُن کی روشنی قدرے ماند پڑ گئی تھی۔

موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ لان سے گزر کر پھولوں کی مہک چُراتی ہوئی ہوا اُس کے بدن سے ٹکرائی تو اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اُس کے باوجود اس نے گہری سانس لے کر تازہ ہوا اپنے اندر اُتار لی۔ یہ سارا

ظر بہت خوبصورت لگ رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اُس نے اتنا بڑا گھر خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کی سوچوں رسائی صرف اس حد تک تھی جیسا کہ بڑی آپا کا گھر تھا اور جب سے ثاقب حسن اُس کی سوچوں پر قابض ہوا تھا ب سے تو وہ بس اُس کی ہمراہی کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اُس کی سنگت میں چلتے ہوئے باقی ساری باتیں کہیں منظر میں چلی گئی تھیں۔ بس ایک چھوٹا سا گھر اور ثاقب حسن کا ساتھ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور اب یہاں کھڑے یر دُور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اُس نے سوچا۔

"زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پُرسکون ماحول۔ زندگی میں جدوجہد ہے لیکن یہ خوف نہیں کہ کل کیا ہو گا؟ آج اور آنے والی کل یقیناً اُن کی دسترس میں ہے۔ نہ فاقہ، نہ کوئی فکر، ب ہی تو کوئی ہلچل نہیں۔ یہ ہلچل، افراتفری اور بھاگ دوڑ تو ہم جیسے لوگوں کے نصیب میں لکھی گئی ہے۔"

دروازہ کُھلنے کی آواز پر اُس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ پلٹ کر دیکھا شہروز احمد اسٹڈی روم سے نکل رہے تھے۔

"السّلام علیکم۔" اُسے متوجہ دیکھ کر انہوں نے سلام کیا اور رُکے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے، تو وہ طویل انس لیتی ہوئی دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اُس نے شہروز کو لان میں داخل ہوتے دیکھا تو وہاں ے ہٹ آئی۔ معطر اور قدرے خنک ہوا نے اُس کے ہاتھوں اور چہرے کو سرد کر دیا تھا۔ وہ ہتھیلیوں کو بس میں رگڑ کر پھر اُن سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھی تو اسی وقت اس کی بڑی نند آ گئیں۔ ایسے وقت ری شرم آپ ہی آپ عود کر آتی ہے لیکن اُسے کیونکہ کوئی نیا احساس نہیں ملا تھا اس لیے وہ اسی طرح بیٹھی بے خیالی اُن کی طرف دیکھے گئی۔

"نئی زندگی کی نئی صبح مُبارک ہو۔" انہوں نے مُسکراتے ہوئے کہا تو اسے ایک دم احساس ہوا کہ اسے اس ح نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ فوراً سر جھکاتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔

"شکریہ۔"

"یہ شہروز کہاں چلے گئے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"غالباً لان میں نکل گئے ہیں۔"

"زندگی میں کچھ ہو جائے یہ بندہ اپنی روٹین کبھی تبدیل نہیں کرے گا۔" وہ شہروز احمد کے بارے میں کہتی ہوئی یسنگ روم میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو اُس کے کپڑے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"تم نہا کر یہ ڈریس پہن لو۔ میں ابھی آ کر تمہیں تیار کر دوں گی۔ سنو، اگر یہ پسند نہ آئے تو اپنی مرضی سے کوئی ر اسوٹ نکال لینا۔" وہ جاتے جاتے کہتی گئیں تو وہ بیڈ پر رکھے سوٹ کو دیکھنے لگی۔ شوکنگ پنک کلر شلوار سوٹ جس کے بڑے سے دوپٹے پر سنہرے کام کا جال بنا تھا۔

"میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ ہلکے سے بڑبڑائی اور وہی کپڑے اُٹھا کر باتھ روم میں گئی۔ نہا کر نکلی تو وہ اُس کی منتظر تھیں، اسے لے کر ڈریسنگ روم میں آ گئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے آئینے کے سامنے بٹھاتے ہوئے پہلے اُس کے بالوں میں برش کیا۔ پھر ڈرائیر سے خشک کرنے لگیں۔ وقت اس کی چھوٹی نند ندا دروازے میں سے جھانک کر پوچھنے لگی۔

"آپی۔ میں بھی آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔ میں ابھی تمہیں بُلانے ہی والی تھی۔" پھر ڈرائیر اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولیں۔ "تم نیچے سے اُس کے بال خشک کرو، میں میک اپ کر دیتی ہوں۔"

"بھابی۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔" ندا اس کے بالوں میں برش کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں گھنے بھی ہیں اور لمبے بھی۔" آپی نے تائید کی۔ پھر کسی ماہر بیوٹیشن کی طرح اس کا میک اپ کرنے ،۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اس کے بال بنائے پھر دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے ندا سے کہنے لگیں۔ جاؤ امی سے معلوم کرو ناشتے کے لیے دلہن کو وہیں لے آؤں یا یہیں بھجوا دیں گی۔"

ندا سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ تو آپی اُسے کمرے میں لے آئیں۔ اس نے دیکھا شہروز احمد صوفے پر بیٹھے اخبار

دیکھ رہے تھے۔ اس کی آمد کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا، جبکہ آپی نے اسے لے جا کر ان کے برابر بٹھا دیا۔ وہ خاصی نروس ہوئی۔ وزدیدہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے ہاتھ میں پکڑا اخبار رول کر کے اُس کے اور اپنے درمیان رکھ دیا

"بیٹھیں آپی۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟" وہ بہن کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میں ناشتے کا پتا کر لوں۔" آپی جانے لگیں تو اُسی وقت ندا ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ گئی۔ آپی نے اس کی مدد سے ناشتے کے تمام لوازمات ٹیبل پر رکھ دیے پھر ندا کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ شاید دونوں ہی اس انتظار میں تھے کہ پہلے وہ شروع کرے۔

"آپ کے لیے چائے بناؤں؟" طویل خاموشی سے گھبرا کر بالآخر وہ بول پڑی۔

"نہیں آپ ناشتا کریں۔ میں اپنا کام خود کروں گا۔"

اُن کا لہجہ بہت عام سا تھا پھر بھی اسے لگا جیسے وہ کچھ جتا رہے ہوں۔ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرتی ہوئی، بمشکل ایک سلائس لے سکی۔ اُس کے بعد چائے صرف اپنے کپ میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے اس کے اٹھنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اطمینان سے ناشتا کرتے رہے پھر خود ہی اپنے لیے چائے بنائی۔ ابھی دو گھونٹ ہی لیے تھے کہ اُن کا بھائی مہروز دروازے پر دستک دے کر چلا آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی خوامخواہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ مہروز نے مُسکراتے ہوئے اُسے آداب کہا پھر شہروز احمد سے کہنے لگا۔

"آپ کے کوئی دوست آئے ہیں ثاقب حسن۔"

شہروز براہِ راست اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اس کا دل جو ثاقب حسن کا نام سُنتے ہی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، اُن کے اس طرح دیکھنے سے ٹھہرنے لگا۔

"کیا کہوں اُن سے؟" مہروز پوچھ رہا تھا۔

"ہاں" وہ چونکے۔ "اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔" مہروز چلا گیا تو وہ اس سے پوچھنے لگے۔

"آپ اسی وقت ملیں گی اُس سے؟"

"کیا اس وقت مجھے اُس سے ملنا چاہیے؟" وہ اُلٹا اُن ہی سے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ اس وقت مناسب نہیں لگتا۔ میں اُس سے کہہ دیتا ہوں دو تین روز بعد۔" وہ اُٹھ کر چلے گئے اور اُسے یہ نئی صورتحال بڑی عجیب سی لگی۔ اپنی پوزیشن الگ خراب لگ رہی تھی۔

"اِس وقت ثاقب حسن کو نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ سوچنے لگی۔

"اس نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے اور شہروز احمد دیکھنے میں تو اچھے خاصے میچور لگتے ہیں۔ وہ اس کی باتوں میں کیوں آ گئے؟"

وہ ابھی اور اُلجھتی کہ آپی کے آنے سے اُس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ اُن کے پیچھے ملازمہ بھی تھی۔ انہوں نے ملازمہ کو ناشتے کے برتن لے جانے کے لیے کہا اور اس سے پوچھنے لگیں۔

"تم نے ناشتا ٹھیک طرح سے کیا ہے ناں؟"

"جی۔"

"شہروز کہاں چلے گئے؟"

"اُن کے کوئی دوست آئے ہیں۔"

"ہاں مہروز بتا تو رہا تھا۔ خیر تم آرام سے بیٹھو۔ ابھی لڑکیاں تمہارے کمرے میں آ رہی ہیں۔" وہ خاموشی سے بیڈ پہ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔

پھر دوپہر تک اُس کے کمرے میں خاصا ہلا گلا رہا۔ شہروز کی کزنز مسلسل وہیں ڈیرا جمائے ہوئے تھیں۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق۔ وہ غائب دماغی سے سب کو دیکھتی رہی۔ دوپہر میں کھانے کے بعد آپی نے سونے کی تاکید کی اور سب کو لے کر چلی گئیں۔

شام میں ولیمے کی تقریب کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔ اُس کے گھر سے بھی سب آئے ہوئے تھے۔ آف وائٹ بیش قیمت شرارہ سوٹ جس پر گولڈن کام کیا ہوا تھا۔ اُس پر بہت سج رہا تھا۔

جب اُسے مہمانوں کے سامنے اسٹیج پر بٹھایا گیا تو کتنے ہی تعریفی جملے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ لیکن وہ اس وقت خاصی پژمردہ تھی۔ دو متضاد کیفیات میں گھری ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ سمجھوتہ کر لیتی۔ گزشتہ ایک ماہ جلنے کُڑھنے کے بعد وہ ہتھیار تو ڈال ہی چکی تھی اور اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ ثاقب حسن اُس کے نصیب میں نہیں ہے۔ لیکن اب اس طرح آ کر اُس نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا اور اگر غیر جانبداری سے سوچتی تو ثاقب حسن کا یہ اقدام کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ غیر جانبداری سے سوچ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی ثاقب حسن کے لیے دل مچلتا اور کبھی اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگتی۔ مزید ستم یہ تھا کہ ابھی وہ اُس کی محبت کو مکمل طور پر دفن بھی نہیں کر پائی تھی۔ اس لیے زیادہ جھکاؤ اسی کی طرف تھا۔

امّی بار بار کسی نہ کسی خاتون کو لے کر آتیں اور اُس سے تعارف کرواتیں۔ کوئی شہروز کی پھوپھی، کوئی چچی، کوئی مامی۔ وہ بس ایک نظر اُٹھا کر سر جُھکا لیتی۔

"زندگی پڑی ہے ان رشتے ناتوں کو سمجھنے کی۔" اُس نے سوچا لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال۔

"مجھے کیا ضرورت ہے سب کو جاننے کی۔ میرا کون سا ناتا ہے ان سب سے؟"

پھر چھوٹی آپا اُس کے پاس آ بیٹھیں۔ اس کا دوپٹہ ٹھیک کرنے کے بہانے، قدرے اس کی طرف جُھک کر سرگوشی میں کہنے لگیں۔

"یوں منہ مت پُھلا کر بیٹھو۔ ولیمے کی دلہن ہو ایک شرمگیں مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر ہونی چاہیے۔"

"کہاں سے لاؤں شرمگیں مسکراہٹ۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"شہروز احمد کا تصور اور پھر اُن کی باتیں یاد کر لو۔ خوبصورت مُسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر سج جائے گی۔"

وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ شہروز کا کوئی کزن انہیں لے کر آ گیا اور پھر اُن دونوں کی تصویریں بنانے لگا۔

"یار اتنے اجنبی کیوں بنے کھڑے ہو؟ بھابی کے کندھے پر ہاتھ رکھو ناں۔" وہ کہہ رہا تھا اور جانے شہروز احمد نے اپنے کزن کا خیال کیا یا قریب کھڑے وجود سے اُٹھتی مہک نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا کہ بے اختیار اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ گئے۔ لیکن جیسے ہی وہ تصویر بنا چکا، وہ کسی سے ملنے کا بہانہ کر کے اسٹیج سے اُتر گئے تھے۔

ولیمے کی تقریب ختم ہوئی تو رواج کے مطابق اماں اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔

گھر آتے ہی اُس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو بھاری بوجھ سے آزاد کیا یعنی زیورات اتارے اور لباس تبدیل کیا۔ اس کے بعد بہنوں کے پاس آ بیٹھی۔ بڑی آپا کرید کرید کر اُس سے پوچھنے لگیں۔

"شہروز کیسے ہیں؟ تمہاری ساس اور نندیں؟"

"بڑی آپا۔" اُس نے ٹوکا۔ "ایک ہی دن میں میں کسی کو کیسے جان سکتی ہوں بھلا؟"

"کچھ اندازہ تو ہوا ہوگا؟"

"سب اچھے ہیں۔" اُس نے جان چُھڑائی۔

پھر رات اور اگلا سارا دن اُس نے یہیں گزارا۔ شام میں اُس کے سسرال سے کافی لوگ اسے لینے آئے۔ اُسی وقت کلثوم اور ہُما نے شہروز کا جوتا چُھپا کر ان سے اچھی خاصی رقم وصول کر لی۔ چھوٹی آپا البتہ الگ تھلگ سی تھیں۔ زیادہ مہمانوں کے سامنے آئی ہی نہیں تھیں۔ پھر کھانے کے بعد وہ سب کے ساتھ دوبارہ اُسی گھر میں آ گئی، جسے وہ اپنا گھر نہیں کہہ سکتی تھی۔

امّی کو احساس تھا کہ شہروز احمد گذشتہ کئی سالوں سے گھر کی ذمّہ داریوں اور آفس کے کاموں میں مسلسل اُلجھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ ہنی مون کے بہانے وہ کہیں گھومنے پھرنے چلے جائیں تاکہ جو مسلسل کام سے تھکا تھکا سا ہے، اُسے کچھ آرام ملے اور وہ ریلیکس ہو جائیں۔ انہوں نے شہروز سے کہا، انہوں نے وہی کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے ٹالنا چاہا۔

"اسی لیے تو میں چاہتی ہوں، کہیں گھوم پھر آؤ۔ مسلسل کام سے تمہاری صحت متاثر ہو رہی ہے۔" امّی نے زور دیا۔

"میری صحت کو کیا ہوا؟۔ ٹھیک تو ہے۔"

"کہاں ٹھیک ہے؟۔ ہر وقت تھکے تھکے سے نظر آتے ہو۔ اور پھر ربیعہ کی بھی خواہش ہوگی۔ تم اُسے لے جاؤ۔"

"لیکن امّی۔ یہاں آفس کا کیا ہوگا؟"

"مہروز ہے ناں۔ اب تو ماشاءاللہ وہ سب سمجھنے لگا ہے۔ میرا خیال ہے وہ آفس کے معاملات کو سمجھتا ہے۔"

"سمجھتا تو ہے لیکن۔" انہوں نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

"بس میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ تم ربیعہ سے پوچھ لو۔ جہاں وہ کہے وہیں کا پروگرام سیٹ کر لو۔"

امّی سے مزید بحث کرنا فضول تھا۔ کیونکہ وہ حکم صادر کر چکی تھیں۔ اس لیے وہ خاموش ہو رہے لیکن اندر ہی اندر خاصے جُز بُز ہوئے۔ انہوں نے سوچا وہ ربیعہ سے کہیں گے، وہی امّی سے کوئی بہانہ کر دے کیونکہ امّی اُن کا تو کوئی عذر ماننے کو تیار نہ تھیں۔

رات میں جب وہ کمرے میں آئے، تو وہ صوفے پر بیٹھی اپنے ہی کسی خیال میں گُم تھی۔ انہوں نے ہلکے سے کھانس کر اُسے متوجّہ کیا پھر کہنے لگے۔

"اگر آپ فوراً سونے کا ارادہ نہیں رکھتیں، تو میں آپ سے کچھ بات کر لوں۔" اُس نے ذرا سا سر اونچا کر کے ان کی طرف دیکھا پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ تو گئے لیکن پھر سمجھ میں نہیں آیا اس سے کیا کہیں، جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور سُلگانے کے بعد بھی خاموش رہے۔ یوں لگا جیسے وہ صرف سگریٹ پینے کے لیے یہاں بیٹھے ہوں۔ اور وہ منتظر تھی۔ کِسی کِسی وقت ان کی طرف دیکھ بھی لیتی تھی۔ لیکن پوچھا نہیں کہ وہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا، وہ ثاقب حَسن کے بارے میں کوئی بات کریں گے۔ لیکن جب وہ بولے تو امّی کی خواہش کا بتانے لگے۔

"امّی کا اصرار ہے کہ ہم کچھ دنوں کے لیے مری سوات وغیرہ چلے جائیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ "میں ایسا نہیں چاہتا اور میں نے امّی کے سامنے بہت عذر تراشنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہیں سُنی۔ اگر آپ کسی طرح۔" اُس کے خاموشی سے دیکھنے پر کڑبڑا گئے۔ "میرا مطلب ہے آپ امّی کے سامنے کوئی بہانہ کر سکیں تو۔"

"یہ ساری صورتحال میری اپنی سمجھ سے باہر ہے شہروز احمد۔" وہ اُلجھ کر بولی۔

"آپ کی اُلجھن کا ذمّہ دار میں نہیں ہوں۔" وہ قطعیت سے بولے۔

"آپ اپنے آپ کو بری الذمّہ قرار نہیں دے سکتے۔"

"کیا مطلب؟۔ آپ مجھے الزام دے رہی ہیں؟۔"

"میرے الزام دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے شہروز احمد۔ آپ اپنے آپ سے پوچھیں کہ جو کچھ آپ نے کیا، وہ صحیح ہے؟۔"

"میں مانتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے لیکن ثاقب حَسن کے پاس غالباً اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا

"ہونہہ۔" اُس کے حلق سے ایک ٹوٹی ہوئی سی آواز نکلی اور وہ سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے۔

"میں نے سُنا تھا محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، اب دیکھ بھی لیا۔ اور آپ اتنی مایوس کیوں ہیں؟۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ثاقب حَسن نے یہ سب آپ کی محبت میں کیا۔ آپ کو پانے کی خاطر۔"

"کیا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ کہ مجھے زبردستی آپ کے سر پر مسلّط کر دے۔ وہ یہ کیوں بھول گیا کہ جس بندھن میں، میں بندھی ہوں، اُس کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں جو دُنیاداری کے لیے تو بہرحال نبھانے ہی پڑیں گے۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ اس انداز سے مت سوچیں کہ ہم پہ مسلّط کی گئی ہیں۔ ثاقب حَسن میرا دوست ہے اور اگر اُس نے اپنی کوئی امانت میرے پاس رکھ چھوڑی ہے تو اُس کی حفاظت میرا فرض ہے۔"

"میں کوئی بے جان شئے نہیں ہوں شہروز احمد۔ جسے آپ لاکر میں بند کر دیں کہ ثاقب حسن آئے گا تو اُسے واپس کر دیں گے۔ جیتی جاگتی انسان ہوں اور زندہ رہنے کے لیے ایک انسان کی کیا ضروریات ہوتی ہیں، یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے۔" وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولے۔ "تو آپ اس وجہ سے پریشان ہیں لیکن یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کے مراحل سے گزرتے ہوئے، میں نے آپ کے نان نفقے کی ذمّہ داری بھی قبول کی ہے۔" اُس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگے۔ "بہرحال آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہوگا۔"

"میری خواہش کے مطابق؟۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ کیا آپ کو ثاقب حَسن کی ہمراہی کی خواہش نہیں تھی؟"

"تھی۔ لیکن اس طرح نہیں۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہی بات میں نے ثاقب حسن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اپنی محبت کو پانے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی محبت کو کہیں دفن تو کر سکتی ہے لیکن۔" اُس پر نظر پڑی تو انہوں نے اپنی بات وہیں روک لی۔ وہ پلکیں جھپکتے ہوئے آنکھوں میں اُترتی نمی شاید اپنے اندر اُتار رہی تھی۔

"ربیعہ۔" وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولے۔ "میں تو یہی کہوں گا کہ اب جو ہو چکا ہے اُس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں۔" پھر اسٹڈی روم کی طرف جاتے ہوئے جیسے اچانک کوئی بات یاد آئی تو پلٹ کر کہنے لگے۔

"سنیں۔ کل آپ کو ثاقب حَسن سے ملنا ہے۔" اپنی بات کہہ کر وہ رُکے نہیں۔ فوراً دروازہ کھول کر اسٹڈی میں داخل ہو گئے۔ اور وہ کتنی دیر تک سُن سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

صبح وہ آفس جانے سے پہلے اُس کے ساتھ دوبارہ کمرے میں آئے، ورنہ تو ناشتے کے بعد وہیں سے چلے جایا کرتے تھے۔ اُس نے انہیں دیکھ کر قدرے حیرت کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے۔

"میں نے امّی سے کہہ دیا ہے کہ آج لنچ پر ہم کہیں انوائیٹڈ ہیں۔ گیارہ بجے آپ تیار رہیے گا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھی۔

"ارے۔" وہ حیران ہوئے۔ "کیا آپ کو یاد نہیں رہا، رات میں نے کیا کہا تھا کہ آج آپ کو ثاقب حَسن سے ملنا ہے۔" اس کے نظریں چُرانے پر کہنے لگے۔ "ثاقب آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ ویسے بھی آج کل میں وہ باہر جانے والا ہے۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ کوئی تبصرہ کیا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس

آئی تو وہ موجود نہیں تھے۔

پھر گیارہ بجے تک کا وقت اُس نے بہت اضطراری کیفیت میں گزارا۔ متضاد کیفیات میں تو وہ اوّل روز ہی گھِر گئی تھی اور آج تو وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بے بس محسوس کر رہی تھی۔ دل ثاقب حسن سے ملنے پر اصرار کر رہا تھا اور دماغ سرزنش۔ ہو سکتا ہے وہ دل کو دماغ کے تابع کر لیتی لیکن حالات اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

گیارہ بجے امّی خود اُس کے کمرے میں آ کر کہنے لگیں۔

"بیٹا۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ شہروز کہہ کر گئے تھے کہ تم دونوں کو کہیں جانا ہے۔" اُس نے سوچا سردرد کا بہانہ کر کے منع کر دے لیکن امّی بڑے اصرار سے کہہ رہی تھیں۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ڈرائیور گاڑی لے کر آتا ہی ہوگا۔" وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے تیاری میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ویسے بھی اُس نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ ہلکے رنگ کا پلین سوٹ اور میک اَپ کے نام پر صرف لپ اِسٹک لگائی تھی۔ کمرے سے نکلی تو امّی اُسے دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

"بیٹا۔ اس طرح جاؤ گی؟"

"جی؟" اس کا 'جی' اثبات بھی تھا اور سوالیہ بھی۔

"بُری بات ہے ابھی تو نئی دلہن ہو۔ جاؤ کوئی اچھا سا سوٹ پہن لو۔ اور تم نے کوئی زیور بھی نہیں پہنا؟"

"ٹھیک تو ہوں امّی۔"

"ٹھیک نہیں ہو۔ اچھا اگر کپڑے نہیں بدلنا چاہ رہیں تو زیور ضرور پہن لو۔"

وہ چپ چاپ دوبارہ اندر چلی گئی۔ بھاری زیور کے بجائے اُس نے ہلکا سا سیٹ پہن لیا۔ پھر جب باہر آئی تو ڈرائیور گاڑی لے کر آ چکا تھا۔ اُس نے امّی کو اپنے جانے کا بتایا اور باہر نکل آئی۔

گاڑی کچھ جانے پہچانے اور کچھ انجانے راستوں پہ دوڑتی ہوئی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رُکی تو وہ قدرے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"صاحب اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ڈرائیور نے اُسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"کون صاحب؟" بے خیالی میں اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"جی۔ اپنے شہروز صاحب۔"

"ہاں۔ اچھا۔" وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوئی گاڑی سے اُتر آئی۔ پھر اُس نے ڈرائیور سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ یہیں رُکے گا یا واپس جانے کا۔ تیز قدموں سے چلتی ہوئی شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایک دم نروس ہو گئی۔ کچھ جھجکتے ہوئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں سب سے آخری ٹیبل پر ثاقب حسن بیٹھا نظر آیا۔

اتنے دنوں بعد اُسے دیکھ رہی تھی۔ فوری طور پر ہر بات ذہن سے نکل گئی۔ بس وہی یاد رہا اور ابھی یہاں آنے سے پہلے وہ جو دل کو دماغ کے تابع کرنا چاہتی تھی۔ اب پورا وجود دل کے تابع ہو گیا تھا۔ قدموں کو بے اختیار اُس کی طرف بڑھنے سے کسی طرح نہ روک سکی۔ بلکہ شاید اس نے دوبارہ سانس بھی اُس کے قریب جا کر ہی لیا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"ہیلو مسز شہروز احمد۔" ثاقب حسن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جبکہ اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور اُس کے روکتے روکتے بھی وہ رو پڑی۔

"بیوقوف۔ یہ کیا کر رہی ہو؟" وہ پریشان ہوا اور دبی دبی آواز میں اُسے رونے سے منع کیا تو اُس نے سارے آنسو رومال میں جذب کر لیے۔

"یہ بتاؤ۔ کھانے سے پہلے کیا لو گی؟" وہ اُس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے پوچھنے لگا پھر اُس کا جواب سُنے بغیر ویٹر کو بُلا کر کولڈ ڈرنک لانے کے لیے کہا پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سنجیدگی سے بات

کرنے لگا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ تمہارے حصول کے لیے میں کچھ بھی کر گزروں گا۔"

"لیکن مجھے تمہارا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔" وہ فوراً بول پڑی۔

"پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کرتا۔؟ فوری طور پر دولتمند بن نہیں سکتا تھا اور میری موجودہ پوزیشن تمہاری والدہ کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ پھر ایک یہی راستہ میری سمجھ میں آیا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا تاکہ دونوں مل کر اس مسئلے کا کوئی حل سوچیں لیکن میں تمہاری راہ دیکھتا رہا اور تم پھر لوٹ کر اس راستے پر نہیں آئیں، جہاں میں گھنٹوں تمہارے انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔"

"اماں کو جانے کیا شبہ ہوا کہ انہوں نے اسی دن میرا کالج چھڑا دیا جس دن تمہاری آماں اور انیلا آئی تھیں۔"

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور پھر اپنے طور پر میں نے جو سوچا اُس پر عمل بھی کر ڈالا۔ یقین کرو میں نے بہت مشکل سے شہروز احمد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ تم سے نکاح کر لیں۔ وہ تو کسی طرح مان ہی نہیں رہے تھے۔ بلکہ پہلی بار تو میری بات سُن کر وہ ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔ اُنہیں میری ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔ بہرحال پورا ایک ہفتہ لگا اُنہیں اس بات پر راضی کرنے میں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"میں کیا کرتا ربیعہ؟۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال کہ تم میری نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے میری زندگی چھین رہا تھا۔"

"اب بھی تو میں تمہاری نہیں ہوں۔"

"ہو نہیں۔ لیکن یہ اطمینان تو ہے کہ میری ہو جاؤ گی۔ اور یقین کرو جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں مل گیا تھا، تب تک میں ہر بات سے بیگانہ تھا بلکہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ بس یہی کسر رہ گئی تھی کہ لوگ ہاتھوں میں سنگ اٹھا لیتے۔" اپنی آخری بات پر شاید وہ محظوظ ہوا تھا کہ ہلکے سے ہنس دیا جب کہ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی، پوچھنے لگی۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟۔"

"میں اسی ہفتے کسی بھی دن چلا جاؤں گا۔ میرا سب کام اوکے ہو گیا ہے، بس سیٹ اوکے کروانے کی دیر ہے۔"

"پھر آؤ گے کب؟۔"

"بہت جلد۔ میرا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ دو سال۔"

"دو سال۔" وہ ہول کر بولی۔

"دو سال پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے ربیعہ۔"

"تمہارے لیے۔ اس لیے کہ تم ہر فکر سے آزاد ہو کر جا رہے ہو۔ میرے بارے میں سوچا ہے کہ میری پوزیشن کتنی آکورڈ ہے۔"

"کیا مطلب؟۔" اُسے جیسے اُس کی بات سمجھ نہ آئی تھی۔

"ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا جس سے میرا کوئی ناتا نہیں، آسان ہے کیا؟۔ اور پھر کیا سوچیں گے شہروز احمد کہ میں اُن کے گھر میں رہ کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اور اگر شہروز کے علاوہ کسی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو؟"

"تم خوامخواہ اندیشوں میں مت گھِرو ربیعہ۔" وہ اُسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ بات ہم تینوں کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ اور نہ ہو گی۔ میں تمہاری خاطر جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"میں نے شہروز احمد سے بات کر لی ہے۔ میری واپسی سے دو تین مہینے قبل وہ تمہیں طلاق دے دیں گے پھر میں یہاں آتے ہی تم سے شادی کر لوں گا۔" اُس کے خاموشی سے دیکھنے پہ کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے، اُس وقت تمہاری اماں انکار نہیں کریں گی کیونکہ ایک تو میں ان کے معیار ـــــ کے مطابق بن کر آؤں گا۔ دوسرے اُنہیں اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش ہو گی۔"

"محبت اندھی ہوتی ہے، یہ تو سُنا تھا لیکن کوئی محبت میں اس حد تک جا سکتا ہے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" وہ افسردگی سے مُسکرائی۔ "ثاقب حسن۔ میرے ماتھے پر طلاق کا لیبل لگتے ہی جو افسانے بنیں گے، اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بیوقوف۔ یہ سب وقتی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر بہت جلد لوگ بھول بھی جاتے ہیں اور جب ہم دونوں خوش و خرم زندگی گزاریں گے تو وہی لوگ جو باتیں بنائیں گے، پھر ہماری زندگی پر رشک کریں گے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"شاید نہیں یقیناً۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ۔ ان دو سالوں میں، میں کیا کروں؟" اور جواب میں اُس نے وہی باتیں دہرائیں جو اکثر اُس کے پوچھنے پر کہا کرتا تھا۔

"تم تو بس اتنا کرنا میری جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سجانا اور تمہاری آنکھوں میں جو میں نے محبتوں کے دیپ جلائے ہیں، انہیں یوں ہی جلائے رکھنا۔ میں واپسی میں انہی جلتے دیپوں کی روشنی میں تمہیں تمہارے خوابوں کی تعبیر دوں گا۔ حسین تعبیر۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ثاقب حسن کا وعدہ۔ جو تمہاری قسم تمہارے بنا زندگی کو زندگی نہیں سمجھتا۔"

ثاقب حسن کا محبتوں سے چُور لہجہ اُسے اپنی گرفت میں لے گیا۔ ویسے بھی اُس نے اپنی کتابِ زندگی کے اس باب کو بند نہیں کیا تھا جو دوبارہ کھولنے کی ضرورت پڑتی۔ ہر ورق سامنے تھا اور ہر لفظ واضح۔

"سنو۔" وہ کہنے لگا۔ "شہروز احمد کی طرف سے کسی اندیشے میں گرفتار مت ہونا۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ تم پر کسی بات کو جتائیں گے نہیں۔ ویسے تم کوشش کرنا کہ زیادہ تر وقت اپنی ماں کے گھر رہو۔ لڑکیاں میکے جاتی ہی رہتی ہیں۔ تم بھی کسی نہ کسی بہانے چلی جایا کرنا۔"

"ہاں۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے۔"

"بس تو میں امید رکھوں کہ اب تم آزردہ نہیں ہوگی۔ شہروز بتا رہے تھے کہ تم بہت اُلجھی ہوئی سی نظر آتی ہو۔"

"اُلجھن تو تھی اور شاید اب بھی ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گی کہ ان حالات سے سمجھوتہ کر سکوں۔" پھر کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔ "میں واپس کیسے جاؤں گی؟"

"میرا خیال ہے شہروز خود لینے آئیں گے بلکہ تم بیٹھو، میں دیکھ کر آتا ہوں کہ آئے یا نہیں۔"

وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر کہنے لگا۔

"شہروز آ چکے ہیں۔ تم جاؤ، میں کچھ دیر بعد یہاں سے نکلوں گا۔" پھر بہت آہستگی سے اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "دو سال کے لیے خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ بس لمحہ بھر کو اُس کی طرف دیکھ سکی پھر فوراً اُٹھ کر چلی آئی۔

شہروز احمد گاڑی لیے منتظر تھے۔ وہ بہت خاموشی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اُن کے برابر بیٹھ گئی اور وہ بھی اُسی خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر لے آئے۔

"آپ نے کیوں زحمت کی؟ ڈرائیور کو بھیج دیتے۔" وہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹھہری نمی ٹشو پیپر میں جذب کرتی ہوئی بولی۔

"ارے۔" وہ حیران ہوئے۔ "آپ تو واقعی خاصی بیوقوف ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ڈرائیور سے میں نے یہ کہہ کر آپ کو لینے بھیجا تھا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ اب اگر وہ گاڑی لے کر آتا تو آپ کی تنہا واپسی مشکوک نہ ہوتی۔ ویسے بھی اس وقت امی کے سامنے ہم دونوں کو ساتھ جانا چاہیے ورنہ پتا نہیں وہ کیا سمجھیں۔"

اُن کی وضاحت پر وہ اپنی احمقانہ بات پر دل ہی دل میں خاصی نادم ہوئی، اس لیے کچھ کہہ نہ سکی۔

"میرا خیال ہے ثاقب نے آپ کو ٹینشن سے نکال لیا ہو گا۔ اور اب آپ مجھے قصوروار نہیں سمجھیں گی۔" وہ کیسٹ آن کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"قصوروار کوئی بھی نہیں ہے۔ میں خود ہوں۔" اُس نے کہا۔ اور رُخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئے، وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی اور دوسرا کوئی موضوع تھا بھی تو وہ اُس سے کیا بات کرتے، اس لیے بقیہ راستہ خاموشی میں کٹا۔

ثاقب حسن چلا گیا۔ جس روز وہ جا رہا تھا، اُس روز اُس نے اپنے جانے کی اطلاع اُسے فون پر دی۔ وہ بہت آزردہ ہو رہا تھا۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"ربیعہ۔ کاش میں حالات کا شکار نہ ہوتا یا پھر تمہارے گھر والے مجھے اپنے ہی جیسا سمجھ کر قبول کر لیتے تو ہمارے درمیان یہ وقتی دُوری بھی حائل نہ ہوتی۔ میں یہیں تمہارے آس پاس رہ کر بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرتا۔ یا پھر کہیں جاتا بھی تو تم میرے ساتھ ہوتیں۔"

اُس کے ٹوٹتے لہجے پر ربیعہ کا دل دُکھنے لگا تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں بہت زیادہ مسائل میں گھرا ہوا ہوں۔ لیکن مسائل ہمیشہ تو نہیں رہتے ناں بالآخر جدوجہد انہیں مات دے ہی دیتی ہے اور اب جبکہ میں بھی اپنے مسائل کو مات دینے جا رہا ہوں تو پتا نہیں کیوں بجائے خوش ہونے کے میرے اندر اداسیوں کے موسم گھر کرتے جا رہے ہیں۔"

"تم اپنے گھر سے دُور جا رہے ہو ناں اس لیے۔" اُس نے کہا تھا۔

"گھر سے نہیں ربیعہ، تم سے۔ تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں بھی تمہیں یاد کروں گی لیکن اپنے آس پاس شہروز احمد کو محسوس کر کے اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ لیکن آنکھوں میں اُترتے پانی کو نہیں روک سکی تھی۔ جس نے اُس کی پلکوں کو بھی نم کر دیا تھا۔

"تم رو رہی ہو۔؟" اُس کی خاموشی محسوس کر کے وہ پوچھنے لگا تھا۔

"نہیں تو۔" آواز میں آنسوؤں کی آمیزش شامل تھی۔

"پلیز ربیعہ، رونا مت۔" اُس نے فوراً ٹوکا۔ "ورنہ میں بہت ڈسٹرب رہوں گا۔"

اُس نے پلکوں پر اُتری نمی اُنگلیوں کی پوروں پر سمیٹ لی تھی۔ اور جب ریسیور رکھ کر وہ پلٹی تو شہروز صوفے پر بیٹھے اپنی کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ وہ حقیقتاً اُس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ لیکن اُسے لگا جیسے اُن کا روم روم اُس کی طرف متوجہ ہو۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اور اسی شام اس نے شہروز احمد سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر جانا چاہتی ہے۔ اُنہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے امی سے ذکر کیا اور پھر اُن کی اجازت سے خود اُسے اماں کے گھر چھوڑ گئے تھے۔

آج تیسرا دن تھا اسے اماں کے گھر آئے ہوئے اور یہاں کیونکہ آس پاس شہروز احمد موجود نہیں تھے، اس لیے اُس کی سوچوں پر صرف ثاقب حسن قابض تھا۔ گذشتہ تین دنوں سے وہ نہ صرف اس کی سنگت میں گزرے لمحات کو سوچتی رہی تھی بلکہ آئندہ کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچ ڈالا تھا۔ اِس وقت بھی وہ برآمدے میں تنہا تھیں بیٹھی تھی۔ چھوٹی آپا رات کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ کلثوم اور ہما اندر پتا نہیں کس کام میں مصروف اور اماں مغرب کی نماز پڑھنے کی غرض سے ابھی اُس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔

آنگن میں لمحہ بہ لمحہ اُترتا اندھیرا ملگجے سے اُجالے کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے سردی اپنے عروج پر تھی۔ ابھی جاتے ہوئے اماں اُس سے کہہ کر گئی تھیں کہ وہ بھی اندر چلی جائے لیکن اُسے یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ تخت پوش پر ٹانگوں کو ذرا سیدھا کر کے اُس نے چادر سے پیروں

پر ڈال لی اور پشت دیوار کے ساتھ لگائی تو ایک سرد لہر پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کے باوجود وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ آس پاس یادوں کے جگنو چمکے تو وہ ہر شے سے بے گانہ ہوگئی۔ پلکیں ایک دوسرے سے گلے کیا ملیں کہ وہ خواب جزیروں میں بھٹکنے لگی۔

چھوٹی آپا کچن سے نکل کر آئیں تو اُسے یوں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گئیں۔ پہلے وہ یہی سمجھیں کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی ہے لیکن جب غور کیا تو اُس کی پلکیں ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں اور وہ جانے کس کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی کہ ہونٹ دلکش مُسکراہٹ کی گرفت میں تھے۔ چھوٹی آپا نے اُس کا یہ روپ کچھ دیر تک دلچسپی سے دیکھا۔ انہیں قدرے حیرت بھی ہو رہی تھی کیونکہ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، وہ افسردہ اور اُلجھی ہوئی نظر آئی تھی اور اس وقت وہ پہلی بار اُس کے چہرے پر اطمینان اور ہونٹوں پہ خوبصورت مُسکراہٹ دیکھ رہی تھیں۔

اپنے طور پر اُنھوں نے یہی قیاس کیا کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کر کے شہروز احمد کو دل سے قبول کرتے ہوئے مطمئن ہوگئی ہے۔ اُنہیں اس خیال سے خود بھی اطمینان ہوا اور وہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر اندر جانے کو تھیں کہ اُسی وقت اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چھوٹی آپا کو سامنے دیکھ کر وہ قدرے جھینپ گئی۔

"یہاں سردی میں کیوں بیٹھی ہو؟۔" چھوٹی آپا اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بس یوں ہی۔" وہ ٹانگیں سمیٹتی ہوئی بولی۔

کچھ دیر تک چھوٹی آپا اُس کی طرف دیکھتی رہیں پھر اُسے چھیڑنے کی غرض سے بولیں۔

"ابھی تصور میں تم شہروز سے باتیں کر رہی تھیں؟۔"

"نہیں تو۔" وہ فوراً کہہ گئی۔

"پھر؟۔" چھوٹی آپا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ سٹپٹا گئی۔ نظریں چُراتی ہوئی بولی۔

"چھوٹی آپا۔ میں تو بس یوں ہی بیٹھی تھی۔"

"اچھا۔" اُنہوں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ربیعہ۔ مجھے انسانوں کی بہت زیادہ پہچان تو نہیں ہے، لیکن شہروز کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں؟۔"

"یہی کہ گزری تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ اور اب جبکہ ایک اچھا انسان تمہارا شریکِ سفر ہے تو اپنے دل میں صرف اُسی کا خیال رکھو۔ اور یہی نہیں بلکہ ہمیشہ اُس کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد بھی کرو۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "جب گزری باتوں کو بُھول جاؤں گی تب آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" قدرے توقف کے بعد رازداری سے کہنے لگی۔ "ایک بات بتاؤں ثاقب حسن باہر چلا گیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟۔" چھوٹی آپا ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

"ایک دن انیلا سے ملاقات ہوئی تھی، اُس نے بتایا تھا۔" چھوٹی آپا کی ناگواری محسوس کر کے اُس نے جھوٹ بولا۔

"دیکھو ربیعہ۔ تمہیں اب ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ ثاقب حسن یہاں رہے یا کہیں بھی جائے تمہیں اس سے کیا، تم اپنے گھر کو دیکھو۔" اُس کے سر جھکانے پر کہنے لگیں۔ "تمہاری سسرال والے بہت اچھے اور نیک لوگ ہیں اور خاص طور پر شہروز کا معاشرے میں ایک نام ہے، مقام ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی کو بھی یہ معلوم ہوگیا کہ تمہارے دل میں اب بھی کسی اور کا خیال ہے تو وہ اُسے نہ صرف اپنی توہین سمجھیں گے بلکہ۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ اُن کی بات کاٹ گئی۔ "کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آپ چاہتی ہیں، میں گزری ہر بات بُھلا دوں۔ ضرور بُھلا دوں گی۔ لیکن کچھ وقت تو لگے گا ناں؟۔"

"ٹھیک ہے، وقت لگے گا۔ لیکن تم کوشش بھی تو کرو۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں چھوٹی آپا۔ آپ فکر نہ کریں۔" وہ مُسکرا کر بولی۔

اب اُنہیں کیسے بتاتی کہ اُسے ایسی کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خواب سارے جو اُس

نے اس آنگن میں بیٹھ کر سجائے تھے، کبھی پھولوں کی کیاری کے پاس کھڑے ہو کر، کبھی گرمیوں کی راتوں میں کُھلے آسمان تلے چارپائی پر سیدھی لیٹی، تو ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے۔ اُن سارے خوابوں کی تعبیر اُسے اُس شخص کے ذریعے سے ملنے والی ہے جس کے ساتھ وہ اسے وفادار رہنے کا درس دے رہی ہیں۔

"ربیعہ۔ صوفیہ۔" امّاں اُن دونوں کو پکارتی ہوئی آگئیں۔ "بیٹا، اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیسے بیٹھی ہو؟۔ اندر چل کر بیٹھو۔"

"چلیں چھوٹی آپا۔" وہ چادر پھینک کر اُٹھتی ہوئی بولی۔ "ذرا چھوٹی دونوں کو بھی دیکھیں کیا کر رہی ہیں؟۔"

چھوٹی آپا بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر دونوں اندر آ کر بیٹھی ہی تھیں کہ ابا میاں آگئے۔ اُن کے آتے ہی کلثوم اور ہما نے دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ کھاتے کے دوران ہی بس ابا میاں نے اُن سب سے تھوڑی بہت باتیں کیں۔ اُس کے بعد اپنے بستر پر چلے گئے۔ وہ چاروں بہنیں ابا میاں کو شب بخیر کہہ کر چھوٹے کمرے میں آگئیں۔ لحافوں میں دبک کر کچھ دیر تک ہنسی مذاق کرتی رہیں پھر جب نیند آنے لگی تو ہما نے اُٹھ کر لائٹ آف کر دی۔

صبح نماز کے بعد جب امّاں ناشتا بنانے کی غرض سے کچن میں گئیں تو وہ بھی اُن کے پیچھے چلی گئی۔ اُسے دیکھ کر امّاں کہنے لگیں۔

"تم یہاں کیوں آگئیں؟۔"

"کیوں امّاں؟۔ میرا یہاں داخلہ منع ہے کیا؟۔" وہ پیڑھی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں بیٹا، منع کیوں ہے۔ میں تو سردی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"سردی صرف میرے لیے تو نہیں ہے اور آپ ہٹیں، ناشتا میں بناؤں گی۔"

"نہ بیٹا۔"

"امّاں۔ آخر پہلے بھی تو میں بنایا کرتی تھی۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تم یہاں مہمان ہو۔"

"کوئی مہمان نہیں ہوں۔ بس آپ ہٹیں۔" اُس نے زبردستی امّاں کو وہاں سے اٹھا کر اندر بھیج دیا اور خود اُن کی جگہ پر آبیٹھی۔

جب سے وہ کچن کا کام کرنے کے قابل ہوئی تھی تب سے صبح اماں کے ساتھ مل کر ناشتا وہی بنایا کرتی تھی۔ اُسے اس گھر سے گئے ہوئے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی اسے یوں لگا جیسے وہ ایک لمبے عرصے کے بعد اس جگہ پر بیٹھی ہو۔ کلثوم اور ہما اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتا کرنے کی غرض سے کچن میں آئیں تو اُسے روٹی پکاتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"آپی۔ آپ کیوں پکا رہی ہیں؟۔"

"فضول سوال کرنے کے بجائے، آرام سے بیٹھ کر ناشتا کر لو۔" اُس نے مگوں میں چائے ڈال کر اُن دونوں کے سامنے رکھ دی۔

"بڑا مزا آئے جو ابھی شہروز بھائی آجائیں۔" کلثوم نوالہ منہ میں رکھ کر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

"ہاں، کہیں گے میری بیوی سے کام کروا رہے ہیں۔ آئندہ نہیں بھیجوں گا۔" ہما ہنستے ہوئے بولی۔

"ویسے آپی شہروز بھائی ہیں بہت اچھے۔ اتنے ہینڈسم، اتنے جینٹس۔"

اُس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ٹرے میں ابا میاں کے لیے ناشتا رکھنے لگی۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟۔" ہما کے پوچھنے پر وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کس بات کی؟۔"

"بھئی، ہم شہروز بھائی کی تعریف کر رہے ہیں۔"

"کرتی رہو۔" وہ ٹرے اُٹھا کر اُن دونوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی اندر آگئی۔ ابا میاں کے سامنے ٹرے رکھی تو انہوں نے اُسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور اپنے ساتھ ناشتا کرنے پر اصرار کیا۔ امّاں جلدی سے اُس کے لیے چائے بنا کر لے آئیں تو وہ شرمندہ ہوگئی۔

"امّاں ۔ میں خود ہی لے آتی ۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا ۔ چلو اب تم ناشتا کر لو ۔"

اُس نے خاموشی سے ابا میاں کے ساتھ ناشتا کیا ۔ پھر کیونکہ امّاں نے اُسے کوئی کام نہیں کرنے دیا، اس لیے وہ دوبارہ جا کر لحاف میں گھس گئی ۔ اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا ۔ لیکن نیند مہربان ہو گئی ۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی، کافی دن چڑھ آیا تھا ۔ چھوٹی آپا صفائی وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھیں ۔ وہ بستر سے نکل کر باہر آئی، تو امّاں دھوپ میں بیٹھی نظر آئیں ۔ اُن کے ساتھ بوا بھی تھیں ۔ اپنے مخصوص انداز میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں ۔

"اُٹھ گئیں بیٹا ۔ ؟" اُس نے بوا کو سلام کیا تو اس کی آواز سُن کر امّاں پوچھنے لگیں ۔

"ہاں ۔ میں سونا تو نہیں چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیسے نیند آ گئی ؟" وہ سوئیٹر اُتار کر امّاں کے پاس ہی بیٹھ گئی ۔ بدن کو دھوپ اچھی لگ رہی تھی ۔

"بٹیا ۔ شادی ہو جائے تو پھر میکے میں لڑکیاں صرف سونے ہی کے لیے آتی ہیں ۔" بوا کہنے لگی "سسرال میں نیند اپنی کہاں رہتی ہے ۔ میاں کی نیند سونا اور میاں کی نیند اٹھنا ۔ پھر جب بچے ہو جاتے ہیں تو عورت اُن کے لیے وقف ہو جاتی ہے ۔"

"بوا ۔ آج کیسے آنا ہوا ؟" وہ اس موضوع سے ہٹنے کی غرض سے پوچھنے لگی ۔

"بٹیا ۔ تمہاری بہن کے لیے ایک رشتہ لائی ہوں ۔"

اور اس سے پہلے کہ بوا تفصیل بتاتیں، چھوٹی آپا کچن سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئیں ۔

"امّاں ۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ میرے لیے سوچنا چھوڑ دیں ۔ اور بوا ! میں آپ کو بھی کئی بار منع کر چکی ہوں پھر آپ کیوں ہر دوسرے ہفتے کسی نہ کسی کا پیغام لے کر چلی آتی ہیں ۔ مجھے نہیں کرنی شادی ۔ اور آپ سُن لیں امّاں، اگر کوئی اس نیت سے ہمارے گھر آیا تو میں اسے دروازے ہی سے واپس کر دوں گی ۔"

"صوفیہ ۔" امّاں شاید اُنہیں سمجھانا چاہتی تھیں ۔ لیکن وہ اپنی بات کہہ کر پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں ۔

"تمہاری لڑکی تو بہت بدتمیز ہو گئی ہے ۔" بوا ناک پر انگلی رکھتے ہوئے بولیں ۔

"نہیں بوا ۔" وہ فوراً بول پڑی "چھوٹی آپا بدتمیز نہیں ہیں ۔ اصل میں اب تک اُن کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس سے دلبرداشتہ ہو کر وہ ایسی باتیں کہہ گئی ہیں ۔"

"ربیعہ ٹھیک کہہ رہی ہے ۔" امّاں نے اُس کی تائید کی ۔ پھر بوا جو اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں، امّاں نے اُنہیں زبردستی روک لیا ۔ البتہ وہ وہاں سے اُٹھ آئی ۔

اندر آ کر دیکھا ۔ چھوٹی آپا حسبِ عادت چادر میں پناہ گزین ہو چکی تھیں ۔ وہ اُن سے بات کرنا چاہتی تھی ۔ لیکن جانتی تھی، اس وقت نہ وہ کچھ سُنیں گی، نہ کہیں گی اور ہو سکتا ہے اُسے ڈانٹ بھی دیں ۔ اس لیے وہ فی الحال اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ کر کچن میں آ گئی ۔ چھوٹی آپا سبزی بناتے ہوئے اٹھ کر گئی تھیں ۔ اُس نے اُن کی جگہ سنبھال لی ۔ پھر امّاں کے بار بار منع کرنے کے باوجود اُس نے نہ صرف سبزی بنائی بلکہ چڑھا بھی دی ۔ پھر چاول نکال کر چُننے لگی ۔ اُسے چھوٹی آپا کے دُکھ کا ہمیشہ سے احساس رہا تھا ۔ اور اس وقت بھی وہ ان ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے اندر ہی اندر کُڑھ رہی تھی ۔

"کاش ۔ میں چھوٹی آپا کے لیے کچھ کر سکتی ۔" اُس نے سوچا ۔ اُسی وقت باہر گاڑی رُکنے اور پھر ہارن کی آواز نے اُسے چونکا دیا ۔ چاولوں کی سطح پر اس کی حرکت کرتی انگلیاں ٹھہر گئیں ۔ پھر دروازے پر دستک ہونے لگی ۔ اور اس نے امّاں کو دروازے کی طرف جاتے دیکھا ۔ واپسی میں شہروز احمد امّاں کے ساتھ آ رہے تھے ۔ اُس نے چاہا کہ جلدی سے ہاتھوں میں پکڑا چاولوں کا تھال کنارے پر رکھ دے اور خود بھی دروازے کی اوٹ میں ہو جائے لیکن وہ بس سوچتی رہ گئی ۔ اُدھر امّاں بھی انہیں اندر لے جانا چاہتی تھیں اور وہ پتا نہیں کس موڈ میں تھے، اندر جانے کے بجائے وہیں دھوپ میں رکھی چارپائی پر آ بیٹھے ۔

اور بیٹھتے ہی اُن کی نظر اس پر پڑی، تو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور وہ جو بے خیالی میں اُن کی طرف

یکھے جا رہی تھی، ایک دم کھڑی ہو گئی ۔ چاولوں کا تھال شیلف پر رکھ کر کچن سے نکلی تو امّاں اُس سے کہنے لگیں ۔

"شہروز کے لیے اندر سے کُرسی اٹھا لاؤ ۔"

"نہیں ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔" وہ فوراً بول پڑے

"اچھا تو بیٹا ۔ آرام سے بیٹھو ۔" امّاں جھٹ اندر چلی گئیں ۔ وہ ویسے بھی شہروز کے آنے سے بوکھلا جایا کرتی تھیں ۔ بہت کم وقت میں چاہتی تھیں کہ اُن کے لیے پتا نہیں کیا کچھ کر ڈالیں ۔ اس وقت بھی وہ پچھلے دروازے سے پڑوس کے کسی بچے کو بُلانے چلی گئی تھیں ۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں ؟ ۔ بیٹھ جائیں ۔" اُنہوں نے بے حد عام سے لہجے میں اُسے مخاطب کر کے کہا تو وہ چارپائی کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی ۔

"آپ اس وقت کیسے آ گئے ؟ ۔" وہ یوں ہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی ۔

"ہاں ۔ میرا اس وقت آنا واقعی اچنبھے کی بات ہے ۔ میرا خیال تھا ابھی آپ کچھ دن یہیں رہیں گی لیکن ابھی آفس میں امّی کا فون آیا، اُنہوں نے کہا ہے، میں اسی وقت آپ کو لے آؤں ۔"

وہ سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگی ۔۔

"اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو ۔۔"

"نہیں میں چل رہی ہوں ۔" وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور اندر جانے کو تھی کہ وہ کہنے لگے ۔

"سُنیں ۔ ذرا اپنا حلیہ ٹھیک کر لیں ۔"

"جی ۔" وہ جلدی سے اندر آ گئی ۔ اپنے آپ پر نظر ڈالی، کپڑے شکن آلود تھے اور دوبارہ جب سو کر اُٹھی تھی تو منہ بھی نہیں دھویا تھا ۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی ہوئی بیگ کھول کر کپڑے نکالنے لگی ۔ اُسی وقت امّاں ہاتھوں میں تھیلا اٹھائے پچھلے دروازے سے نمودار ہوئیں ۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں ؟" وہ استری کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی ہوئی پوچھنے لگی ۔

"یہ سموسے وغیرہ ۔ اور میں نے تمہیں منع کیا تھا باورچی خانے میں مت بیٹھو ۔ کیا سوچتے ہوں گے شہروز کہ دو دن یہاں رہنے کے لیے آئی اور ہم نے تمہیں کام پر لگا دیا ۔" امّاں دبی دبی آواز میں بولیں تو اُسے ہنسی آ گئی ۔

"کچھ نہیں سوچتے وہ ۔ بس آپ جلدی سے اُنہیں چائے وغیرہ دیں ۔ وہ زیادہ دیر نہیں رُکیں گے ۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ جا رہی ہوں ۔"

"تمہیں لینے آئے ہیں ؟ ۔"

"ہاں ۔"

امّاں اُس کا جواب سُن کر کچن میں چلی گئیں ۔ اور وہ جلدی جلدی کپڑے استری کرنے لگی ۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو سوچا نہا لے لیکن پانی گرم کرنے کا مسئلہ تھا اس لیے بس منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیے ۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے چھوٹی آپا کے پاس آ ئی ۔ چادر کے اندر پتا نہیں وہ سو رہی تھیں یا نہیں اس لیے ہلکے سے ایک دو آوازیں دیں، جواب ندارد ۔ پھر اُس نے اُن کا کندھا ہلا ڈالا ۔

"کیا ہے ؟ ۔" وہ چادر میں سے منہ نکال کر ناگواری سے بولیں ۔

"میں جا رہی ہوں ۔" اُس نے اطلاع دی ۔

"کہاں ؟ ۔"

"شہروز احمد کے گھر ۔" وہ جلدی میں یہی کہہ گئی ۔

"کیا مطلب ؟ ۔ کیا وہ تمہارا گھر نہیں ہے ۔ ؟ ۔" چھوٹی آپا کے ٹوکنے پر احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے ۔

"میرا مطلب ہے ۔ اپنے گھر جا رہی ہوں ۔" اُس نے ہنسی میں بات سنبھالی ۔

"اس وقت کیوں جا رہی ہو ؟ ۔ شام میں چلی جانا ۔"

"کیا کروں، شہروز اسی وقت لینے آ گئے ہیں ۔"

"اچھا تو خدا حافظ۔" چھوٹی آپا نے دوبارہ منہ پر چادر ڈالنی چاہی کہ اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا مطلب؟۔ آپ شہروز سے نہیں ملیں گی؟"

"اِس وقت نہیں۔"

"کیوں؟۔"

"میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر پھولے ہوئے چہرے کے ساتھ اُن کے سامنے چلی گئی تو وہ سمجھیں گے کہ ان کا آنا ناگوار گزرا ہے۔"

"وہ ایسا کچھ نہیں سمجھیں گے۔ آپ چلیں باہر۔" اُس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن چھوٹی آپا نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ربیعہ۔ مجھے تنگ مت کرو۔ تم جاؤ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔" چھوٹی آپا چادر اُوڑھ کر کروٹ بدل گئیں۔ اُس کا دل چاہا وہ اُن کے پاس بیٹھ کر اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرے لیکن اَمّاں آواز دے رہی تھیں، اس لیے وہ کمرے سے نکل آئی۔ شہروز احمد کے سامنے رکھی ٹرے میں چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سجے تھے اور اَمّاں انہیں دوپہر کے کھانے تک رُکنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔

"اِس وقت میں امّی کے حکم پر آفس کے ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ پھر کسی دن خاص طور سے کھانے کے لیے آجاؤں گا۔" وہ اَمّاں کو سہولت سے منع کر رہے تھے۔ اُس پر نظر پڑی تو کہنے لگے۔

"چلیں۔؟۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو کھڑے ہو گئے۔ پھر اچانک انہیں یاد آیا تو پوچھنے لگے۔ "آپ کی چھوٹی آپا نظر نہیں آ رہیں۔؟"

"اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اندر لیٹی ہوئی ہیں۔" فوری طور پر اُسے یہی جواب سُوجھا۔

"چلیے، اُن کی مزاج پُرسی کر لوں۔" انہوں نے کہا تو وہ اَمّاں کی طرف دیکھنے لگی اور اُن کا اشارہ پا کر انہیں اندر لے گئی۔

"چھوٹی آپا۔ شہروز آئے ہیں۔" اُس نے چھوٹی آپا کا کندھا ہلا کر کہا تو وہ منہ پر سے چادر ہٹا کر شاید یہ کہنا چاہتی تھیں کہ 'یہ اطلاع وہ پہلے بھی دے چکی ہے' لیکن شہروز پر نظر پڑی تو انہوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ اُن کے انداز، اُن کے لہجے میں جانے کیا بات ہوتی تھی کہ مقابل دامن بچانے کی کوشش میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ چھوٹی آپا کے بھینچے ہوئے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ جو اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ چھوٹی آپا کوئی سخت جملہ نہ کہہ دیں۔ اس وقت قدرے مطمئن ہو گئی۔ جب اُس نے چھوٹی آپا کو نرم آواز میں کہتے سُنا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ اور آپ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟۔"

"بس کچھ کام ہے۔ پھر کبھی فرصت سے آجاؤں گا۔"

چھوٹی آپا اُٹھنے لگیں تو انہوں نے روک دیا۔

"پلیز آپ لیٹی رہیے۔ ہم چلتے ہیں۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے اپنا بیگ اٹھا لائی۔

"اچھا چھوٹی آپا۔" اس نے مُسکرا کر چھوٹی آپا کو 'خدا حافظ' کہا۔ اور اُن کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے سے نکلی تو اَمّاں برآمدے میں کھڑی تھیں۔ وہ ان سے گلے ملی انہوں نے دونوں کو دعائیں دیں۔ پھر شہروز پھر کبھی فرصت سے آنے کا کہتے ہوئے اُسے لے کر باہر آ گئے۔

شہروز احمد واقعی آفس میں اپنا ضروری کام چھوڑ کر آئے تھے۔ امّی کی بات کو وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کام چھوڑ کر اُسے لینے چلے آئے۔ اور اب خیال تھا اُسے گھر چھوڑ کر دوبارہ آفس چلے جائیں گے لیکن امّی نے یہاں بھی روک لیا۔

"امّی۔ میں شام میں جلدی آجاؤں گا۔" وہ بڑی عجلت میں بولے کہ جیسے ہی امّی اجازت دیں گی، وہ نکل جائیں گے لیکن امّی نے سنجیدگی سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر دو ٹکٹ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

"یہ کیا ہے؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ٹکٹ اور کبھی امی کی طرف دیکھنے لگے۔

"تمہیں تو میرے کہنے کے باوجود خیال نہیں آیا۔ اس لیے میں نے خود ہی تمہارا پروگرام سیٹ کر دیا ہے۔ یہ دو ٹکٹ اسی سلسلے میں ہیں۔ آج چار بجے کی فلائیٹ سے تم اور ربیعہ اسلام آباد جا رہے ہو۔"

"کس سلسلے میں؟" اُن کے پوچھنے پر امّی کو غصہ آ گیا۔

"کسی سلسلے میں نہیں۔ بس وہاں کی مٹی اُٹھا کر واپس آجانا۔"

"آئی ایم سوری امّی۔ میرا مطلب ہے۔"

"مجھے کوئی مطلب سمجھانے کی کوشش مت کرو۔" پھر اُسے مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

"جاؤ ربیعہ۔ تم تیاری کرو۔"

اُس نے ایک نظر شہروز احمد کی طرف دیکھا پھر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔ فوری طور پر اُس سے تو کچھ نہیں کہا۔ بس خوامخواہ چیزوں کی جگہ بدلتے رہے۔

وہ کنکھیوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ صبیح پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر ڈرنے لگی۔ کہیں اس سے نہ کچھ کہہ دیں لیکن انہوں نے تو اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ تب اس سارے معاملے کا قصوروار اپنے آپ کو سمجھتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنے اندر ہمت پیدا کرتی ہوئی اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے۔" اس سے آگے الفاظ بھی ساتھ چھوڑ گئے اور آواز بھی۔ وہ صوفے کی بیک سے پشت اور پھر سر ٹکاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

"میں امی سے کہہ آتی ہوں کہ۔" اُن کے اس طرح دیکھنے سے اس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔

"اگر ڈانٹ کھانے کا شوق ہے تو ضرور ان کے پاس جائیں۔"

"کوئی بات نہیں وہ جو کہیں گی، میں سُن لوں گی۔"

وہ جانے لگی تو انہوں نے پُکار لیا۔

"ربیعہ۔" اُس کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ لیکن پلٹ کر دیکھا نہیں۔

"امّی کے پاس جانے کے بجائے آپ ایک سوٹ کیس پیک کر لیں۔" اُنہوں نے کہا اور اُٹھ کر اسٹڈی میں چلے گئے۔

"کس مشکل میں پھنسا گیا ہے ثاقب حسن مجھے؟" وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر اُچھالنے لگی۔ اُسی وقت اُس کی چھوٹی نند ندا دروازے میں سے جھانک کر کہنے لگی۔

"بھابی۔ میں اندر آجاؤں؟۔"

"آؤ بھئی، پوچھنے کی کیا بات ہے؟" وہ مُسکرا کر بولی۔

"اصل میں بھائی جان بھی ہیں ناں، اس لیے پوچھنا پڑا۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی۔ "کہاں ہیں بھائی جان؟"

"اسٹڈی میں۔"

"کچھ خفا ہیں۔"

"نہیں تو۔" وہ کچھ سوٹ منتخب کر کے باقی دوبارہ الماری میں رکھنے لگی۔

"یہ کیا؟۔ بس یہی چند سوٹ لے جائیں گی؟" ندا نے بیڈ پر رکھے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"بہت ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہتی ہوئی سوٹ تہہ کر کے اٹیچی میں رکھنے لگی۔

"ارے نہیں بھابی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو آپ دو ہی دن میں پہن ڈالیے گا۔" ندا خود ہی الماری کی

طرف بڑھ گئی۔ اور اُس کے مزید سوٹ نکالنے لگی۔

"رہنے دو ندا۔ ہم نے کون سا کہیں آنا جانا ہے۔" وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔

"کیا مطلب؟" ندا کے پوچھنے پر احساس ہوا کہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔ فوراً سنبھلتے ہوئے بولی۔

"میرا مطلب ہے اتنی سردی میں کم ہی کہیں جانا ہوگا۔"

"بھائی جان کو سردی بہت پسند ہے، خاص طور پر برفباری۔ اور مجھے یقین ہے وہ آپ کو ہوٹل کے کمرے میں بند نہیں رہنے دیں گے۔"

جواب میں وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ شہروز کو آتے دیکھ کر خاموش ہو رہی۔

"ندا میرا بلیک اور براؤن سوٹ نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دو۔" اُنہوں نے کہا اور فون اُٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگے جبکہ وہ دُزدیدہ نظروں سے ندا کی طرف دیکھنے لگی کہ کہیں اُس نے اس بات کو محسوس تو نہیں کیا کہ انہوں نے اسے نظرانداز کر کے ندا کو مخاطب کیا ہے۔ ندا نے خاموشی سے ان کے دونوں سوٹ نکال کر اُس کی طرف دیے۔ جنہیں لے کر اُس نے اپنے کپڑوں کے اُوپر ہی رکھ دیا۔

"بھابی۔ میرے لیے کیا لائیں گی؟" ندا اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"کیا لاؤں؟"

"اپنی مرضی اور پسند سے کوئی بھی چیز لے آئیے گا۔ مجھے یقین ہے آپ کی پسند بہت اچھی ہوگی۔"

"تمہارا یقین غلط نہیں ہے ندا۔ ان کی پسند واقعی بہت اچھی ہے لیکن ظاہری خوبصورتی کی حد تک۔" انہوں نے پتا نہیں کس حوالے سے یہ بات کہی تھی، وہ سمجھ نہ سکی۔ بس لمحہ بھر کو اُن کی طرف دیکھا۔ پھر سوٹ کیس بند کرنے لگی۔

"ندا۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟" اُن کے پوچھنے پر ندا پیشانی پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔

"میرے خدا۔ میں آپ دونوں کو کھانے کے لیے ہی تو بلانے آئی تھی، یہاں آکر بھول گئی۔ اصل میں"

"بس وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اُنہوں نے ٹوکا۔ پھر اُس سے کہنے لگے۔

"چلیں ربیعہ۔" اُس نے ندا کو جاتے ہوئے دیکھا پھر اُن کے ساتھ چل پڑی۔

کتنا شوق تھا اسے کہ جب وہ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے۔ تو کھلی فضاؤں میں آزادی سے سانس لے سکے۔ مہکتی فضائیں، خوبصورت جگہیں۔ کبھی سبزے اور کبھی برف سے ڈھکے پہاڑ اور اونچے نیچے راستے جن پر چلتے ہوئے اُس کا ہاتھ اُس شخص کے ہاتھ میں ہو، جس نے اُس کی آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلائے تھے۔ اور بارہا وہ اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر خوابوں کی سرزمین پر بہت دُور تک نکلی تھی۔

اور اب جب کہ خوابوں کو حقیقت ملی تھی کہ وہی خوبصورت جگہیں۔ وہی برف سے ڈھکے پہاڑ اور اُونچے نیچے راستے۔ تو ساتھ چلتا شخص وہ نہیں تھا۔ گو کہ وہ اس کا ہاتھ تھامنے کا شرعی اور قانونی حق رکھتا تھا، پھر بھی اجنبی بنا رہا اور وہ خود بھی کچھ دُور دُور سی تھی۔

مری میں وہ ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے اور آج یہاں تیسرا دن تھا۔ بس پہلے دن ہی وہ اُسے لے کر یوں ہی ٹہلتے ہوئے کچھ دُور تک گئے تھے۔ اُس کے بعد یوں لاتعلق ہو گئے جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ کل بھی وہ اُسے چھوڑ کر صبح ہی نکل گئے تھے اور پھر اُن کی واپسی شام میں ہوئی تھی۔ پتا نہیں سارا دن کہاں رہے تھے، اُس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اور آج بھی وہ صبح سے نکلے ہوئے تھے۔ اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ انتہائی بوریت محسوس کرتے ہوئے وہ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتی، کبھی بالکونی میں آ کھڑی ہوتی۔ باہر کا منظر گو کہ بہت خوبصورت تھا لیکن ایک ہی منظر کو بار بار دیکھتے ہوئے وہ اُکتا گئی تھی۔

دل چاہ رہا تھا، باہر نکل کر بہت دُور تک جائے۔ اتنی باحوصلہ نہیں تھی کہ اکیلی ہی نکل جاتی۔ اندر ہی اندر کُڑھتی ہوئی ایک بار پھر بالکونی میں آگئی۔ برفباری شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے دیکھا، دُور تک پھیلے سبزے پر روئی کے گالوں کی طرح گرتی ہوئی برف بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اُس کی ساری بوریت اور کوفت پل بھر میں دُور ہو گئی اور وہ بہت اشتیاق سے سبزے کو سفید چادر میں چھپتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ہاں ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی نے یہاں سے وہاں تک سفید چادر تان دی ہو اور کہیں کہیں کسی روزن سے جھانکتی سبز پتیاں پتا نہیں دُہائی دے رہی تھیں یا کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ اُس کا دل البتہ ضرور کھلکھلا کر ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز برف سے ڈھک گئی۔ ماحول کے اُجلے پن میں انوکھا نکھار سمٹ آیا تھا۔

وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے قدرے آگے کو جھکی ہوئی ماحول میں اُترتی ڈھیر ساری خوبصورتی کو دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ اُسے شہروز کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ اُسے کمرے میں نہ پاکر بالکونی میں دیکھنے چلے آئے تھے۔ کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ کہ شاید وہ خود ہی متوجہ ہو لیکن وہ تو بے خبر تھی بالآخر انہوں نے خود ہی پکار لیا۔

"ربیعہ۔"

وہ چونکی اور فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" انہوں نے پوچھا تو کچھ دیر کو وہ بھول گئی کہ سامنے کھڑا شخص اُس کا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ سادگی سے کہنے لگی۔

"پتا ہے شہروز۔ ابھی میں نے اس پورے سبزے کو برف میں چھپتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت اچھا لگا۔ ابھی بھی دیکھیں، کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" اُن کی نظریں اُس پر سے ہٹ کر دُور تک بھٹکتی چلی گئیں اور وہ کہہ رہی تھی۔

"اگر میں وہاں کھڑی ہوتی، تو کیا میں بھی برف میں چھپ جاتی؟"

"ارے۔" وہ ہلکے سے ہنسے اور نظریں پھر اُس پر جما دیں۔ اب وہ باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔ اس برف کے فرش پر چلتے ہوئے کیسا لگتا ہوگا؟ چلتے ہوئے دشواری ہوتی ہے یا۔؟" بات کرتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا تو ایک دم احساس ہوا کہ وہ انجانے میں کچھ حدبندیاں توڑ گئی ہے۔ فوراً ہونٹ بھینچ کر اُن کی طرف سے رُخ موڑ گئی۔ دل ہی دل میں نادم بھی تھی کہ پتا نہیں وہ کیا سوچتے ہوں گے جب کہ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے کہ جب اُس کے ساتھ یہاں تک آ ہی گئے ہیں، تو پھر اپنے ساتھ باہر لے جانے میں کیا قباحت ہے۔؟

"آئیے باہر چلتے ہیں۔" وہ شاید اپنے روّیے کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔

"نہیں بس یہیں ٹھیک ہے۔"

"یہاں ٹھیک نہیں ہے۔ میں ویسے بھی باہر جا رہا ہوں۔ ان مناظر کی کچھ تصاویر بناؤں گا، آپ بھی چلیں۔" اُن کا لہجہ دوستانہ تھا۔ وہ اُن سے پہلے کمرے میں آگئی اور وہ اُس کے پیچھے آتے ہوئے بولے۔

"گرم شال ضرور لے لیں، باہر بہت سردی ہے۔" وہ ایک بار پھر جانے سے انکار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُس کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ اس لیے اُلجھنے کے بجائے اس نے خاموشی سے گرم شال نکال کر کندھوں پر ڈال لی۔ اُنہوں نے کیمرہ نکالا اور چیک کرنے کے بعد اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ نظریں چرا گئی تو کہنے لگے۔

"مجھے احساس ہے کہ میرا ساتھ آپ کے لیے۔"

"پلیز چلیں۔" وہ اُن کی بات کاٹ کر بول پڑی۔ تو وہ کندھے اُچکا کر کمرے سے نکل آئے۔

باہر اب بھی ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی اور شدید سردی سے اُسے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا لگا لیکن برف پر چلنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ واپسی کے لیے صرف سوچ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اُن کے ساتھ اسی مقام پر تھی جو اُس کی بالکونی سے نظر آرہا تھا۔

"بہت خوبصورت۔" وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ اور اُس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ یقیناً اس خوبصورت ماحول کی مرہون منت تھی۔

شہروز خوبصورت مناظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے لگے اور وہ انہیں اپنے کام میں مصروف دیکھ کر بہت خاموشی سے اُس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گئی۔

اُونچائی پر کھڑے ہو کر اُس نے دُور دُور تک نظریں دوڑائیں۔ کہیں کہیں کچھ منچلے برف سے کھیلتے نظر آئے اور کچھ بے فکرے جوڑے جو شاید خاص طور پر برفباری دیکھنے آئے تھے۔ اُس نے ایک نظر شہروز کو دیکھا پھر وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اور ہاتھوں سے برف کو ایک جگہ جمع کرنے لگی۔

کتنی دیر گزر گئی تھی۔ شہروز کیمرہ بند کر کے اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔ پھر وہ اُنہیں اُس چھوٹی سی پہاڑی پر بیٹھی نظر آ گئی۔ اُس کے آگے برف کا ڈھیر تھا۔ اُنہوں نے یوں ہی دُوربین آنکھوں سے لگا کر دیکھا تو وہ بہت قریب نظر آئی۔ اتنی قریب کہ اُس کا ہر نقش واضح تھا۔ اُس کی سرخی مائل گندمی رنگت میں بے پناہ کشش تھی۔ تراشیدہ ہونٹ جانے کس خیال سے متحرک تھے۔ کبھی مُسکراتے اور کبھی نیم وا ہوتے تو اُس کے برابر سے جمے دانت جھلک دِکھلانے لگتے تھے۔

آنکھیں ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے دیکھا اُس کی خوبصورت آنکھوں میں قندیلیں روشن تھیں اور ذرا اُوپر سیدھی شفاف مانگ جو سیاہ بالوں کے بیچ چمکتی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید اُڑتی ہوئی برف آن ٹھہری تھی۔ جو کہیں کہیں بالوں میں بھی نظر آ رہی تھی۔ گذشتہ ایک ماہ سے وہ اُن کے آس پاس رہ رہی تھی لیکن اس طرح انہوں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یا اگر دیکھا بھی تھا تو اس طرح نہیں ورنہ وہ اوّل روز ہی دل میں ہلچل مچا دیتی جیسا کہ اب مچا رہی تھی۔

"اونہوں شہروز احمد۔" اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے اُنہوں نے دُوربین آنکھوں سے ہٹائی تو وہ بہت دُور نظر آئی۔

"یہ کیا حماقت تھی؟" اپنے آپ کو ٹوکا۔ لیکن یہ حادثہ اُن کے ساتھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اُس لڑکی ربیعہ اکرام علی کی آنکھوں میں چھپی روشن قندیلوں تک کو کھوج آئے تھے۔ اُس کے ہونٹوں کا متحرک ہونا، اُس کی شفاف مانگ میں ٹھہرے ہوئے روئی کے گالے۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ ان مناظر میں سمٹی یہ ڈھیر ساری خوبصورتیاں اس ایک وجود کی مرہونِ منت ہیں۔" دل حقائق کو جھٹلانے پر کسی صورت تیار نہیں تھا۔

"میرے خدا۔" پیشانی پر آئے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اُس کی طرف سے رُخ موڑتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"وہ میرے پاس امانت ہے۔"

"امانت۔" دل ہنسا۔ مذاق اُڑایا۔ "وہ تمہاری ہے شہروز احمد صرف تمہاری۔ کیا اتنے لوگوں کی موجودگی میں تم نے اُسے اپنا نہیں کہا تھا۔ اور اُس نے اقرار نہیں کیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ سب ہوا تھا۔ دُنیا دکھاوے کے لیے۔ ورنہ دل سے نہ میں راضی تھا اور نہ وہ۔ ہم جانتے تھے کہ یہ سب ناٹک ہے۔"

"اپنے بارے میں تم کہہ سکتے ہو۔ اُس کے بارے میں نہیں۔ وہ ہر بات سے لاعلم تھی اور اُس نے تمہیں ہی مجازی خدا تسلیم کیا۔"

دل سے اُٹھنے شور سے گھبرا کر وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ برف سے ایک گھروندہ بنائے بیٹھی تھی اور شاید تصور کی آنکھ سے وہ اس گھروندے میں کہیں اپنے آپ کو کھڑا بھی دیکھ رہی تھی اور شاید کسی اور کا خیال بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُن کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہونے لگا تو وہ اُس کے قریب ہی پنجوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک دم چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"برف کا گھروندہ زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکے گا۔" اُنہوں نے پتا نہیں یوں ہی یہ بات کہہ دی تھی اُسے جتایا تھا، وہ خود بھی نہیں سمجھ سکے۔

"میں جانتی ہوں۔"

"جانتی ہیں تو بنایا کیوں؟۔ اور پھر اس میں اپنے خوابوں کی تعبیر کیوں تلاش کر رہی ہیں؟"

"آپ کو کیسے معلوم کہ میں اس میں خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہی تھی؟" وہ نظریں چُراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ کی آنکھوں سے جن کی سطح پر آپ کا ہر خواب جھلکتا نظر آ رہا ہے۔"

"تم نے میری آنکھوں میں کیسے دیکھ لیا شہروز احمد۔" اُس نے سوچا اور اُٹھنے کو تھی کہ اُنہوں نے روک دیا۔

"ایک منٹ۔ میں اس گھروندے کے ساتھ آپ کی تصویر بناؤں گا۔" وہ اٹھ کر قدرے فاصلے پر چلے گئے۔ اور اُس کی تصویر بنانے کے بعد کہنے لگے۔

"چلیں۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور جان بوجھ کر اُن سے دو قدم پیچھے چلنے لگی۔

اُن کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تو ایک دم سے بہت زیادہ ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ گو کہ کمرہ قدرے گرم تھا لیکن شاید احساسات بیدار ہو گئے تھے۔ اس لیے ہاتھ، چہرہ یہاں تک کہ پورا وجود بے حد سرد لگا۔ باہر تھی تو ہر طرف جمی برف نے شاید احساسات پر بھی ہلکی سی تہہ جما دی تھی جو کسی بات کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اور اب دل چاہ رہا تھا، فوراً کمبل میں چھپ جائے۔ لیکن شہروز نے آتے ہی انٹرکام پر چائے کا کہہ دیا تھا اس لیے اُسے بیٹھنا پڑا تھا۔

شال کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑنے لگی۔ اور جب ہتھیلیاں کچھ گرم ہونے لگتیں، تو وہ اپنا چہرہ تھپتھپانے لگتی۔ وہ اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے پھر بھی بار بار نظریں بھٹک جاتیں۔ ہر بار دل مچلا، اُس کے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ وہ کوئی غیر نہیں، اُن کی اپنی ہے۔ اپنی مرضی سے اپنے سارے حقوق اُنہیں سونپ چکی ہے۔

ویٹر چائے لے کر آیا تو وہ سر جھٹک کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر میز پر رکھی۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر آ گئی۔ اور کپ میں چائے ڈالنے لگی۔ پھر اُن کے آگے چائے رکھ کر اپنا کپ لے کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

"عجیب بات ہے، باہر تھی تو ٹھنڈک کا اتنا احساس نہیں تھا۔" وہ چائے کا سِپ لے کر یوں ہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

"آپ چائے پی کر فوراً کمبل میں چلی جائیں۔" اُنہوں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی پھر بھی وہ کہنے لگی۔

"نہیں اب تو سردی کا احساس اتنا نہیں رہا۔"

"اچھا۔" وہ ہنس دیے۔ "مجھے تو آپ کا وجود کانپتا ہوا لگ رہا ہے۔"

"نہیں تو۔" وہ ساری چائے ایک ہی بار پی کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خالی کپ ٹرے میں رکھا اور بالکونی کی طرف جانے کو تھی کہ اُنہوں نے پکار لیا۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"میں یہاں سے کھڑے ہو کر اپنے بنائے ہوئے گھروندے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں اس وقت بالکونی میں جانے کی۔ چلیں کمبل اوڑھ کر بیٹھیں۔" قدرے رعب سے کہا۔ تو وہ وہیں سے پلٹ آئی۔ بیڈ پر بیٹھ کر ذرا سا کمبل اپنے اُوپر کھینچا لیکن جب محسوس ہوا کہ وہ اُسے ہی دیکھ رہے ہیں تو پوری کمبل میں جا چھپی۔ وہ خاصے محظوظ ہوئے۔ اور سگریٹ سُلگا کر اپنے لیے اور چائے بنانے لگے۔

وہ بالکل ہی بے خبر ہو گئی تھی۔ ایسی گہری نیند سوئی کہ رات میں نہیں اُٹھی۔ اُنہوں نے کھانے کے لیے ایک دو بار اُسے آواز دی لیکن وہ بے خبر تھی۔ کمبل اُس کے چہرے سے سرک گیا تھا۔ اور ایک بازو بھی باہر تھا۔ اور وہ اُس کی بے خبری پر حیران تھے۔ حیرت کی بات تو تھی کہ اُن کے جذبوں کو بیدار کر کے خود مزے

سے سو رہی تھی۔ کاش وہ اُس وقت دیکھتی کہ شہروز کی آنکھیں زندگی میں پہلی بار رتجگے سے آشنا ہو رہی تھیں۔

اپنے آپ سے کیسے لڑا جاتا ہے، وہ اب جان رہے تھے۔
انہونی خواہشات کیسے جنم لیتی ہیں، آج معلوم ہو رہا تھا۔
اور
دل کو سمجھانا کس قدر مشکل ہے، یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

رات لمحہ بہ لمحہ بھیگتی جا رہی تھی اور وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی گہری نیند سو رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر شہروز احمد کا جی چاہ رہا تھا، وہ بھی اُس کی طرح گہری نیند سو کر ہر بات سے بے خبر ہو جائیں لیکن ہمیشہ تو وہی نہیں ہوتا جو دل چاہتا ہے۔ اُنہوں نے بھی بہت کوشش کی لیکن پلکیں ایک دوسرے سے ملنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئیں۔

کتنی دیر تک کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ کِسی کِسی وقت رُک کر اُسے دیکھنے لگتے۔ پھر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے اُس کے پاس سے ہٹ جاتے۔ دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زندگی میں یہ کیسا مقام آ گیا ہے۔

"میں اس طرح بے اختیار تو کبھی نہیں ہوا۔" اُنہوں نے سوچا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر کمبل سینے تک کھینچ لیا۔ اب اُس کا چہرہ براہِ راست اُن کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ بہت کوشش کی نظروں کا زاویہ بدل لیں، کسی طرح کامیابی نہیں ہوئی، تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں اُس کی طرف چھوڑ دیا۔
بس لمحہ بھر کو ہی درمیان میں دُھند کی چادر سی تنی تھی اور جب دُھند چھٹی تو وہ ڈسٹرب کر دینے والا چہرہ پھر سامنے تھا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

یہ نہیں تھا کہ شہروز احمد کو کبھی لڑکیوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جیسی وجیہہ شخصیت کے وہ مالک تھے اور جو اسٹیٹس ان کا تھا، اس لحاظ سے تو بے شمار لڑکیاں اُن کی آرزومند تھیں اور اکثر ہی کسی نہ کسی بہانے ان کے راستے میں آتی رہی تھیں' لیکن انہوں نے کبھی توجّہ ہی نہیں دی یا پھر شاید کسی نے اتنا اٹریکٹ ہی نہیں کیا تھا جو وہ کسی کے لیے سوچتے۔

وہ آئیڈیلزم پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کوئی خاکہ نہیں تراشا کہ شاہراہِ حیات پر قدم سے قدم ملا کر چلنے والی کیسی ہوگی۔ بس خیال تھا جب وقت آئے گا، امّی خود ہی سوچیں گی اور جسے منتخب کریں گی سعادت مندی سے سر جھکا دیں گے اور امّی تو بہت پہلے سے اُن کے لیے سوچنے لگی تھیں۔

لیکن ابو جی کی اچانک وفات نے اُن کے کاندھوں پر جو ذمّہ داریاں ڈال دی تھیں، اس سے وہ نہ صرف خود اپنی ذات سے نظریں چُرانے پر مجبور ہوئے بلکہ امّی کو بھی منع کر دیا کہ وہ فی الحال ان کے بارے میں نہ سوچیں جب تک مہروز کسی قابل نہیں ہو جاتا۔ اور جب مہروز ان کے ساتھ آفس کی ذمّہ داریاں شیئر کرنے کے قابل ہوا تو امّی ایک بار پھر ان کے لیے سوچنے لگیں اور باقاعدہ لڑکی کی تلاش بھی شروع کر دی۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی، بس چاہتے تھے، پہلے ندا اپنے گھر کی ہو جائے۔ اور انہوں نے دبے لفظوں میں امّی سے کہا بھی لیکن انہوں نے اُن کا یہ عذر کسی طرح نہیں مانا۔

ان ہی دنوں ثاقب حسن اُن کے پاس آیا۔ بے حد پریشان اور زندگی سے مایوس۔ پہلی بار بھی وہ اُنہیں اسی طرح مایوس حالت میں ملا تھا۔ اس وقت غالباً وہ فائنل ایئر میں تھا اور امتحانوں کی فیس نہ ہونے کی وجہ سے بے حد مایوسی کے عالم میں ان کی سائیٹ پر مزدوری کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اس وقت اتفاق سے وہ بھی سائیٹ پر موجود تھے۔
ثاقب حسن نے اُن کے پاس آ کر کہا کہ وہ صرف ایک ہفتہ کے لیے کوئی کام چاہتا ہے"۔ اور اُن کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ وہ پڑھ رہا ہے اور اس وقت کسی انتہائی ضرورت کے تحت یہ کام کرنے کے لیے چلا آیا ہے۔ اُس نے صاف لفظوں میں نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس امتحانوں کی فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ شاید خودداری آڑے آئی تھی' لیکن وہ کچھ کچھ سمجھ گئے تھے اور انہوں نے سوچا تھا، اگر وہ یہاں مزدوری پر لگ گیا تو پھر اس کی اسٹڈی کا حرج ہوگا۔ اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ آفس لے گئے اور اس کی ضرورت بغیر مزدوری کے پُوری کرنے کی کوشش کی لیکن اُس نے انکار کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے بصد اصرار قرض کے طور پر کچھ رقم دی تھی۔ اور جب کچھ عرصے بعد ثاقب حسن اُن کا قرض لوٹانے آیا تو اسی دِن سے اُن کی دوستی کی ابتدا ہوئی تھی۔

پھر اکثر ثاقب حسن اُن کے پاس آنے لگا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بے شُمار مسائل میں گھِرا ہوا اور حالات کا شکار ہونے کے باوجود خاصا خوددار ہے۔ کیونکہ اس نے اوّل روز کے بعد پھر کبھی اپنے کسی مسئلے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور ایک دو بار انہوں نے اسے جاب کی آفر بھی کی' تو اس نے شکریہ کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ شاید وہ اُن کے سامنے اپنے آپ کو مجبور ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اور دوسری بار جب وہ پریشان حال اور زندگی سے مایوس ان کے سامنے آیا تو وہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ بے حد کمزور اور شکستہ سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟۔ مجھے بتاؤ۔" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔
"کیا آپ میرا مسئلہ حل کریں گے؟۔" وہ کچھ یقین اور غیر یقینی میں گھِر کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"اگر میرے اختیار میں ہوا تو ضرور حل کروں گا۔"
"آپ کے اختیار میں ہے شہروز احمد۔" وہ فوراً بولا تھا۔
"اچھا۔ اگر تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو کہ اسے حل کرنا میرے اختیار میں ہے' تو ضرور حل کروں گا۔"
"وعدہ؟۔" ثاقب حسن نے اپنا ہاتھ میز کی سطح پر رکھ دیا تھا۔
"ارے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ذرا سا مُسکرائے تھے۔ "وعدہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی ثاقب حسن؟۔ کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں؟"
"اعتبار کی بات نہیں ہے۔ بس میں کچھ غیر یقین سا ہوں۔"
"چلو، تو پھر میں تمہارے یقین کی خاطر وعدہ بھی کر لیتا ہوں۔"
ثاقب حسن طویل سانس لے کر گویا مطمئن ہو گیا تھا۔ اور اپنی ہتھیلی پر رکھے اُن کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے اُس نے انہیں اپنے اور ربیعہ کے بارے میں بتایا اور پھر اُن سے' ربیعہ سے شادی کر لینے کے لیے کہا۔ وہ کِس قدر حیران ہوئے تھے اور انہیں ثاقب کی دماغی حالت پر شبہ بھی ہوا تھا۔ صاف منع کر دیا۔

لیکن ثاقب حسن نے اُن کی بہت منت سماجت کی یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اُسے یقین ہے کہ وہ ربیعہ کو اُس کی امانت سمجھ کر اپنے گھر رکھیں گے' اور جب وہ اپنی جدّوجہد میں کامیاب ہو کر لوٹے گا تو شہروز احمد اُس کی امانت اُسے لوٹا دیں گے۔ شہروز احمد پھر بھی تیار نہیں ہوئے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر تُل گیا تھا اور یہیں وہ مجبور ہو گئے اور اُنہوں نے ہامی بھر لی۔ پھر ربیعہ باقاعدہ نکاح کے بعد اُن کے گھر آ گئی۔

گو کہ وہ اس ساری صورتحال سے لاعلم تھی لیکن اُنہوں نے 'شبِ زفاف' کے اوّلین لمحوں میں ہی ثاقب حسن کا خط اُس کے ہاتھ میں تھما کر ساری صورتحال اس پر واضح کر دی تھی اور خود بری الذمہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بے ضرر سی لڑکی اگر کچھ عرصہ اُن کے گھر ——— رہ لے گی' تو اس سے انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ اس بے ضرر سی لڑکی کو وہ باقاعدہ بیاہ کر لائے ہیں۔ اور جس بندھن

میں بندھے ہیں، اُس کے تقاضے دُنیاداری کے لیے ہی سہی بہرحال نبھانے پڑیں گے۔

کل تک بلکہ کچھ وقت پہلے تک انہیں اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ امّی کے حکم پر وہ اسے اس پُرفضامقام پہ لے آئے تھے۔ خیال تھا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں رُک کر واپسی کی راہ لیں گے۔ اور اس کے لیے تو ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسی لڑکی کے ساتھ وہ کیا تفریح کرسکتے تھے جس کا صرف وجود اس کے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ اور اب اچانک جیسے ہرشے بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُس کی موجودگی کا نہ صرف احساس دلا رہا تھا بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہے تو سب کچھ ہے۔

"میرے خدا۔" انہوں نے گھنے بالوں میں اُنگلیاں پھنسا کر بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ کچھ حیران بھی تھے، پشیمان بھی کہ اُن کی سوچیں کس رُخ پہ بہنے لگی ہیں۔ کتنے یقین سے ثاقب حسن نے کہا تھا کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور پہ اعتبار نہیں کرسکتا۔"

"لیکن اُسے سوچنا چاہیے تھا کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور سینے میں پتھر نہیں عام انسانوں جیسا دل رکھتا ہوں۔" اُنہوں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے سوچا

اپنی ذمّہ داریوں کو اِحسن طریقے سے نبھانے کے لیے اگر کچھ وقت کے لیے میں نے اپنی ذات کو نظرانداز کردیا تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں ہمیشہ ہی اپنے آپ سے غافل رہتا۔ مجھے بہرحال اپنے لیے سوچنا تھا۔ اور ثاقب حسن! ایک جیتا جاگتا وجود جس کا خمیر شاید قدرت نے دوسروں کو تسخیر کرلینے والی مٹی سے اُٹھایا ہے، میرے سپرد کرکے اتنے اطمینان سے کیسے چلا گیا۔ اُس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب انسان بالکل ہی بے بس و بے اختیار ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں رہا ہوں۔

بخدا، اس گزرتی شب کا ہرپل گواہ ہے کہ میں نے اس چہرے سے نظریں ہٹانے کی بہت کوشش کی لیکن کسی طرح بھی مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔

"یہ ثاقب حسن مجھے کس امتحان میں ڈال گیا ہے؟" وہ کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے آپ سے اُلجھتے ہوئے بالکونی میں نکل آئے۔ رات کا سفر اپنے اختتام پہ تھا۔ گہرے بادلوں میں سے کہیں کہیں اُجالے کی ہلکی سی کرن دن کے آنے کی نوید دے رہی تھی۔

"اگر میں وہاں کھڑی ہوتی تو کیا میں بھی برف میں چھپ جاتی؟" اس کی سادہ سی سرگوشی کہیں آس پاس سُنائی دینے لگی۔ گویا یہاں بھی وہ ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ گھبرا کر دوبارہ اندر آئے۔ وہ ابھی تک اسی طرح سورہی تھی۔ دل چاہا جھنجھوڑ کر اٹھا دیں اور پوچھیں 'میری نیند چُرا کر تم اتنے سکون سے کیسے سو رہی ہو؟'۔ بے اختیار ایک قدم اس کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ جیسے ہوش میں آ گئے۔

"مجھے اس سے دُور چلے جانا چاہیے۔ شاید اس کے سحر سے نکل سکوں۔" انہوں نے سوچا اور کوٹ پہن کر جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ پھر جاتے جاتے ایک کاغذ پر چند لائنیں گھسیٹ کر اس کے سرہانے رکھ گئے تھے

اُن کے جانے کے کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اُٹھی تھی۔ انہیں کمرے میں نہ پاکر پہلے یہی سمجھی کہ باتھ روم میں ہوں گے یا پھر بالکونی میں۔ لیکن دونوں دروازے بند تھے۔ کندھے اُچکاتے ہوئے دوپٹے کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ تو تکیے پر رکھا کاغذ ہاتھ میں آ گیا۔ فوراً دیکھنے لگی۔

"میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہوجائے
گی۔ شام یا ہوسکتا ہے رات بھی ہو جائے۔"

"مطلع کرنے کا شکریہ شہروز احمد۔" وہ قدرے اُونچی آواز میں بڑبڑائی۔ "یہ تکلّف نہ بھی کرتے، تو مجھے کون سا انتظار رہنا تھا۔"

اب جب یہ معلوم ہوگیا تھا کہ شہروز اس پاس موجود نہیں ہیں۔ اور فوراً آئیں گے بھی نہیں تو وہ اطمینان سے گنگناتی ہوئی اُٹھی۔ منہ ہاتھ دھو کر انٹرکام پر ناشتے کے لیے کہا اور بالکونی میں نکل آئی۔

اس وقت برفباری نہیں ہو رہی تھی البتہ گہرے بادلوں کے قافلے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے چلے آرہے تھے۔ اُس نے گہری سانس لے کر دوبارہ خارج کی تو ہونٹوں سے بھاپ نکلی۔ جیسے سگریٹ کا دُھواں۔ وہ خاصی محظوظ ہوئی اور بار بار ہونٹوں سے بھاپ اُڑانے لگی۔

دروازے پہ دستک دے کر شاید ویٹر اندر آگیا تھا۔ میز پہ برتن رکھنے کی آواز آنے لگی تھی۔ اُس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر اُس کے جانے کے بعد اندر آئی۔ اطمینان سے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر ابھی چائے کے دو تین سپ ہی لیے تھے کہ انٹرکام پر منیجر نے بتایا، کراچی سے اس کی کال ہے۔ وہ کپ چھوڑ کر تقریباً بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ دوسری طرف امّی تھیں۔

"السلام علیکم امّی۔" اُن کی آواز سُنتے ہی اُس نے سلام کیا۔ بھاگنے کی وجہ سے سانس پھولی ہوئی تھی، جبھی امّی قدرے پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا بیٹا، خیریت سے تو ہو ناں؟"

"جی ٹھیک ہوں، اصل میں بہت جلدی میں سیڑھیاں اُترتی ہوئی آئی ہوں اس لیے سانس پھول رہی ہے۔"

"اور یہ شہروز کہاں ہے؟"

"وہ ابھی کسی کام کے سلسلے میں نکلے ہیں۔"

"وہاں بھی اُسے کام یاد آگئے اور تمہیں اکیلا چھوڑ کر گیا ہے۔؟" امّی کے کہنے پر لمحہ بھر کو وہ گڑبڑا گئی۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولی۔

"جی، میں خود نہیں گئی۔ اصل میں سردی اتنی ہے کہ باہر نکلنے کی ہمّت نہیں ہوئی اور نِدا کیسی ہے؟" آخر میں بات بدل گئی۔

"ٹھیک ہے۔ اچھا شہروز آئے تو اس سے کہنا مجھے فون کرے۔"

"جی اچھا۔" اس نے خداحافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اور منیجر کا شکریہ ادا کرتی ہوئی اُوپر آگئی۔ اب کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس کی غیرموجودگی میں کمرے کی صفائی ہوچکی تھی اور ویٹر ناشتے کا سامان بھی لے گیا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی بے دلی سے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر میگزین لے کر بیڈ پر آبیٹھی۔ کمبل ٹانگوں پر کھینچ کر میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے اچانک ذہن بھٹک گیا۔

"تم تو بس اتنا کرنا میری جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سجانا اور تمہاری آنکھوں میں جو میں نے محبتوں کے دیپ جلائے ہیں، انہیں یوں ہی جلتا رکھنا۔"

آس پاس دھیمی دھیمی سرگوشیاں سُنائی دینے لگیں تو اُس نے پلکیں موند کر بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا لیا اور کھو جانا تو اُس کی عادت تھی۔ پھر اس وقت کوئی اور موجود بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی ڈسٹرب کر دینے والی آواز، نہ چونکا دینے والی آہٹ۔ کچھ بھی نہ تھا۔ بس گئے دنوں کے کچھ حسین لمحات جو درِ دل پر دستک دیتے چلے آرہے تھے۔ اور دل کے دریچے کیا وا ہوئے کہ یادوں کی برسات اُترتی چلی آئی جس میں اس کا تن من بھیگنے لگا۔

وہ کالج سے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ اس کی ہمراہی میں طے کرنا۔

وہ کبھی کبھار اس کا نرمی سے ہاتھ چھو لینا۔

وہ آزردگیوں میں حوصلہ دیتے ہوئے اس کا ہونٹ بھینچ لینا۔

کیا کیا نہ یاد آیا۔ یادوں کے میلے میں بھٹکتے ہوئے وہ حال سے بالکل ہی ناتا توڑ بیٹھی تھی، جب ہی تو شہروز احمد کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ اُسے نظرانداز کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا یہ روپ نظرانداز کر دینے والا ہرگز نہیں تھا۔ پلکوں کا لرزنا۔ ہونٹوں کا متحرک ہونا۔ اور چہرے پر پھیلے قوس وقزح کے رنگ۔

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے بے حد خاموش نظروں سے اُسے دیکھے گئے۔ اُس کے متحرک ہونٹ اچانک کُھلے اور پھر ایک دوسرے پر جم گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ بار بار ایسا کر رہی تھی۔ بے خیالی میں انہوں نے بھی اسی کے انداز میں اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور جیسے ہی ہونٹ نیم وا ہو کر دوبارہ ایک دوسرے پر جمے، وہ

چونک گئے۔

"ثاقب۔" دل ہی دل میں دہراتے ہوئے وہ بے چین ہو گئے۔ جس سے فرار کی خاطر وہ صبح ہی یہاں سے نکل گئے تھے۔ خیال تھا اس سے دُور ہوں گے تو اس کے سحر سے بھی آزاد ہو جائیں گے۔ لیکن وہ تو ہر جگہ جیسے ان کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اس کا خیال اتنا زور آور تھا کہ کہیں بھی چین نہیں لینے دیا بالآخر ہار مان کر وہ واپس لوٹ آئے اور جس کی خاطر لوٹے تھے، وہ کسی اور کے تصور میں گم شدت سے اُسے یاد کر رہی تھی۔

ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی اور محض اس کا تصور توڑنے کی غرض سے کھانسنے لگے۔

اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور انہیں دیکھ کر سیدھی بیٹھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"آپ کب آئے؟۔"

"ابھی جب آپ نے دیکھا۔" وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگے۔ وہ کچھ دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہی پھر اس خیال سے کہ شاید وہ لیٹنا چاہیں۔ بیڈ سے اُتر آئی۔

"آپ کیوں اُٹھ گئیں؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کنارے والے صوفے پر جا بیٹھی، پھر کہنے لگی۔

"امّی کا فون آیا تھا؟۔"

"خیریت؟۔ کیا کہہ رہی تھیں؟۔"

"کوئی خاص بات نہیں البتہ یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ انہیں فون کر لیجیے گا۔"

"اچھا۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ "فون کرنے کی بجائے کل ہم لوگ خود چلتے ہیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"یہی مناسب ہے۔" پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "چلیے مال روڈ چلتے ہیں، آپ کچھ شاپنگ کر لیں۔"

"میں۔؟" اپنی طرف اشارہ کیے وہ کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔ "لیکن مجھے تو کچھ نہیں لینا۔"

"کیوں؟ ندا کے لیے گفٹ نہیں لینا۔"

"ہاں، اس نے کہا تو تھا۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"چلیں جلدی سے ڈریس چینج کر لیں، پھر آ کر پیکنگ کریں گے۔"

وہ خاموشی سے اُٹھی۔ اور اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"کوٹ پہن لیں، باہر سردی زیادہ ہے۔" وہ اسے ہلکا سا سوئیٹر پہنے دیکھ کر کہنے لگے۔ اُس نے سوئیٹر پھینک کر کوٹ اُٹھا لیا اور ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

یہ پہلا موقع تھا جو وہ اُن کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا یہی بہت ہے کہ وہ اسے اپنے گھر میں جگہ دیے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے مزید کوئی چیز اسے نہیں لینی چاہیے۔ اس لیے وہ ہر شوکیس پر سرسری نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

آخر اُنہیں پوچھنا پڑا۔ "کیا لیں گی ندا کے لیے؟۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟۔" وہ دامن بچانے لگی۔

"ارے۔" وہ قدم روک کر کھڑے ہو گئے۔ "اُس نے تو بڑے مان سے کہا تھا کہ آپ اپنی مرضی اور پسند سے کوئی چیز لے آئیے گا۔"

"ہاں لیکن مجھے اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا چیز پسند کرے گی؟۔"

"آپ جو بھی چیز لیں گی، وہ ضرور پسند کرے گی، یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ ہنس پڑی۔ "یہ جاننے کے باوجود کہ میری پسند صرف ظاہری خوبصورتی کی حد تک ہے۔"

"ہاں۔" وہ براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے تھے۔ وہ نروس ہوئی اور رُخ موڑ کر دوکان کے اندر داخل ہو گئی۔

ندا اور امّی کے لیے اس نے سوٹ اور گرم شال پسند کی۔ اور جب پیک کرنے کے لیے کہا تو وہ پوچھنے لگے "اپنی سسٹرز کے لیے نہیں لیں گی؟"

"نہیں۔" اس نے منع کیا۔ اس کے باوجود انہوں نے خود سیلزمین سے تین سوٹ اور پیک کرنے کے لیے کہا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی لیکن باہر آ کر اُلجھ پڑی۔

"یہ سب ندا کے لیے ہیں۔ میں اپنی کسی سسٹر کو نہیں دوں گی۔"

"آپ مت دیجیے گا۔ میں دے دوں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اور اَب واپس چلیں۔"

"واپس بھی چلیں گے۔ پہلے آپ اپنے لیے تو شاپنگ کر لیں۔"

"مجھے کچھ نہیں لینا۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"کیوں نہیں لینا؟۔ امّی اور خاص طور پر ندا پوچھے گی کہ آپ اپنے لیے کیا لائی ہیں، تو کیا دِکھائیں گی؟"

"میں کچھ بھی کہہ دوں گی، بس اَب واپس چلیں۔" وہ اُلجھ کر بولی۔

"اس طرح نہیں۔ آئیے اِدھر چلتے ہیں۔"

"شہروز پلیز، آپ سمجھتے کیوں نہیں۔؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا سمجھانا چاہتی ہیں آپ مجھے؟۔" اس کا اُلجھنا اور خفا ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

"میں کیا سمجھاؤں گی، آپ خود۔" وہ خاموش ہو کر نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"چلیے، یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں بعد کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال تو آپ میرے ساتھ آئیں۔"

وہ اسے لیے ہوئے ایک دوکان کے اندر داخل ہو گئے۔ پھر مختلف دُوکانوں سے اس کے لیے مختلف چیزیں خریدیں۔ اس دوران وہ احتجاجاً خاموش رہی اور کسی چیز میں دلچسپی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ حالانکہ ہر بار انہوں نے اس کی پسند پوچھی۔ کوئی بھی چیز پیک کروانے سے پہلے اس سے پوچھا کیسی ہے؟ جواب میں وہ ان کی طرف سے منہ پھیر گئی۔ وہ اُس کی اِس حرکت سے محظوظ ہوئے۔ واپسی میں تمام شاپنگ بیگ بیڈ پر رکھے اور خود بھی وہیں نیم دراز ہوتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں نے سُنا تھا لڑکیاں شاپنگ کی بڑی دلدادہ ہوتی ہیں۔ لیکن آپ تو سارا وقت بہت بیزار رہیں۔ کیا واقعی آپ کو شاپنگ سے کوئی دلچسپی نہیں؟۔"

جواب میں وہ ہاتھوں میں چہرہ چُھپا کر رو پڑی۔

"ارے۔" وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس کے قریب آتے ہوئے قدرے پریشانی سے پوچھنے لگے۔ "ربیعہ کیا ہوا ہے؟"

وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"ربیعہ۔" انہوں نے پکارا اور چاہا کہ اس کی دونوں کلائیاں تھام کر چہرے سے ہاتھ ہٹا دیں۔ لیکن پتا نہیں وہ کیا سمجھے، یہی سوچ کر اپنے آپ کو باز رکھا۔

"پلیز خاموش ہو جائیں۔" قدرے رعب سے کہا تو وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا؟۔" وہ اُس کی بھیگی پلکوں پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

"شہروز احمد۔ آپ جانتے ہیں کہ میں زبردستی آپ پر مُسلط کی گئی ہوں۔ آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ مجھے اپنے گھر میں جگہ دی اور اس نام نہاد بندھن کے تقاضے نبھانے کی خاطر آپ کو اپنے ضروری کام چھوڑنے پڑے

پڑتے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ مجھے زیرِبار نہ کریں۔ میں آپ کا احسان اُتارنے کی اہل نہیں ہوں۔" بار کے اختتام پر اُس نے سر اُٹھایا تو وہ اس کی سُرخی مائل آنکھوں میں دیکھتے رہ گئے۔ اور دل میں یہ خواہش بھی جاگی کہ ان بے حد حسین آنکھوں کی پہریدار پلکوں کو نرمی سے چھُولیں۔

"ربیعہ۔" بمشکل تمام اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر پائے۔ "سب سے پہلے تو دل سے یہ خیال نکال دیجیے کہ میں نے آپ پر کوئی احسان کیا ہے یا کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بندھن نام نہاد سہی یہ ناتے جھوٹے سہی، پھر بھی ایجاب و قبول نے مجھے کچھ ذمّہ داریوں یا فرائض کا پابند کر دیا ہے اور میں اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"ابھی تو ابتدا ہے اور دو برسوں میں جانے کتنے موسم آئیں گے، جب مجھے آپ کے لیے نہ صرف سوچنا بلکہ کرنا بھی ہے۔ تو کیا ہر بار آپ یہ سمجھیں گی کہ میں آپ پر احسان کر کے آپ کو زیرِبار کر رہا ہوں اور کیا ہر بار آپ مجھے اس بندھن کے نام نہاد ہونے کا احساس دلائیں گی۔ پلیز ربیعہ میرے اندر یہ احساس زندہ ہے میں خود اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔ آپ بار بار کسی بات کو مت دہرائیں اور پھر مجھے صرف آپ کا نہیں اپنا بھی خیال ہے۔ مجھے اپنی پوزیشن بھی صاف رکھنی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مجھے اپنے ہر عمل کے لیے اپنی امّی کے آگے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ وہ میرا آپ کی ذات کو نظر انداز کرنا کسی طرح برداشت نہیں کریں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟" وہ فقط ایک لفظ 'جی' تک نہ کہہ سکی۔

"ربیعہ۔" (کاش وہ آگے 'میری جان' کا اضافہ بھی کر سکتے)۔ "ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے نہ سوچیں۔ یہ ساری باتیں معمول کا حصّہ ہیں، انہیں اسی طرح فیس کریں۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ نادم نظر آنے لگی۔

"کس بات کے لیے؟"

"میں نے آپ کو پریشان کیا۔"

"تم نے مجھے کس طرح پریشان کیا، یہ تم کیا جانو۔" اُنہوں نے سوچا پھر پیکنگ میں اُس کی مدد کرنے لگے۔

امّی جان ان کی اتنی جلدی اور اچانک واپسی پر حیران رہ گئیں۔ ابھی کل ہی تو انہوں نے ربیعہ سے فون پر بات کی تھی۔ اور اُس نے اپنی آمد کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

"اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے؟" امّی اچنبھے سے پوچھنے لگیں۔

"ربیعہ سے پوچھیں۔" انہوں نے مُسکرا کر اُس پر بات ڈال دی اور اس کے گڑبڑا کر دیکھنے سے خاصے محظوظ ہوئے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ کیا وہاں دل نہیں لگا یا شہروز زبردستی واپس لے آیا ہے؟"

"نہیں تو۔ اصل میں۔" فوری طور پر کوئی بہانہ نہیں سُوجھا تو پھر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہیں رحم آگیا اس کی بات سنبھالتے ہوئے کہنے لگے۔

"اصل میں یہ خاصی نازک مزاج ہیں۔ وہاں کے موسم کی شدّتیں برداشت نہیں کر پائیں۔ جاتے ہی نزلہ اور زُکام شروع ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہوتیں، میں واپس لے آیا۔ آپ ان کی شکل نہیں دیکھ رہیں۔"

"ہاں۔" امّی نے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کمزور لگ رہی ہے ورنہ میرا تو خیال تھا، وہاں کی آب و ہوا اچھا اثر ڈالے گی۔"

"ویسے بھابی، اچھا ہوا آپ آگئیں۔ آپ کے بغیر گھر سُونا سُونا لگ رہا تھا۔" نِدا اُس کے گلے میں بازو حمائل کرتی ہوئی بولی۔

"ربیعہ۔ اب آپ جلدی سے نِدا کو اس کا گفٹ دے دیجیے۔ ورنہ یہ یوں ہی جھوٹی محبت جتاتی رہے گی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے ندا کو چھیڑا تو وہ بُرا مانتی ہوئی بولی۔

"آپ کا مطلب ہے۔ میں صرف گفٹ کی خاطر۔؟"

"بالکل۔"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے گفٹ کی۔ میں ایسے ہی بھابی سے بہت پیار کرتی ہوں، آپ سے بھی زیادہ۔"

"مجھ سے بھی زیادہ؟" اُنہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

"بالکل۔" وہ ان ہی کے انداز میں کہہ کر ہنستی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جا کہاں رہی ہو؟"

"چائے لانے۔"

"ہاں یار۔ بہت شدید خواہش ہو رہی ہے چائے کی اور پلیز ذرا جلدی لانا۔" پھر امّی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "مہروز کہاں ہے؟"

"آفس میں۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی اُسے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات کی تو نہیں اُس نے۔ میرا خیال ہے اب وہ آفس کے معاملات اچھی طرح سمجھنے لگا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" اُنہوں نے کارنر ٹیبل کھینچ کر سامنے رکھی اور اس پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے اطمینان بھرا سانس لے کر بولے۔

"مجھے بھی بہت اطمینان ہو گیا ہے۔" امّی کہنے لگیں۔ "تمہاری دن رات کی مصروفیت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اب کچھ وقت فراغت کا تمہیں بھی مل پائے گا۔"

"ہاں۔" انہوں نے کہا اور نِدا کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ جو چائے لے کر آ رہی تھی۔

پھر چائے پیتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں اب سوؤں گا۔ اور پلیز کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے کہنے لگے۔

"نِدا۔ اوّل تو کسی کو میرے آنے کا علم نہیں ہے پھر بھی کوئی فون وغیرہ آئے تو میرا مت بتانا۔"

"جی اچھا۔" نِدا نے سر ہلایا پھر اچانک جیسے کچھ یاد آیا تو کہنے لگی۔ "دو دن پہلے آپ کی کہیں باہر سے کال آئی تھی۔"

"کون تھا؟"

"شاید ثاقب حسن نام تھا۔" نِدا انجانے میں بھونچال لے آئی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر سر اُٹھا کر نِدا کی طرف دیکھنے لگی تھی اور شاید اُس کے مزید کچھ کہنے کی منتظر بھی تھی۔ قریب تھا کہ بے اختیار اُس سے کوئی سوال کر بیٹھتی، وہ اس سے پہلے بول پڑے۔

"کچھ کہا ثاقب حسن نے؟ میرا مطلب ہے کوئی میسیج وغیرہ چھوڑا؟"

"نہیں کہہ رہے تھے پھر رِنگ کریں گے۔"

"اچھا، انتظار رہے گا۔" اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ اُن کے لہجے پر غور کرتی رہ گئی۔

"بیٹا۔ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔" امّی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولی۔

"نہیں امّی۔ میں ٹھیک ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے میں نِدا کو اس کا گفٹ دے دوں۔"

"میں کچھ بھی نہیں لوں گی۔" نِدا بُرا مان کر بولی تھی۔
"کم آن نِدا۔ شہروز تو یوں ہی مذاق کر رہے تھے اور پھر مجھے تمہاری محبت پر بالکل شبہ نہیں ہے"
"سچ کہہ رہی ہیں؟" نِدا معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔
"بالکل سچ۔" اُس نے مسکرا کر نِدا کا گال تھپکا، پھر سوٹ کیس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑ
لگی۔
"آپ کا سوٹ کیس امّی نے آپ کے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔"
"اچھا میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ جلدی میں چل پڑی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹک کر رُک
پڑا۔ شہروز مسہری پر نیم دراز سگریٹ پینے میں مصروف تھے۔ اس پر نظر پڑی تو نظریں اسی پر جمی رہنے
وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔
"میں کہہ کر آیا تھا کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" لہجے کی تلخی اُس نے محـ
لیکن وجہ نہ جان سکی۔
"آئی ایم سوری۔ میں بھول گئی تھی۔"
"میری باتیں یاد رکھا کیجیے۔"
"جی۔"
"کس کام سے آئی تھیں؟"
"جو بھی کام تھا، بعد میں کرلوں گی۔" وہ جلدی سے کہہ کر باہر نکل آئی۔ اور اُس کے پیچھے بند درواز
کو دیکھتے ہوئے وہ اُلجھ گئے۔ اپنے رویے پر خود حیران ہوئے پھر اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگے۔
اصل میں وہ اُس کے ساتھ بہت اچھے موڈ میں آئے تھے۔ اور امّی اور نِدا کے ساتھ خوشگوار م
میں باتیں بھی کیں، لیکن اچانک ثاقب حسن کے ذکر نے اُن کے اندر ناگواری کی لہر دوڑا دی تھی۔ گذشتہ دا
سے وہ بالکل بھی نہیں سوئے تھے اور ان کی آنکھوں کو رتجگا بخشنے والی ربیعہ ہی تھی۔ اب گھر آتے ہی ا
نے سوچا وہ سکون سے لمبی تان کر سوئیں گے، لیکن نِدا نے انجانے میں 'ثاقب حسن' کا نام لے ان کا سار
درہم برہم کر دیا تھا اور پھر جس طرح نِدا کے منہ سے ثاقب حسن کا نام سُن کر ربیعہ نے چونک کر دیکھا تھا
سے بھی وہ خاصے ڈسٹرب ہوئے تھے۔
اور اس وقت سے اپنے کمرے میں آ کر وہ اپنے آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ
کا چونکنا ایک فطری عمل تھا۔ اور ظاہر ہے اسے اسی کے نام پر چونکنا ہے۔ پھر وہ کیوں بُرا مان رہـ
لیکن دل کسی طرح، کوئی بھی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اپنے آپ سے لڑ رہے تھے کہ وہ سامنـ
اور اس سے بات کرتے ہوئے اندر کی ساری تلخی لہجے میں سمٹ آئی۔ اب وہ چلی گئی تھی، شاید ان کـ
رویے کو محسوس کرکے، تو وہ پشیمانیوں میں گھِر گئے۔
کئی بار سوچا جا کر دیکھیں وہ کیا کر رہی ہے اور کسی بھی طرح اپنے روّیے کی تلافی کر دیں لیکن فـ
اپنی سوچ پر عمل کرنا مناسب نہیں لگا تو اپنے آپ پر جبر کرکے سونے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر جب
آئی تو گذشتہ دو راتوں کے رتجگے کی کسر پوری کر دی۔ پورا دن اور پوری رات سوتے رہے۔ صبح بہ
جلدی ان کی آنکھ کھلی تو طبیعت خاصی فریش تھی۔ ذہن بھی ہلکا پھلکا تھا۔ فوری طور پر کوئی بات یاد
آئی پھر جب سوٹ کیس پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ وہ تو صبح آئے تھے۔ فوراً کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔
دن کی تاریخ دیکھ کر حیران رہ گئے۔
"میرے خدا، اتنی بے خبری کی نیند تو میں کبھی نہیں سویا۔" پیشانی پر آئے بالوں کو انگلیوں سے پـ
ہوئے سوچا، پھر فوراً ہی ربیعہ کا خیال آیا۔ وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ بہت آہستگی سے بیڈ۔
اُترے اور اسی طرح احتیاط سے اسٹڈی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ صوفے پر سو رہی تھی جہاں اُسـ

ـنے کے بعد سے وہ خود سویا کرتے تھے۔ انہیں افسوس ہونے لگا۔ پتا نہیں وہ آرام سے سوئی ہوگی یا نہیں۔
پتا نہیں ان کے بارے میں کیا خیال کیا ہوگا؟۔
یہی سب سوچتے ہوئے گاؤن پہن کر لان میں نکل آئے۔ رُخصت ہوتا اندھیرا اُجالے کی آغوش میں پناہیں
ڈھونڈ رہا تھا۔ مخملیں گھاس شبنم سے غسل کرکے نکھر آئی تھی۔ اور چاروں طرف قطار سے لگے پودوں پر کھلتے پھول
انہیں 'صبح بخیر' کہہ رہے تھے۔ ہوائیں الگ سرگوشیاں کرتی ہوئی اُن کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ انہوں نے آہستہ روی
ـے پورے لان کا چکر لگایا اور پلٹنے لگے، تو مہروز کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہیں رُک گئے۔
"السلام علیکم۔" مہروز نے قریب پہنچ کر سلام کیا تو جواب میں انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔
"کیسے ہو؟" مسکرا کر پوچھا۔
"فائن۔ آپ بتائیے، ہنی مون سے اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے؟"
"بس یار۔"
"میں کل شام میں آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ سو رہے تھے۔"
"ہاں میں بہت لمبی نیند سویا۔ تم مجھے اُٹھا دیتے۔"
"میں نے کہا تھا لیکن بھابی نے منع کر دیا، کہنے لگیں آپ نے سختی سے منع کیا ہے کہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"
"ہاں، میں نے ایسا ہی کہا تھا۔" انہوں نے اعتراف کیا۔ "تم بتاؤ آفس میں سب ٹھیک ہے؟"
"اور تو سب ٹھیک ہے، بس ذرا جے جے کنسٹرکشن والے پے منٹ میں کچھ پس و پیش سے کام لے رہے
ہیں۔"
"پے منٹ کے معاملے میں وہ ایسے ہی ہیں، جب پیسوں کی بات آتی ہے، ان کی کمپنی دیوالیہ ہو جاتی ہے۔"
ہنستے ہوئے بولے۔
"اگر ایسی بات ہے تو آپ ان کا ایگریمنٹ کینسل کر دیں۔"
"نہیں خیر ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ لوں گا انہیں۔" دونوں آفس کے معاملات ڈسکس کرتے ہوئے
برآمدے میں آ بیٹھے تو خانساماں اُن کے لیے چائے لے آیا۔
"بھابی اُٹھ گئیں؟" مہروز چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"پتا نہیں، اصل میں میں بہت جلدی اُٹھ گیا تھا۔ اس وقت وہ سو رہی تھیں۔" انہوں نے لاعلمی کا اظہار
کیا پھر فوراً چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔
"ویسے آپ بہت لکی ہیں شہروز بھائی کہ ربیعہ بھابی جیسی لڑکی آپ کی شریکِ سفر ہے۔"
"اچھا۔" وہ خوامخواہ ہنسے۔ "کیا وہ بہت اچھی ہے؟"
"کیوں؟ آپ کو شک ہے کیا؟"
"نہیں خیر مجھے تو شک نہیں ہے، وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔" صرف مہروز کے سامنے ہی اعتراف
نہیں کیا، دل بھی گواہی دے رہا تھا۔
"امّی بھی ان کی بہت تعریف کرتی ہیں اور نِدا تو جی جان سے فِدا ہے۔"
وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ربیعہ کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر اپنی بات ہونٹوں میں روک لی جب کہ مہروز اسے
دیکھتے ہی کہنے لگا۔
"بڑی عمر ہے آپ کی، ابھی ہم آپ ہی کا ذکرِ خیر کر رہے تھے۔"
"ابھی تو میں زندہ ہوں۔" وہ انہیں نظر انداز کرکے پُوری طرح مہروز کی طرف متوجہ تھی۔
"کیا مطلب؟" مہروز واقعی نہیں سمجھا۔
"بھئی ہمارے ہاں ذکرِ خیر تو اب صرف مرنے والوں ہی کا کیا جاتا ہے اور میں تو خوش قسمتی سے کہہ لو یا بدقسمتی
سے، زندہ سلامت کھڑی ہوں۔"

"ربیعہ —" انہوں نے ٹوکا "صبح ہی صبح کیسی باتیں کرنے لگیں؟"

"سوری —" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"بھابی، آپ کی یہی بات بہت اچھی ہے۔ فوراً مصالحت پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ آپ کی جگہ کو[illegible] ہوتی تو یہیں بحث کرنے کھڑی ہو جاتی۔ سارا الزام میرے سر رکھ کر کہتی مہروز نے ایسی بات کہی جب [illegible] نے ایسا جواب دیا۔ اور جب تک مجھے بھائی جان سے ڈانٹ نہ پڑوا دیتی، اسے چین نہ آتا۔"

"مہروز —" اب انہیں مہروز کو ٹوکنا پڑا "بات کو مزید طول دینے کے بجائے جا کر ربیعہ کے لیے [illegible] کا کہو۔"

"جی اچھا —" وہ اٹھنے لگا تو اس نے روک دیا۔

"میں چائے نہیں پیوں گی اور ویسے بھی اب میں کچن میں جا رہی ہوں" اس کے ساتھ ہی وہ کچن کو[illegible] گئی۔ اور وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ سمجھ گئے کہ وہ ان کے کل کے رویّے سے خفا ہے اور [illegible]ہے تو بھی احتجاجاً انہیں نظر انداز کر رہی ہے۔

پھر جب وہ نہانے کے بعد آفس کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی غرض سے ڈائننگ روم میں آئے تو [illegible] دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

"خوب سوئے؟"

"جی کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔" کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے خود ہی تو منع کیا تھا اور یہ اب کہاں کی تیاری ہے؟"

"ظاہر ہے آفس جاؤں گا۔"

"بیٹا، آفس تو تمہیں جانا ہی ہے۔ اگر دو ایک دن اور آرام کر لیتے تو۔"

"لیکن امی، گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گا؟"

"گھر میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ربیعہ کو اس کے میکے لے جاؤ۔"

"آج ہی؟"

"ظاہر ہے بچی اپنے گھر والوں سے ملنا چاہے گی۔ اور کیا تمہیں اس بات کا خیال نہیں ہے؟" ا[illegible] تنبیہی انداز اختیار کیا۔

"ربیعہ نے کہا ہی نہیں۔" وہ خود بری الذمہ ہونا چاہتے تھے کہ امی نے ٹوک دیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شہروز احمد؟ کیا ہر بات وہ کہے گی تب ہی تمہیں خیال آئے گا۔ تمہیں اس کے [illegible] خیال رکھنا چاہیے۔"

"جی آئندہ ایسا ہی ہوگا۔" وہ چائے کا آخری گھونٹ لے کر کھڑے ہو گئے۔ "ربیعہ! ناشتے کے بع[illegible] جانا ہے گا، چلیں گے۔"

"جی —" وہ ان کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پائی۔ یوں ہی سر جھکائے ہوئے بولی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد وہ ڈرتے ڈرتے کمرے میں آئی تھی۔ کہیں وہ کوئی سخت بات نہ کہہ دیں لیکن[illegible] میں موجود نہیں تھے۔ اس نے شکر کیا اور جلدی سے الماری سے سوٹ نکال کر باتھ روم میں گھس[illegible] اپنے آپ میں گلٹی فیل کر رہی تھی۔ ٹھیک کہا تھا شہروز نے کہ امی ان کا اس کی ذات کو نظر انداز کرنا کب[illegible] نہیں کریں گی اور اب ایسا ہی ہوا تھا۔ تیار ہو کر وہ کمرے سے نکلی تو شہروز امی کے ساتھ ٹی وی لاؤنج [illegible] نظر آئے۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"وہ گفٹ لے آئیں جو میں نے آپ کی سسٹرز کے لیے لیے تھے۔"

وہ ان ہی پیروں واپس لوٹ گئی اور جب تینوں گفٹ ایک شاپنگ بیگ میں لے کر واپس آئی [illegible] اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے بھی امی سے اجازت لی اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

"آئی ایم سوری ربیعہ —" وہ گاڑی اس کے گھر جانے والے راستے پر ڈالتے ہوئے بولے۔ "کل میں آپ کے ساتھ کچھ تلخی سے پیش آیا۔"

"یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو معمول کا حصہ ہیں شہروز احمد اور مجھے انہیں فیس کرنا ہے۔" وہ اتنی جلدی اپنی بات لوٹائے جانے پر حیران تھے۔ جب ہی تو بقیہ تمام راستہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

اماں کے گھر میں وہی معمول تھا۔ ناشتے کے بعد چھوٹی آپا صفائی میں لگی ہوئی تھیں اور اماں برآمدے میں رکھے تخت پوش پر بیٹھی شاید دوپہر کے کھانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ کیا پکنا چاہیے؟۔ ان دونوں کو آتے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ اسے سینے سے لگایا پھر شہروز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چھوٹی آپا کو آواز دینے لگیں۔

"صوفیہ۔ اندر سے کرسی لیتی آؤ شہروز میاں کے لیے۔"

"ارے نہیں اماں — میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ وہیں اماں کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گئے جب کہ وہ ابھی آئی، کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

چھوٹی آپا تک شاید اماں کی آواز نہیں پہنچی تھی، جب ہی وہ اب تک جھاڑو دینے میں مصروف تھیں۔ اس نے پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور اس کے ہاتھوں کو چھوتے ہی چھوٹی آپا کہنے لگیں۔

"ارے ربیعہ — تم کب آئیں؟"

"ابھی —" وہ سامنے سے آ کر ان سے لپٹ گئی پھر الگ ہوتے ہوئے بولی "یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ رکھیں جھاڑو۔ شہروز بھی آئے ہیں۔"

"اچھا کہاں ہیں؟"

"باہر اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔"

"چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔" چھوٹی آپا ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتی ہوئی اس کے ساتھ کمرے سے نکلیں۔ شہروز کو سلام کیا پھر اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

"ارے بیٹا۔ پہلے چائے وغیرہ کا تو پوچھ لو۔" اماں نے ٹوکا۔ تو چھوٹی آپا فوراً معذرت کرتی ہوئی اٹھنے لگیں لیکن اس نے روک دیا۔

"چھوٹی آپا۔ ہم ابھی ناشتا کر کے آ رہے ہیں۔"

"صرف چائے پی لینا۔"

"میں بالکل نہیں پیوں گی البتہ شہروز سے پوچھ لیں، یہ پینا چاہیں تو۔"

"صرف ایک کپ چائے پر آپ ہمیں ٹرخانا چاہتی ہیں تو ضرور پلا دیں ورنہ میں تو آج فراغت سے آیا تھا۔" ان کے ہلکے پھلکے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"شہروز بھائی، آپ کا اپنا گھر ہے۔ ابھی میں آپ کو چائے بھی ضرور پلاؤں گی اور کھانے میں جو آپ پسند کریں گے وہی۔"

"اچھا۔" وہ ہنسے "بیٹھ جائیں آرام سے۔ مجھے اس وقت چائے کی بالکل خواہش نہیں ہے۔"

"تکلف تو نہیں کر رہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"چلیے اب یہ بتا دیں۔ کھانے میں کیا پسند کریں گے؟"

"بھئی جو آپ پکا دیں گی، وہی کھا لوں گا۔" پھر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگے "کیوں ربیعہ، میں نے کبھی کسی خاص چیز کی فرمائش کی ہے؟" اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ اور اماں کا پاندان کھول کر اس میں سے چھالیہ نکالنے لگی۔

"ربیعہ —" چھوٹی آپا کو اچانک یاد آیا تو کہنے لگیں "ایک خوشخبری سنو، بڑی آپا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔"

"کیا —؟" اس کے منہ سے حیرت اور خوشی کی ملی جلی چیخ نکل گئی "سچ اماں کیسا ہے؟ کس پر گیا ہے؟"

آپ نے دیکھا ہے اور بڑی آپا اس وقت کہاں ہیں؟" ایک ہی سانس میں سوال پہ سوال کیے گئی۔

"توبہ ربیعہ۔ تم تو پاگل ہی ہوگئیں؟" چھوٹی آپا ہنسیں۔

"پاگل کر دینے والی خوشی ہی تو ہے۔ میں ابھی اسے دیکھوں گی۔ چلیں شہروز۔" اُنہیں مخاطب کرتے بے اختیار اُن کے کندھے پہ ہاتھ رکھ گئی اور وہ جو اُس کے چہرے پر خوشی کے اَن گنت رنگوں کی برسات دیکھ رہے تھے۔ کندھے پہ اُس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے چونک گئے۔

"چلیں گے۔"

"چلیں گے نہیں، ابھی چلیں۔" کندھے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اصرار کیا۔ پھر اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی "کیوں اماں، میں ابھی جاؤں ناں؟"

"چلی جانا بیٹا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ دوپہر کے کھانے کے بعد چلی جانا۔"

"نہیں اماں۔ میں ابھی جاؤں گی۔ دوپہر کے کھانے تک آجائیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اماں کی اجازت ملتے ہی وہ شہروز احمد کی طرف دیکھنے لگی تو وہ کندھے اُچکا کر کھڑے ہوگئے۔

"ہیں کہاں بڑی آپا؟ ہاسپٹل یا گھر؟" وہ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگی۔

"گھر پہ ہیں۔" چھوٹی آپا اُس کی بوکھلاہٹ پر بے ساختہ ہنسیں اور وہ جلدی سے شہروز کے ساتھ باہر آگئی۔

"لگتا ہے آپ کو بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"ہاں، بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ اپنی دُھن میں مگن کہنے لگی "بڑی آپا کے لیے میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ اللہ میاں انہیں بیٹا دے۔"

"بیٹا ہی کیوں؟"

"اصل میں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے ناں اور اماں کو بھی ہمیشہ بیٹے کے نہ ہونے کا احساس رہا۔ اس لیے ہم سب کی خواہش تھی کہ بڑی آپا کی گود میں پہلے بیٹا آئے۔"

"چلیے۔ آپ کی دعائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ ویسے بھی شاید شدت سے مانگی جانے والی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔"

"شاید نہیں، یقیناً۔"

"اچھا۔" انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے بولے "اور کون کون سی دعائیں آپ شدت سے مانگا کرتی ہیں؟" وہ ان کی بات پر چونکی اور فوری طور پر جواب دینے کے بجائے قیاس کرنے لگی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"آپ نے بتایا نہیں؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا تو وہ براہِ راست جواب دینے کے بجائے رُک رُک کر یوں بولی۔

"کوئی ایک نہیں شہروز احمد! دعائیں تو بے شمار ہیں جو شدت سے مانگا کرتی ہوں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مستجاب وہی دعائیں ہوں گی۔ جنہیں اُوپر والا میرے حق میں بہتر سمجھے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے لیکن اکثر لوگ دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے پر شکوہ کناں رہتے ہیں۔"

"ان اکثر لوگوں میں مجھے بھی شامل کرلیں کیونکہ میں بھی کبھی کبھی شاکی ہوجاتی ہوں۔" اُنہیں اس کی صاف گوئی اچھی لگی اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ ایک طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"آپ شاید بھول گئے بڑی آپا کا گھر یہ ہے بس یہیں روک دیں۔"

اُنہوں نے گاڑی بند کی پھر اس سے کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے یوں خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں ہے۔"

"لیکن اب تو آگئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گئی۔ انہوں نے گاڑی لاک کی۔ پھر اس کے قریب آکر جیب سے پرس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور اُس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔

"آپ بچے کی خالہ ہیں۔ اوّل تو آپ کو خالی ہاتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اور اگر آہی گئی ہیں تو پلیز بچے کا ہاتھ خالی مت رہنے دیجیے گا۔" اُس نے خجل ہوکر اُن کے ہاتھ سے پرس لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بڑی آپا کو اُس نے ڈھیروں مبارکباد دی اور فوراً بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ دولہا بھائی بھی گھر پہ تھے۔ شہروز اُن کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ کسی کسی وقت اس کی طرف دیکھ لیتے۔ جو بچے کو گود میں لیے کبھی اُس کے ہاتھوں کو اپنے گالوں کے ساتھ لگا لیتی اور کبھی اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی ٹکا لیتی۔ ساتھ ساتھ بڑی آپا سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ ملازمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آئی تو بڑی آپا نے اُسے چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ اُس نے بچے کو اُن کے برابر لٹایا، پھر آکر چائے بنانے لگی۔

"ربیعہ۔" دولہا بھائی اسے مخاطب کر کے شرارت سے کہنے لگے "تم ہنی مون کا کیا تحفہ لائی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی جس طرح ہمارا ہنی مون کا تحفہ یہ نومولود ہے۔"

'میرے خدا۔ یہ دولہا بھائی کیا کہہ رہے ہیں، وہ بھی شہروز احمد کے سامنے۔'

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہتھیلیاں تر ہوگئیں اور چہرے سے لگا جیسے گرم گرم بھاپ نکل رہی ہو۔ شہروز احمد کی موجودگی کے احساس نے تو سر اُٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دل چاہا سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی یہاں سے نکل جائے۔ شہروز احمد اس کی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ دولہا بھائی اسے مزید چھیڑتے، انہوں نے موضوع بدلنے کی غرض سے بزنس کی باتیں چھیڑ دیں۔

اُس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے جلدی سے چائے بنا کر ٹرالی اُن کے آگے دھکیل دی۔ اور اپنی چائے لے کر دوبارہ بڑی آپا کے پاس آبیٹھی۔ پھر چائے پیتے ہی وہ جانے کی بات کرنے لگی۔ دولہا بھائی، شہروز کو کھانے کے لیے روک رہے تھے۔ اُس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ کھانا وہ اماں کے گھر کھائیں گے۔ پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"چلیں ربیعہ۔"

"جی۔" وہ اجازت طلب نظروں سے بڑی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

"ربیعہ۔" شہروز احمد نے دوبارہ پکارا اور اس کے دیکھنے پر جانے کیا اشارہ کیا۔ وہ نہیں سمجھی تو دل ہی دل میں اس کی بیوقوفی پر ماتم کرتے ہوئے خود ہی کہنے لگے۔

"اصل میں ہم اتنی جلدی میں آئے کہ بچے کے لیے کچھ لا نہ سکے۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے یاد آیا فوراً بیگ کھول کر ان کے پرس میں ہاتھ ڈالا اور یہ دیکھے بغیر کہ ہاتھ میں کتنے کا نوٹ آیا ہے، بچے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ شہروز احمد نے اس کا ہاتھ مٹھی میں دبا لیا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" دبے دبے لہجے میں ڈانٹا۔

"کیا ہوا؟" سادگی سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ غیر محسوس طریقے سے اس کا ہاتھ پیچھے کیا پھر بڑی آپا اور دولہا بھائی کے منع کرنے کے باوجود خود ہی پانچ سو روپے بچے کو دیے اور یوں ہی اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آگئے۔ وہ ان کی اس حرکت پر اندر ہی اندر بہت اُلجھ رہی تھی لیکن جب گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے اس کا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کیا تو وہ دس کا نوٹ دیکھ کر بے حد شرمندہ ہوئی۔

"آخر کہاں رہتی ہیں آپ؟" انہوں نے غصے سے کہا تو وہ سر جھکا کر نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اگر یہ بچے کے ہاتھ میں چلا جاتا تو ۔۔ ؟"

"آئی ایم سوری۔"

"آئی ایم سوری۔" اسی کے لہجے میں کہا اور گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔

"ذہن کو حاضر رکھا کیجیے۔ آئندہ آپ کی اس قسم کی حماقتیں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ سمجھیں آپ" امّاں کے گھر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے اسے وارننگ دی تھی۔

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ اگر ثاقب حسن کا خیال درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اب تک شہروز احمد کے گھر اور ان کے ماحول میں مکمل طور پر رچ بس گئی ہوتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس گھر میں کچھ عرصہ کی مہمان ہے۔ اس لیے امّی کی بے پناہ شفقتوں، ندا کی جان چھڑکنے والی اداؤں اور مہروز کی معتبر کر دینے والی باتوں کے باوجود اس نے اپنی حد قائم رکھی۔

امّی اس کی ہر بات میں 'جی' کہنے کی عادت کو اس کی سعادت مندی پر معمور کرتی تھیں۔ لیکن حقیقت میں وہ دامن بچایا کرتی۔ اس کا خیال تھا اسے اس گھر کے معاملات میں دخل دینے یا رائے دینے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ سرے سے اس گھر کی فرد ہی نہیں ہے۔ چھ مہینے ہو گئے تھے اسے اس گھر میں آئے ہوئے اور اس تمام عرصے میں اس نے کبھی ارادتاً اپنی قائم کی ہوئی حد پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے انداز میں اب بھی تکلف اور جھجک اتنی کہ ضرورت کی چیز لینے کے لیے بھی سو بار سوچتی تھی۔ خاص طور سے کبھی اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا۔ امّی احساس دلاتیں یا شہروز خود سے کہتے تب بھی پہلے انکار کرتی پھر مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑتے۔

اس کا خیال تھا گھر والے بہت جلد اس کے اس رویے سے بیزار ہو جائیں گے کہ ہنستی کھلکھلاتی زندگی میں وہ روتی صورت کہاں سے آ گئی ہے، لیکن اس کے برعکس سب اس کے گرویدہ ہوتے گئے۔ اس کا دھیمے میں بولنا اور دھیرے دھیرے چلنا سب کو اچھا لگتا تھا۔ اور یوں ہی دبے پاؤں ہی تو وہ شہروز احمد کے دل کے دروازوں سے ہوتی ہوئی ایوانوں میں جا سجی تھی۔ اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ اس شخص کو اپنا اسیر کر گئی جسے ثاقب حسن اس کا محافظ بنا گیا تھا۔

اور خبر ہوتی بھی کیسے۔ شہروز احمد جس آگ میں جل رہے تھے، انہوں نے اس کی تپش سے اسے محفوظ رکھا تھا۔ اب تک تو وہ اپنے آپ سے ہی لڑ رہے تھے کہ جو ہو رہا ہے، غلط ہو رہا ہے۔ وہ ان کے پاس امانت ہے اور انہیں خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔ وہ شروع سے ہی خاصے حقیقت پسند تھے لیکن کبھی کبھی انسان حقائق سے نظریں چرا بھی لیتا ہے۔ کبھی حالات سے مجبور ہو کر اور کبھی یوں ہی دل کے کہنے میں آ کر۔ اور ان کے ساتھ پتا نہیں کیا معاملہ تھا کہ اس روز آفس سے ذرا جلدی آ گئے۔ وہ اس وقت امّی کے پاس بیٹھی تھی، سب وہیں آ کر بے تکلفی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"ربیعہ۔ میں آپ کی خاطر جلدی آ گیا ہوں۔ چلیے کہیں آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ آپ کو کچھ شاپنگ کرا دوں گا۔" وہ ان کے اس انداز پر بہت حیران ہوئی۔

"چلیں جلدی کریں۔" اس کی حیرت سے پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرائے۔

"جاؤ بیٹا۔ شہروز تمہارے لیے وقت نکال کر آیا ہے۔" امّی نے کہا۔ وہ چپ چاپ ان کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلے آئے۔ ٹی وی لاؤنج تک آئے تو فون کی بیل بجنے لگی۔

"آپ حلیہ ٹھیک کر کے آ ئیں۔" اس سے کہا اور خود فون کی طرف بڑھ گئے۔ پھر ابھی وہ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی۔ کہ وہ پکار کر کہنے لگے۔

"ربیعہ۔ آپ کا فون ہے۔"

وہ وہیں سے پلٹ آئی اور ریسیور ان کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف ثاقب حسن تھا جس کی آواز سنتے ہی وہ گھبرا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی پیشانی شکن آلود تھی۔ اور ہونٹ بھنچے ہوئے

سے متوجہ پا کر قدموں کی زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ربیعہ۔" ثاقب حسن اس کی مسلسل خاموشی پر پکارے جا رہا تھا۔

"ہاں کہو۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ میری پکار کا جواب ہی نہیں دے رہیں۔"

"میں تمہیں ہی سن رہی ہوں۔ کہو کیسے ہو؟"

"تمہارے بن ادھورا ہوں۔"

"یہ بتاؤ، منزل کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے میری جان۔ بس کچھ وقت اور۔ کیا تم گھبرا گئی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "تم مجھے کس مشکل میں ڈال گئے ہو۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔"

"کیا اچھا نہیں لگ رہا؟"

"تم خود سوچو ابھی تمہارا فون شہروز نے ریسیو کیا تھا۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟"

"وہ کچھ نہیں سوچیں گے۔ خوامخواہ ایسی باتوں سے پریشان مت ہوا کرو۔"

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک اچھی خبر سناتا ہوں۔ مجھے ایک بڑی فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔"

"پہلی جاب کا کیا ہوا؟"

"ظاہر ہے چھوڑ دی۔ اب جو جاب ملی ہے وہ میری توقع سے کہیں بڑھ کر ہے اور میں انشاءاللہ بہت جلد۔" شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اپنے کمرے میں کیسے جائے اور کیسے شہروز احمد کا سامنا کرے۔ کشمکش و پیچ میں مبتلا کھڑی سوچ رہی تھی، کہ وہ خود ہی کمرے سے نکل آئے۔ اسے جو یوں کھڑے دیکھا تو کہنے لگے۔

"چلنا نہیں ہے؟"

"جی۔" وہ اسی طرح ان کے ساتھ چل پڑی۔ خیال تھا راستے میں وہ کسی نہ کسی بہانے ثاقب حسن کا ذکر ضرور کریں گے اور پوچھیں گے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اپنا موڈ بھی کافی حد تک خوشگوار کر لیا تھا۔ آؤٹنگ کے دوران اس سے اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے اور شاپنگ کے دوران ہر چیز میں اس کی پسند پوچھتے رہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"مجھے واقعی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت ہے یا نہیں، آپ کو لینی ہے۔" وہ رعب سے کہہ کر اس کی پسند پوچھتے، پھر واپسی میں رات کا کھانا چائنیز میں کھایا۔ جب گھر آئے تو سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی، گیارہ بجنے والے تھے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے تمام پیکٹ بے دلی سے صوفے پر ڈال دیے اور شہروز سٹڈی کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ تھک گئی ہیں؟" وہ شاید اس کی بیزاری محسوس کر گئے تھے۔

"نہیں۔" وہ کھردرے لہجے میں بولی۔

"پھر۔۔؟"

"پھر یہ شہروز احمد کہ یہ ساری باتیں معمول کا حصہ سہی، اس کے باوجود مجھے اتنا کچھ نہیں چاہیے۔" وہ اتنے سارے پیکٹوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"کیوں نہیں چاہیے؟" ان کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا۔

"میں کیا کروں گی ان سب کا؟"

"آپ انہیں استعمال کریں گی۔" وہ اس کی طرف آتے ہوئے بولے۔ "آپ میری منکوحہ ہیں۔ شہروز احمد

کی منکوحہ۔ جس کا معاشرے میں ایک مقام ہے۔ ایک نام ہے اور جب تک آپ یہاں رہیں گی، کو میرے اسٹینڈرڈ کے مطابق رہنا ہوگا۔ سمجھیں آپ۔"

"شہروز احمد۔" اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

شہروز احمد کا چہرہ اچانک سُرخی مائل ہوگیا تھا۔ اس کی حیرت سے پُوری کُھلی آنکھوں میں دیکھ کاٹ دار لہجے میں بولے۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ آپ کو خود ہر بات سمجھنی چاہیے لیکن آپ نے تو شاید کوئی بھی بات خو نہ سمجھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ذرا اپنے حلیے پر غور کریں اور آپ اسی حالت میں میرے ساتھ نکل آئیں۔ کم از کم بالوں میں برش کرنے کی زحمت ہی کر لیتیں۔"

اُس کے سر جھکا لینے پر وہ مزید بولے "جانتی ہیں، شاپنگ سینٹر میں مجھے اپنا ایک بہت ساتھی نظر آیا تھا، جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ لیکن محض آپ کی وجہ سے میں اس سے سکا۔"

وہ کہنا چاہتی تھی۔ 'میری وجہ سے؟' لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ بس اپنی طرف اش ہی کر سکی۔

"ہاں، آپ کی وجہ سے۔ کیا امپریشن پڑتا اُس پر آپ کا؟۔ ملگجا، شکن آلود لباس۔ بکھر اور چہرے پر چھائی بیزاری۔ میں جانتا ہوں ربیعہ بیگم کہ آپ کو مجھ سے یا اس گھر سے نہ دلچسپی نہ کوئی سروکار۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہر وقت اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی کر کی آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی اُتر آئی جسے چُھپانے کی خاطر پہلے پلکیں جھپکیں پھر رُخ موڑ گئی۔

"امّی کے سامنے بھی مجھے جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں، میں آپ کا خیال نہیں رکھتا۔ کہ اُن کے سامنے تو مجھے سُرخرو کریں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس گھر میں کچھ وقت کی مہمان ہیں لیکن سب لوگ نہیں جانتے۔ اس لیے خدا کے لیے تکلف چھوڑ دیں۔ جبراً ہی سہی، اس گھر کو اپنا گھ لیں۔ اور اسی طرح رہیں، جس طرح میری بیوی کو رہنا چاہیے تھا۔"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ کہ شاید وہ کچھ کہے۔ لیکن وہ اسی طرح رُخ موڑے کھڑی رہی۔

"کیا میں اُمید رکھوں کہ آئندہ مجھے کوئی بات سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔؟ آپ خیال رکھیں گی۔"

جواب میں ہنوز خاموشی تھی۔

"آپ شاید میری زبان نہیں سمجھتیں۔ مجھے ثاقب حسن سے کہنا پڑے گا۔ وہی شاید آپ کو قائل 'میرے خُدا۔ یہ کون سا مقام ہے؟' آنکھوں میں ٹھہری ساری نمی رخساروں پر اُترنے لگی چاہا، یوں ہی رُخ موڑے موڑے کمرے سے اور پھر اس گھر سے ہی نکل جائے۔ کہیں دُور جہاں نہ ہو۔ یا صرف شہروز احمد۔ یا پھر صرف ثاقب حسن۔

اسٹڈی کا دروازہ کُھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ کمرے میں تنہا رہ گئی ہے۔ لیکن نہ وہ سینے میں دبی سانس کو خارج کر سکی اور نہ ہی پلٹ کر دیکھنے ہمت ہوئی۔ آہستہ روی سے بیڈ تک آئی اور پھر تکیے پر سر رکھتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹ آنسوؤں کو روکنے کی ساری کوششیں ترک کرتے ہی جیسے سیلاب اُتر آیا تھا۔

"کاش ثاقب حسن اپنی محبت میں اندھا ہو کر یہ قدم کبھی نہ اُٹھاتا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر

کرب سہہ لیتا۔' انتہائی دُکھ سے سوچتے ہوئے اُس نے چادر سر تک کھینچ لی۔ آنسو اب بھی اسی روانی سے بہہ رہے تھے اور یُونہی روتے ہوئے جانے کب نیند اس پر مہربان ہوگئی۔

صبح اُس کی آنکھیں شدتِ گریہ کی چغلی کھا رہی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ اپنی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ سُوجن تو کسی حد تک کم ہوگئی لیکن سُرخی اسی طرح برقرار رہی۔ اب ناشتے کی ٹیبل پر سب سے سامنا ہونا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب کے پُوچھنے پر کیا جواب دے۔ کشمکش و پیچ میں مُبتلا کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ شہروز خود آ گئے۔ شاید اُسے بُلانے آئے تھے، قدرے جھنجھلائے ہوئے کہ رات کی باتوں کا اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا جو انہیں خود بُلانے کے لیے آنا پڑا۔ شاید تنبیہہ کرنے کا ارادہ بھی تھا لیکن اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ سُرخ ہوتی آنکھیں جن میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ انہیں پشیمانی سے ہمکنار کر گئیں۔

"آئیے۔ سب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔" نرم لہجے میں کہا تو وہ چُپ چاپ اُن کے ساتھ چل پڑی۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"رات ربیعہ کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی۔ بہت دیر تک سو نہیں سکیں۔"

کسی کے کچھ پُوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے اُس کی سُرخ آنکھوں کی وضاحت کر دی۔

"بٹیا۔ پھر یہاں کیوں چلی آئیں؟۔ میں ناشتا تمہارے کمرے میں بھجوا دیتی۔" امّی نے شفقت سے کہا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ آہستہ آواز میں کہتی ہوئی کُرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ شہروز احمد! اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا۔" امّی کی نظریں اُس پر تھیں اور مخاطب شہروز کو کیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ کیوں ربیعہ؟۔" اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے بڑے اچھے مراسم ہوں۔

"جی۔" اس نے کہا اور جلدی جلدی سلائس پر مکھن لگا کر پلیٹ اُن کے سامنے رکھ دی۔ پھر چائے بنانے لگی۔

"بھابی۔" مہروز اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "میں نے بہت فلمیں دیکھی ہیں جن میں ساس بہو کے جھگڑے، نند بھاوج کی مار کٹائی اور بیوی کا شوہر پر چیخنا چلّانا وغیرہ قسم کے بہت سے سین ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی۔؟"

اس کے نفی میں سر ہلانے پر کہنے لگا۔

"بہرحال جب شہروز بھائی کی شادی ہوئی تو میرا خیال تھا۔ اب ہمارے گھر میں اسی قسم کے سین ہوا کریں گے۔ لیکن لڑائی تو دُور کی بات، آپ تو کسی کی کسی بات سے اختلاف ہی نہیں کرتیں۔ واقعی اختلاف ہوتا نہیں ہے یا شہروز بھائی نے آپ پر دہشت جما دی ہے کہ خبردار۔"

"مہروز۔" امّی کے ٹوکنے پر وہ فوراً خاموش ہوگیا لیکن اسے دیکھتے ہوئے بھنوؤں کو یوں حرکت دینے لگا جیسے پُوچھ رہا ہو 'سچ بتائیں، کیا بات ہے؟' اُسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"ارے۔ آپ تو ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں ورنہ میں تو سمجھا تھا، آپ کی شکل خاصی مضحکہ خیز ہو جاتی ہوگی۔ جب ہی ہنسنے سے گریز کرتی ہیں۔"

"گریز تو نہیں کرتی۔ بس بلاوجہ نہیں ہنستی۔"

"کبھی کبھی بلاوجہ بھی ہنس لینا چاہیے۔ بلکہ اکثر۔ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔"

"تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا۔ مہروز کی باتوں میں تم نے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

"بس امّی۔ ویسے بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شہروز کے کہنے پر چلی آئی۔" اُس نے انہیں اپنے نام پر چونکتے دیکھا۔ پھر فوراً وہاں سے اُٹھ گئی۔

رات وہ صرف اپنے بارے میں سوچتی اور کڑھتی رہی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اور اب جب وہ غیر جانبداری سے سوچنے لگی۔ تو شہروز احمد بے قصور نظر آئے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ثاقب حسن کے مجبور کرنے پر اس سے شادی کر بیٹھے تھے اور ایک مخصوص مدت تک ہی سہی، انہیں اس بندھن کو نبھانا تو تھا اور وہی اُن کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی کیا کرتی؟ شروع دن سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اسے یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ گھر اس کا نہیں اور نہ ہی اس گھر کے مکینوں سے اس کا کوئی ناتا ہے۔ پھر وہ کیوں اپنے آپ کو یہاں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرے بس وقت ہی تو گزارنا ہے، جو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گا۔

لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ اس طرح شہروز کی پوزیشن خاصی آکورڈ ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے اُن کے گھر میں سب یہی جانتے تھے کہ انہوں نے اپنی پسند سے اس سے شادی کی ہے۔ پھر وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام کیوں ہو رہے ہیں؟۔ اس نے اپنے اس گھر میں گزرے روز و شب کو سوچا تو کوئی ایسا دن یاد نہیں آیا جب اُس نے بیوی کی حیثیت سے یا اس گھر کی بہو ہونے کے ناتے کوئی کام کیا ہو امّی بلاتیں تو جا کر اُن کے پاس بیٹھ جاتی۔ ورنہ خود سے کبھی خیال نہیں آیا۔ اسی طرح ندا بھی جب کبھی فارغ ہوتی، خود سے اُس کے پاس آ بیٹھتی تھی۔ اور مہروز کا کمرہ تو اُس نے آج تک اندر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

کیا بڑی بھاوج ہونے کے ناتے اس کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ ندا اور مہروز کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور ضرورتوں کا خیال رکھے' اور تو اور وہ تو شہروز سے بھی غافل تھی۔ جب وہ آفس کے لیے نکلتے تو دُنیا دکھاوے کے لیے ہی سہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ انہیں چھوڑنے باہر تک گئی ہو۔ اور کبھی جب انہیں واپسی میں بہت زیادہ دیر ہو جاتی' تو کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس شہروز اپنا کردار خوبی سے نبھا رہے تھے۔ اُس کے ساتھ اماں کے گھر جاتے تو اپنے گرد کھنچا حصار توڑ دیتے تھے۔ سب کے ساتھ اُس کے مزاج کے مطابق باتیں کرتے اور اس سے یُوں پیش آتے جیسے وہ اُن کی من چاہی بیوی ہو' ورنہ اگر وہ بھی اس کی طرح ہی لیا دیا انداز اختیار کیے رکھتے تو امّاں اس کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوتیں۔ یقیناً اِس کے لیے کڑھتے ہوئے اُن کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اُسے اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی کہ اُس نے یہ ساری باتیں پہلے ہی کیوں نہ سمجھ لیں؟۔ شہروز احمد کے بار بار ٹوکنے کے باوجود نظر انداز کرتی رہی۔ اور کل تو واقعی اُس نے حد کر دی تھی کہ یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ اُن کے ساتھ چل پڑی۔ اپنا کل کا حلیہ اور روّیہ یاد کر کے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ سارا دن پشیمانیوں میں گھری تلافی کا سوچتی رہی۔

شام میں شہروز آفس سے لوٹے، اس وقت وہ ندا کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی، روزانہ سے مختلف قدرے گہرے رنگ کا سلکی سوٹ ہم رنگ ٹاپس اور ہلکا ہلکا میک اَپ بھی کر رکھا تھا۔ ندا سے باتیں کرتے ہوئے کلائی میں پڑی چوڑیوں کو شہادت کی انگلی سے یوں چھیڑ رہی تھی' جیسے ستار کے تاروں کو چھیڑا جاتا ہے۔

انہوں نے لمحہ بھر رُک کر اسے دیکھا۔ پھر قدرے اُونچی آواز میں سلام کیا۔ وہ چونک کر پہلے سیدھی بیٹھی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟۔" وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"ٹھیک ہوں۔ بلکہ بالکل ٹھیک۔" لہجے میں قدرے بے تکلفی پیدا کی اور اُن کے حیرت سے دیکھنے پر کہنے لگی۔ "چائے لاؤں آپ کے لیے؟۔"

وہ سمجھ گئے، ان کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود بھی سارا دن

پشیمانیوں میں گھرے رہے تھے' کہ ناحق اسے اتنی باتیں سُنا ڈالیں۔ خیال تھا اس وقت اس سے معذرت کر لیں گے' لیکن اس کا یہ روپ اچھا لگ رہا تھا۔ اور معذرت کرنے کا مطلب تھا، وہ پھر پہلے جیسی بن جاتی اس لیے محض اس کا یہ روپ برقرار رکھنے کے لیے یوں ظاہر کرنے لگے جیسے ابھی تک خفا ہوں۔

"چائے کمرے میں بھجوا دیجیے گا۔" سنجیدگی سے کہا۔ اور اُٹھ کر چلے گئے۔ اُس نے ندا سے معذرت کی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر وہ خود ہی اُن کے لیے چائے لے کر کمرے میں گئی۔ وہ ڈریس چینج کر کے صوفے پر نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

"آپ نے کیوں زحمت کی؟۔ ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔"

"میرا خیال ہے، مجھے خود آنا چاہیے تھا۔" انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے کپ اُس کے ہاتھوں سے لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید بیٹھنے کے لیے کہیں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔

"شہروز۔" انہیں کسی طرح متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر خود سے پُکارا اور اُن کے دیکھنے پر کہنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں رہتے ہوئے بھی ہر بات سے غافل رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ میرا مطلب ہے۔"

"آپ کا مطلب جو بھی ہو۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "بس مجھے اتنا یقین دلا دیجیے کہ آئندہ اپنے مخصوص خول میں بند نہیں رہیں گی؟"

"ایسا ہی ہوگا۔" وہ جلدی سے کہہ گئی۔

"کیسا؟۔" بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل ہونٹوں میں دبا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"میرا مطلب ہے، آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"اور جو آپ نے شکایت کا موقع فراہم کیا تب؟۔" انہوں نے نظریں اس پر جما دیں۔ شاید وہ کہہ دے 'جو چاہے سزا دے لیجیے گا'۔ اور پھر کبھی جو اُس کی طرف سے شکایت کا موقع ملے تو سزا کے طور پر وہ اس کی بقیہ زندگی اپنے نام لکھوا لیں۔

"تب جو قدم آپ ثاقب حسن کے آنے پر اُٹھائیں گے، وہ ابھی اُٹھا لیجیے گا۔ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔" وہ سہولت سے کہتی ہوئی اُن کے ہاتھ سے خالی کپ لے کر کمرے سے نکل گئی اور وہ کتنی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

پھر واقعی اُس نے خود اپنی قائم کی ہوئی حد بندی توڑ ڈالی۔ کچھ دن تک بڑی سہولت سے ویسی رہی جیسی وہ اور سب گھر والے اُسے دیکھنا چاہتے تھے۔ صبح لان میں اُن کے ساتھ چہل قدمی کرنا۔ ناشتے کی ٹیبل پر مہروز اور ندا کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق۔ پھر دوپہر کے کھانے کے لیے خاص طور سے اپنی رائے دینا۔ اور شام میں' جب وہ لوٹتے' تو وہ کمرے کے بجائے برآمدے ہی میں انہیں اپنی منتظر ملتی' لیکن پھر احساس ہونے لگا جیسے وہ دھوکا دے رہی ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو بھی اور یہ کہ وہ مزید [illegible] نہیں کھیل سکے گی۔ پھر اس سے پہلے کہ دوبارہ اپنے خول میں بند ہوتی، راہِ فرار اختیار کر گئی۔ یعنی امّی سے اجازت لے کر کچھ دنوں کے لیے امّاں کے گھر چلی آئی۔

امّاں ان دنوں چھوٹی آپا کے لیے بہت فکر مند رہنے لگی تھیں۔ اور جب [illegible] ربیعہ اپنے گھر کی ہوئی تھی' تب سے تو وہ اور بھی چاہتی تھیں کہ چھوٹی آپا جلد سے جلد اپنے گھر بار کی ہو جائیں' کیونکہ ایک تو ربیعہ اُن سے چھوٹی تھی۔ دوسرے اب کلثوم اور ہُما بھی چھوٹی آپا کے قد کے برابر ہو گئی تھیں۔ امّاں کو خدشہ تھا، کہیں اب آنے والے کلثوم اور ہُما کی طرف اشارہ نہ کرنے لگیں۔

اورادھر جب سے چھوٹی آپا نے بوا کے منہ پر ان سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ اُن کے لیے کوئی پیغا
لائیں۔ وہ شادی نہیں کریں گی، تب سے بوا نے بھی آنا چھوڑ رکھا تھا۔ امّاں کو یہ پریشانی بھی تھ
اب کس سے کہیں۔۔؟۔ ہر آئے گئے کے سامنے تو نہیں کہہ سکتی تھیں، البتہ اپنے خاص ملنے والوں کو کہہ
تھا۔

اُس وقت جب کہ چھوٹی آپا دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں کچن میں مصروف تھیں۔ امّاں اس سے ا
یشانی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"بیٹیا۔ تم شہروز سے کہو۔ وہ کہیں اپنے ملنے جلنے والوں میں صوفیہ کے لیے بات کرے۔"
بولیں "بیا۔۔؟" بے خیالی میں اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی تو امّاں حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہو

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟"
"نہیں امّاں۔ لیکن میرا خیال ہے شہروز سے کہنا مناسب نہیں ہے۔" وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔
اب صاف صاف کیسے کہہ دیتی کہ وہ کیوں ان کے گھر کے مسئلے سننے اور پھر حل کرنے لگے۔ ان کا اس
گھر سے ناتا ہی کیا ہے۔۔؟۔

"کیوں مناسب نہیں ہے؟۔ آخر تمہاری بڑی آپا نے بھی تو اپنے میاں سے کہہ رکھا ہے اور ایک د
تو وہ کسی کا پیغام لائے بھی تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔"
"کیوں منع کر دیا آپ نے؟" وہ واقعی متعجب تھی کہ آخر دولہا بھائی کا لایا ہوا پیغام امّاں نے کیو
ریجیکٹ کر دیا۔؟
"بیٹیا۔ وہی مسئلہ تھا، اتنا بڑا کنبہ اور کمانے والا ایک۔"
"امّاں۔ یہ مسئلہ تو ہر دوسرے گھر کا ہے۔ خود آپ اپنے گھر کو دیکھ لیجیے۔ بے چارے ابّا میا
اکیلے کمانے والے ہیں اور پھر۔۔" اُس نے فوراً نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ورنہ وہ کہنے جا رہی تھ
اس مسئلے کو اہمیت دے کر آپ نے میری زندگی داؤ پر لگا دی۔
"امّاں۔ قسمت بھی کوئی چیز ہے۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ "ہر انسان کی قسمت میں جو لکھا ہے، وہ اُسے ضرور مل کر رہے گا۔ کوئی کسی کے نصیب کا چھین کر نہیں کھا سکتا۔ آپ اس بات پر یقین کیوں نہیں رکھتیں؟"
"بی بی، مجھے سبق مت پڑھاؤ۔ میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔" امّاں نے کبھی ابّا میاں کو اس موضوع پر زیادہ نہیں بولنے دیا تھا، اسے کیسے بولنے دیتیں؟۔ اسے چُپ کرا کر کہنے لگیں۔
"تمہیں اگر شہروز سے بات کرنے میں کوئی اعتراض ہے تو میں خود اس سے کہہ دیکھتی ہوں۔"
"نہیں امّاں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "میں خود بات کر لوں گی۔ آپ کچھ مت کہیے گا۔"
"ٹھیک ہے لیکن یاد سے کہنا اور اگر ہو سکے تو اپنی ساس سے بھی تذکرہ کر دینا۔ وہ مجھے اچھی عور
لگتی ہے۔" اُس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
شام میں شہروز آفس سے واپسی پر پہلے اُس کے پاس آئے۔ وہ سمجھی اُسے لینے آئے ہیں جب
وہ کچھ دن رہنے کی غرض سے آئی تھی اور صبح اُس نے بتا بھی دیا تھا، اس لیے اُن کے بیٹھتے ہی کہنے لگی
"میں نے شاید صبح آپ کو بتا دیا تھا۔ کہ میں ابھی کچھ دن یہیں رہوں گی۔"
"مجھے یاد ہے۔" وہ اس کا مطلب سمجھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہوئے۔ لیکن کچھ نہیں کہا۔ اُس کے منہ سے سننا چاہتے تھے کہ وہ کیا کہتی ہے؟۔ اور وہ کہنے لگی۔
"پھر آپ لینے کیوں آئے ہیں؟"
"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کو لینے آیا ہوں؟"
وہ خجل سی ہو کر نظریں چراتی ہوئی بولی۔

"پھر؟"
"بیوقوف لڑکی۔ اس گھر میں میری نام نہاد زوجہ آئی ہوئی ہے اور آفس سے واپسی پر میرا فرض بنتا تھا
یں گھر جانے سے پہلے اس کا دیدار کرتا چلوں۔ اس کا احوال پوچھوں اور یہ کہ میں تو اس کے بنا نہیں رہ سکتا
یا وہ میرے بنا رہ لے گی؟"
اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے پا کر کہنے لگے۔ "اور آپ جانتی ہیں کہ میں اپنے فرائض سے کبھی غافل
ہیں ہوتا۔"
"جی۔" اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ "میں سمجھی شاید۔۔"
"آپ ہمیشہ غلط سمجھتی ہیں۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ "اور جس روز صحیح
مجھنے لگیں، بہت سی باتوں کا ادراک ہو گا۔ بلکہ زندگی گزارنے کے ڈھنگ بھی سیکھ لیں گی۔"
"اچھا۔" وہ خوامخواہ ہنس پڑی۔
"کوشش کر دیکھیے۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔ "اب چلوں گا ورنہ کہیں آپ کچھ اور نہ سمجھنے لگیں۔"
"میں کچھ نہیں سمجھوں گی۔ آپ پلیز بیٹھ جائیں۔"
"کوئی کام ہے؟"
"نہیں ہما چائے لے کر آ رہی ہے۔ پی کر جائیے گا۔"
"ہما چائے لا رہی ہے۔ آپ کو خیال کیوں نہیں آیا؟" بلاارادہ ہی وہ ٹوک گئے تھے۔
"ہما سے میں نے ہی کہا ہے۔"
"اچھا۔ پھر تو بیٹھنا پڑے گا۔ اور چائے بھی پینی پڑے گی۔" وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔
پھر جب ہما چائے لے کر آئی تو اسی وقت ابّا میاں بھی آ گئے، جنہوں نے چائے کے بعد انہیں جانے نہیں
یا بلکہ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے اور جب جانے لگے تو کلثوم اور ہما کے
رار پر کل انہیں کلفٹن لے جانے کا وعدہ بھی کیا۔
حسبِ وعدہ اگلے دن وہ چار بجے آ گئے۔ اسے اُن کے آنے کا قطعی یقین نہیں تھا اور اُس نے کلثوم اور
ما سے بھی کہہ دیا تھا کہ شہروز نے یوں ہی جان چھڑانے کے لیے وعدہ کر لیا ہو گا۔ ورنہ انہیں اتنی فرصت نہیں ہے
یکن جب انہیں آتے دیکھا تو فوراً کلثوم اور ہما کے سر پہ پہنچ گئی۔
"شہروز آ بھی گئے ہیں اور تم دونوں ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟"
"شہروز بھائی آ گئے؟" دونوں خوشی سے اُچھل پڑیں۔ "لیکن آپ نے تو کہا تھا وہ نہیں آئیں گے۔"
"بیوقوف۔ میں نے تو یوں ہی کہا تھا۔ چلو اب جلدی کرو۔" وہ انہیں جلدی تیار ہونے کا کہہ کر بڑے
مرے میں آئی تو چھوٹی آپا اُن سے چائے کا پوچھ رہی تھیں۔
"جب باہر جا ہی رہے ہیں تو چائے وغیرہ بھی وہیں پی لیں گے۔" پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
"کہیں آپ اسی حلیے میں جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتیں؟"
"نہیں، میں چینج کر رہی ہوں۔ چلیں چھوٹی آپا، آپ بھی جلدی سے۔"
"میں نہیں جا رہی۔" چھوٹی آپا فوراً بول پڑیں۔
"کیوں؟" اُس کے ساتھ ساتھ شہروز نے بھی پوچھا۔
"میرا موڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی امّاں اکیلی ہو جائیں گی۔" چھوٹی آپا نے عذر تراشا۔
"اکیلے میں امّاں کو ڈر نہیں لگے گا۔ بس آپ چلیں۔" چھوٹی آپا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہروز بول پڑے۔
"آپ نہیں جائیں گی تو ہمیں اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا؟"
"بالکل۔" اُس نے تائید کی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانے لگی۔ چھوٹی آپا مدد کے لیے امّاں کی طرف دیکھنے لگیں۔
شاید وہی ان کی طرفداری کریں۔ لیکن ابّا۔۔ نے بھی جانے کے لیے کہا تو مجبوراً انہیں اُٹھنا پڑا۔
پھر جب چاروں بہنیں تیار ہو کر آئیں تو شہروز اکیلے بیٹھے تھے۔ اُس نے امّاں کی تلاش میں اِدھر اُدھر

نظریں دوڑائیں۔ اسی وقت وہ شہروز کے لیے چائے لیے آتی نظر آئیں۔ انہیں دیکھ کر شہروز فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔ اور بڑھ کر اُن کے ہاتھ سے کپ تھام لیا۔ پھر اس کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہو بولے۔

"ربیعہ۔ آپ کو خیال نہیں آیا، امّاں چائے بنا رہی تھیں؟۔"

"تو کیا ہوا؟۔" امّاں کہنے لگیں۔ "یہ سب تیار ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا چائے ہی بنالوں۔"

"آپ ربیعہ سے کہہ دیتیں۔ خود آپ نے کیوں زحمت کی؟۔"

"چلو، تم چائے پیو۔" امّاں نے کہا تو انہوں نے کھڑے کھڑے ہی دو تین گھونٹ میں چائے ختم کر ڈالی پھر خالی کپ اس کی طرف بڑھا دیا جسے لے کر وہ فوراً کچن میں چلی گئی۔

اسے ان کا یوں سب کے سامنے ڈانٹنا بہت بُرا لگا تھا۔

"پتا نہیں۔ اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے ہیں؟۔" اندر ہی اندر کھولتے ہوئے سوچا۔ "کچھ زیادہ ہی پوز کر نے لگے ہیں۔ سمجھتے ہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کسی دن سب کے سامنے ایسی کھری کھری سناؤں گی کہ یاد کریں گے۔" کپ رکھ کر واپس آئی تو اندر کے غصّے کا اظہار چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ تو گئے لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ امّاں سے اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ وہ کچھ روٹھی روٹھی سی اُن کے برابر آبیٹھی تھی۔

"موڈ ٹھیک کریں۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سرگوشی میں قدرے رُعب سے کہا۔

"رُعب جمانے کی کوشش نہ کریں ورنہ سنجیدگی سے خفا ہو جاؤں گی۔" لہجے کی خفگی وہ چھپا نہ سکی جسے محسوس کر کے انہوں نے ایک نظر اُس پہ ڈالی، پھر گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔

"پتا ہے شہروز بھائی۔" ہُما اپنی باتوں کے دوران اچانک انہیں مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "آپی کہہ رہی تھیں آپ نے جان چھڑانے کے لیے ہم سے وعدہ کیا ہے اور یہ کہ آپ اپنا کام چھوڑ کر کبھی نہیں آئیں گے۔"

"ہوسکتا ہے، اُن کے نزدیک وعدے کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ لیکن میں جب وعدہ کرتا ہوں تو ہر حال میں اُسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ بات انہیں اب تک سمجھ لینی چاہیے تھی۔" وہ صرف اسے سُنانے کی غرض سے آہستہ آواز میں بولے۔ "اور کون سی بات سمجھی ہیں، جو یہ سمجھیں گی۔"

وہ خاموشی سے گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ ہُما پر غصّہ آرہا تھا کہ اُس نے کیوں یہ بات چھیڑی۔ اس وقت اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

ساحل پر اترتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی نم ہوا نے یوں استقبال کیا کہ اس کا موڈ آپ ہی آپ ٹھیک ہوگیا لیکن اُن سے پھر بھی بات نہیں کی۔ چھوٹی آپا نے وہ جگہ منتخب کی جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک بڑے سے پتھر پہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا کہ اب کوئی انہیں یہاں سے اُٹھنے کے لیے نہ کہے۔ وہ نہ گیلی ریت پر چلیں گی اور نہ ہی انہیں لہروں کا تعاقب کرنا پسند ہے۔

"بھئی، ہم تو لہروں کا تعاقب ضرور کریں گے۔" کلثوم نے کہا ساتھ ہی ہُما کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"ہم جائیں شہروز بھائی؟" ہُما پوچھنے لگی۔

"ہاں۔ لیکن زیادہ دُور نہیں۔" وہ دونوں نرم نرم ریت پر تقریباً بھاگتی ہوئی پانی تک چلی گئیں۔

"آپ دونوں پلیز، میری وجہ سے یہاں نہ رُکے رہیں۔" چھوٹی آپا شہروز بھائی کو مخاطب کر کے کہنے لگیں تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی چھوٹی آپا۔ آپ کے پاس بیٹھوں گی۔" وہ جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کر کے چھوٹی آپا کے پاس بیٹھی تو وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے ٹہلنے کے انداز میں آگے نکل گئے۔

"ربیعہ۔ یہ کیا حرکت ہے؟" چھوٹی آپا اسے سرزنش کرنے لگیں۔ "تمہیں یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے۔"

"کیوں؟۔"

"شہروز بھائی ہوسکتا ہے، مائنڈ کریں۔ جاؤ بے چارے اکیلے کھڑے ہیں۔ جاؤ ناں، کیا تمہیں خیال نہیں ہے؟۔" چھوٹی آپا نے اُسے دھکیلا۔ تو وہ اندر ہی اندر کُڑھتی ہوئی اُن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ انہیں مخاطب کر کے خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔

"لگتا ہے سب نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی جملہ ہے۔ 'کیا تمہیں خیال نہیں ہے؟'۔ میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر بات کا خیال رکھنے کا۔"

وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے جو بُری طرح جھنجھلا رہی تھی۔

"میں نے آپ کو نہیں بُلایا۔ آپ اطمینان سے وہاں بیٹھ سکتی ہیں۔" وہ بھی ناگواری سے بولے۔

"اطمینان سے۔" لہجے میں ہلکا سا طنز سمٹ آیا تھا۔ "کہیں اطمینان ہے میرے لیے؟۔ یہاں آئی ہوں تو آپ کہیں گے صوفیہ اکیلی بیٹھی ہیں، آپ کو خیال نہیں ہے۔ اُن کے پاس تھی تو وہ آپ کے بارے میں احساس دلا رہی تھیں۔ آخر آپ سب مجھے سمجھتے کیا ہیں؟۔ کیا میں بے حس ہوں جو ہر وقت میرے احساس کو بیدار کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے ہر وقت ٹوکنے سے گریز کریں ورنہ۔"

"ورنہ۔؟" اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر چل پڑی۔ وہ حیران ہوئے اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ نرم ریت پر قدموں کے نشان چھوڑتی لمحہ بہ لمحہ اُن سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتی لہریں اس کے پیروں سے ٹکرانے لگیں۔ وہ پھر بھی چلتی رہی۔ اور وہ جو اس پر نظریں جمائے کھڑے تھے، اس وقت چونک گئے، جب وہ گھٹنوں تک پانی میں تھی۔ اس وقت بھی وہ رُکی نہیں تھی۔

"ربیعہ۔" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ پہلے پلٹ کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھا، وہ ہر طرف سے بے نیاز ریت پہ انگلی کی مدد سے لکیریں کھینچنے میں مصروف تھیں۔ انہیں متوجہ نہ پا کر انہوں نے ربیعہ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

"ربیعہ۔" اس سے کچھ فاصلے پر تھے کہ آواز دے ڈالی، وہ نہیں رُکی تو ایک پل میں درمیانی فاصلہ طے کر کے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"اِرادے کیا ہیں آپ کے؟۔" اُنہوں نے غصّے سے پوچھا۔

"شہروز احمد۔" وہ براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ "اگر میں آپ کی 'ورنہ' کے جواب میں یہ کہتی کہ میں ان پانیوں میں اُتر جاؤں گی تو آپ مذاق سمجھتے۔ ہنس کر ٹال دیتے۔ اس لیے میں عملی مظاہرہ کر رہی ہوں۔"

"ہوش میں ہیں آپ؟۔"

"قطعی ہوش میں ہوں اور آپ پلیز سامنے سے ہٹ جائیں۔ میں سچ مچ پانیوں میں اُترنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں گزارنی ایسی زندگی جس میں خود میرا عمل دخل نہ ہو۔"

"یہ بات آپ اس سے کہیں جس نے آپ کے لیے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔"

ثاقب حسن کا ذکر ہو اور اُن کی پیشانی شکن آلود نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔

"زندہ رہی تو اس سے بھی پوچھ لوں گی کہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اسے کس نے دیا تھا؟۔"

"واپس چلیں؟۔" وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہ کہنا چاہتے تھے اور نہ سُننا چاہتے تھے۔

"میں آگے تو جاؤں گی واپس نہیں۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کریں۔" وہ اُس کی کلائی تھام کر تقریباً کھینچتے ہوئے واپس لے آئے اور چھوٹی آپا کے پاس بٹھاتے ہوئے نارمل لہجے میں انہیں مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"ہم لوگ ذرا آگے تک نکل گئے تھے۔"

"سراسر دھوکا۔" اُس نے گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے سوچا۔ "نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی۔ اور چاہتے ہیں، میں بھی اُن کی طرح پل بھر میں موڈ تبدیل کر لیا کروں۔ ناممکن، مجھ سے یہ سب نہیں ہوسکتا۔ میں کبھی بھی ان کی طرح اتنی کامیاب اداکاری نہیں کر سکتی۔"

"تم تو پوری بھیگ گئی ہو۔" چھوٹی آپا کے کہنے پہ اس کی سوچیں منتشر ہوگئیں۔ طویل سانس لے کر،

سیدھی ہو بیٹھی۔

"میرے منع کرنے کے باوجود باز نہیں آئیں ۔ اتنی دُور نکل گئیں ۔" شہروز ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"تمہیں شہروز بھائی کی بات مان لینی چاہیے تھی ۔ دیکھو تمہارے ساتھ وہ بھی بھیگ گئے ہیں۔" چھوٹی آپا نے یوں ہی ان کی طرفداری کی لیکن وہ ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

"بہت گناہگار ہو گئی ہوں میں ان کی بات نہ مان کر۔ سزاوار ٹھہری ہوں تو دیجیے سزا مجھے ۔"

"ربیعہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔" چھوٹی آپا کے ساتھ وہ بھی حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"پاگل ہو گئی ہوں ۔" پیشانی گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا تو انہوں نے اشارے سے چھوٹی آپا کو منع کیا کہ اسے نہ چھیڑیں۔ چھوٹی آپا سر ہلاتی ہوئی دُور بیٹھی کلثوم اور ہما کو دیکھنے لگیں جو دنیا جہاں سے بے خبر جانے کن باتوں میں مصروف تھیں ۔ اور یہاں کتنی دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی۔

لمحے چپ چاپ سرکتے رہے ۔ آسمان کی وسعتوں پہ سفر کرتا سورج اب شاید نیلے پانیوں میں اُترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بیچ آسمان میں جو دُودھیا نظر آتا تھا۔ اب نارنجی لبادہ اوڑھ چکا تھا۔ اس کی سُرخی مائل شعاعیں پانی کی سطح پر چمکتی نظر آ رہی تھیں ، کائنات کو انوکھا حُسن بخش کر لمحہ بہ لمحہ اوجھل ہو رہا تھا۔

"دیکھیں صوفیہ۔ غروب آفتاب کا منظر کس قدر دلفریب ہے ۔" شہروز نے چھوٹی آپا کو مخاطب کر کے کہا تو وہ اسی طرف دیکھنے لگیں۔

"آپ آنے سے انکار کر رہی تھیں ۔ اچھا ہوا آ گئیں ورنہ اس دلفریب منظر کو دیکھنے سے محروم رہ جاتیں ۔"

"میں تو ویسے بھی محروم ہوں ۔" جانے کیسے چھوٹی آپا کہہ گئیں ۔ ورنہ وہ تو خاصی محتاط رہا کرتی تھیں خاص طور سے دولہا بھائی کے سامنے ۔ اور شہروز احمد کے سامنے بہت ریزرو رہ کر اپنے آپ کو مطمئن پوز کیا کرتی۔ اِس وقت پتا نہیں کیسے ، اندر کسی محرومی کے احساس نے اچانک بیدار ہو کر ان کے چہرے اور لہجے کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ کہنے لگے ۔

"ہر شخص ہی محروم ہے ۔ کسی نہ کسی پہلو سے اُدھورا ۔"

"نہیں شہروز بھائی ۔ ہر شخص محروم نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو محرومی کا احساس کبھی نہ جاگتا۔ کسی کو اللہ میاں نے بساط سے بڑھ کر نوازا دیا ہے تو کسی کو بساط بھر بھی نہیں ۔"

وہ جو گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی ، چھوٹی آپا کی بات پر چونکی اور سر اُٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی ، وہ کہہ رہی تھیں ۔

"انسانوں کے درمیان یہ تفریق گو کہ خود اُس کی اپنی پیدا کردہ ہے لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو بُلندی پر کھڑا ہے ، وہ پستی والے کو تھام لے اور ہم انسانوں نے اس تفریق کو تو قبول کر لیا ہے لیکن اس کی دُوسری بات پر عمل نہیں کرتے ۔ بلندیوں کو چھُونے والے پستیوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے شہروز بھائی کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور میں بھی مانتی ہوں کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے ، جن کی میں بات کر رہی ہوں ۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے ۔" وہ کہنے لگے۔ "لیکن یہ جو معاشرتی یا طبقاتی فرق کو آپ نے بلندی اور پستی کا نام دے دیا ہے تو یہاں میں اختلاف کروں گا۔ پتا نہیں آپ کے تصوّر میں بُلندی کیا ہے ۔ میں تو جب سر اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو بلندی پر صرف آسمان ہی نظر آتا ہے جو بلا امتیاز سب پر سایہ فگن ہے اور جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں چھُو سکتا ۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے ۔ "اور گہرے پاتالوں کا نام پستی ہے ۔ میرے نزدیک پاتال میں وہ گرتا ہے جو اپنے کردار کے ہر پہلو سے ادھورا ہو اور جو اپنی آبرو کی حفاظت نہ کر سکے ۔ ایسا شخص جو خود اپنے ضمیر کی عدالت سے سُرخرو نہ ہو سکے ۔ اُسے کوئی دوسرا کیسے تھامے گا بھلا ۔"

"چلیے آپ نے بلندی اور پستی کی نشاندہی کر دی اور یہ بھی کہ اپنے غلط کردار و عمل کی بناء پر ہی آدمی پستی میں گرتا ہے لیکن بعض لوگوں کو بنا کسی قصور کے ، بنا کسی گُناہ کے پستیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے ۔ اُن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ؟"

"وہ واقعی قابلِ رحم ہیں لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ وہ خود گرے ہیں یا دھکیلے گئے ہیں ؟"

"یہ جاننا کون سا مشکل کام ہے ۔" اُس نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا ۔ وہ بھی یوں جیسے مذاق اُڑا رہی ہو۔ "جو طاقتور ہو گا وہ یقیناً دوسروں کا حق مارتے مارتے پستی میں جا گرا ہو گا اور کمزور کو دھکیلا گیا ہو گا ۔"

"بائی داوے ۔ آپ کے سر پر جو بھوت نماشے تھی ، وہ اُتر گئی کیا ؟" وہ مُسکراہٹ دبا کر بولے تو وہ پھر لاتعلق نظر آنے لگی ۔ "عجب لڑکی تھی ، دل کے تاروں کو چھُو کر بھی انجان ۔"

"ہاں تو صوفیہ ۔ آپ کیا کہہ رہی تھیں ؟" وہ اُسے مزید چھیڑنے کا ارادہ ملتوی کر کے پھر چھوٹی آپا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"چھوڑیں شہروز بھائی ، ہم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ گفتگو لے بیٹھے ہیں ۔ اس وقت تو ہمیں اس ماحول کی مناسبت سے ہلکی پھُلکی باتیں کرنی چاہئیں ۔"

"ہاں ۔" وہ طویل سانس لے کر براہِ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے ۔ "ماحول کی مناسبت سے تو یہ کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ یہاں اُتری ڈھیر ساری خوبصورتیاں اس لڑکی کی مرہونِ منّت ہیں جو روٹھی بیٹھی ہم سے لاتعلق نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے ۔"

"میرے خدا ۔" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ چھوٹی آپا کی طرف دیکھا ، وہ ہنس رہی تھیں اور وہ شوخی پر آمادہ ۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے ؟ گھبرا کر کھڑی ہو گئی ۔ اور کلثوم کو آواز دے ڈالی۔ اس کی آواز پر ان دونوں نے چونک کر دیکھا اور بھاگی چلی آئیں ۔

"کیا ساری زندگی یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے ؟" اپنی کیفیت چھپانے کے لیے ان دونوں کو خوامخواہ ڈانٹنے لگی۔

"اُن پر کیوں خفا ہو رہی ہیں ؟" شہروز اُٹھتے ہوئے بولے ۔ "آپ خود بھی تو یہاں اطمینان سے بیٹھی تھیں ۔"

"چلیں چھوٹی آپا ۔" وہ اُن کی بات نظر انداز کر کے چھوٹی آپا کو اُٹھانے لگی ۔ پھر واپسی میں پہلے انہوں نے ڈائنیز میں کھانا کھایا ۔ اس کے بعد اُس کے کہنے پر کچھ دیر کے لیے بڑی آپا کے پاس رُکے اور جب گھر آئے تو کافی دیر ہو چکی تھی ۔ دن بھر کے تھکے ہارے ابّا میاں سو چکے تھے ۔ اور اماں اُن کی راہ تک رہی تھیں۔ شہروز ان سب کو چھوڑنے اندر تک آئے ۔ پھر کھڑے کھڑے ہی جانے کی اجازت چاہی۔

"کب تک یہاں قیام کا ارادہ ہے ؟" وہ انہیں سی آف کرنے دروازے تک آئی تو پوچھنے لگے ۔

"ارادہ تو بہت زیادہ دن رہنے کا ہے ۔"

"لیکن میں اجازت نہیں دوں گا ۔"

"کیا ۔ ؟" وہ آگے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ فوراً بول پڑے ۔

"جب تک کچھ حق رکھتا ہوں ۔ اُسے استعمال بھی کروں گا ۔"

"حق استعمال کر بیٹھے گے ۔" وہ دروازہ بند کر کے بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی ۔ اور تھکن کا بہانہ کر کے فوراً سونے کے لیے لیٹ گئی ۔

اگلے دن ناشتے کے بعد ابھی معمول کے کام شروع نہیں ہوئے تھے کہ مہروز آ گیا اُسے لینے کے لیے۔ اماں اس وقت سبزی وغیرہ لینے گئی ہوئی تھیں ۔ اور وہ چھوٹی آپا کے ساتھ برآمدے میں رکھے تخت پوش پر بیٹھی یوں ہی کوئی پرانا اخبار دیکھ رہی تھی ۔ مہروز آیا تو وہ اسے لے کر اندر جانے لگی تھی کہ وہ بھی شہروز کی طرح وہیں برآمدے میں بیٹھ گیا ۔

"کیسے آئے؟" وہ یوں ہی پوچھ گئی۔
"بڑے بھائی نے آپ کو لینے بھیجا ہے۔ وہ خود آتے لیکن آج کوئی ضروری میٹنگ تھی اس لیے فرض مجھے سونپ دیا۔"
"جب تک کچھ حق رکھتا ہوں، اُسے استعمال بھی کروں گا۔" فوراً ذہن پر اُن کی رات کی کہی بات دستک دینے لگی تو کتنی دیر تک وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ کچھ حیران اور کچھ بے یقین سے انداز سے مہروز کی طرف دیکھے گئی۔
"میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا؟" وہ اسے یوں اپنی طرف دیکھتے پا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا، لہجے میں شوخی تھی۔
"سینگ تمہارے نہیں تمہارے بھائی کے نکلے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا دماغ کچھ اُلٹا ہو گیا ہے۔ سنائی بھی کم دینے لگا ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد یقیناً آنکھیں بھی متاثر ہوں گی۔" وہ جو منہ میں آیا کہہ کر چلی گئی۔
"الٰہی خیر۔ یہ تو خطرناک بات بتا رہی ہیں آپ۔" وہ پریشان نظر آنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا "ہوا کیا؟"
"رات میں نے اُن سے کہا تھا کہ میں ابھی کچھ دن یہیں رہوں گی پھر اس وقت انہوں نے تمہیں کیوں بھیج دیا؟"
"میں تو حکم کا غلام ہوں بھابی۔ انہوں نے کہا اور میں چلا آیا۔"
"اور اب جا کر اُن سے کہہ دو کہ میں آج نہیں آؤں گی۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔
"نہیں ربیعہ۔" چھوٹی آپا جو سر جھکائے بیٹھی تھیں، اس کی بات پر فوراً بول پڑیں۔ "کوئی بات ہو گی جب ہی انہوں نے بلایا ہو گا۔ تمہیں منع نہیں کرنا چاہیے۔"
مہروز چھوٹی آپا کی بات پر یوں ہی اُن کی طرف متوجہ ہوا تھا لیکن پھر بہت دیر تک ان پر سے نظر نہیں ہٹا سکا۔
"میں جانتی ہوں، کیا بات ہے۔" اُس نے سوچا "محض اپنا حق استعمال کر کے مجھ پر جتانے کی کوشش کی ہے۔"
"تو پھر آپ چل رہی ہیں؟" مہروز اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔
"ہاں۔ یہ جائے گی۔" اُس کے بجائے چھوٹی آپا نے جواب دیا اور اُٹھتے ہوئے بولیں "تم جب تک ڈریس چینج کر لو، میں چائے بناتی ہوں۔"
"چائے کا تکلف رہنے دیں۔" مہروز نے روکا۔
"تکلف کیسا؟۔ اور پھر اماں کے آنے تک تو آپ کو رُکنا ہی ہے۔ کیوں نہ اس دوران ہم چائے ہی پی لیں۔"
"ہاں چھوٹی آپا۔ میں بھی پیوں گی۔" وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی اور جب چھوٹی آپا کچن کی طرف جانے لگیں تو وہ چونکا اور کچھ تاسف کا تاثر لیے اُس کی نظریں اُن کا تعاقب کرتی گئی تھیں۔
کچھ دیر بعد جب وہ چینج کر کے اپنا بیگ اُٹھائے، اُس کے پاس آئی تو اسی وقت چھوٹی آپا بھی چائے لے کر آئیں۔ اس کے سامنے ٹرے رکھی تو وہ ان کے نرم ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ دُھلے دُھلے اُجلے اُجلے شفاف ہاتھ کہ جنہیں بے اختیار تھام لینے کو دل چاہے اور کوئی جی دار ہی انہیں تھامنے کی جرأت کر سکتا تھا۔
واپسی میں وہ کھویا کھویا سا تھا جیسے اپنی کوئی چیز وہیں چھوڑ آیا ہو۔ یا کوئی نیا احساس ساتھ لے آیا ہو۔ پتا نہیں کیا تھا، کچھ بے قراری سی۔ جانے پا لینے کی تھی یا کھو دینے کی؟۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ غصے میں تھی۔

بار بار یہ خیال کہ شہروز احمد اپنے نام نہاد حقوق کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں، اسے طیش دلا رہا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ مسلسل ضبط کر رہی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ مہروز کے سامنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ وہ اگر اپنے آپ میں ہوتا تو اس کی کیفیت محسوس کر کے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن تمام راستہ اُس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا۔
اُسے گھر کے سامنے اُتار کر کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے کہیں چلا گیا۔ وہ اندر آئی تو ٹی وی لاؤنج میں اُمی سے سامنا ہو گیا۔ وہ بہت عجلت میں تھیں۔ اُسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں اور صرف اتنا کہا۔
"آگئیں بیٹا؟" اس کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں جاتے جاتے جانے کیا خیال آیا کہ فون کے پاس آ کر شہروز کے آفس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف فون اُن کی سیکریٹری نے اُٹھایا۔ اس نے جب اُن سے بات کرانے کے لیے کہا تو وہ معذرت کرتی ہوئی بولی "وہ اس وقت ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔"
"میں اُن کی مسز ہوں۔" اُس نے بھی حق استعمال کر ڈالا "وہ خواہ کہیں بھی مصروف ہوں، فوراً میری بات کرائیں۔"
سیکریٹری کے "او کے" کہنے پر انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ساعتوں سے اُن کی آواز ٹکرائی تو وہ بغیر سلام کے طنزیہ لہجے میں بولی۔
"مسٹر شہروز احمد۔ بہت جلدی آپ نے اپنا حق استعمال کر ڈالا۔"
"کون؟۔ ربیعہ؟" وہ واقعی حیران تھے کیونکہ اس نے کبھی انہیں رنگ نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی یقین نہیں تھا۔ کہ وہ ہو گی اور پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔
"جی، اتنے مستعجب کیوں ہیں شہروز احمد۔ یہ میں ہی ہوں۔"
"کہیے کیا کام ہے؟"
"مجھے آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے بھلا؟"
"ربیعہ۔" انہوں نے تنبیہی لہجہ اختیار کیا۔ "اگر کوئی کام نہیں ہے تو فون بند کر دیں۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔"
"میں پوچھ سکتی ہوں ایسی کون سی مصروفیت ہے جو۔"
"شٹ اَپ۔" پوری بات سُنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ ریسیور رکھ کر دل ہی دل میں بدلہ لینے پر ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ بیگ سے کپڑے نکال کر الماری میں رکھ رہی تھی کہ ملازمہ نے آ کر کہا۔
"بیگم صاحبہ بُلا رہی ہیں۔"
اُس نے "ابھی آتی ہوں" کہہ کر بقیہ کپڑے رکھے اور الماری بند کر کے جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی نظر آئیں۔ وہ جا کر اُن کے پاس بیٹھی تو وہ کہنے لگیں۔
"بیٹا۔ تم نے بُرا تو نہیں مانا؟۔ میں نے تمہیں اس وقت بُلوا لیا۔"
"جی۔" وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔
"تم ہفتہ بھر رہنے کے ارادے سے گئی تھیں لیکن بات ایسی ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی ضروری تھی۔ کل پھر چلی جانا۔"
"مجھے آپ نے بُلوایا ہے۔؟ لیکن مہروز نے تو آپ کا نام نہیں لیا۔ وہ تو کہہ رہا تھا اسے شہروز نے بھیجا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔
"شہروز ہی نے بھیجا ہو گا۔ کیونکہ میں نے شہروز سے کہا تھا۔ اور ہو سکتا ہے مصروفیت کی بنا پر اُس نے مہروز کو بھیج دیا ہو۔"
وہ چپ چاپ امی کی طرف دیکھے گئی۔ انداز ایسا تھا کہ دیکھ تو انہیں رہی تھی لیکن ذہن کہیں اور بھٹک

رہا تھا۔ انجانے میں کتنی غلطی ہوگئی تھی۔ شہروز نے حق استعمال نہیں کیا تھا لیکن وہ ایسا کر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے فون پر ان سے بات کرتے کرتے جو انداز اختیار کیا تھا، اُسے سوچ کر پسینہ آ گیا۔ پتا نہیں سوچا ہوگا انہوں نے اور اُس کے بارے میں کیا خیال کیا ہوگا۔

"میرے خدا۔" اُس نے ڈھیر ساری ندامتوں میں گھر کر سوچا۔ "اب ان کا سامنا کیسے کر پائے گی؟"

"ہاں تو بیٹیا۔" امی نے کہا۔ تو اس نے بمشکل تمام اپنی ساری توجہ ان کی طرف مبذول کی۔ "میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ آج شام میں ندا کے سسرال والے آ رہے ہیں۔ میں نے خانساماں کو ہدایات تو دے دی ہیں۔ پھر بھی تم خود دیکھ لینا۔ ندا ابھی جا کر چیک کر لینا۔ کسی چیز کی کمی ہو، کوئی ڈش بنوانا مقصود ہو تو۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں سب دیکھ لوں گی۔ بلکہ کچھ چیزیں میں خود تیار کروں گی۔" وہ فوراً بول پڑی۔

"اور ذرا انتظامات پر بھی نظر رکھنا۔"

"جی بہتر۔" وہ سعادت مندی سے بولی پھر پوچھنے لگی۔ "کسی خاص سلسلے میں آ رہے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے شادی پر زور دیں۔"

"تو کیا آپ ابھی ندا کی شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"

"نہیں، میں چاہتی ہوں، وہ تعلیم مکمل کر لے پھر۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ "اگر وہ اصرار کریں گے۔ پھر تو کرنی پڑے گی۔ بہرحال آج کروں یا کل۔ کرنی تو ہے۔"

"جی۔" وہ اس معاملے میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ان کا گھریلو معاملہ تھا، اس گھر کی فرد بہرحال نہیں تھی۔

"میں کچن دیکھ لوں۔"

"ہاں ضرور۔"

امی کی اجازت ملتے ہی وہ ان کے پاس سے اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ سامان چیک کرتے ہوئے ساتھ خانساماں سے پوچھتی گئی کہ وہ کیا پکانے کی تیاری کر رہا ہے۔ پھر ایک آدھ ڈش جو وہ خ چاہتی تھی، اس کا سامان اُسی وقت اُس نے منگوا لیا۔

پھر سارا دن وہ خاصی مصروف رہی۔ ڈرائنگ روم کی صفائی اپنی نگرانی میں کروائی۔ کچن میں وقفے سے جانا اور ڈائننگ روم میں ٹیبل پر ہر چیز قرینے سے رکھنا۔ اپنی دانست میں پوری کوشش کی کوئی بے ترتیبی نہ ہو۔

دوپہر میں امی نے کہا بھی کہ کچھ دیر آرام کر لو، لیکن وہ مصروف رہی۔ پھر جب ہر طرف سے پو طرح اطمینان ہو گیا، تب اپنے کمرے میں آئی۔ گھڑی کی طرف دیکھا، چار بجے تھے۔ اب سونے کا وا نہیں رہا تھا۔ فریش ہونے کے لیے نہانے کا ارادہ کیا اور فوراً باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی، تب کیا، مہمانوں کے سامنے اچھے حلیے میں جانا چاہیے۔ جلدی سے الماری کھول کر کپڑے منتخب کرنے لگ ہلکا فیروزی رنگ اُس پر بہت سوٹ کرتا تھا۔ اس نے وہی نکال لیا اور ابھی الماری بند کر کے پلٹی ہی تھی لاؤنج سے آتی شہروز کی آواز اس کے پورے وجود کو لمحہ بھر کے لیے سُن کر گئی۔ صبح کا واقعہ جو وہ مصروف میں گھر کر بھلا بیٹھی تھی۔ ایک دم یاد آیا تو اسے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"اُن کا سامنا کیسے کروں گی؟" یہ سوچ کر پھر پریشان ہو گئی۔ اپنا لہجہ بھی یاد آیا کس طرح کہہ ر "میں پوچھ سکتی ہوں ایسی کون سی مصروفیت ہے جو۔"

"میرے خدا۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ ان سے زیادہ دیر چُھپ نہیں سکتی تھی لیکن فو پر ان سے بچنے کے لیے اُن کے اس طرف آنے سے پہلے ہی کپڑے لیے، ندا کے کمرے میں چلی گ ندا اُس کی اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر تشویش سے بولی۔

"آپ کو کیا ہوا ہے؟" وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ بس نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے تھک گئی ہیں۔" ندا نے خود ہی قیاس کیا۔ تو وہ پھر نفی میں سر ہلاتی ہوئی گرنے کے انداز میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"بھابی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" اُس کی مسلسل خاموشی سے ندا گھبرا کر پوچھنے لگی پھر بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے آپ کے تو ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" وہ اس خیال سے کہ کہیں ندا گھبرا کر شہروز کو نہ بلا لائے، فوراً بول پڑی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی ابھی نہا کر نکلی ہوں۔ اس لیے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ ہاں تم یہ سوٹ دیکھو، شام میں پہننے کے لیے کیسا ہے؟"

"آپ پہنیں گی؟" ندا نے قدرے تعجب سے کہا۔

"ہاں کیوں؟"

"رہنے دیں بھابی۔" ندا نے اس کے ہاتھ سے سوٹ لے کر ایک طرف ڈال دیا۔

"اچھا تو ہے۔" اُس نے کہا۔

"ہاں۔ اچھا تو ہے۔ پھر بھی اسے مت پہنیں۔" ندا بولی۔

"پھر۔؟" وہ سوالیہ نشان بن کر پوچھ بیٹھی۔

"ساری باندھیں۔ ایمان سے آپ پر بہت سُوٹ کرے گی۔"

"ندا پلیز۔ مجھے کچھ میزبانی کے فرائض بھی انجام دینے ہیں۔ اور ساری میں میں بہت اُلجھن محسوس کروں گی۔ بلکہ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا۔" اُس نے منع کر دیا لیکن ندا نے بہت محبت سے اُس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"میری خاطر بھابی۔ ایمان سے آپ بہت اچھی لگیں گی۔ اور کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے بیٹھے بیٹھے ملازم سے کہہ دیجیے گا۔"

"مجھے باندھنی بھی نہیں آتی۔" اُس نے نیا شوشا چھوڑا۔

"میں باندھ دوں گی۔ بلکہ پنیں بھی لگا دوں گی کہ نہ آپ کو سنبھالنی پڑے گی اور نہ ہی دقت محسوس ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب خود جا کر میری الماری میں سے اپنی مرضی سے کوئی ساری نکال لاؤ۔" اُس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ تو ندا اس کے گال پر پیار کرتی ہوئی فوراً اُٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ویسے ہی رنگ کی ساری تھی جیسا وہ سوٹ لائی تھی۔ پھر ندا خود ہی استری بھی کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر یوں ہی ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔

"ندا۔" امی پکارتی ہوئی اندر آئیں۔ پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگیں۔ "تم یہاں ہو بیٹا۔ میں تمہارا ہی پوچھنے آئی تھی۔"

"جی کوئی کام ہے؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ اب تم تیار ہو جاؤ۔ مہمان بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے، تیار ہو کر میرے پاس آ جانا۔" امی جاتے جاتے کہتی گئیں۔

پھر وہ تیار ہونے کے بہانے ندا کے کمرے میں ہی رہی۔ اصل میں تو وہ شہروز احمد سے چُھپ رہی تھی۔ اِن ہی کے ڈر سے امی کے کہنے کے باوجود تیار ہونے کے بعد اُن کے پاس نہیں گئی۔

جب ملازمہ بلانے آئی اور اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ مہمان آ چکے ہیں، تب وہ کمرے سے نکلی اور یہ سوچ کر کہ مہمانوں کے سامنے تو وہ کچھ کہنے سے رہے، اسے سہارا دے گیا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔

بالکل سامنے شہروز بیٹھے تھے۔ اور اسی وقت وہ یوں ہی بلا ارادہ اِدھر متوجہ ہوئے تھے، اس پر نظر پڑی

تو ایک پل میں جانے کتنے رنگ اُن کی آنکھوں میں آسمائے تھے۔ ساری میں اس کا تراشا ہوا دراز قدرے نمایاں ہوگیا تھا۔ حالانکہ اُس نے پلو کو دُوسرے کندھے تک پھیلا رکھا تھا۔ فیروزی رنگ واقع پر بہت سُوٹ کر رہا تھا۔ ساتھ فیروزے کا سیٹ اور میک اَپ وہ عام دنوں سے کس قدر مختلف رہی تھی۔ اور پشت پر پھیلے اس کے گھنے بال۔

کوئی تو وقت تھم جانے کی نوید دے۔
وہ اسے دیکھتے رہیں، یونہی دیکھتے رہیں۔
کوئی تشنگی نہ رہے، کوئی کسک نہ رہے۔

"شہروز احمد۔ یہ کیا حماقت ہے؟" دل کے ٹوکنے پر سنبھلے لیکن بے اختیاری پر اختیار نہ رہا۔ جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

"آیئے ربیعہ۔" یہ لہجہ صرف اسی کے لیے تھا۔ جس کا خمیر تسخیر کر لینے والی مٹی سے اُٹھایا گیا تھا جو دل کے تاروں کو چُھو کر بھی انجان تھی، بے خبر تھی۔ پھر اس کے قریب چلے آئے۔ مخصوص انداز اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنے ساتھ لیے ہوئے سب کے درمیان آگئے۔ امی نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا اور محبت سے بولیں۔

"یہ ربیعہ ہے۔ میری بہو، آپ نے پہلے اسے دیکھا ہوگا۔"

"ہاں۔ بس شادی پر ہی دیکھا تھا۔ پچھلی بار جب آئے تھے تو یہ شاید میکے گئی ہوئی تھیں۔" ساس کہنے لگیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے ہوں۔ بہت ساری نظروں کا اور قریب بیٹھے شہروز احمد کے وجود سے اُٹھتی مسحور کن مہک نے اُسے نروس کر دیا تھا۔ دل چاہا کسی بھی بہانے اُٹھ کر چلی جائے یا پھر اپنے اور شہروز احمد کے درمیان کچھ فاصلہ ہی پیدا کر دے جو کندھا بار بار اُس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ مُلازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔ اُس نے موقع غنیمت جانا اور فوراً اُٹھ کر ٹرالی اپنی طرف کھینچ لی۔ اور مُلازم کو جانے کا اشارہ کیا۔

پھر سب کو اسکوائش سرو کرنے کے بعد امی کے پاس جا بیٹھی۔ سرگوشی میں ان سے پوچھا کہ کیا وہ ڈائننگ روم کا جائزہ لے لے اور اُن کی اجازت ملتے ہی وہاں سے چلی آئی۔ باہر آتے ہی پہلے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ پھر ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو ٹیبل کا جائزہ لینے کے بجائے کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئی۔ اچانک ایک نامعلوم سا احساس اس کے گرد حصار کھینچنے لگا تھا، جس میں مقید ہوتے ہی اس نے سوچا۔

اگر ثاقب حسن جان لیتا کہ اس زندگی میں مجھے قدم قدم پر ایسی صورتحال کا سامنا ہوگا تو شاید وہ قدم کبھی نہ اُٹھاتا یا پھر میرے حصول کا خیال دل سے نکال دیتا۔

کب سوچا تھا کہ محبت میں ایسی کڑی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔؟

کیا محبت زندہ ہے؟" دل دھڑک دھڑک کر اس سے سوال کرنے لگا تھا۔ اور وہ اپنا محاسبہ کرنے جا رہی تھی کہ شہروز احمد اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور یوں ہی کبھی کبھی کھو جانا تو اس کی عادت تھی۔ دِل سوال کر رہا تھا۔ ذہن جواب سوچنے میں مصروف اور نظریں اُن پر جمی رہ گئیں۔

"ربیعہ۔" انہوں نے پکارا اور اندر کے شور میں اسے اُن کی آواز سُنائی ہی نہ دی۔

"ربیعہ۔" دوبارہ پکارنے کے ساتھ میز کو بھی انگلیوں سے بجایا تو وہ چونکی اور فوراً کھڑی ہوگئی۔

"کیا سوچنے لگی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔" اُس کے لہجے کی افسردگی اُن سے چُھپی نہ رہ سکی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" بے قراری سی بے قراری۔

"جی۔" مختصر یہی کہہ سکی۔

"یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"میں اس سارے انتظام کا از سرِ نو جائزہ لینے آئی تھی۔" پھر اپنے آپ پر قابو پا کر ان سے پوچھنے لگی۔ "سب ٹھیک ہے ناں؟"

"بظاہر تو سب ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔"

"بظاہر۔"

"ہاں ربیعہ جی۔ بظاہر تو سب ٹھیک ہی لگتا ہے۔ اندر کا حال خُدا جانے یا وہ جس پر بیتے۔" ذومعنی بات کہی، پھر رُکے نہیں۔

پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے کھانے میں سب کے ساتھ شریک ہونا پڑا۔ امی بڑے فخر سے بتا رہی تھیں کہ یہ سارا انتظام ربیعہ نے کیا ہے۔ اور سب کی تعریفوں پر وہ شرمندہ ہوتی رہی۔ پھر رُخصت ہوتے ہوئے سلمان (ندا کا منگیتر) نے خاص طور سے اس سے کہا کہ وہ یہ سارے ڈھنگ اپنی نند کو ضرور سکھائے۔ وہ ہلکے سے مُسکرائی تھی۔

ہر طرف سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو شہروز صوفے پر بیٹھے کوئی میگزین دیکھنے میں مصروف تھے۔ (حقیقت میں اس کا انتظار کر رہے تھے)۔ وہ سیدھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ ڈریس چینج کر کے واپس آئی تو وہ اسی طرح بیٹھے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان کے یہاں بیٹھنے کا جواز سوچتی ہوئی ساری تہہ کر کے ہینگر پر لٹکانے لگی۔ یہ کام بھی ہوگیا اور جب مصروف رہنے کا کوئی بہانہ نہ رہا تو مجبوراً اُن کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور وہ تو اسی انتظار میں تھے۔ میگزین ایک طرف رکھ کر پوچھنے لگے۔

"فارغ ہوگئیں آپ؟" اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"یہاں آ کر بیٹھیں۔" انہوں نے قریب والے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے چلتی ہوئی وہیں جا بیٹھی۔ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے، پھر اطمینان سے سامنے کی میز پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ صبح فون پر آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"میرے خدا۔ جس بات کا ڈر ہو، وہ ضرور ہو کر رہتی ہے۔ کیا تھا جو وہ صبح والا واقعہ بھول جاتے۔" اس نے سوچا۔

"بتایئے۔ کس کے حقوق کی بات کر رہی تھیں، میرے یا اپنے؟"

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگے۔ "میں واقعی اس وقت بہت مصروف تھا آپ کی بات ڈھنگ سے سُن نہیں سکا۔"

اُن کے لہجے میں خفگی نہیں تھی بلکہ دوستانہ انداز تھا۔ اور اس کی بات نہ سُن سکنے کا تھوڑا ملال بھی۔

"آئی ایم سوری شہروز احمد۔" وہ بمشکل اپنے آپ کو بولنے کے قابل بنا سکی۔ "میں نے غلطی فہمی کی بنا پر آپ کو رِنگ کر لیا تھا۔"

"کیسی غلط فہمی؟" وہ وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے اب جب کہ غلط فہمی نہیں رہی تو اُسے دوہرانے سے کیا فائدہ؟"

"پھر بھی میں جاننا چاہوں گا۔" وہ بضد تھے۔

"اور میں بتانا نہیں چاہتی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

"ربیعہ۔ بیٹھ جایئں۔"

لیکن وہ نہیں بیٹھی۔ رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"اچھا۔" وہ کھڑے ہوگئے۔ "ایک بات بتائیں، ایمانداری سے۔ کیا میری کسی بات نے آپ کو دُکھ

پہنچایا ہے ؟"
"نہیں ۔" وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر بولی ۔
"کچھ خفا لگتی ہیں ؟"
"نہیں شہروز احمد ۔" وہ اُن کی طرف پلٹی ۔" میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتی ۔ اپنی اب تک کی ز
میں کبھی کسی سے نہیں رُوٹھی ۔ پتا نہیں کیوں ہمیشہ مجھے ایسا لگا اگر میں رُوٹھ گئی تو کوئی منا نہیں پائے
آپ کو بھی شہروز احمد ۔ اِس کچھ وقت کے ساتھ میں خیال رکھنا ہے کہ ۔"
لمحہ بھر خاموش رہ کر وہ بولی ۔
"مجھے رُوٹھنے نہ دینا ۔"

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

"میں تمہیں کیوں رُوٹھنے دوں گا بھلا ؟" انہوں نے سوچا ۔"کوئی اپنی متاعِ عزیز کو خفا نہیں کر سکتا او
سے خفا ہو سکتا ہے ۔" وہ کچھ اور بھی سوچتے کہ وہ بولی اور اُس کی آواز اُن کی سوچوں کو توڑ گئی ۔
"اگر آپ کہیں تو میں اسٹڈی میں چلی جاؤں ۔" وہ انہیں جانے پہ آمادہ نہ دیکھ کر کہنے لگی ۔
"کیوں ؟"
"آپ کو وہاں دقت ہوتی ہوگی ۔"
"نہیں ۔ اوکے ۔ شب بخیر ۔"
وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اصرار نہ کرنے لگے ، جلدی سے 'شب بخیر' کہہ کر چلے گئے ۔
وہ بھی سونا چاہتی تھی ۔ اتنے دنوں بعد آج کا دن مصروف گزرا تھا ۔ اور مصروفیت نے تھوڑی
عطا کی تھی ۔ دل چاہا تکیے پہ سر رکھے اور پل میں غافل ہو جائے لیکن بیڈ پہ جانے کو دل نہیں چاہا ۔ اچانک
احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی دوسرے کے بیڈ روم پر قابض ہو گئی ہے ۔ یہاں کی کوئی چیز اس کی ا
نہیں ۔ وہ زبردستی کی مہمان ہے اور شاید بن بلائی بھی ۔
آہستہ روی سے چلتی ہوئی وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔ لان میں اُتری چاندنی نے اسے فوراً
کر دیکھنے پر مجبور کر دیا ۔ آسمان کے سینے پر جگمگاتے ستاروں کے درمیان پورا چاند کائنات پر اپنی چاند
کر کے بھی شاداں و فرحاں تھا ۔ اُس کی نظریں چاند کے اندر کسی کا عکس تلاش کرنے لگیں ۔
کتنی دیر گزر گئی ۔ آنکھیں دُکھنے لگیں ۔ لیکن وہ جسے تلاش رہی تھی ، وہ کہیں نہیں ملا ۔ نہ پورے
میں اس کا عکس جھلملایا اور نہ ستاروں کے جھرمٹ میں ۔ وہ پریشان ہو گئی ۔
"میرے خدا ۔ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟" انتہائی دکھ کے احساس میں گھر کر اُس
سوچا ۔
"یہ کون سا راستہ ہے جہاں سے پلٹ کر دیکھنے پر کوئی نظر نہیں آتا ہے ۔ نہ سامنے ۔ کس سمت
کسے آواز دوں ؟ کسے پکاروں ؟" آنکھوں میں نمی اُتری تو ہر شے دھندلا گئی ۔
گرل پر پیشانی ٹیک کر پلکیں موندیں تو آنکھوں میں ٹھہری نمی ، چپ چاپ رخساروں پہ اُتر آئی ۔
لمحے سرکتے رہے ۔ چپ چاپ ، بن آہٹ کے ۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی ۔ کوئی ہمدم نہیں ،
غمگسار نہیں ۔
کاش ۔ کوئی تو ہو جو پلکوں سے بے آواز ٹوٹتے موتیوں کو محسوس کر کے چلا آئے ۔ نرمی سے
پوچھے ۔
"کیوں روتی ہو ؟"
"تمہارے آنسو اتنے ارزاں نہیں ہیں ، انہیں یوں مت لٹاؤ ۔"
لیکن کون تھا جو بے آواز آنسوؤں کا سبب پوچھتا ۔ اُس نے خود ہی سارے آنسو اپنے دامن میں
لیے اور تھکے تھکے قدموں سے صوفے پر آ بیٹھی ۔ پتا نہیں ذہن تھکا ہوا تھا یا دل آزردہ کہ کوئی اچھی با

گئی ۔
مختلف اندیشے ، مختلف وسوسے جو آہستہ آہستہ دل میں جگہ بناتے جا رہے تھے اور بے شمار سوالات
د اُس کے اپنے متعلق تھے اور جن کے جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سو گئی تھی ۔
صبح معمول کے مطابق اُس کی آنکھ نہیں کھلی ۔ جس وقت شہروز اٹھ کر آئے ، وہ بے خبر سو رہی تھی ۔ انہوں
اٹھانا مناسب نہیں سمجھا ۔ ویسے بھی آج چھٹی کا دن تھا ۔ وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر کمرے سے نکل آئے ۔
حسبِ معمول لان میں کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے ۔ آج مہروز اٹھ کر نہیں آیا تھا ۔ شاید چھٹی کی وجہ سے
ا ہو ۔ انہوں نے اُس کے کمرے کی بند کھڑکی کو دیکھا ، پھر اندر چلے آئے ۔
خانساماں چائے لے کر آ رہا تھا ۔ انہوں نے روزانہ کی طرح لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی ۔ ساتھ ساتھ اخبار
دیکھتے رہے ۔ اس دوران امّی اور پھر مہروز بھی اپنے کمرے سے نکل آیا ۔ ندا آئی تو سیدھی کچن میں چلی گئی ۔
"ربیعہ نہیں اٹھی ۔ ؟" امّی انہیں مخاطب کر کے پوچھنے لگیں ۔
"نہیں ۔ اور میں نے اُٹھایا بھی نہیں ۔" وہ اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولے ۔
"اچھا کیا نہیں اُٹھایا ۔ شاید کل کی مصروفیت نے اسے تھکا ڈالا ۔" قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگیں ۔
ت نیک اور سعادت مند لڑکی ہے ۔ کبھی کسی کام کو منع نہیں کرتی ۔ کل سارا دن مجال ہے جو اس کے ماتھے
ی سی شکن بھی آئی ہو ۔ یہ یقیناً ہماری خوش نصیبی ہے کہ ربیعہ جیسی لڑکی اس گھر میں آئی ہے ۔"
"بھائی جان کی پسند کو داد دیجیے امّی ۔" مہروز شرارت سے بولا ۔
"شہروز کی پسند ہمیشہ سے ہر معاملے میں اچھی رہی ہے ۔" امّی مسکرا کر کہنے لگیں تو وہ اپنی جگہ پہلو بدل
ہ گئے ۔
"کل ندا کے سسرال والے بھی بہت تعریف کر رہے تھے ۔"
امّی کی بات پر انہیں موضوع بدلنے کا بہانا مل گیا ، یوں بولے جیسے ان ہی کی بات پر انہیں یاد آیا ہو ۔
"ہاں امّی ۔ پھر ندا کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں ؟"
"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ۔ اس کے سسرال والے تو اب جلدی شادی کرنا چاہتے ہیں جب کہ
خیال تھا ، ندا کم از کم امتحان تو دے لے ۔"
"ندا کے امتحان کوئی بہت زیادہ دُور تو نہیں ہیں ۔ یہی کوئی تین چار مہینے ہیں ۔ اور اتنا عرصہ تو شادی کی
ی میں بھی لگ ہی جاتا ہے ۔ آپ ان سے کہہ دیں جیسے ہی ندا امتحانوں سے فارغ ہوگی ، ہم شادی کر دیں گے ۔"
"میں نے کل بھی ان سے یہی کہا تھا لیکن پتا نہیں ان لوگوں کو کس بات کی جلدی ہے ۔"
"میں ایک بار پھر اُن سے بات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کروں گا ۔ اور میرا خیال ہے وہ ہماری
مان لیں گے ۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے ۔" اس دوران اگر مہروز کی بھی کہیں بات ہو جائے
۔"
"ہاں میری اپنی بھی یہی خواہش ہے کہ ساتھ ساتھ مہروز کی شادی بھی کر دیں ۔" امّی نے فوراً ان کی تائید کی ۔
"پھر کوئی لڑکی دیکھی آپ نے ؟"
"لڑکیاں تو کئی دیکھی ہیں بیٹا اور سب ہی ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں لیکن میں جو چاہتی ہوں وہ ۔" امّی
وش ہو کر پتا نہیں کیا سوچنے لگیں ۔
"آپ کیا چاہتی ہیں ؟" وہ پوچھنے لگے ۔
"میں شاید ربیعہ جیسی لڑکی ڈھونڈتی ہوں ۔"
"بھابی جیسی لڑکی ڈھونڈنی ہے تو ۔" مہروز بے اختیار بولا اور پھر فوراً خاموش بھی ہو گیا ۔
"ہاں ہاں کہو ۔ خاموش کیوں ہو گئے ؟" شہروز چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُسے جھینپتے دیکھ
اسے حوصلہ دینے کی غرض سے بولے ۔

"کمال ہے یار۔ بات تمہاری شادی کی ہے اور ہم تمہارا ہی مشورہ نہیں لے رہے۔ میرا خیال ہے بلا جھجک اپنی پسند بتا دو۔"

"میں۔۔۔؟" وہ سر کھجانے لگا۔

"کم آن مہروز۔ امی بالکل اعتراض نہیں کریں گی۔" شہروز نے پھر اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"میں بھلا کیوں اعتراض کروں گی؟ کیا شہروز کی پسند پر اعتراض کیا تھا میں نے؟ اور پھر بیٹا، تم تو میرا مسئلہ حل کر رہے ہو۔ جلدی بتاؤ۔"

امی کی بات پر کچھ حوصلہ ہوا تو کہنے لگا۔ "اصل میں کل اچانک ایک لڑکی اچھی لگی۔"

"یہ حادثہ اچانک ہی ہوا کرتا ہے۔" شہروز ہنسے۔ "تم کچھ اتا پتا بھی تو بتاؤ۔"

"آپ لوگ جانتے ہیں۔"

"ہم تو بہت سارے لوگوں کو جانتے ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم کہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں بھابی کی بہن کی بات کر رہا ہوں غالباً اُن سے بڑی ہیں۔"

مہروز سر جھکا کر کہہ رہا تھا۔ چاہتا تھا اپنی بات کا ردِعمل دیکھے لیکن فوراً سر نہ اُٹھا سکا۔

"کون صوفیہ؟" ان کی آواز میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں نام نہیں جانتا۔" اُس نے لاعلمی ظاہر کی۔

"تم نے کہاں دیکھا اُسے؟"

"کل جب بھابی کو لینے اُن کے گھر گیا تھا۔"

شہروز اس پر سے نظریں ہٹا کر امی کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر کتنی دیر تک ان دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بول سکا۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگا۔

"آپ بھابی جیسی لڑکی چاہتی ہیں جو اس گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھے تو ایسی لڑکی آپ کو اور کہیں نہیں ملے گی۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "آپ کہیں گی، میں نے شاید لڑکی کو ٹھیک طرح سے دیکھا نہیں تو میں نے اُسے دیکھا ہے۔ چلتے ہوئے بھی۔ اس کے پیر میں شاید نقص ہے۔ وہ چلتے ہوئے ذرا لنگڑاتی ہے۔"

"تمہیں اس سے ہمدردی ہوئی ہوگی۔" امی بڑی دیر بعد بولیں۔

"نہیں۔" وہ فوراً بول پڑا۔ "محض ہمدردی کی بناء پر میں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ فیصلہ میں نے اسی وقت نہیں کیا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد ہر پہلو سے سوچا، اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا۔" بات کے اختتام پر وہ امی کی طرف دیکھنے لگا۔ تو وہ کہنے لگیں۔

"بیٹا۔ مجھے تمہاری پسند اور تمہارے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ اعتراض ہے۔ پھر بھی میں کہوں گی کہ تم نوجوان ہو، جذباتی بھی ہو سکتے ہو۔ اور جذبات میں کیے گئے فیصلے پائیدار نہیں ہوتے۔ بہتر ہے کہ تم کچھ وقت اور سوچ لو۔"

"مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کو اختلاف ہو یا اعتراض، تو آپ بخوشی میری پسند ریجیکٹ کر سکتی ہیں۔ میں قطعی بُرا نہیں مانوں گا اور آپ جہاں کہیں گی وہیں شادی بھی کر لوں گا۔ اس کے برعکس اگر میری پسند کا سوال اُٹھائیں گی تو میں نہ صرف آج بلکہ آئندہ بھی جب کبھی آپ مجھ سے پوچھیں گی اسی کا نام لوں گا۔"

اس کی بات پر امی کچھ دیر تک سوچتی رہیں پھر شہروز سے پوچھنے لگیں۔

"تم کیا کہتے ہو؟"

"میں کیا کہوں؟" وہ اُلٹا اُن ہی سے پوچھنے لگے۔

"میرا مطلب ہے، تمہارا وہاں آنا جانا ہے۔ تم نے اس لڑکی کو کیسا پایا؟"

"میں وہاں بہت تو نہیں جاتا۔" وہ دامن بچاتے ہوئے بولے۔ "بہرحال آپ خود سوچ سکتی ہیں کہ ایک ہی گھر میں اور ایک ہی ماحول میں پروان چڑھنے والی لڑکیاں بہت زیادہ مختلف تو نہیں ہوں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"ویسے اچھی لڑکی ہے۔ بس ذرا احساسِ کمتری کا شکار ہے۔"

"یہ احساسِ کمتری ان لوگوں نے بخشا ہوگا جو اسے دیکھ کر ریجیکٹ کر دیتے ہوں گے۔ محض ذرا سے نقص کی بناء پہ۔"

مہروز کی بات پر امی ہلکے سے مُسکرائیں۔ جان گئی تھیں کہ اُس کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوگا۔

"بہرحال بیٹا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اس نقص کے ساتھ اسے قبول کر رہے ہو اور ایک بات یاد رکھنا کہ زندگی میں کبھی تم نے اس نقص کی بناء پر اُس کی دل آزاری کی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا امی۔" وہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر بولا۔

"پھر یہ سلسلہ کب شروع کر رہی ہیں؟" شہروز امی کو رضامند دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" مہروز کے فوراً بولنے پر شہروز اور امی بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی وقت ندا ناشتے کے لیے بلانے آ گئی۔ تو امی اس سے کہنے لگیں۔

"بیٹا۔ اپنی بھابی کو بھی اُٹھا دو۔ ناشتا ہمارے ساتھ کرے، پھر بے شک سو جائے۔"

ندا سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اُٹھ چکی تھی۔ اور اب کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ ندا کو دیکھ کر معذرت کرتی ہوئی بولی۔

"سوری۔ مجھے اُٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی۔"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہم لوگ بھی اب ناشتا کرنے جا رہے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے ندا کے ساتھ آ گئی۔ پھر ناشتے کے دوران مہروز اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"بھابی، آج امی آپ کے گھر جا رہی ہیں۔"

"میرے گھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے آپ کے میکے۔" وہ اُس کے سوال کا جواب دیتا ہوا بولا۔

"اچھا۔" وہ اچھا کہہ کر چپ ہو رہی۔

"کیا بات ہے؟ آپ پوچھیں گی نہیں، کس لیے؟" شہروز کے ٹوکنے پر پہلے اُس نے اُن کی طرف دیکھا، پھر مہروز اور ندا پر سے ہوتی ہوئی اُس کی نظریں امی پر جا ٹھہریں۔

"بیٹا۔ میں تمہاری بہن صوفیہ کے لیے جانا چاہتی ہوں۔"

"چھوٹی آپا کے لیے؟" اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور فوری طور پر امی کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

"ہاں، لیکن پہلے یہ بتا دو، وہ کہیں منسوب تو نہیں؟" فوراً اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"نہیں۔ لیکن آپ کس لیے جانا چاہتی ہیں؟"

"ظاہر ہے، اب اس گھر میں صرف مہروز ہی رہ گیا ہے۔"

"مہروز۔" اُسے بالکل یقین نہیں آیا۔ اور یقین آتا بھی کیسے، اتنے معمولی معمولی لڑکے انہیں ریجیکٹ کر چکے تھے۔ تصدیق کے لیے کبھی مہروز کی طرف دیکھتی، کبھی شہروز کی طرف۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ گئے کہ وہ غیر یقینی سی ہے اور اس خیال سے کہ کہیں اس کے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے۔ ٹیبل کے نیچے اُس کے پیر کو اپنے پیر سے دبا کر سنبھلنے کا اشارہ کیا اور وہ فوراً سنبھل بھی گئی۔

"تم کچھ کہو گی نہیں ؟" امّی پوچھنے لگیں۔

"میں کیا کہوں امّی۔ آپ بہتر سمجھتی ہیں۔" وہ ابھی تک گومگو کا شکار تھی۔

"بھابی، آپ ہمیشہ ہر معاملے میں دامن بچا جاتی ہیں۔" ندا نے چھیڑا۔ ویسے اُس نے حقیقت بیان کی تھی۔

"میں دامن نہیں بچا رہی۔ بس اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دے سکوں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہاں سے اُٹھ کر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر ابھی وہ اس ساری بات کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شہروز آ گئے۔

"یہ کیا حرکت تھی ؟" قدرے ناگواری سے پوچھنے لگے۔

"کون سی ؟" وہ واقعی نہیں سمجھی۔

"اس طرح وہاں سے اُٹھ کر کیوں چلی آئیں ؟"

"کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا ؟" وہ اُلٹا ان ہی سے پوچھنے لگی۔

"عجیب لڑکی ہیں آپ۔ امّی ایک اہم موضوع پر بات کر رہی تھیں اور آپ کے اُٹھ کر آنے سے وہ پتا نہیں کیا سمجھنے لگیں۔"

"کک۔ کیا سمجھنے لگیں ؟"

"یہی کہ آپ کو صوفیہ کے لیے مہروز پسند نہیں۔"

اُس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگے۔ "کیا واقعی ایسا ہے ؟"

"نہیں تو۔"

"پھر ؟"

"پھر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" وہ اُلجھی اُلجھی سی بولی۔

"کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ؟ سیدھی سی بات ہے کہ آج ہم صوفیہ کے لیے مہروز کا پروپوزل لے کر جائیں گے۔"

"لیکن امّی شاید نہیں جانتیں کہ۔"

"امّی بھی جانتی ہیں اور مہروز بھی۔" وہ جان گئے تھے کہ وہ چھوٹی آپا کے نقص کی طرف اشارہ کرے گی، اس لیے اُس کی بات کاٹ کر کہنے لگے اور وہ بے خیالی میں ان کی طرف دیکھے گئی۔

"اب بھی کوئی اُلجھن ہے ؟" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرائے تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ بھی کہہ ڈالیے۔"

"یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں ؟" وہ واقعی حیران تھے۔

"اس لیے شہروز احمد کہ میں یہاں کچھ وقت کی مہمان ہوں۔ اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔ ہمارا ناطہ بندھن کچے دھاگے سے بھی کمزور ہے۔" اُن کے ہونٹ بھینچنے پر رُخ موڑتی ہوئی بولی۔

"جس روز یہ ناتا ٹوٹا ظاہر ہے کہ ٹوٹنا ہی ہے، اس سے چھوٹی آپا کی زندگی متاثر ہوگی۔"

"ناتا ہمارا ٹوٹے گا۔ اُن کی زندگی کیوں متاثر ہوگی ؟"

"ظاہر ہے، وہ میری بہن ہیں۔ اور میرے ساتھ ہونے والی ہر بات ان کے لیے طعنہ بن جائے گی۔"

"اپنے دل سے یہ خدشات نکال دیجیے ربیعہ بیگم۔ میں آپ پر ایسا کوئی الزام نہیں آنے دوں گا جو آپ کی بہن کے لیے طعنہ بنے اور پھر مہروز اُسے مضبوط بندھن میں باندھ کر لائے گا۔ کچے دھاگے سے نہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ رُکے نہیں، فوراً کمرے سے نکل گئے تھے۔

امّاں حیران تھیں کہ ابھی دو روز پہلے ہی تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ شہروز سے یا اپنی ساس سے کہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں میں صوفیہ کے لیے کوئی لڑکا دیکھیں اور اب اتنی جلدی وہ اپنی پوری سُسرال کے ساتھ موجود تھی۔ وہ بھی کسی اور کا نہیں، مہروز کا رشتہ لے کر۔ اور اس سے بڑی خوشی امّاں کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن کیونکہ ایسے موقعوں پر وہ کمالِ ضبط کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ اس لیے اب بھی تحمل سے کام لیا۔

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے ابّا میاں بھی اس وقت موجود تھے اور اس سے پہلے کہ ابّا میاں کے منہ سے "صوفیہ آپ ہی کی بیٹی ہے" قسم کا کوئی جملہ نکلتا، امّاں فوراً بول پڑیں۔

"گو کہ ہمیں سوچنے کی ضرورت تو نہیں ہے کیونکہ ہماری بیٹی ربیعہ آپ کے گھر میں ماشاءاللہ خوش و خرم ہے۔"

"اِنشاءاللہ صوفیہ بھی خوش و خرم رہے گی۔" امّی نے فوراً جواباً کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ پھر بھی ہم صوفیہ کی رائے لے لیں، پھر کوئی جواب دے سکیں گے۔" امّاں نے آئندہ پر بات ٹالی۔

"آپ ابھی اُس سے پوچھ لیں۔ میں منہ میٹھا کر کے ہی جاؤں گی۔" امّی اطمینان سے بیٹھ گئیں کیونکہ انہیں مہروز کے لیے اس گھر کے علاوہ اور کہیں نہیں جانا تھا۔ امّاں نے ابّا میاں کی طرف دیکھا تو وہ ربیعہ سے کہنے لگے۔

"جاؤ بیٹا۔ تم بہن سے بات کر لو۔"

وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی جہاں چھوٹی آپا چائے بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

"بس چائے تیار ہے۔ میں ابھی لے کر آ رہی ہوں۔"

"آپ کو چائے لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ شریر مُسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کیوں ؟"

"اس لیے کہ اندر آپ کے سسرال والے آئے ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟ اور کون آیا ہوا ہے ؟" چھوٹی آپا ایک دم اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"اور کوئی نہیں ہے۔ امّی، شہروز اور ندا ہیں۔" پھر آواز دھیمی کر کے بولی۔ "یہ سب آپ کو مہروز کے لیے مانگنے آئے ہیں۔"

"کیا ؟" چھوٹی آپا کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔

"چھوٹی آپا پلیز۔" وہ کہنا چاہتی تھی، آہستہ بولیں۔ لیکن چھوٹی آپا آہستہ تو کیا بولتیں، اُسے اپنے سامنے سے دھکیلتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ وہ ان کے پیچھے بھاگی لیکن دروازے ہی میں اُس کے قدم رُک گئے۔

چھوٹی آپا کو پتا نہیں ابّا میاں کی موجودگی کا علم تھا کہ نہیں براہِ راست امّی کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

"بیگم صاحبہ، آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔ میں چلتی ہوں تو لوگ میرا مذاق اُڑاتے ہیں اور اکثر کو تو میرا نام بھی معلوم نہیں کیونکہ ان میں، میں لنگڑی مشہور ہوں۔"

"بیٹا۔ یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔" امّی نے چھوٹی آپا کی باتوں کا بالکل بُرا نہیں منایا بلکہ محبت سے اپنے پاس بلانے لگیں۔ جبکہ امّاں کے ساتھ ابّا میاں بھی پتا نہیں شدید شاک میں تھے یا اُنہیں سکتہ ہو گیا تھا۔ حیرت سے آنکھیں اور منہ کھولے چھوٹی آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور چھوٹی آپا امّی کے بُلانے پر ان کے پاس جانے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولیں۔

"مجھے ہمدردی نہیں چاہیے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ پر ترس کھانے کی۔ اپنے بیٹے پر رحم کھائیں، آخر کیا سوچ کر آپ یہاں آئی ہیں ؟"

"صوفیہ۔" ابّا میاں اچانک ہوش میں آ گئے اور انہیں سرزنش کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔

"آپ سب لوگ میرے دشمن ہیں۔ میرا تماشا بنوانا چاہتے ہیں لیکن میں کسی کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ مجھے نہیں کرنی شادی کسی سے بھی نہیں۔ آپ سب لوگ چلے جائیں یہاں سے۔" چھوٹی آپا نے دونوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ شاید وہ رونے لگی تھیں۔ اسی طرح وہ چھوٹے کمرے میں چلی گئیں اور دروازہ اندر بند کر لیا۔

ایک دم سے خاموشی چھا گئی اور کتنی دیر تک کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔ امّاں اور ابا میاں کی طرح وہ بھی تھی اور کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

بہت خاموشی سے اٹھ کر وہ کچن میں آ گئی۔ چائے بنی رکھی تھی۔ اس نے ٹی پاٹ اٹھا کر ٹرے میں پھر ٹرے اٹھا کر اندر آ گئی۔ ابھی تک ویسی ہی خاموشی تھی۔ وہ میز کے پاس گھٹنے ٹیک کر پیالیوں میں چائے لگی۔ شہروز نے امّی کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کیا اشارہ کیا اور جواب میں ان کا اشارہ سمجھ کر اُس سے قدرے اونچی آواز میں کہنے لگے۔

"ربیعہ۔ گھر میں کوئی میٹھی چیز رکھی ہو تو وہ بھی لے آئیں۔ ہم سب منہ میٹھا کر کے جائیں گے۔"

اُس نے ہڑبڑا کر پہلے انہیں دیکھا پھر امّاں کی طرف دیکھنے لگی۔ امّاں کچھ نہ بول سکیں تو ابا میاں کہنے لگے۔

"میری بچی نے جو کچھ کہا اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔" امّی کہنے لگیں۔ "یقیناً حالات نے اسے تلخ بنا دیا ہے۔ ہمیں بالکل بُرا نہیں لگا۔ اور ہم مایوس بھی نہیں ہوئے۔ آپ اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیجیے۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے بھی لیجیے گا۔"

"تو کیا اب بھی۔؟" امّاں حیران تھیں۔

"ہاں۔ ہمارا دامن ابھی تک پھیلا ہوا ہے اور ہم بنا لیے سمیٹیں گے بھی نہیں۔"

"ہم ہامی بھر لیں اور وہی نہ مانے پھر؟"

"وہ مان جائے گی۔ جب اسے یہ یقین مل جائے گا کہ ہم واقعی اُس کے طلب گار ہیں، خلوصِ دل اور نیت کے ساتھ۔ ہم نے اُس کی ذات کی اچھائیوں کو پا لیا ہے، جن کی روشنی سے ہم اپنے گھر میں اُجالا کرنا چاہتے ہیں۔" امّاں اور ابا میاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اُن کی عظمتوں کے سامنے سر جھکا کر رہ گئی۔

"شہروز بیٹا۔ ڈرائیور سے کہہ دو، اچھی سی مٹھائی لے کر آئے۔" انہوں نے ماحول پر چھائی افسردگی کم کرنے کی غرض سے مسکرا کر کہا تو وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔

"میں خود لے کر آتا ہوں۔" پھر جاتے جاتے اس سے کہنے لگے۔ "ربیعہ، آپ ذرا دوبارہ چائے بنانے کی زحمت کر لیں۔"

"جی۔" وہ فوراً برتن سمیٹنے لگی تو امّی کے اشارے پر ندا بھی اُس کے ساتھ مل گئی۔ پھر اُس کے ساتھ کچن میں آئی۔ وہ بہت خاموش ہو گئی تھی۔ اور ندا سے بھی نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ خاموشی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور چائے کے برتن دھو کر دوبارہ ٹرے میں رکھنے لگی۔

ندا نے چاہا کہ اسے مخاطب کرے لیکن وہ کچھ اتنی لاتعلق سی نظر آ رہی تھی کہ وہ بار بار بس اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اسی وقت ہما اس طرف آئی۔ اُن دونوں کو کچن میں دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپی۔ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اور یہ ندا باجی کو بھی کام سے لگا دیا۔ مجھ سے کہا ہوتا۔" اُس کے خیال میں جیسے یہ بہت بڑی بات تھی۔

"بس چائے ہی تو بنانی تھی۔" اُس نے ٹی پاٹ میں کھولتا ہوا پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور یہ ندا باجی کیا سوچیں گی؟" اُسے یہی فکر لاحق تھی۔

"میں کچھ نہیں سوچوں گی۔" ندا نے مسکراتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا۔ "تم یہ بتاؤ، صوفیہ باجی کہاں ہیں؟"

"چھوٹے کمرے میں۔"

"کیا میں اُن کے پاس جا سکتی ہوں؟"

"اس وقت نہیں۔" ہما نہیں جانتی تھی کہ چھوٹی آپا کس بات پر رو رہی ہیں اس لیے ندا کے سامنے بات بناتی ہوئی کہنے لگی۔ "ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو، کوئی ایسی بات کر جائیں جو آپ کو بُری لگے۔"

"ہاں ندا۔ پھر کسی وقت آنا تو مل لینا۔" اُس نے ہما کی تائید کی پھر شہروز کے آنے پر اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے مٹھائی کے ڈبے اُن کی طرف بڑھا دیے۔ جو ان کے ہاتھوں سے لیتے ہی اس نے ندا اور ہما کے سامنے رکھے اور کھولنے کے لیے کہا۔ خود جلدی جلدی پلیٹیں نکالنے لگی۔

"یہ مٹھائی کس خوشی میں آئی ہے؟" ہما پوچھنے لگی۔

"تمہیں نہیں پتا۔" ندا اس کی بے خبری پر حیرت سے بولی۔

"نہیں۔"

"بھئی مہروز بھائی اور صوفیہ باجی کی نسبت طے ہوئی ہے۔"

"کیا؟" ہما کو یقین نہیں آیا۔ تصدیق کے لیے ربیعہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر کندھے جھٹکتی ہوئی بولی۔

"تو چھوٹی آپا اس لیے رو رہی ہیں؟"

"حالانکہ یہ رونے کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔" ندا کے کہنے پر وہ زور سے ہنس پڑی۔ "پھر میں کلثوم کو بتا آؤں" کہتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اُس نے ایک ٹرے ندا کے ہاتھوں پر رکھی اور دوسری خود اُٹھا کر اندر چلی آئی۔

اندر کا ماحول کافی حد تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے نکلتے ہوئے اُس نے امّاں اور ابا میاں کے چہرے پر جو شرمندگی کے بادل دیکھے تھے، وہ چھٹ چکے تھے۔ اور یقیناً یہ امّی کا کمال تھا۔ اُس نے ابا میاں سے اجازت لے کر مٹھائی کی پلیٹ امّی کی طرف بڑھا دی۔ پھر خوشگوار ماحول میں سب نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ اور جب امّی جانے کے لیے اُٹھیں تو امّاں ایک بار پھر ان سے چھوٹی آپا کے رویے کی معافی مانگنے لگیں۔

"امّاں۔ آپ ناحق شرمندہ ہو رہی ہیں۔" شہروز امّاں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "غلطی ہماری ہے جو یوں ہم منہ اُٹھائے چلے آئے ہیں۔ ہمیں ربیعہ کے توسط سے نہ صرف صوفیہ کی مرضی معلوم کرنی چاہیے تھی بلکہ آمادہ بھی کروانا چاہیے تھا۔ بہرحال آپ دل پر بوجھ مت ڈالیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

امّی نے شہروز کی تائید کی پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"چلو بیٹا۔" وہ اس وقت ان سب کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کسی بھی بہانے میں رُک جائے لیکن امّی نے اُسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر تک آئیں اور پھر وہ چُپ چاپ اُن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

رات میں وہ اس خیال سے جلدی کمرے میں آ گئی کہ شہروز موجود ہوں گے اور وہ اُن سے چھوٹی آپا کے رویے کی معافی مانگ لے گی۔ دل پر ایک بوجھ تھا۔ گو کہ وہ امّی اور ندا کے سامنے بھی شرمندگی کا اظہار کر چکی تھی لیکن شہروز سے معذرت بھی ضروری تھی۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً اپنی انسلٹ محسوس کرتا۔ لیکن انہوں نے بڑی فراخدلی سے سارا الزام اپنے سر لے لیا کہ انہیں ہی چھوٹی آپا کی مرضی معلوم کرنی چاہیے تھی۔

اور اب اس کا بھی فرض تھا کہ ان کی بڑائی تسلیم کرتے ہوئے معافی کے چند الفاظ ہی کہہ دے لیکن شہروز کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اُس نے اسٹڈی روم کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اُسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ہی وہ اتنی جلدی کمرے میں بند ہو گئے ہیں۔

کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی، پھر یوں ہی اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

ویسے بھی جب تک دل بوجھل تھا، نیند نہیں آنی تھی۔ کئی بار رُک کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔
"کاش اُنہیں کوئی کام یاد آجائے۔ کوئی چیز بھول گئے ہوں۔ اُسے ہی اٹھانے چلے آئیں۔ کوئی ضرو
کال آجائے۔ کچھ تو ہو۔" لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور اُسے ہی اپنے اندر ہمت پیدا کرنی پڑی۔ بے آواز
سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور کچھ دیر کے لیے سانس روک کر دروازے سے کان لگائے یہ مو
کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ آیا وہ سو رہے ہیں یا کوئی کام کر رہے ہیں۔
پھر اندر ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دروازے پر ہلکی سی دستک
ڈالی۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، فوراً ہی دروازہ کُھل گیا اور اُسے دیکھ کر ہلکی آواز میں پوچھنے لگے۔
"اینی پرابلم؟" اُس نے یونہی بے خیالی میں اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ پورا دروازہ کھول کر کمرے میں
پہلے اِدھر اُدھر کا جائزہ لے کر اپنا اطمینان کیا، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
"کیا بات ہے؟"
"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے لیکن پلیز پہلے آپ بیٹھ جائیں۔"
وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بیٹھ گئے اور سوالیہ نظریں اُس کے چہرے پر جما دیں۔ اب اُس کی سمجھ
نہیں آرہا تھا، بات شروع کس طرح کرے۔
"جو بھی بات ہے صبح کر لیجیے گا۔" وہ اُسے گومگو کی حالت میں دیکھ کر اُٹھنے لگے کہ اُس نے روک
"نہیں۔ اس طرح مجھے نیند نہیں آئے گی۔"
"اچھا۔" وہ ہنسے۔ "اگر سونے کے لیے اپنی بات کہنی ضروری ہے تو جلدی سے کہہ ڈالیے۔"
"میں چھوٹی آپا کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بھی جلدی سے کہہ گئی۔
"ربیعہ۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "صوفیہ کا طرزِ عمل بالکل فطری تھا۔ اُن کی جگہ کوئی اور یا میں ہی
تو ایسا ہی کرتا۔ یہ تو اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے، کوئی جان لیتا ہے اور کوئی جان نہیں پاتا۔ بہر حال آپ ا
دل پر بوجھ مت ڈالیے۔ میں نے امّی یا ندا میں سے کسی نے آپ سے کچھ کہا نہیں ناں، تو پھر آپ کیوں
خوامخواہ شرمندہ ہو رہی ہیں؟"
اُس کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگے۔
"میں جانتا ہوں، آئندہ بھی وہ ایسا ہی کریں گی اور اگر ہم اسے اپنی ہتک محسوس کر کے وہاں جانا چھوڑ
دیں تو اس طرح مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ہمیں انہیں سمجھانے کے ساتھ یہ یقین دلانا ہے کہ ہم اُن پر ترس نہیں کھا
سمجھیں آپ۔"
وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکا گئی۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اُٹھ کھڑے ہوئے پھر اسٹڈی روم میں جا
سے پہلے ہلکی مُسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔
"میرا خیال ہے اب آپ سو سکیں گی۔"

شہروز احمد نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے
دنیا کا مشکل ترین کام چھوٹی آپا کو سمجھانا ہے۔ اس واقعے کے کوئی ہفتہ بھر بعد وہ امّی کے کہنے پر محض اسی
سلسلے میں امّاں کے گھر رہنے آئی تھی کہ چھوٹی آپا کو اس رشتے پر رضامند کر سکے۔
لیکن چھوٹی آپا تو اس کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر کر کچن میں چلی گئیں۔ اسے بے حد دُکھ ہوا۔ گمان میں
بھی نہیں تھا کہ چھوٹی آپا اس سے بھی ناراض ہو سکتی ہیں۔ امّاں کی طرف دیکھا تو انہوں نے اشارے سے منع
کیا کہ فی الحال اسے نہ چھیڑو لیکن اسے چین نہیں آیا۔
کچھ دیر امّاں کے پاس بیٹھ کر بہانے سے کچن میں چلی گئی۔ چھوٹی آپا پیڑھی پر بیٹھی چاول چن رہی تھ

نے یوں ہی بنا پیاس کے ایک گلاس پانی پیا۔ پھر اندر ہی اندر ڈرتی ہوئی دوسری پیڑھی کھینچ کر ان کے
نے بیٹھ گئی۔ چھوٹی آپا نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں۔
"چھوٹی آپا۔ مجھ سے کیوں خفا ہیں؟" اُس کے پوچھنے پر انہوں نے غصّے سے چاولوں کی ٹرے ایک طرف
ی اور اُٹھنے کو تھیں کہ اُس نے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
"چھوٹی آپا۔ پلیز میرا قصور بتائیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"
"یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہے۔" وہ دانت پیستی ہوئی بولیں۔ "بہت شوق ہے میری امّاں بننے کا۔ میں
ی ہوں تمہیں شرم نہ آئی، اپنی ساس سے میرے لیے بَر مانگتے ہوئے؟"
"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ صدمے سے جیسے رو دینے کو تھی۔
"تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کیا اس دن امّاں تم سے یہ نہیں کہہ رہی تھیں کہ شہروز سے
ی ساس سے میرے لیے بات کرو اور دو ہی دن بعد تم ان سب کو لے کر آگئیں۔" غصّے سے چھوٹی
ا چہرہ لال ہو گیا تھا۔
"یہ صحیح ہے کہ امّاں نے مجھ سے کہا تھا لیکن یقین کریں، میں نے تو ابھی کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا تھا
لوگ خود ہی یہ بات چھیڑ گئے۔"
"جھوٹ بولتی ہو تم۔" وہ سختی سے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولیں۔
"جو چاہیں قسم لے لیں اور پھر آپ ہی سوچیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اِدھر میں بات کروں اور اُدھر وہ
تیار ہو جائیں؟"
"تم نے منّت کی ہو گی یا اپنا حق استعمال کیا ہو گا۔"
"حق۔ کیسا حق؟ میرا کوئی حق نہیں ہے اُن پر۔" وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی اور شکر کہ چھوٹی آپا نے اس
ت پکڑی نہیں، کہنے لگیں۔
"چہیتی بہو ہو اس گھر کی اور میں جانتی ہوں وہ لوگ تمہاری بات نہیں ٹالتے۔"
"ٹھیک ہے، وہ میری بات نہیں ٹالتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ادھر میں منہ سے بات نکالوں اور
ر اُ پوری کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آخر کچھ وقت تو سوچنے میں بھی لگتا ہے۔"
"تم کچھ بھی کہہ لو ربیعہ۔ میں نہیں مانوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے پر یہاں آئے ہیں ورنہ
ے بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟"
"چھوٹی آپا۔" وہ رونے لگی۔ "آپ بے شک ہامی نہ بھریں لیکن مجھے الزام تو نہ دیں۔ بخدا میں نے آج تک
گھر کا کوئی چھوٹا سا مسئلہ بھی شہروز احمد کے سامنے نہیں رکھا۔ آپ میرا یقین کریں، میں کبھی بھی ان سے یا
سے آپ کے بارے میں بات نہیں کر سکتی تھی۔"
"پھر انہیں کیا باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ اچھی بھلی لڑکیوں کو چھوڑ کر مجھ لنگڑی کے لیے چلے آئے۔" وہ
حد تلخ لہجے میں بول رہی تھیں۔
"خدا کے لیے چھوٹی آپا۔ اپنے آپ کو اس طرح مت کہا کریں، مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔" وہ اور
شدّت سے رونے لگی۔ "میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی ٹانگ کاٹ کر آپ کے لگا دیتی۔"
"ربیعہ۔" اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ یوں بلک بلک کر روئے اور چھوٹی آپا پتھر بنی بیٹھی رہیں۔ اُس
کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ "اس طرح تو مت رو۔"
"پھر کیا کروں؟ آپ میرا یقین جو نہیں کر رہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔
"یقین دلانے کے لیے رونا ضروری ہے کیا؟" وہ بھی زچ کر دیتی تھیں۔
"پھر اور کون سا طریقہ اختیار کروں؟" وہ سادگی سے پوچھنے لگی۔
"مزید کوئی طریقہ مت آزماؤ۔ میں مان لیتی ہوں کہ تم نے کچھ نہیں کہا ہو گا۔" چھوٹی آپا کے سپاٹ لہجے پر

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔
"آپ میرا دل رکھنے کی خاطر ایسا کہہ رہی ہیں۔؟"
"نہیں بھئی۔ میں نے تمہارا یقین کر لیا ہے۔ لیکن پلیز اب اس موضوع پر کوئی بات مت کرنا۔" اس لیے فی الحال یہی بہت تھا کہ چھوٹی آپا اس کا یقین کر کے اب خفا نہیں رہی تھیں۔ اُس نے سوچا پھر کسی ان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کرے گی۔ دوپٹے کے پلّو سے چہرہ صاف کرتی ہوئی بدلنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔
"کیا پکاتے جا رہی تھیں؟"
"دال، چاول۔ لیکن اب تم آگئی ہو تو کچھ اور۔"
"نہیں بھئی۔ میں تو دال، چاول ہی کھاؤں گی۔" وہ فوراً بول پڑی۔
"شہروز بھائی نہیں آئیں گے؟"
"اس وقت تو نہیں آئیں گے۔ اور شام میں بھی آتے ہیں تو کون سا کھانے کے لیے رُک جاتے ہیں۔"
چھوٹی آپا کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہیں، پھر دوبارہ چاول کی ٹرے اٹھاتی ہوئی کہنے لگیں۔
"اچھا۔ اب تم اندر جا کر بیٹھو۔"
"نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔ لائیے چاول میں چُن دیتی ہوں۔ آپ جب تک دال چڑھا لیں۔" اُس
چھوٹی آپا کے منع کرنے کے باوجود چاول کی ٹرے ان کے ہاتھوں سے لے لی۔ پھر کھانا پکنے تک وہیں رہی اور اُن کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔
شام میں شہروز آئے۔ حسبِ سابق کچھ دیر بیٹھے۔ بس ایک فرض جوان کے خیال میں انہیں نبھانا تھا لیا۔ اس دوران چھوٹی آپا ان کے سامنے نہیں آئیں اور پہلی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے ان کے بارے میں بھی نہیں۔
پتا نہیں انہیں خیال نہیں آیا یا جان بوجھ کر نظر انداز کر گئے تھے۔ اس وقت اُس نے بالکل دھیان دیا۔ کہ ہمیشہ تھوڑے وقت میں بھی ہر ایک کے بارے میں پوچھنے والے اس وقت چھوٹی آپا کو کیسے نظر کر گئے ہیں۔ وہ تو جب رات کو سونے کے لیے لیٹی، تو چھوٹی آپا خود ہی اس سے پوچھنے لگیں۔
"سنو، شہروز بھائی میرے بارے میں پوچھ رہے تھے؟"
"نہیں۔" بے خیالی میں اُس کے منہ سے سچ نکل گیا۔ لیکن پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ "اصل میں آج وہ بہت عجلت میں تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنی جلدی اُٹھ کر چلے گئے۔" اِ خیال آیا تو پوچھنے لگی۔
"لیکن چھوٹی آپا۔ آپ تو اُن کے سامنے آئی ہی نہیں۔ کہاں تھیں آپ؟"
"میں اندر ہی تھی۔" وہ دبے لہجے میں بولیں۔
"کیا شہروز سے بھی خفا ہیں؟"
"میں ان سے خفا نہیں ہوں بلکہ شرمندہ ہوں۔"
"کیوں؟" ربیعہ نے انجان بن کر پوچھا۔
"اس روز میں نے بہت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ پتا نہیں، وہ کیا سوچتے ہوں گے؟" وہ اپنے آ کچھ کہنے سے باز رکھنا چاہتی تھی کہ چھوٹی آپا مزید کچھ کہیں اور وہ کہنے لگیں۔
"مجھے بعد میں احساس ہوا کہ مجھے کم از کم ابا میاں اور شہروز بھائی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا لیکن میں کرتی، اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ میں نے تو تمہارا خیال بھی نہیں کیا۔ تمہاری پوزیشن سسرال میں آکوَرڈ ہو گئی ہوگی۔ سچ بتاؤ ربیعہ، سب نے کیا کیا کہا تم سے؟"
"چھوٹی آپا۔" اُس نے چارپائی کی پٹی پر رکھے اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "کسی نے کچھ نہ

یہ کہ میں نے امّی، ندا اور شہروز سے الگ الگ معذرت کی لیکن کسی نے مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔"
لیکن شہروز بھائی خفا ضرور ہیں۔ کیونکہ آج میں اُن کے سامنے نہیں گئی تو انہوں نے میرے بارے میں تک نہیں۔"
ارے نہیں چھوٹی آپا۔ میں نے بتایا ناں، وہ بہت عجلت میں تھے۔"
خواہ کتنی ہی عجلت میں کیوں نہ ہوں، کھڑے کھڑے ہی سب کا احوال پوچھ لیتے ہیں۔"
اگر آپ کو ان کی خفگی کا اتنا ہی خیال ہے تو ایک ذرا سی 'ہاں' کہہ کر اُن کی خفگی دور کر دیجیے۔" وہ فوراً موضوع کی طرف آگئی۔
نہیں ربیعہ، ایک یہی نہیں کر سکتی۔" وہ جیسے خود کو مجبور پا رہی تھیں۔
کیوں؟ کیوں چھوٹی آپا؟ آخر کیا خامی ہے مہروز میں؟"
خامی مہروز میں نہیں، مجھ میں ہے۔ پتا نہیں وہ کس کے دباؤ میں آکر مجھ سے شادی کی ہامی بھر رہا ہے۔ تم ہی ایمانداری سے بتاؤ کہ شاہراہِ حیات پر میں اُس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل ہوں؟"
وہ نہیں جانتی تھی کہ پہلے مہروز نے انہیں پسند کیا اور اس کے کہنے پر امّی یہاں آئی تھیں۔ کسی نے بتایا بھی نہیں تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ اسی وقت بتا دیتی کہ مہروز کسی کے دباؤ میں نہیں ہے۔ نے خود انہیں پسند کیا ہے لیکن لاعلمی کی بناء پر خاموش تھی اور چھوٹی آپا اپنی بات کا جواب نہ پا کر کروٹ لیں۔
اگلے دن اتفاق سے بڑی آپا آگئیں۔ بہت دنوں کے بعد آئی تھیں (ویسے بھی وہ کم کم ہی آتی تھیں)۔ میں جو ایک ٹینشن سی تھی، اُن کے آنے سے دُور ہو گئی۔ سب ہی اُن کے بچّے میں لگ گئے تھے۔ کیونکہ گھر میں ایک طویل مدّت کے بعد بچّے کی آمد ہوئی تھی، اس لیے اس ننھی سی جان کے لیے ایک افراتفری تھی۔
کوئی اُسے گود میں لینا چاہتا، کوئی اس کی فیڈر دھونے میں مصروف، کسی کو یہ فکر کہ چارپائی پر کیسے لیٹے گا؟ آپا اپنے بچّے کی اتنی ناز برداریاں دیکھ دیکھ کر مغرور ہوئی جا رہی تھیں۔
ربیعہ کتنی دیر سے اُسے اپنی گود میں لینا چاہ رہی تھی لیکن چھوٹی آپا، کلثوم اور ہما اسے موقع ہی نہیں دے رہیں۔ ذرا دیر کو وہ اماں کی گود میں آیا تو اس نے لپک کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر گود میں لٹا کر اُس کی غوں غاں کر رہی تھی کہ بڑی آپا اس سے کہنے لگیں۔
ربیعہ۔ تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا؟۔ غالباً سال تو ہونے والا ہو گا؟"
جی۔" وہ ہنوز منّے میں مگن تھی۔
پھر تمہاری گود ابھی تک کیوں خالی ہے؟"
جی۔" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ 'یہ بڑی آپا کیا کہہ رہی ہیں؟'
یوں آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو، کسی ڈاکٹر کو۔"
ہلکے پکارنے پر بڑی آپا اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں تو وہ موقع غنیمت جان کر بچّے کو اماں کی گود میں دے کر کھڑی ہوئی۔ اور جانے کو تھی کہ بڑی آپا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور اب نئی بات۔
یہ تم ہر وقت اماں کے گھر کیوں ڈیرہ جمائے رکھتی ہو؟۔ تمہارے سسرال والے کچھ نہیں کہتے؟"
کیا مطلب؟۔ اب اماں کے گھر بھی نہ آؤں۔" وہ الٹا اُنہی سے پوچھنے لگی۔
ضرور آؤ۔ لیکن قدم روک کر۔ میں تو جب بھی سنتی ہوں معلوم ہوتا ہے، تم یہیں ہو اور آٹھ آٹھ دن آئی ہو۔"
بیٹا کیسی باتیں کرتی ہو؟" اماں نے ٹوکا۔
اماں۔ میں غلط بات نہیں کر رہی۔ اِسے احساس ہونا چاہیے کہ اس گھر کے حالات ایسے نہیں ہیں جو

بیاہی بیٹیاں آٹھ آٹھ دن رہنے آجائیں۔"

"تواب اس گھر پر بھی میرا حق نہیں رہا۔" اُس نے دُکھ سے سوچا اور اندر گھر کرتے آزردگیوں کے چہرے پر بھی منڈلائے تھے جنہیں محسوس کر کے بڑی آپا نرم پڑتی ہوئی بولیں۔

"بُرا مت ماننا ربیعہ۔ میں تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔" پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا کہنے لگیں۔

"دیکھو لڑکی کا اصل گھر اس کا سسرال ہوتا ہے، تم اگر ہر دوسرے دِن بھاگ کر یہاں آجاؤ گی تو ا کو اس گھر میں کبھی بھی ایڈجسٹ نہیں کر سکو گی۔"

"میں روز روز کہاں آتی ہوں، ابھی بھی میں چھوٹی آپا کی وجہ سے آئی ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا صوفیہ کو؟" اُس پر سے ہوتی ہوئی بڑی آپا کی سوالیہ نظریں اماں پر پڑیں تو اماں مہروز کے رشتے اور چھوٹی آپا کے انکار کی ساری بات کہہ سُنائی۔ بڑی آپا پہلے تو حیران ہوئیں پھر ا انداز میں کہنے لگیں۔

"صوفیہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟۔ اتنے اچھے رشتے سے انکار کر رہی ہے۔ آخر چاہتی کیا بات اس موضوع پر آکر رُکی تو اُس نے شکر ادا کیا۔

"پتا نہیں کیا چاہتی ہے۔"

"اماں، آپ کو اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ مجھ سے یا ربیعہ سے تو آپ نے نہیں پوچھا اسے کیوں اتنی اہمیت دے رہی ہیں؟۔"

"اہمیت کی بات نہیں ہے بیٹا؟۔ اُس روز تم موجود ہوتیں تو دیکھتیں کہ کس طرح اُس نے سر درمیان آکر منع کیا۔ تم میں اور ربیعہ میں تو ایسی جرأت نہیں تھی۔ اور میں تو کہتی ہوں کمال عورت۔ کی ساس جو اس کی باتیں سُن کر بھی بُرا نہیں مانا بلکہ زبردستی منہ میٹھا کر کے گئیں۔ اب بھی انہوں نے ر لیے بھیجا ہے کہ بہن کو سمجھائے۔"

"اسے خود سمجھنا چاہیے۔ بچی تو نہیں ہے اور میں تو کہتی ہوں شکر کرے کہ اتنے اچھے لوگ ہیں ورنہ۔" کوئی غلط بات مُنہ سے نکلنے سے پہلے ہی بڑی آپا خاموش ہو گئیں۔

"تم اس سے بات کر دیکھو۔" اماں پراُمید نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"نہ بھئی، میں اس کے منہ نہیں لگتی جب آپ کا اور ابا میاں کا لحاظ نہیں کیا تو میرا کیا کرے گی!" فوراً دامن بچا گئی تھیں۔

پھر سرِ شام ہی دولہا بھائی آئے تو بڑی آپا اُن کے ساتھ چلی گئیں۔ گو کہ اماں اور سب بہنوں اصرار کیا کہ رات کے کھانے تک رُک جائیں لیکن وہ نہیں رُکیں۔ اور اُن کے جانے پر اُس نے بھی شہروز کے آنے پر اُن کے ساتھ چلی جائے گی۔ گو کہ وہ کافی دن رہنے کے ارادے سے آئی تھی آپا نے جس انداز سے اس کے یہاں رہنے پر اعتراض کیا تھا، اس سے اپنا آپ کچھ ہلکا لگنے لگا تھا

"تم کوشش کرنا کہ زیادہ تر اپنی اماں کے گھر رہو۔ ویسے بھی لڑکیاں میکے جاتی ہی ہیں۔" شاہ نے کہا تھا اور اس وقت اس نے بھی سوچا تھا کہ یہی مناسب ہوگا اور پھر فرار کا یہی ایک راستہ تو تھا آج بڑی آپا نے پہلی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔

"میں جب تمہارے بارے میں سُنتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے تم اماں کے گھر ہو۔" بڑی آپا کی کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اب تک اماں نے غور نہ کیا ہو لیکن اب ضرور غور کریں ہو سکتا ہے کہہ بھی ڈالیں۔

اس سے پہلے کہ اماں اُس کے زیادہ آنے جانے پر مشکوک ہوں، اُسے سنبھل جانا چاہیے سوچا اور جیسے ہی شہروز آئے وہ بہت خاموشی سے اپنا بیگ اُٹھا لائی۔ ان کے لیے یقیناً حیر

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا، ہمیشہ وہ ہی چلنے کے لیے کہتے اور آج وہ پہلے ہی تیار ہو گئی تھی۔

"خیریت؟۔" وہ کہے بغیر رہ نہ سکے اور اس کے جواب نہ دینے پر کہنے لگے۔

"آپ تو غالباً ہفتے بھر کے لیے آئی تھیں؟" لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

"ہاں۔ لیکن اب میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ کیونکہ ایک ہفتہ تو کیا، پورا مہینہ بھی رہ لوں تو چھوٹی آپا کو قائل ...کر سکوں گی۔" اُس نے اپنے جانے کی وجہ یوں بیان کی۔

"ہیں کہاں صوفیہ؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"اپنے حجرے میں۔" وہ چھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"ناراض ہیں۔"

"نہیں۔"

"چلئے پہلے میں ان سے مل لوں۔" انہوں نے کہا تو وہ انہیں لے کر اندر آگئی۔

چھوٹی آپا الماری کے پاس کھڑی تھیں۔ شہروز کو آتے دیکھا تو فوراً الماری کھول کر سر اندر کر لیا۔ وہ ان کی اس ...ت پر اپنی بے ساختہ مُسکراہٹ کو نہ روک سکے۔ اطمینان سے بیٹھے تو کہنے لگے۔

"صوفیہ۔ جو بھی کام کر رہی ہیں، اسے بعد کے لیے اُٹھا رکھیے اور یہاں میرے پاس آکر بیٹھیں۔"

اور ساری دُنیا میں ایک شہروز احمد ہی تو تھے جن کے سامنے چھوٹی آپا بلا چوں و چرا ہتھیار ڈال دیا کرتی تھیں۔ اُن ...پُروقار لہجے میں دھیمی دھیمی محبت، نرم نرم شفقت کے ساتھ بڑے بھائی کا ہلکا سا رُعب چھوٹی آپا کو مجبور کر دیا ...ا۔ وہ بے بس ہو جاتیں۔

ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی، کوئی اپنا بھائی ہوتا، بہت محبت کرنے والا، بہت شفیق۔ جو بات ملنے تو ...ولنے کا فن بھی جانتا ہو۔ رُعب لیکن محبت اور مان کے ساتھ۔ اور یہ مان شہروز احمد نے حاصل کر لیا تھا۔ وہ بہت ...اموشی سے الماری بند کر کے اُن کے پاس آ بیٹھیں۔

"کچھ خفا ہیں؟" مخصوص نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"رُوٹھنے پر پابندی نہیں ہے۔ اور رُوٹھنا کوئی بُری بات بھی نہیں ہے اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ...یسے مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہیں۔ بندے کو بزدل کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ...شکلات اور آزمائشیں مقدر ہو جاتی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ مہروز کے لیے ضرور ہامی بھر لیں لیکن یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ سوچیں ضرور۔"

"میں کیا سوچوں؟"

"کچھ بھی لیکن مثبت انداز سے۔ کوئی خوشی دروازے پر دستک دے تو کان بند نہیں کرنے چاہئیں بلکہ بڑھ ...ر دروازہ کھول دینا چاہیے۔ اس لیے کہ خوشیاں مقدر سے ہی ملتی ہیں۔ ہم انہیں خرید نہیں سکتے۔ اور نہ ہی چھین ...سکتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟۔"

"جی۔ لیکن شہروز بھائی۔" چھوٹی آپا کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔

"خاموش مت رہیں۔ کوئی اُلجھن، کوئی پریشانی ہو تو کہہ ڈالیں۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟"

"وقت سے۔ جو پہلو بدلتا ہے تو انسان بدل جاتے ہیں۔" وہ اپنے خدشے کو زبان پر آنے سے روک نہ ...سکیں۔

"آپ غلط نہیں کہہ رہیں۔ مگر مہروز میرا بھائی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وقت اس کا کچھ نہیں ...بگاڑ سکتا کیونکہ وہ وقت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر بھی اگر آپ کے معاملے میں اس سے کوئی غلطی یا ...کوتاہی ہوئی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

اب اس سے زیادہ چھوٹی آپا کو اور کیا چاہیے تھا کہ وہ بھائی کے مقابلے میں انہیں اہمیت دے پھر بھی وہ اندر ہی اندر اُلجھتی گئیں۔ دُنیا میں لڑکیوں کی کمی تو نہیں پھر میں ہی کیوں ؟۔ میں جو اس کے قدم ملا کر نہیں چل سکتی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے پھر کیونکر مجھے اپنانے پہ آمادہ ہوا۔ شاید ہم ترس اور اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

"صوفیہ ۔" شہروز نے اُن کے جُھکے ہوئے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کیا کوئی اور یقین چاہیے ؟"

"نہیں شہروز بھائی ۔" سر پہ ٹھہرے مضبوط ہاتھ تلے وہ بے بس ہو گئیں۔

"پھر میں گھر جا کر امّی سے کیا کہوں ؟" وہ پوری طرح مطمئن ہونا چاہتے تھے ۔

"جو آپ کا دل چاہے ۔" وہ بے دم ہو کر بولیں۔

"گڈ گرل ۔" وہ ان کے سر کو ہلکے سے تھپکتے ہوئے مُسکرائے پھر اُس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ تھی، موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں، حسبِ عادت کھو چکی تھی۔ ان کے نرم لہجے میں لفظوں کے ہم مخصوص مُسکراہٹ جو ان کی شخصیت کو جاذبِ نظر بنا دیتی تھی۔

"ربیعہ ۔" انہوں نے پکارا لیکن اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یونہی بیٹھی ایک ٹک انہیں دیکھے گ "ربیعہ ۔ آپ کہاں کھو گئیں ؟" اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو چونکی اور کچھ ۔ سمجھ میں نہ کھڑی ہو گئی۔ اُن کے ساتھ چھوٹی آپا بھی بے ساختہ ہنس پڑیں ۔

"شہروز بھائی ۔ میں تو سمجھی تھی، آپ کی صحبت نے اسے انسان بنا دیا ہو گا لیکن یہ تو ۔"

"کیا یہ شروع سے ایسی ہیں ؟" وہ فوراً پوچھ بیٹھے۔

"ہاں ۔ بیٹھے بیٹھے کہیں غائب ہو جاتی ہے ۔ مجھے تو ڈر ہے کسی دن اپنے وجود سمیت غائب نہ چھوٹی آپا کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

"چھوٹی آپا ۔ آپ تو بس ۔" وہ خِفت مٹانے کو اُلجھنے لگی تھی کہ اُنہوں نے ٹوک دیا۔ پھر اُٹھتے ہوئے "اوکے صوفیہ ۔ ہم چلتے ہیں ۔ اور ربیعہ آپ امّاں سے کہہ دیجیے ۔ صوفیہ نے مہروز کے حق میں دیا ہے ۔" اُس نے شرارت سے چھوٹی آپا کی طرف دیکھا پھر ان سے پہلے کمرے سے نکل آئی۔ امّاں جو تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اشارے سے پوچھا۔ "کیا ہوا ؟"

"سب ٹھیک ہے امّاں ۔ چھوٹی آپا مان گئی ہیں ۔" وہ امّاں کے گلے میں بازو ڈالتی ہوئی بولی۔

"شکر ہے خدا کا ۔ ورنہ میں تو بڑی پریشان تھی۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شہروز کو آتے دیکھ کر فا اور امّاں سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی ۔

"اچھا امّاں، اب اجازت دیجیے ۔"

"بیٹا، رات کا کھانا کھا کر جاتے ۔" امّاں نے روکا۔

"پھر سہی بلکہ اب ہم سب آئیں گے باقاعدہ رسم کرنے ۔"

"کیوں نہیں ۔ جب چاہے آؤ ۔" امّاں اب خوشی چھپا نہیں پا رہی تھیں۔

"میں امّی سے طے کر کے آپ کو اطلاع کر دوں گا ۔" پھر تخت پوش پر رکھا اُس کا بیگ اُٹھا لیا کے ساتھ چل پڑی ۔

"اگر آپ رُکنا چاہیں تو ۔" دروازے کے قریب رُک کر انہوں نے بغور اُس کی طرف دیکھا، کہیں اُن کے ساتھ نہیں چل رہی۔

"میرے خدا کس مُشکل میں پھنس گئی ۔" اُس نے سوچا" یہ شاید لے جانا نہیں چاہتے اور یہا نہیں ۔"

"کیا بات ہے ؟" اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں چلیں ۔" پلٹ کر ایک نظر آنگن سے برآمدے تک ڈالی۔ سب اپنے اپنے کام میں

چکے تھے۔ اپنا وجود بے معنی سا لگا۔ اپنی ہستی غیر معتبر ۔

"الٰہی ۔ ایسے بے نشان راستے کسی کا مقدر نہ ہوں۔" دل میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا۔ ان کے برابر گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ اپنے مقدر سے سخت شاکی تھی۔

"میں نے تو کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا ۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ؟"

امّاں کے گھر سے نکلتے ہوئے اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اچانک کچھ چپ سی ہو گئی ہے۔ پھر تمام راستہ ہی وہ اسی طرح خاموش اور لاتعلق سی رہی تھی اور اب جب وہ امی کے ساتھ مہروز کی باقاعدہ منگنی کا پروگرام بنا رہے تھے، تب بھی وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

"بیٹا ۔ تم بھی کچھ کہو ناں ۔" امّی نے اچانک اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ چونک گئی ۔ پھر سر جھکاتے ہوئے بولی.

"میں کیا کہوں ؟"

"ارے ۔" امّی کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ وہ بول پڑے ۔

"اصل میں ان کی طبعیت کچھ ٹھیک نہیں ہے

"کیا ہوا ؟" امّی پریشان ہو گئیں ۔

"سر میں درد ہو رہا ہے ۔" وہ فوراً بول پڑی ۔

"اچھا ۔ تم اپنے کمرے میں جا کر لیٹو ۔ میں چائے کے ساتھ ٹیبلیٹ بھجواتی ہوں ۔" امّی نے کہا تو وہ ممنون نظروں سے اُنہیں دیکھتی ہوئی وہاں سے اُٹھ کر آ گئی۔

لیٹنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں امّی اُسے دیکھنے نہ آ جائیں۔ وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد شہروز خود ہی چائے لے کر آ گئے تو وہ بے حد ندامت محسوس کرتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، وہ اُسے کپ تھما کر خود سامنے ہی بیٹھ گئے۔

"آئی ایم سوری ۔ مجھے پتا نہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے ۔" وہ انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر نظریں چُراتی ہوئی بولی۔

"کوئی کیفیت بنا سبب نہیں ہوتی ربیعہ ۔" وہ کہنے لگے ۔ "کوئی بات ہوتی ہے، جب ہی اچانک کیفیت بدلتی ہے۔ خوشیوں میں اُداس ہونا اور اُداسیوں کے موسم میں کِھلکِھلا کر ہنسنا ۔ ایسا یونہی نہیں ہوتا ۔ پس منظر میں ضرور کوئی ایسی بات ہوتی ہے ۔ آپ بتایئے، آپ کے ساتھ کیا ہوا ؟"

"شہروز احمد ۔" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ نظریں زاویہ بدلتی ہوئی اُن پر جا ٹھہریں۔

"کسی نے کچھ کہا ؟ ۔ میرے حوالے سے یا کسی اور حوالے سے ؟"

"نہیں ۔" وہ نفی میں سر ہلاتی گئی ۔

"میرا خیال ہے، امّاں کے گھر کوئی بات ہوئی ہے، جب ہی آپ وہاں سے چلی آئیں ورنہ آپ کا ارادہ تو ۔" اُن کی بات ہونٹوں میں رہ گئی ۔ نِدا دستک دے کر اُنہیں پکارتی ہوئی کہنے لگی۔

"بھائی جان ۔ آپ کا فون ہے ۔ ثاقب حسن نام بتایا ہے ۔"

"ثاقب حسن ۔" انہوں نے دہرایا اور اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔ "تو یہ بات ہے، تم اس کی خاطر اپنا پروگرام کینسل کر کے چلی آئیں ۔" اور وہ اُن کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بے بسی سے سر جھکا گئی۔ کیونکہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ثاقب حسن کا فون آئے گا۔

"چلیے ۔ وہ یقیناً آپ کی آواز سُننا چاہے گا ۔"

"پلیز اُس سے کہہ دیں، میں یہاں نہیں ہوں ۔"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا ۔" وہ اُسے اپنے آپ سے اُلجھتے لڑتے سنگدلی سے دیکھ رہے تھے ۔

"تو پھر صاف کہہ دیجیے کہ میں بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ دبے دبے لہجے میں چیخی۔

"یہ بات آپ خود کہہ دیں ۔ ٹھہریئے میں فون یہیں لے آتا ہوں ۔"

وہ فوراً چلے گئے۔ اور ابھی وہ اپنے آپ کو سنبھال ہی رہی تھی کہ وہ فون لے کر آ گئے۔ سخت نا گ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔

"ربیعہ۔"

"ربیعہ۔"

ثاقب حسن بے قراری سے پکار رہا تھا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

"ربیعہ۔!" لہروں پر سفر کرتی ثاقب حسن کی آواز اُسے پکار رہی تھی۔ اپنی طرف بلا رہی تھی بے قراری سی بے قراری اور شاید بے بسی بھی کہ اختیار میں ہوتا تو آواز کے ساتھ ساتھ خود بھی لہروں پ کرتا ہوا، سامنے آن کھڑا ہوتا۔

"ربیعہ۔ بولتی کیوں نہیں؟۔ یہ تم ہی ہو ناں؟۔ میری آواز سن رہی ہو؟"

اُس کی مسلسل خاموشی سے دوسری طرف وہ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ اور شہروز احمد جانے کیوں آج جم کر کھڑے ہو گئے۔ شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ جو بات وہ ان سے کہلوانا چاہتی تھی، وہ خود کہہ سکے یا نہیں۔؟ کاش اتنی باحوصلہ ہو جائے۔ صاف منع کر دے۔ سختی سے کہے۔ میں بات نہیں کر سکتی اب، نہ آئندہ کبھی۔

"ثاقب حسن۔ میں اس وقت بات نہیں کر سکتی۔" اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے اُس نے اسی قدر اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور شہروز احمد اُس کے منہ سے یہی بات سُن کر مطمئن ہونا چاہتے تھے لیکن ایک لفظ نے انہیں مطمئن ہونے نہیں دیا۔

اِس وقت۔ اِس وقت نہیں۔ گویا آئندہ بات ہو سکتی ہے۔" انہوں نے تلخی سے سوچا۔ ا ے کر کمرے سے نکل گئے۔

وہ چپ چاپ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح بے حرکت بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔

کافی دیر بعد شہروز کسی کام سے اندر آئے۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ پہلے ا نے غور نہیں کیا۔ سرسری نظر اُس پر ڈالتے ہوئے اپنی الماری کی طرف بڑھ گئے۔ اور جب وہاں سے ف ہو کر پلٹے، تب اسے دیکھ کر چونکے۔ ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کیے وہ کسی مجسمے کی طرح ساکن تھی۔ وہ بے قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اُس نے پھر بھی حرکت نہیں کی۔

"ربیعہ۔" انہوں نے پکارا۔ جواب میں خاموشی۔

"کیا بات ہے ربیعہ؟" گھٹنے قالین پر ٹیک کر اُس کی کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جوا ندارد۔

"ربیعہ۔ کیا ہو گیا ہے؟۔ آپ بولتی کیوں نہیں؟" اور وہ جیسے خواب میں بولنے لگی۔

"کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس پر خود میرا اپنا اختیار نہیں رہا۔ کٹھ پتلی ہوں میں، جو میری ڈور کبھی ثاقب کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور کبھی شہروز احمد تھام لیتے ہیں۔ میری اپنی نہ کوئی مرضی ہے اور نہ کوئی سوچ۔ پل ایک خوف، ایک دھڑکا ایک مجرمانہ سا احساس گھیرے رہتا ہے۔ میری ہر بات۔ ہر قدم مشکوک کیوں؟۔ کیا خطا ہوئی مجھ سے؟۔ صرف اتنی ناں کہ میں نے ثاقب حسن سے محبت کی تھی اور محبت کی سزا، وہ بھی کسی اور نے نہیں، خود اُس نے دے ڈالی۔"

اُس کا لہجہ کھویا کھویا اور آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ سمجھ گئے، اپنے آپ میں نہیں۔ نیچے سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آ بیٹھے۔ اور اس کا کندھا چھو کر آہستہ سے ہلایا۔

"ربیعہ۔ کیا ہوا ہے؟" اس کے سارے احساسات ایک دم بیدار ہو گئے۔ اور وہ سر جھٹک

طرف دیکھنے لگے۔

"کچھ پریشان ہیں؟" اُن کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

"ہاں۔" اُس نے اعتراف کیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

"کیا کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہی جا سکتی؟"

"کیا مجھے ہر بات آپ سے کہنی چاہیے؟" اندر کی ساری تلخی طنز بن کر لہجے میں سمٹ آئی۔ "کیا ناتا ہے آپ سے؟۔ کیا تعلق ہے جو میں ہر بات آپ سے کہوں اور آپ کیوں پوچھتے ہیں؟۔ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" وہ جیسے وحشت بھرے لہجے میں چیخ اٹھی۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟۔ کیا ثاقب حسن نے میرے دکھ سکھ شیئر کرنے کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی ہے؟"

"کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟" وہ اُلجھ سے گئے۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔" وہ بدتمیزی کا مظاہرہ کر گئی۔

"کہیں آپ میرا محاسبہ تو نہیں کرنا چاہ رہیں؟" وہ خدشہ زبان پر لے آئے۔

"میں ایسا کیوں کروں گی؟۔ کبھی فرصت ملے تو اپنا محاسبہ خود کر لیجیے گا۔ اور پلیز اس وقت مجھے چھوڑ دیں۔" وہ ہونٹ بھینچ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگے۔

"ربیعہ بیگم۔ اگر ثاقب حسن سے بات نہ کرنے کا اتنا ہی دکھ ہے تو خود اُسے کال کر لیجیے۔" وہ ایک سناٹے میں آ گئی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟۔" اُن کے جاتے ہی اُس نے پیشانی گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے سوچا۔ "شہروز احمد ثاقب حسن کا طعنہ کیوں دے گئے ہیں۔ جب وہ ہر بات نہ صرف جانتے ہیں بلکہ خود بھی شریک ہیں پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے۔ اوّل تو انہیں ثاقب حسن کی بات ماننی ہی نہیں چاہیے تھی اگر کسی وجہ سے مان بھی لی، تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک دم مجھ سے لاتعلق کیوں نہیں ہو جاتے۔ جب یہ طے تھا کہ مجھے ثاقب حسن کی واپسی تک یہاں رہنا ہے تو پھر وہ مجھ پر، میری ذات پر حق جتانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟۔

تو اس ساری پریشانی کا سبب یہ ہے ربیعہ اکرام علی کہ شہروز احمد نے دل کے ایوانوں میں سجی اس مورت کو نکال باہر کیا ہے جس نے پہلے پہل محبتوں کی آشنائی بخشی تھی اور جو جاتے جاتے بھی اپنا پابند کر گیا تھا۔

"مجھے آزاد کرو۔"

"مجھے آزاد کر دو ثاقب حسن۔" وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔

دل و دماغ میں شدید جنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات تو اُس نے اوّل روز ہی سوچی تھی کہ ثاقب حسن نے اُسے پانے کا جو طریقہ اپنایا ہے، وہ انتہائی نامناسب ہے اور اُس نے شہروز احمد سے بھی بہ دیا تھا اور اب تو وہ خاصی متنفر ہو رہی تھی۔ نہ صرف ثاقب حسن سے بلکہ شہروز احمد سے بھی۔ دونوں مرد جنہوں نے اسے کوئی بے جان شے تصور کر لیا تھا۔

دل نادان تھا، اب بھی خواب دکھانے پر آمادہ۔ "تم چیز ہی ایسی ہو ربیعہ اکرام علی، کوئی تمہیں پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" دماغ سراپا احتجاج۔ اور یوں ڈیپریشن کا شکار ہو کر وہ بیمار پڑ گئی۔

صبح شہروز احمد نے اُسے سوتے دیکھ کر کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنے طور پر وہ اس سے خفا تھے۔ (خفگی کا حق نہ رکھتے ہوئے بھی) اور محض اس خیال سے کہ ناشتے کی ٹیبل پر امّی ان سے ربیعہ کے متعلق سوال جواب نہ شروع کر دیں۔ وہ ناشتا کیے بغیر ہی آفس چلے گئے۔

رات بھر وہ بہت ڈسٹرب رہے تھے۔ ربیعہ کی باتیں، اس کا رویہ گو کہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ پھر بھی وہ اُلجھتے رہے تھے۔ شاید انجانے میں یہ توقع کر بیٹھے تھے کہ وہ ثاقب حسن کے سنگ وقت کو بُھلا کر اب ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی ہوگی۔ اور کچھ وقت گزرے گا کہ وہ انہیں بھی ت گی لیکن جس طرح کل وہ اچانک اماں کے گھر سے آگئی تھی۔ اور پھر ثاقب حسن کا فون جس سے ا یقین ہوگیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہر پل سے آگاہ رہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اس بات کی ہونی چاہیے تھی کیونکہ وہ بہرحال ثاقب حسن کی امانت تھی لیکن وہ شاید حقائق سے نظریں چُرانے لگے

"کیا ضروری ہے کہ وہ گئے دنوں کو یاد رکھے۔ ؟" وہ اکثر اپنے آپ سے کہتے۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ ثاقب حسن ساری باتیں، سارے پیمان بُھلا ڈالے۔ کسی دن کوئی عذر تراشتے ہو "میرا انتظار مت کرنا ربیعہ۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔" وہ ایسی ہی باتیں سوچا کرتے اور شدت منتظر تھے ایسی کسی بات کے۔ جو اُن کے اور ربیعہ کے درمیان کھڑی دیوار کو ایک دم ڈھا دے۔ لیکن ا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دیوار گرنے کے بجائے اور اُونچی ہوتی جا رہی ہو۔

"کاش یہ لڑکی بہت عام سی ہوتی اور میں کبھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔" وہ اس سے فرار کی خاطر آفس آگئے تھے لیکن فرار شاید نصیب میں نہیں تھا۔ کہ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مسلسل اسے رہے تھے۔ کئی بار سر جھٹکا، اپنے آپ کو سرزنش بھی کی۔ لیکن اسے سوچنے سے باز نہ رہ سکے۔

گیارہ بجے کے قریب امی کا فون آگیا۔ اُنہوں نے فوراً انہیں گھر آنے کے لیے کہا۔ وہ پوچھتے ر آخر کیا کام ہے۔ لیکن امی نے حکم صادر کر کے فون بند کر دیا۔

امی کے لہجے میں رُعب کے ساتھ قدرے پریشانی بھی تھی جسے محسوس کر کے وہ خود بھی پریشا اور اُسی وقت چل پڑے۔

گھر میں داخل ہوئے تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے امی کے کمرے جا رہے تھے کہ وہ انہیں ان کے اپنے کمرے سے نکلتی نظر آئیں۔ وہیں رُک کر انتظار کرنے لگے۔

"میں نہیں سمجھتی تھی شہروز احمد کہ تم اتنے غیر ذمہ دار ہو۔" امی کا انہیں شہروز احمد کہہ کر مخاطب کے غصے کا اظہار تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھے گئے۔

"میں پوچھتی ہوں۔ ایسا کون سا ضروری کام تھا جو تم بیمار بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ؟"

"بیمار بیوی۔ ؟" اُن کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ پھر پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا ربیعہ کو ؟"

"کیوں ؟ کیا تم نہیں جانتے۔ ؟"

"نہیں۔ کیونکہ صبح تو وہ ٹھیک تھیں۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی خاطر بولے ورنہ صبح جاتے انہوں نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔

"صبح ٹھیک تھی۔ تو اتنی سی دیر میں اُسے کیا ہوگیا ہے ؟۔ آؤ میرے ساتھ۔" امی اُنہیں اپنے کا اشارہ کر کے چل پڑیں تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اُن کے پیچھے اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے پر وہ بے سُدھ پڑی تھی۔ پتا نہیں کیسے اتنے کٹھور بن گئے۔ کہ بس ایک نظر اس پر ڈالی پھر امی پوچھنے لگے۔

"ڈاکٹر کو بلایا ؟"

"ہاں۔ ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے، یہ ٹینشن کا شکار ہے۔" امی انہیں ٹٹولتی ہوئی سے دیکھتی ہوئی بولیں۔ "کیا کہا ہے تم نے اِسے ؟"

"میں نے ؟"

"ہاں تم نے۔ بغیر کسی بات کے وہ ٹینشن کا شکار نہیں ہو سکتی۔ کوئی بات ہوئی ہوگی تب ہی تو

امی —" وہ اُن کی بات پُوری ہونے سے پہلے بول پڑے — "میں کیا کہوں گا بھلا — ڈاکٹر نے یونہی کہہ دیا ہوگا۔"

"اچھا — تم اسے اُٹھاؤ — میں کچھ کھانے کے لیے بھیجتی ہوں۔ رات سے کچھ نہیں کھایا بچی نے۔" امی چلی گئیں تب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ قریب آکر پیشانی چھو کر دیکھی۔ وہ بخار میں جل رہی تھی۔ قدرے تشویش تو ہوئی لیکن کوئی ملال نہیں جاگا۔ اور نہ کوئی ایسا احساس کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُن کے خیال میں ثاقب حسن سے بات نہ کر سکنے کا دُکھ جیسے اُس نے کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیا ہوگا۔

"یہ خوب ہے۔ بیمار وہ کسی اور کے فراق میں پڑے اور تیمارداری میں کروں ؟" اُنہوں نے جل کر سوچا پھر زور سے آواز دے ڈالی۔

"ربیعہ —" وہ ذرا سا کسمسائی اور کروٹ بدلنا چاہتی تھی کہ انہوں نے پھر پُکارا۔ اور اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"اُٹھ جائیں پلیز —"

وہ فوراً اُٹھ نہیں سکی۔ بس آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے ہر بات کے لیے امی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ وہ مجھ سے پُوچھ رہی ہیں۔ کہ اچانک آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ بتائیے میں کیا جواب دوں اُنہیں ؟" ان کا لہجہ روزانہ سے بہت مختلف تھا اور آنکھوں میں ناگواری کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

"ٹھیک تو ہے، وہ کیوں اس کے لیے جوابدہ ہوں ؟" اُس نے سوچا اور تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر تک اُس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی جس سے وہ مزید جھنجھلا گئے۔

"جانتی ہیں امی نے مجھے اس وقت آفس سے بلوایا ہے صرف آپ کے لیے۔"

"میرے لیے ؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"جی ہاں۔ آپ کے لیے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ آپ کی بات پر عمل کرتے ہوئے آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نتیجے میں امی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑا۔" وہ ذرا سا سر اونچا کر کے دیکھنے لگی۔

"اب امی کو آپ ہی مطمئن کیجیے کہ میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ رہی ہیں۔"

دروازے سے باہر امی کی آواز سن کر وہ فوراً خاموش ہو گئے۔ امی اندر آئیں، اُن کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ وہ بے حد ندامت محسوس کرتی ہوئی فوراً بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے کیوں زحمت کی امی ؟۔ میں خود آ رہی تھی۔" وہ اُن کے ہاتھوں سے ٹرے لیتی ہوئی بولی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہ تم کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔ چلو آرام سے بیٹھو۔" امی نے پیار سے ڈانٹا۔ تو وہ کنکھیوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ بہت غصے میں کھڑے تھے۔ پیشانی شکن آلود اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔

"عجیب شخص ہے۔ غصے میں بھی اچھا لگتا ہے۔" اُس نے سوچا اور اُن کی طرف سے رُخ موڑ کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ ڈرتی تھی کہیں ان کے اس روپ میں اُلجھتی نہ چلی جائے۔ ویسے بھی اپنی عادت سے واقف تھی۔

"بیٹا — یہ اچانک کیا ہو گیا تھا تمہیں ؟۔ کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھیں۔" امی نے محبت سے پوچھا تو جانے کیسے وہ بزدل سی لڑکی انہیں چھیڑنے کی جسارت کر گئی۔ زیادہ نہیں بس اتنا کہا۔

"شہروز سے پوچھیں۔"

"کیوں شہروز ؟"

اور وہ جو اس کی جسارت پر حیران کھڑے تھے۔ امی کے پکارنے پر چونکے ضرور لیکن فوری طور پر کچھ

کہہ نہ سکے۔ اور وہ اپنی پشت پر اُن کی نظروں کی چبھن محسوس کر کے اُنہیں مزید غصہ دلانے کی غرض سے بولی۔

"یہ بات بے بات مجھے ڈانٹتے ہیں۔ کل امّاں کے گھر سے آتے ہوئے راستہ بھر مجھ سے خفا ہو رہے۔ بنا کسی بات کے اور۔ اور صبح مجھے اتنا تیز بخار تھا، اس کے باوجود انہوں نے پروا نہیں کی مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر آفس چلے گئے۔" امّی نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ پھر اُس سے کہنے لگیں۔

"تم اُٹھو بیٹا۔ میرے کمرے میں چلو۔ یہ پروا نہیں کرتا نہ کرے، ہم سب تو ہیں ناں۔"

وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ویسے بھی اب یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ٹرے اُٹھانے لگی کہ امّی نے روک دیا۔

"رہنے دو۔ میں ملازمہ کو بھیج کر منگواتی ہوں۔" وہ سر جھکا کر امّی کے پیچھے چل پڑی۔ پھر جیسے ہی امّی کمرے سے نکلیں، اُنہوں نے بڑھ کر اُس کی کلائی تھام لی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" غصہ عروج پر تھا۔

"کون سی؟" وہ انجان بنی۔

"میں آپ کو ڈانٹتا ہوں بات بے بات اور۔"

"اور شہروز احمد۔ آپ بھول رہے ہیں کہ ہمارے درمیان بندھا بندھن نام نہاد سہی لیکن اُس کے تقاضے بہر حال ہمیں نبھانے ہیں۔" وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں اس وقت امّی سے یہی کہہ سکتی تھی۔"

"اس بندھن کے تو اور بھی بہت تقاضے ہیں۔" اُنہوں نے اُس کی کلائی پر گرفت مضبوط کی اور پھر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پلیز۔" اس کے حلق سے گھُٹی گھُٹی چیخ نکلی۔ "میرا ہاتھ چھوڑیں۔"

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر جس طرح اپنی طرف کھینچا تھا، اسی طرح دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ اور اس میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی تھی کہ رُک کر اُن کے تیور دیکھ لیتی۔ فوراً باہر نکل گئی۔ پھر امّی کے کمرے میں جا کر ہی اطمینان کا سانس لیا تھا۔

مہروز کی منگنی کے لیے امّی نے جمعہ کا دن تجویز کیا تھا۔ اور اُنہوں نے امّاں کے گھر بھی کہلوا دیا تھا کہ اس جمعہ کو منگنی کی رسم ادا کرنے آئیں گے۔ درمیان میں بس تین چار دن ہی تھے اور اسی میں ساری تیاری کرنی تھی۔ اس کی طبیعت مکمل طور پر سنبھلی نہیں تھی، پھر بھی وہ امّی کے ساتھ تیاری میں لگ گئی۔ منگنی کا جوڑا میچنگ شوز، زیور کا ہلکا سیٹ اور میک اَپ کا سامان وغیرہ ان ساری چیزوں کی خریداری کے لیے وہ امّی کے ساتھ جاتی رہی تھی۔ اور امّی نے بھی خاص طور پر ہر چیز میں اُس کی پسند کو مدِنظر رکھا تھا۔

ندا کو اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ چیزیں لینی تھیں۔ اس روز وہ بھی ساتھ تھی۔ ایک دوکان سے وہ امّی اور ندا کے ساتھ نکل رہی تھی کہ سامنے سے ثاقب حسن کی بہن انیلا اور اُس کی والدہ کو آتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر چاہا کہ کترا کر نکل جائے یا رُخ موڑ لے لیکن انیلا اسے دیکھ چکی تھی، لپک کر اُس کی طرف آئی۔

"ربیعہ۔ کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں۔" اُس نے حتی الامکان اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی پھر بھی اُس کی طرح گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ شاید اندر کہیں یہ خوف تھا کہ وہ ندا اور امّی کے سامنے ثاقب حسن کا ذکر نہ چھیڑ دے۔ اس لیے فوراً تعارف کروانے لگی۔

"اِن سے ملو، یہ امّی ہیں یعنی میری ساس۔ اور یہ میری چھوٹی نند ندا۔ اور ندا یہ میری دوست انیلا ہے۔ ہم کالج میں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ندا نے انیلا سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ پھر اُس سے کہنے لگی۔

"بھابی۔ آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔؟"

"یہ بڑی بے وفا ہے۔ بھول گئی ہوگی۔" انیلا نے اُسے دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کی۔ "اب بھی اگر میں نہ بلاتی تو یہ یقیناً کترا کر نکل جاتی۔"

"نہیں۔ خیر ایسا بھی نہیں ہے۔" وہ بُرا مانتی ہوئی بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تمہارے وہ کہاں ہیں؟ بڑا اشتیاق ہے اُن سے ملنے کا۔"

"وہ اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔"

"آپ کسی دن گھر آئیں ناں۔ بھائی جان سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔" ندا نے فوراً دعوت دے ڈالی۔ "بلکہ اسی جمعہ کو آجائیں، ہمارے ہاں ایک تقریب ہے، اس میں بھی شرکت کریجیے گا۔"

"بھئی سوری۔ اس جمعہ کو تو میں نہیں آ سکتی کیونکہ میرے اپنے گھر میں شادی ہے۔"

"کس کی؟" وہ یونہی پوچھ گئی۔

"میری بہنوں کی اور اب تو میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تم لوگ بھی آنا کیونکہ تم لوگ خود مصروف ہو۔"

"ہاں بس اتفاق ہے۔" وہ یہی کہہ سکی۔

"چلیے آپ شادیوں سے فارغ ہو لیں، پھر ہمارے ہاں آئیے گا۔" ندا نے کہا تو انیلا اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے نظریں چرانے پر بولی۔

"جو میری دوست ہے، وہ تو بُلا نہیں رہی، تم ہی اصرار کر رہی ہو۔"

"ندا اور میں الگ تو نہیں ہیں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "ندا بلائے یا میں، ایک ہی بات ہے۔ کیوں ندا۔؟"

"بالکل۔" اُس نے تائید کی۔

"پھر بھی تم جب تک اپنے منہ سے نہیں کہو گی، میں آنے کی ہامی نہیں بھروں گی۔"

"بھئی ضرور آنا۔" امّی اور ندا کا خیال کر کے مجبوراً کہنا پڑا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا۔ صاف منع کر دے کبھی مت آنا۔"

"آؤں گی۔" انیلا ہنسی۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔" اُس نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیے۔

گھر آئی تو اپنی چیزیں لے کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ خود اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔

"زندگی میں اتفاقات کیوں ہوتے ہیں؟" منہ ہاتھ دھو کر اطمینان سے بیٹھی تو سوچنے لگی۔ "آخر یوں بھی تو زندگی گزر سکتی ہے۔ بُری بھلی جیسی بھی ہو۔ پھر کیا ضروری ہے کہ کوئی حادثہ، کوئی اتفاق ضرور ہو۔ پتا نہیں کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی زندگیوں میں اتفاقات خوشگوار اثرات چھوڑتے ہیں۔ ایک میں ہوں، جب بھی عہدِ رفتہ کو بھلا کر حال میں مگن ہونے کی کوشش کرتی ہوں تو اچانک کوئی حادثہ، کوئی اتفاق رُونما ہو کر مجھے اسی عہد میں دھکیل دیتا ہے۔ آخر کیوں؟" بہت آزردہ ہو کر اُس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"پچھلے چند دنوں سے میں خوش تھی۔ اپنے حال میں مگن۔ سوچا تھا مہروز اور چھوٹی آپا کی منگنی پر خوب ہلا گلا کروں گی۔ لیکن آج انیلا نے اچانک سامنے آ کر میری ساری خوشی چھین لی۔" اور انیلا کے ساتھ ہی اُس کی کہی بات یاد آئی کہ جمعہ کو اس کی بہنوں کی شادی ہے۔

"تو ثاقب حسن اپنے اہم فرائض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔" اِس خیال کے ساتھ ہی اُس کا دل

زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ گھبرا کر سینے پہ ہاتھ رکھا اور آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ یوں جیسے وہ پکارتا ہوا چلا آ رہا ہو۔

"ربیعہ۔ میں آ گیا ہوں۔ اپنے سارے مسائل کو شکست دے کر۔"

"نہیں۔" وہ خوفزدہ ہو کر سر کو زور زور سے نفی میں ہلانے لگی۔

"ربیعہ۔" شہروز احمد کمرے میں داخل ہوئے اور اسے سر کو زور زور سے جھٹکے دیتے دیکھ قدرے پریشانی سے آواز دے ڈالی اور وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ان کی پکار پر کسی اور کا گمان کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"نہیں۔ میرے قریب مت آؤ۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے مت چھوؤ۔ میں اب تمہاری نہ ہوں۔"

"ربیعہ۔" وہ اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"خُدا کے لیے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔؟"

"ربیعہ۔ کیا ہوا ہے؟" اُس کی دونوں کلائیاں تھام کر چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے تو وہ بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہونے لگا اور جب حقیقت سمجھ پائی تو طویل سانس لیتی ہوئی دوبارہ صوفے پر ڈھے گئی۔ وہ کچھ دیر تک کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"یہ اچانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟"

"میں خواب دیکھنے لگی ہوں۔ بہت بھیانک قسم کے۔" وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکاتی ہوئی

"جاگتے میں؟"

"ہاں جاگتے میں۔ کھلی آنکھوں سے۔ جبھی تو ڈر جاتی ہوں۔ مجھے آپ کی ذہنی کیفیت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا خیال ہے کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا پڑے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے میں پاگل ہوں؟"

"ہیں نہیں لیکن ہو ضرور جائیں گی۔" اس کی شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگے۔ "جب ہر بات کا بوجھ اپنے دل پہ اٹھائے پھریں گی تو پاگل نہیں ہوں گی تو کیا ہوں گی۔۔۔؟ کوئی بات۔ کوئی پریشانی، کوئی مسئلہ ہو تو کہہ ڈالا کیجیے۔"

"کس سے؟" بلا ارادہ ہی اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"مجھ سے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کی پریشانی کا کوئی حل نہ ڈھونڈ سکوں۔ لیکن کہہ دینے سے کے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جائے گا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ "انسان کو ہر دور میں دوست، کسی ہمدم یا غمگسار کی ضرورت رہتی ہے جب کہ آپ نے اپنے آپ کو بالکل تنہا کر لیا ہے۔ خوفزدہ ہیں، کہیں کوئی آپ کی زندگی کے اس راز کو پا نہ لے۔ کوئی جان نہ لے کہ بظاہر شہروز احمد کے پر راج کرنے والی، حقیقت میں اس سے کتنی دُور ہے۔ اور ربیعہ اکرام علی، کوئی جانے نہ جانے میں ہوں ناں۔ بس پھر مجھ سے کیا پردہ داری؟ کیا آپ مجھ سے بھی خائف ہیں؟"

وہ کیا کہتی، خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اس طرح تو بہت مشکل ہو جائے گی ربیعہ۔ آپ کے لیے اور میرے لیے بھی۔ آپ بس میرا یقین کر لیں کہ جب تک اس گھر میں ہیں۔ میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔" انہوں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد کہنے لگے۔

"اپنے دل سے ہر خوف نکال دیں۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ کچھ وقت کے لیے عہدِ رفتہ سے ناتا توڑ کر بالکل آزاد ہو جائیں۔ پھر دیکھیے زندگی کتنی سہل ہو جاتی ہے۔ اور زندگی سہل ہو جائے تو

وہ رنگ جاتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی سر کو اثبات میں ہلا سکی۔

"میری طرف دیکھیں۔" انہوں نے کہا تو وہ بڑی مشکلوں سے پلکوں کو ذرا سا اٹھا سکی۔

"ہم اچھے دوست تو ہو سکتے ہیں ناں؟" اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "اور اچھے دوست ایک دوسرے سے کوئی بات چھپایا نہیں کرتے۔ آپ بھی آئندہ کوئی بات اپنے تک محدود نہیں رکھیں گی، سمجھیں آپ؟ میں اور میرے ساتھ اس گھر کا ہر فرد آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے، جب آپ سارے اندیشوں، ساری پریشانیوں سے نکل آئیں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" اُس نے سوچا۔

"ہر بات ممکن ہے۔" وہ جیسے اُس کی سوچ تک رسائی حاصل کر گئے۔ "آپ کوشش تو کریں۔ اب یہی دیکھیے، اس گھر میں ایک خوشی کی تقریب ہونے والی ہے بلکہ آپ کے لیے تو ڈبل خوشی ہے کہ ایک طرف اکلوتا دیور اور دوسری طرف بہن۔ پھر بھی آپ کمرے میں بند ہو کر اپنی الگ تھلگ دنیا بسائے بیٹھی ہیں۔ اس کمرے سے باہر نکلیں، ندا اور امی کے ساتھ پروگرام سیٹ کریں۔ اور کل تو آپی بھی اپنے بچوں کے ساتھ آنے والی ہیں۔ وہ یوں آپ کو الگ تھلگ دیکھ کر کیا سوچیں گی؟"

"میرے خدا۔ میں کیا کروں؟" وہ اپنے آپ سے اُلجھنے لگی۔

"چلیے اُٹھیں، باہر کا موسم خاصا خوشگوار ہے۔ آؤٹنگ پہ چلتے ہیں۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی، آئیے۔"

اُن کے اصرار پہ وہ اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑی۔ پھر اچانک خیال آیا تو اپنے آپ پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

"میں ڈریس چینج کر لوں۔"

انہوں نے رُک کر اُسے دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں، آپ چینج کر کے آ جائیں۔"

وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ پھر جب تیار ہو کر باہر آئی۔ تو وہ گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ قدرے جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔ تو انہوں نے دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"کہاں چلیں؟" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"میں کیا بتاؤں؟"

"کوئی ایسا جگہ جہاں جانے کی خواہش ہو۔" انہوں نے مرریوں سیٹ کیا کہ وہ نگاہوں کی زد میں آ گئی۔

"اگر میں کہوں مجھے سیدھا اوپر جانے کی خواہش ہے تب۔۔۔؟"

وہ اُس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت محسوس کر کے ہنس پڑے۔ پھر کیسٹ آن کرنے کے ساتھ گاڑی کی اسپیڈ بھی بڑھا دی۔

شام کی فرحت بخش ہوا، اُس کے چہرے کو چھو کر بالوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگی تھی۔ اس وقت اس نے جلدی میں بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ جو اب خاصا پریشان کر رہے تھے۔ کبھی اُس کے چہرے پہ چلے آتے اور کبھی اُن کے کندھے کو چھو کر آنکھوں کے سامنے لہرا جاتے۔ اس صورتِ حال سے وہ خاصی نروس ہو گئی۔ دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان کے ہونٹ دلکش مسکراہٹ کی گرفت میں تھے اور آنکھوں میں ایک انوکھا رنگ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

بہت غیر محسوس طریقے سے اس نے اپنی طرف کا شیشہ بند کر دیا۔ تو آوارہ پنچھی کی مانند اُڑتے بالوں کو جیسے ٹھکانا مل گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں ساکن، جیسے یہی منزل ہو۔ یہیں بسیرا۔ پھر اُس نے بہت آہستگی سے بالوں کو سمیٹ لیا۔ اور وہ جو اس کے بالوں سے اُٹھتی مہک میں اپنا آپ فراموش کیے ایک نیا جہان آباد کیے بیٹھے تھے،

ایک دم چونک گئے ۔ اس کے وجود سے چھو کر آتی ہوائیں اب بند شیشے سے ٹکرا کر واپس پلٹ رہی تھ
"شیشہ کیوں بند کر دیا ؟" ذرا سی گردن موڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے ۔
"بس یونہی ۔"
"جب آپ ہر کام 'بس یونہی' کرتی ہیں تو اس وقت یونہی اپنی خاموشی بھی توڑ دیجیے ۔ میں اب تک نہ
سکا کہ آپ واقعی کم بولتی ہیں یا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں ۔"
"یہ دونوں باتیں نہیں ہیں ۔"
"پھر ۔ ؟"
"پھر یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا بات کروں ؟" وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔
"کرنے کو تو بہت سی باتیں ہوتی ہیں ۔ موسم کی ، رنگوں کی ، روشنیوں کی اور خوشبوؤں کی ۔" لمحہ بھ
کر کہنے لگے ۔" اور دل کی باتیں ۔"
"ہاں کرنے کو تو واقعی بہت باتیں ہوتی ہیں لیکن میں ڈرتی ہوں ، کہیں کوئی ایسی بات نہ کر جاؤں جو آپ
ناگوار گزرے ۔"
"ارے ۔" وہ ایک دم اسپیڈ آہستہ کر کے اُس کی طرف دیکھنے لگے ۔" آپ ڈرتی ہیں ؟"
"جی ۔ اس لیے کہ آپ کے موڈ کا پتا نہیں چلتا ۔ کبھی دوستوں کے دوست اور کبھی دشمنوں کے د
اُن کے خاموش رہنے پر پوچھنے لگی ۔" ایسا کیوں ہوتا ہے ، آپ اچانک اپنا رویہ بدل کیوں لیتے ہیں
"اصل میں جب میں آپ کو سوچتا ہوں تو سب اچھا لگتا ہے اور جب کسی اور کا خیال آتا ہے تو کچھ بھ
نہیں لگتا ۔" وہ شاید بے خیالی میں کہہ گئے تھے ۔ فوراً احساس ہوا تو سنبھلتے ہوئے بولے ۔" خیر چھوڑ
اب ایسا نہیں ہوگا ۔ اب آپ سے دوستی پکی ہے ناں ؟"
اُس نے مسکرا کر سر جھکا لیا ۔ پھر جب انہوں نے گاڑی پارک کر کے اُسے اُترنے کے لیے کہا ، تب
نے سر اٹھایا ۔ اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئی ۔ یہ جگہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی ، اس لیے کچھ
سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔
"میں اس کلب میں اکثر آتا ہوں ۔" وہ گاڑی لاک کر کے اس کی طرف آئے تو کہنے لگے ۔" اِسنوکر کھیلنے
کارڈز ۔ آئیے آج میں آپ کو اپنے دوستوں اور ان کی بیگمات سے ملواؤں ۔ بہت دنوں سے سب اصر
رہے تھے کہ میں آپ کو لے کر آؤں ۔" وہ کچھ نہیں بولی ، چپ چاپ اُن کے ساتھ چل پڑی ۔ گیٹ سے دا
ہو کر روش پر ابھی وہ کچھ دور ہی چلے تھے کہ لان میں سے ایک لڑکی نے زور سے پکارا اور پھر بھاگتی ہوا
باڑھ پھلانگ کر دونوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی ۔
"اِتنے دِنوں سے کہاں غائب تھے ؟" بہت بے تکلفی سے اُن سے پوچھ رہی تھی ۔
"کچھ مصروف رہا ۔"
"کیسی مصروفیت ۔ ؟"
اُس پر نظر پڑی تو اشتیاق سے پوچھنے لگی ۔
"یہ کون ہے ؟"
"کون ہو سکتی ہے ؟" وہ اُلٹا اُسی سے پوچھنے لگے ۔
"ہوں ۔" وہ لڑکی پُرسوچ انداز میں کبھی اِسے اور کبھی اُنہیں دیکھنے لگی ۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی ۔
"گرل فرینڈ تو نہیں کہہ سکتی ، کیونکہ تم اس لفظ سے بہت چڑتے ہو ۔ اور یونہی کسی لڑکی کو لے کر گھومنا
تمہاری عادت نہیں ۔ اس سے یقیناً کوئی خاص نسبت ہوگی ۔"
"زیادہ تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں ۔ شی از مائی وائف ۔"
"ہاؤ سویٹ !" وہ لڑکی چلائی ۔" آخر ہمیں ان کے درشن کی سعادت نصیب ہو ہی گئی ۔ نام کیا ہے

ربیعہ ۔" پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ۔" اور ربیعہ ! یہ بدتمیز سی لڑکی سونیا ہے ۔ ایک
دوست ۔"
سونیا کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔
ذرا غور کرو ربیعہ ۔ بدتمیز بھی اور اچھی بھی ۔"
انہیں مخاطب کرنا فضول ہے ۔ تمہاری ہر بات کا جواب ایک ہلکی سی مُسکراہٹ سے دیں گی ۔" در پردہ
کر ڈالا ۔
کیوں ، بول نہیں سکتیں کیا ؟" سونیا بغور اس کی طرف دیکھنے لگی ۔
بولتی ہیں لیکن تمہاری طرح نہیں ۔"
کچھ دن میرے پاس چھوڑ دو ۔ فر فر بولنا سکھا دوں گی ۔"
نہ بابا ۔ یہ ایسے ہی ٹھیک ہیں اور اب تم راستہ چھوڑو تو ہم اندر جائیں ۔"
چلو ۔ میں بھی چل رہی ہوں ۔" وہ ایک طرف ہٹ کر شہروز کے ساتھ چلنے لگی ۔ ہال کمرے میں کافی
تھے ۔ کچھ اسنوکر کھیلنے میں مصروف کچھ کارڈز ۔ اور خواتین دائرے کی شکل میں رکھی کرسیوں پر بیٹھیں ،
ایک دوسرے کے ملبوسات اور جیولری پر تبصرہ کر رہی تھیں ۔
اُس کے لیے یہ جگہ ۔ یہ ماحول قطعی اجنبی تھا ۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھی ، پھر بھی ان اجنبی لوگوں کے درمیان
ہوئے بے اختیار ان کا بازو تھام گئی ۔
اُس نے دیکھا شہروز احمد اور اُن کے ساتھ اُسے دیکھ کر سب لوگوں میں ہلچل مچ گئی تھی ۔ سب ان کی طرف
ہو گئے ۔ اور خواتین میں سے اکثر لڑکیاں اُٹھ کر اُن کے پاس چلی آئیں ۔ انہوں نے ایک ایک سے اس
ارف کروایا ۔ جواب میں کچھ تعریفی جملے ، کچھ برجستہ ، کچھ رشک بھری نظریں اور کچھ حسد لیے ہوئے ۔
ب کچھ بس محسوس کرتی رہی تھی ۔ اور جب موقع ملا تو سرگوشی میں بولی ۔
"واپس چلیں ۔" انہوں نے بس سر ہلایا اور کچھ دیر بعد کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے معذرت کرتے ہوئے
ٹھے ہوئے ۔
آپ کو شاید اچھا نہیں لگا ۔" واپسی میں اس سے کہنے لگے ۔
اچھا نہ بُرا ، بس کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ۔ اور اپنا آپ اجنبی ۔"
آہستہ آہستہ اجنبیت دُور ہو جائے گی ۔"
لیکن میرا دوبارہ یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے ۔"
کیوں ؟"
اس کیوں کا جواب گھر آنے پر دوں گی ۔" اُس نے کہا تو وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے ۔ لیکن گھر کے سامنے
روکتے ہی کہنے لگے ۔
ہاں ۔ اب اس 'کیوں' کا جواب دیں ۔" اُس نے لمحہ بھر کو ان کی طرف دیکھا پھر سامنے گیٹ پر نظریں جماتی ہوئی بولی ۔
کیوں کا جواب یہ ہے کہ مجھے وہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگا ۔ اس لیے دوبارہ نہیں جاؤں گی اور آپ کو بھی جانے
ازت نہیں دوں گی ۔"
کیا ؟"
جی ۔ جب تک کچھ حق رکھتی ہوں ، اُسے استعمال بھی کروں گی ۔"
ان ہی کی بات لوٹا کر وہ رُکی نہیں فوراً دروازہ کھول کر اُتری اور تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ پار کر گئی ۔ وہ پہلے
ے نہیں اور جب بات کی تہہ تک پہنچے تو بے ساختہ مُسکراہٹ کو نہ روک سکے ۔
ربیعہ اکرام علی ۔ میں تمہارے حقوق دل سے تسلیم کرتا ہوں ۔ تم کچھ کہو تو ۔" ایک خوشگوار احساس میں
دل ہی دل میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا اور اندر چلے آئے ۔ ٹی وی لاؤنج میں ندا اور مہروز ٹی وی پر کوئی

ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کی متلاشی نظریں اِدھر اُدھر اُسے ڈھونڈنے لگیں۔ اصل میں وہ دیکھنا چاہتے تھے
نے یونہی ان کی بات لوٹائی ہے یا کسی نئے احساس سے آشنائی ملی ہے۔ کوئی نیا جذبہ جاگا ہے۔ وہ ندا
کے ساتھ نہیں تھی اور وہ اسے کھوجتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے آئے لیکن وہ وہاں بھی نہیں ملی۔

"عجیب لڑکی ہے۔" سوچتے ہوئے وہیں بیٹھ گئے۔ آخر اسے یہیں آنا تھا لیکن اس سے پہلے ندا
کے لیے بلانے آگئی۔ وہ اُٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ ڈائننگ روم میں وہ امی کے ساتھ موجود تھی
اس کے برابر بیٹھے تو وہ لاتعلق نظر آنے لگی۔ اور وہ باوجود کوشش کے، اس کی کیفیت جان نہ پائے۔
سے کھانا کھا کر اُٹھے اور کمرے میں آکر پھر اس کا انتظار کرنے لگے۔

اور وہ واقعی ان کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ بار بار سوچتی، پتا نہیں وہ کیا کہہ گئی ہے اور پتا نہیں
نے کیا سمجھا ہو۔ اور اب جب اُن کے سامنے جائے گی، تو پتا نہیں وہ کیا کہیں گے۔ بس یہی سب
کر وہ رات بہت دیر تک ندا کے پاس بیٹھی رہی اور جب یقین ہو گیا کہ وہ سو چکے ہوں گے۔ تب اُٹھنے کا
کر ہی رہی تھی کہ وہ اسے پکارتے ہوئے وہیں آگئے۔

"ربیعہ۔ آپ ابھی تک سوئی نہیں۔"

"جی۔" وہ کچھ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے معمول کی بے قاعدگی
ٹوکا ہو۔

"اتنی دیر تک جاگتی ہیں، جب ہی بیمار پڑ جاتی ہیں۔ چلیں جا کر سوئیں اور ندا تمہیں اتنی دیر تک جاگنے
کس نے دیا ہے؟۔"

"سوری بھائی جان۔ بس اب سو رہی ہوں۔"

ندا نے تکیہ سیدھا کرتے ہوئے اسے بھی جانے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے اس کے کمرے سے
آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ وہ بھی سر پہ پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتے وہ بول

"جب دوستی نبھا نہیں سکتے تو کرتے کیوں ہیں؟۔"

"کیا مطلب؟۔" وہ نہیں سمجھے۔

"شام میں آپ نے مجھ سے پکی دوستی کی تھی۔ اور کہا تھا آئندہ موڈ خراب نہیں ہوگا پھر۔"

"آپ نے ایسا موقع کیوں فراہم کیا؟۔"

"میں نے کیا کیا ہے۔ بس ندا کے پاس ہی تو بیٹھ گئی تھی۔"

"ندا کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اور جو میں یہاں انتظار کر رہا تھا۔" وہ بے اختیار کہہ گئے اور وہ ایک
میں آگئی۔

"مجھے آپ سے کام تھا۔" شاید احساس ہو گیا تھا کہ کچھ غلط کہہ گئے ہیں۔ یا پھر قبل از وقت اس
بنانے کی غرض سے بولے۔

"کیا کام تھا؟۔"

"تھا۔ اب نہیں ہے۔" جھنجھلا کر بولے۔

"آئی ایم سوری۔ آپ اسی وقت بلا لیتے۔" وہ شرمندہ ہوتی ہوئی بولی۔

"میرا خیال تھا آپ کوئی ضروری کام کر رہی ہوں گی۔ اس لیے نہیں بلایا۔ خیر اب سو جائیں۔"
اسٹڈی کی طرف جانے لگے کہ وہ پکار کر پوچھنے لگی۔

"آپ خفا تو نہیں ہیں؟۔" انہوں نے طویل سانس لے کر نفی میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں چلے گئے

اگلے دن اُس کی بڑی نند آپی بمعہ اپنے بچوں کے آئیں تو گھر میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ بچوں نے
ہی اُودھم مچانا شروع کر دیا۔ آپی امی سے مہروز کی منگنی اور پروگرام کی تفصیل معلوم کرنے لگیں اور وہ جو رات

تھی کہ اب اپنے خول میں بند نہیں رہے گی۔ اب واقعی اس خول سے نکل آئی تھی۔ ہر کام میں پیش پیش، ہر
میں مشورہ جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ آپی کے تینوں بچے عامر، شانی اور روبی بار بار اُس کے گرد منڈلاتے اور
بہت محبت سے ان کی بات سنتی اور معصوم شرارتوں پر کھلکھلا کر ہنستی رہی تھی۔
دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی تو اپنے آپ کو بہت فریش
ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

"ٹھیک تو کہتے ہیں شہروز احمد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا کر لیا ہے۔" وہ سوچنے لگی۔ "اپنے خول
بند، اندیشوں میں گھری ہوئی خوفزدہ سی اس طرح کب تک چلے گا؟۔ آخر زندگی پر میرا بھی حق ہے اور وقت
مٹھی میں میرے لیے جو خوشیاں مقید ہیں، مجھے انہیں حاصل کرنا چاہیے۔ یہ خوشیاں تو مقدر سے ہی ملا کرتی
پھر میں کیوں نظریں چراتی رہی ہوں۔"

"آنٹی۔" عامر اور روبی نے اس کے کمرے میں جھانک کر پکارا تو اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ چونک کر
کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہم اندر آجائیں؟۔"

"آجاؤ بیٹا۔" وہ مسکرائی تو دونوں بچے بھاگتے ہوئے آئے اور اُچھل کر اس کے بیڈ پر چڑھ گئے۔

"آپ سو تو نہیں رہی تھیں؟۔" روبی نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ بلکہ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اُس نے پیار سے روبی کا گال چھوا۔

"سچ آنٹی۔؟"

"بالکل سچ۔ یہ بتاؤ شانی کہاں ہے؟۔"

"وہ ممی کے ساتھ سو رہا ہے۔"

"تم دونوں نہیں سوئے؟۔"

"نہیں۔ ہمیں اس وقت سونا اچھا نہیں لگتا۔ ممی زبردستی سُلا دیتی ہیں۔ ابھی ہم چپکے سے یہاں آئے
ہیں۔ ممی کو پتا چلے گا تو خفا ہوں گی۔ ڈانٹیں گی بھی۔"

"میں تمہاری ممی کو خفا نہیں ہونے دوں گی۔ کہہ دوں گی تم دونوں کو میں نے بلایا تھا۔"

"سچ۔" بچے خوش ہو گئے۔

"ہاں۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گے؟۔"

"آپ کے پاس چاکلیٹ ہیں؟۔" عامر پوچھنے لگا۔

"چاکلیٹ تو نہیں ہیں۔" اسے افسوس ہونے لگا کہ جب معلوم تھا بچے آنے والے ہیں۔ پھر ان کے
لیے ایسی چیزیں کیوں نہیں رکھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "چاکلیٹ نہیں ہیں تو کیا ہوا، چلو میں تم دونوں
کو کوئی سویٹ ڈش بنا دیتی ہوں۔"

"آنٹی کسٹرڈ بنا دیں۔" دونوں بچے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے تم دونوں یہیں بیٹھو، میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔"

پھر وہ فوراً اُٹھ کر چلی گئی۔ امی اور ندا ابھی شاید سو رہی تھیں۔ وہ اس خیال سے کہ کہیں کوئی ڈسٹرب
نہ ہو، بہت خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ کسٹرڈ بنانے میں دیر نہیں لگی۔ منٹوں میں تیار کر کے اس نے فریزر
میں رکھ دیا اور جب تک وہ ٹھنڈا ہو، اتنی دیر میں اُس نے اپنے لیے چائے بنا لی۔ پھر دونوں چیزیں ٹرے
میں رکھ کر کمرے میں آئی تو کہنے لگی۔

"دیکھو، میں نے منٹوں میں تیار کیا ہے، اب تم دونوں منٹوں میں صاف کرنا ورنہ۔"

"ورنہ۔" شہروز احمد کی آواز پہ چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ کب آئے؟۔"

"ابھی۔" وہ مُسکرائے۔" اور آتے ہی معلوم ہوا کہ آپ ہمارے لیے کوئی خاص ڈش تیار کر رہ
"آپ کے لیے نہیں، بچوں کے لیے۔" اُس نے مُسکراہٹ کا جواب مُسکراہٹ سے دیا۔
"چلیے۔ تو ہم صرف چائے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔" انہوں نے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اُس ن
پیچھے کھینچ لی۔
"یہ چائے بھی آپ کے لیے نہیں ہے۔"
"ارے تو کیا میں آپ لوگوں کو دیکھتا رہوں گا؟"
"دیکھنے پر بھی پابندی ہے۔"
"یہ پابندی قبول نہیں کروں گا۔" اسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے بولے تو وہ جو اعتماد سے
رہی تھی، نروس ہو گئی۔ غیر محسوس طریقے سے رُخ موڑ کر بچوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔
"چلو بیٹا۔ آپ کسٹرڈ لیں۔" دونوں بچے ٹیبل کے پاس آ بیٹھے۔ تو اُن سے کہنے لگے۔
"ماموں جانی آپ نہیں لیں گے؟"
"نہیں بیٹا۔ یہ میرے لیے نہیں ہے۔"
"آپ۔ کے لیے بھی ہے۔" وہ اسی طرح رُخ موڑے ہوئے بولی۔
"کیا چیز؟" وہ بچوں کو کھانے کا اشارہ کر کے پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"یہ کسٹرڈ۔" وہ فوراً پلٹ کر بولی۔
"اور۔؟"
"اور یہ چائے بھی۔"
"اور۔؟"
"اور۔" اُس نے دہرایا اور اُن کی طرف دیکھنے لگی۔
وہی دلفریب مُسکراہٹ جو اُن کے ہونٹوں پر ٹھہرتی تو مقابل اپنا ہوش بھلا دیتا ہے۔
وہی رنگ جو آنکھوں میں اُترتے تو مقابل سارے محاذوں پر ہتھیار ڈال دیتا۔
روشنی سی روشنی جو آنکھوں سے پھوٹتی تو منزل کے بے نشان راستوں کو منور کرتی چلی جاتی تھی۔
اور۔

چاہتوں کے رنگ، اپنی طرف بُلاتے ہوئے اور مقابل تو وہ تھی جسے پہلے ہی اپنا آپ بُھلا دینے
لاحق تھا۔ کبھی کہیں کوئی ایک رنگ جو اچانک توجہ کھینچتا اور آنکھوں کے رستے دل میں اُتر کر گرد و پیش
کر دیا کرتا۔ پھر یہاں تو رنگوں کی برسات اُتری تھی۔ وہ کیسے اپنے آپ میں رہتی۔ کچھ یاد نہیں رہا، وہ
اور مقابل کون ہے؟۔ بس ایک ٹک انہیں دیکھے گئی۔ اور وہ کافی حد تک اس کی عادت سے واقف ہو چکے
اُسے یوں گم صم دیکھا، تو جان گئے، اپنے آپ میں نہیں رہی۔ لیکن یہ نہ جان سکے کہ کس بات نے اسے
بنایا ہے۔ کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔ شاید خود ہی سنبھل جائے لیکن وہ اسی
کھڑی تھی۔ وہ اسے چونکانا نہیں چاہتے تھے لیکن اس خیال سے کہ کہیں اچانک کوئی آ نہ جائے ا
دے ڈالی۔
"ربیعہ۔"
"ہاں۔" جیسے وہ خواب میں بولی۔
"بھئی اس طرح کھڑے کھڑے تھک جائیں گی۔ بیٹھ جائیں۔" اور ذرا سی پلکیں جھپکنے کی دیر تھ
جیسے نیند سے بیدار ہو گئی۔
فوراً ہی احساس ہو گیا کہ پچھلے کئی لمحوں سے ان کے سامنے اسی طرح کھڑی ہے۔ دل ہی دل
محسوس کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوئی اسی طرح کمرے سے نکل آئی جب کہ وہ پیچھے

ے تھے۔
اگلا دن جمعہ تھا اس لیے، یا پھر آپی کے آنے سے رات دیر تک سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے رہے۔
ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ ہنسی مذاق میں کبھی کوئی نشانہ بنتا، کبھی کوئی۔ وہ بھی سب کے ساتھ شریک
ویسے بھی اب مہروز کے ساتھ اُس کا ایک نیا رشتہ استوار ہو رہا تھا، اس لیے وہ زیادہ تر اُسے ہی چھیڑتی

"ویسے بھابی۔ اس نئے رشتے کے حوالے سے آپ مجھ سے چھوٹی ہو جائیں گی۔ پھر میں آپ کا لحاظ
روں گا۔" مہروز نے کہا تو وہ آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی۔
خیر دار! میں بڑی ہی ٹھیک ہوں۔"
آپ کو بڑا بننے کا شوق ہے؟" ندا پوچھنے لگی۔
ہاں۔ ذرا رعب رہتا ہے۔ ویسے کوئی میرے رعب میں آتا نہیں ہے۔" وہ ہنسی۔
کیوں شہروز۔ بھئی تمہارے رعب میں نہیں آتے؟" آپی نے چھیڑا۔
تو بہ کریں۔ یہ کسی کے رعب میں آنے والے ہیں؟ اُلٹا رعب جماتے ہیں۔ اور پتا ہے آپی غصّے میں
نکل اتنی خوفناک ہو جاتی ہے کہ۔
کہ مقابل اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔" انہوں نے بات اُچک لی۔ وہ سمجھ گئی، کیا یاد دلا رہے ہیں
ڑاتی ہوئی بولی۔
ظاہر ہے ڈر کے مارے بندے کی حالت ایسی ہو ہی جاتی ہے۔"
لیکن شہروز۔ تمہیں پہلے تو اتنا غصّہ نہیں آتا تھا۔" آپی سنجیدگی سے پوچھنے لگیں۔
رے چھوڑیں آپی۔ آپ بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہیں، یہ تو یونہی مذاق کر رہی ہیں۔"
ہیں مذاق نہیں کر رہی۔ ندا سے پوچھیں۔ کیوں ندا، کل رات میں دیکھا نہیں تھا۔" وہ اپنی بات سچ ثابت
پر تل گئی۔
ہیں بھابی۔ رات تو بھائی جان بس یونہی خفا ہوئے تھے۔ ویسے آپ نے ان کا اصلی والا غصّہ دیکھا
ہے۔ جو کبھی کبھار آتا ہے۔" وہ تصدیق کے لیے ان کی طرف دیکھنے لگی تو وہ ہنس پڑے۔ اسی طرح رات
ے یہ محفل جمی رہی۔ پھر جب نیند آنے لگی تو سب اُٹھ گئے۔
دیر سے سونے کی وجہ سے صبح کوئی بھی معمول کے مطابق نہیں اُٹھا۔ دس بجے سب ناشتے کی میز پر بیٹھے
خفا ہونے لگیں۔
نہائی غیر ذمہ دار ہو تم سب۔ معلوم بھی ہے آج کتنے کام ہیں۔ پھر بھی اتنی دیر تک سوتے رہے ہو۔"
سب کام ہو جائیں گے۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔؟" انہوں نے اطمینان دلایا اور سب سے پہلے ناشتا
اُٹھ کھڑے ہوئے۔
پھر سارا دن مصروف گزرا۔ آپی کسی طرح مطمئن نہیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اسی
ے بار بار ہر چیز کو نئے سرے سے چیک کر رہی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر کے
اور وہ اپنی تیاری میں لگ گئیں۔ وہ اس وقت بہت مگن تھی۔ شاید تمام اندیشے جو کسی پل چین
نے دیتے تھے، وہ کہیں پس منظر میں جا چھپے تھے یا اُس نے خود ہی کہیں پیچھے دھکیل دیے تھے۔ وہ
اہتمام سے تیار ہوئی۔ آئینے میں اپنا آخری جائزہ لے رہی تھی کہ ندا دروازے میں پکار کر کہنے لگی۔
بلدی آئیں بھابی۔ سب تیار کھڑے ہیں۔"
آ رہی ہوں۔" اُس نے کہا اور پرفیوم اسپرے کر کے کمرے سے نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی بھی موجود نہیں
اس نے گلاس ڈور سے باہر نظر ڈالی۔ آپی گاڑی میں سامان رکھوا رہی تھیں۔ وہ باہر نکلنا چاہتی تھی
بیلنے اس کے قدم روک دیے۔ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً اُسے ہی پلٹنا پڑا۔

"ہیلو۔" ریسیور کان سے لگا کر اُس نے بڑی عجلت سے کہا۔
"میرے خدا۔ میں بڑی شدت سے دعا مانگ رہا تھا کہ تمہاری ہی آواز سننے کو ملے۔ یہ میں ہوں
ثاقب حسن۔"
"آئی ایم سوری ثاقب حسن۔ میں اس وقت بالکل بات نہیں کر سکتی۔" اُس نے عجلت میں کہہ کر ریسیور رکھ
دیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔
"آپ کہاں رہ گئی تھیں؟" شہروز احمد اُس کے سراپے میں اُلجھتے ہوئے پوچھنے لگے۔
"وہ۔۔ فون۔" بے خیالی میں اُس کے منہ سے نکل گیا۔
"کس کا فون تھا؟"
"رانگ نمبر۔" وہ جلدی میں کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔
اماں کے گھر میں ایک خوشگوار ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بڑے ماموں اور چاچی اپنی فیملیز کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔
وہ سب سے مل کر اندر چھوٹی آپا کے پاس آ گئی۔ بڑی آپا اُن کے بال سلجھا رہی تھیں۔ اُسے دیکھا تو برش اُس
کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"نور بیٹا۔ یہ کام تم کرو۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔" بڑی آپا اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔
"لاؤ میں خود ہی سلجھا لیتی ہوں۔" چھوٹی آپا نے برش لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے ان کا ہاتھ
تھام لیا۔
"چھوٹی آپا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے آپ کو سنواروں گی۔"
"لیکن میں خوش نہیں ہوں۔" چھوٹی آپا کا لہجہ سپاٹ اور افسردہ تھا۔
"ارے کیوں؟" وہ ان کے برابر بیٹھ گئی۔
"اپنی کم مائیگی کا احساس اور۔۔"
"چھوٹی آپا پلیز۔" اُس نے ٹوک دیا۔ "آخر میں بھی تو اس گھر میں گئی ہوں۔ کبھی کسی نے غلطی سے بھی نہیں
جتایا کہ میں اُن کے مقابلے میں کم حیثیت ہوں۔ سب محبت کے ساتھ اتنی عزت دیتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں مگن
ہو جاتی ہوں۔"
"تمہاری بات اور ہے۔"
"کیوں؟ میری بات اور کیوں ہے؟"
"تمہیں وہ محبت اور چاہت سے بیاہ کر لے گئے تھے۔ اور مجھ پر ترس کھا رہے ہیں۔"
"آپ نہیں سمجھیں گی چھوٹی آپا لیکن وقت آپ کو خود سمجھا دے گا۔ بس میری اتنی سی بات مان لیں کہ خوامخواہ
کے اندیشوں میں مت گھریں۔ یقین کریں آپ وہاں بہت خوش رہیں گی۔"
"بھابی۔" ندا نے دروازے پر دستک دے کر پکارا تو وہ چھوٹی آپا کا کندھا تھپکتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
دروازہ کھولا تو ندا چھوٹی آپا کے کپڑے اور زیور وغیرہ لیے کھڑی تھی۔
"میں بھی اندر آ جاؤں؟" ندا پوچھنے لگی۔
"آ جاؤ۔" ندا اندر آ گئی تو اُس نے دروازہ بند کر دیا۔
پھر دونوں نے مل کر چھوٹی آپا کو تیار کیا۔ پھر جب اماں نے کہا تو وہ انہیں لے کر بڑے کمرے میں آ گئیں
جہاں امی نے منگنی کی رسم ادا کرتے ہوئے انہیں انگوٹھی پہنائی اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ اس کے بعد
ہلکا پھلکا ہنگامہ جاگ اُٹھا۔ ہنسی مذاق۔ ایک دوسرے پر چیزیں پھینکنا۔ فقرے بازی۔ سب انجوائے کر رہے تھے۔
رات کے کھانے کے بعد جب سب سے رخصت ہو کر وہ واپس آ رہی تھی تو بے حد مطمئن تھی۔
ایک عرصے کے بعد اُس نے اماں اور ابا میاں کو اتنا خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔ اور وہ خود بھی تو چھوٹی آپا کے
لیے بہت سوچا کرتی تھی۔ کڑھا کرتی تھی۔ ان کی زندگی میں یہ خوشگوار سا موڑ اُس کے لیے واقعی خوشی کا باعث
تھا اور اس خوشی میں وہ اپنے آپ کو بالکل فراموش کر گئی تھی۔ یہ بھی بھول گئی تھی کہ یہاں آنے سے پہلے

فون آیا تھا۔ اور یہ بھی کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟۔ بس خوش تھی اور اندرونی خوشی کا عکس اُس
کے چہرے پر بھی جھلملا رہا تھا۔ ایک خوبصورت مسکراہٹ جو مستقل ہونٹوں پر ٹھہر گئی تھی۔ جو کسی کسی وقت ہنسی
میں ڈھل کر جلترنگ بجا دیتی۔
گھر آ کر وہ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پھر اپنے کمرے میں آئی تو سیدھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ آئینے
میں اپنے آپ کو دیکھتی رہی۔ دل چاہا کہ کوئی سراہنے والا ہو۔ وارفتگی سے کہے۔
تمہاری آنکھیں۔
تمہارے ہونٹ۔
تمہارے بال۔
تمہارا سراپا۔
"ارے یہ میں کیا سوچنے لگی؟" اپنے آپ کو ٹوکا اور جلدی سے ڈریس چینج کر کے نکلی تو کمرے میں شہروز احمد
موجود تھے۔ اور پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ ٹھٹکی نہیں، جھجکی نہیں۔ پہلے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، پھر آ کر اُن سے
کہنے لگی۔
"میرا اس وقت چائے پینے کا زبردست موڈ ہے۔ آپ پئیں گے؟"
وہ یوں اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے سوچ رہے ہوں کہ انہیں کیا جواب دینا چاہیے۔
"میرا خیال ہے اس وقت چائے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ خود ہی کہتی ہوئی کمرے
سے نکل گئی۔
کچھ دیر کے بعد چائے لے کر آئی تو وہ اطمینان سے ٹیبل پر ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھے تھے۔ اس نے ایک
کپ انہیں تھمایا اور کنارے والے صوفے پر جا بیٹھی۔
"تھک گئی ہیں؟" وہ پوچھنے لگے۔
"ہاں۔" اُس نے اعتراف کیا۔ "اصل میں یہاں آ کر میں بہت آرام طلب ہو گئی ہوں۔ اسی لیے ذرا ذرا سے
کام میں تھکنے لگی ہوں۔"
قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "پتا ہے میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں سو جاؤں۔ پُرسکون نیند۔ اور ایک
طویل مدت تک ایسے ہی سوتی رہوں۔ مجھے کوئی نہ چھیڑے، کوئی نہ اُٹھائے۔"
"فرار چاہتی ہیں۔۔؟" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔
"ہاں۔" صاف گوئی سے بولی۔
"فرار کا یہ راستہ یا طریقہ بزدلانہ ہے۔"
"اور میں بہت بزدل ہوں۔" جواباً اُن کے جواب کی تصدیق کر دی۔
"اور میں آپ کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بھی کسی بھی مقام پر، سمجھیں آپ۔" وہ اتنی سنجیدگی سے بولے
کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ خاموشی سے اُن کی طرف دیکھتی رہی تھی۔
"زندگی میں بہت ساری باتیں ہماری مرضی کے خلاف ہو جاتی ہیں۔" وہ کہنے لگے۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں
ہے کہ ہم ان پر کُڑھتے رہیں۔ یا فرار کے طریقے سوچتے رہیں۔ اس کے برعکس ہمیں جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے انہیں فیس کرنا چاہیے۔"
"شہروز احمد پلیز۔ میں اس وقت کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی کہیں انہیں
بُرا نہ لگے جب کہ وہ ہنس پڑے۔
"آپ سے کچھ کہنا۔ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کو چھوڑیں۔ اور سو جائیں۔ لیکن طویل مدت کے لیے نہیں۔ صبح معمول کے مطابق اُٹھ جائیے گا۔"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر اپنے کمرے میں جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

"اس بند خول سے نکل کر آپ اچھی لگتی ہیں۔ اسی طرح رہا کریں سب لوگوں کے ساتھ مل کر۔"

وہ اُن کی طرف دیکھنا چاہتی تھی لیکن کوشش کے باوجود پلکیں نہ اُٹھا سکی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

شہروز احمد کچھ دیر تک اُس کی جھکی جھکی پلکوں کو دیکھتے رہے، جن کی ہلکی سی لرزش اُن کے دل کو ہلائے دے رہی تھی۔ خوابیدہ خواہشات اچانک بیدار ہونے لگیں، تو بمشکل تمام اپنی ہر خواہش پر بند باندھتے ہوئے وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے۔

اور—

وہ جو سانس روکے بیٹھی تھی، دروازہ بند ہونے کی آواز پر پہلے پلکوں کو ذرا سی حرکت دی اور انہیں نہ پا کر طویل سانس لیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے چاہا تھا کہ کوئی اُسے سراہے اور گو کہ انہوں نے بہت زیادہ تعریف نہیں کی تھی۔ بس ایک جملہ، اور وہ بجائے خوش ہونے کے افسردہ ہو رہی تھی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" اپنی جگہ پر لیٹی تو سوچنے لگی۔ "کبھی کبھی انسان اتنا مجبور اور بے بس کیوں ہو جاتا ہے۔ اختیار ہوتے ہوئے بھی اُنہیں استعمال کرنے سے قاصر۔ ایک دیوار جو اوّل روز سے میرے اور شہروز احمد کے درمیان کھڑی کی گئی تھی، ہم اُسے ڈھانے پر قادر کیوں نہیں؟ جبکہ اُسے ڈھا بھلا نگنے بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹانے کے سارے حقوق ہمارے پاس موجود ہیں۔ بس ایک الزام ہی آئے گا مجھ پر بے وفائی اور اُن پر خیانت کا۔"

"تو کیا تم اس دیوار کو ڈھانا چاہتی ہو؟" اُس کے اندر سے سوال اُٹھنے لگا۔

"میں؟" دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ حیران ہو گئی اور کوئی جواب ڈھونڈے سے نہ "تم میری محبت ہو۔" آس پاس سرگوشیاں اُبھرنے لگیں۔ "زندگی کی طویل شاہراہ پر میں تمہارے بغیر چلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہارا ہوں اور تمہارا رہوں گا۔ اور تم بھی ربیعہ اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ تمہیں پانے کے لیے اگر مجھے جان سے بھی گزرنا پڑا تو گزر جاؤں گا۔"

"ثاقب حسن۔" ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ دل میں گزری محبتوں کا کوئی احساس، کوئی ملال نہیں تھا پھر بھی جانے کیوں آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔

"دیکھو۔ رونے کی کوشش مت کرنا۔" وہ جیسے ایک دم سامنے آن کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ مسافتوں کی دُھول میں اَٹا ہوا تھا۔ آنکھوں کے وہ روشن دیپ، جو کبھی نئی زندگی کا پتا دیتے تھے، ماند پڑ رہے تھے۔ کچھ ٹوٹا ہوا سا۔ کچھ شکستہ سا کھڑا کہہ رہا تھا۔

"جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، اُن میں پانی نہیں اُترنا چاہیے۔ اور تم ربیعہ۔ محبتوں کے دیپ کبھی بجھنے مت دینا۔"

"ثاقب حسن۔" دل ہی دل میں اُسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"گو کہ میں نے اپنے احساسات و جذبات کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، زندگی کی ساری رنگینیاں اپنے آپ پر حرام کر لیں، پھر بھی میں فرشتہ نہیں ہوں اور نہ ہی پتھر کی کوئی بے جان مورت کہ کوئی احساسات نرمی سے چھوئے اور میں چونکوں نہ۔ کوئی آنکھوں میں وارفتگیاں سجا کر دیکھے اور دھڑکنیں منتشر نہ ہوں کیسے ممکن ہے بھلا۔ ہے۔ اور کوئی بھی کون، شہروز احمد۔ جو جہاں کھڑے ہو جائیں تو آس پاس کے ماحول کو بھی رشک آنے لگتا ہے۔ جو جس پر نظر ڈال لیں، وہ معتبر ہو جائے۔ پھر میں تو بہت کمزور اور

دل سی لڑکی ہوں۔ ساتھ ہی ذرّے ذرّے میں حُسن تلاش کر کے اس میں کھو جانے والی اور شہروز احمد تو نہیں آفتاب ہیں۔ خدا گواہ ہے میں نے اُن میں حُسن تلاش کرنے کی سعی کبھی نہیں کی۔ اُن کا ہر روپ اپنے اندر ایک حُسن لیے ہوئے ہے۔

ایک ذرا سی مسکراہٹ جو مجھے دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر ٹھہرتی ہے، تو لگتا ہے جیسے ہر ایک شے میری دوست اور ہمنوا ہو گئی ہو۔

ایک ذرا سی لکیر جو اُن کی صبیح پیشانی پر نمودار ہو جائے تو سب دشمن۔

اور—

ایک ہلکی سی خفگی جو کبھی اُن کے لہجے میں اُتر آئے، تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مجھ سے خفا ہو کر مجھے شدید تنہائی کا احساس بخش جاتا ہے۔

یقین کرو ثاقب حسن۔ میں اوّل روز سے اپنے آپ سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے مجھے تمہارے اُس اقدام نے دھچکا پہنچایا کہ میرے حصول کے لیے تم نے بہت غلط طریقہ استعمال کیا۔ بمشکل تمام اپنے آپ کو سمجھایا۔ سمجھوتے پر آمادہ ہوئی تو شہروز احمد اپنی تمام تر سحر انگیزیوں سمیت مجھ پر چھانے لگے۔ میں اُن سے اور اُن کی ذات کی تمام ظاہری و باطنی خوبیوں سے نظریں چُراتے چُراتے تھک گئی اور اب اِس مقام پر مجھے لگ رہا ہے، میں ہار گئی ہوں۔ ہاں ثاقب حسن، میں ہار گئی ہوں۔ مزید اپنے آپ سے نہیں لڑ سکتی۔ اور تم پلیز مجھے الزام مت دینا کہ مجھے اس راستے پر کھڑا کرنے والے تم خود ہو۔"

اُس نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھیں، تو احساس ہوا کہ آنکھوں کا پانی روانی سے بہہ رہا ہے۔

"جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، ان میں پانی نہیں اُترنا چاہیے۔" اُس نے کہا تھا اور اب وہ کہہ رہی تھی۔

"میں ان دیپوں کو بُجھا رہی ہوں۔ جنہیں تم نے جلایا تھا۔" اُس کے ساتھ ہی تکیے میں منہ چھپا کر روتی چلی گئی۔

ثاقب حسن نے اپنے گھر، اپنے وطن، اپنی مٹّی سے دُور جانے کا فیصلہ محض اس لڑکی ربیعہ اکرام علی کی خاطر کیا تھا، تاکہ جلد سے جلد کوئی مقام حاصل کر سکے اور پھر اپنے مسائل سے نکل کر اسے اپنا سکے۔ اگر اُس کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنے گھر سے دُور نہ جاتا لیکن صرف اُس کی خاطر اُس نے یہ بن باس قبول کیا۔ وہ اس سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔ اور جیسا کہ اُس نے کہا تھا کہ وہ اُسے پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، تو اُس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ جس گھر اور ماحول میں رہ کر وہ اس کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے اس گھر سے ہی نکال لایا۔ یوں کہ اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اور پھر یہ یقین تے کر گیا کہ وہ برس دو برس تو کیا، ہزار برس بھی اُس کا انتظار کر لے گی۔

وہ اتنا طویل انتظار تو اسے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ خود بھی اُس سے جُدائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن کیا کرتا، مجبور تھا اُسے پانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نہ صرف کسی اچھے مقام پر کھڑا ہو بلکہ اپنے مسائل سے بھی آزاد ہو چکا ہو۔ اور اس کے لیے وہ دن رات محنت کر رہا تھا۔ اپنوں سے دُور، اجنبیوں کے دیس میں جب فراغت کے لمحے میسّر آتے، تو وہ انہیں اُس کے نام کر دیتا۔ اُس کے سنگ گزرے لمحات اُس کی زندگی کا حاصل تھے۔

اس کا دھیرے دھیرے چلنا اور دھیمے دھیمے بولنا۔

کبھی لبوں کا بے اختیار مسکرانا اور کبھی آنکھوں کا بے اختیار چھلک جانا۔

وہ اُس کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا سوچا کرتا۔ اور کبھی جب اُسے سوچتے ہوئے دل کی بے قراری سوا ہو جاتی، اُسے دیکھنے کو دل مچلنے لگتا تو وہ فون کا سہارا لیتا۔ اُس کی آواز سُنتے ہی دل

بے قرار کو قرار آ جاتا۔ لیکن اِدھر کچھ عرصے سے اُسے یہ قرار بھی نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

پہلی بار جب اُس نے کہا تھا کہ "میں بات نہیں کر سکتی" تو وہ اُسے اس کی کوئی مجبوری سمجھا تھا۔ باتیں سوچیں۔ "ہو سکتا ہے شہروز کی والدہ وہاں موجود ہوں یا کوئی بہن یا کوئی اور جس کے سامنے بات نہ کر سکتی ہو۔" لیکن آج جب کہ وہ بے حد خوش تھا۔ اُس کی بڑی دونوں بہنوں کی شادی تھی، اِس طرح سے وہ اپنے اہم فرائض سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ اور یقیناً یہ اُس کے لیے خوشی کی بات تھی اور اِس خوشی میں وہ اُسے بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔

صبح ہی سے کال بُک کرائی تھی اور سارا دن دُعا کرتا رہا کہ فون وہی ریسیو کرے۔ اُس کی دُعائیں مُستجاب ضرور ہوئیں لیکن ایک بار پھر اُس نے کہہ دیا۔

"میں بات نہیں کر سکتی۔"

اس کے لہجے میں مجبوری ہوتی تو وہ اپنے آپ کو سمجھا لیتا۔ اس کے برعکس بیزاری جسے وہ صاف محسوس کر گیا تھا اور پھر جس طرح اُس نے ریسیور پٹخا تھا اس سے اُس کی ناگواری کا احساس بھی ہوا۔ پہلے وہ حیران ہوا، پھر پریشان اور اب تو کسی پل قرار نہیں تھا۔ بے شمار اندیشے، بے شمار وسوسے منتظر تھے۔ ایک کے بعد ایک اُس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔

"بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔" وہ سوچنے لگا۔ "صرف ایک سال اور یہ کوئی اتنا لمبا عرصہ نہیں ہے جو انتظار کو کوفت میں بدل دے۔ محبت کرنے والے تو صدیوں کی بات کرتے ہیں اور اِس کو مقدر جان کر آس کے دیپ جلا رکھتے ہیں۔ خواہ ان دیپوں کو خونِ جگر سے جلانا پڑے، روشن ہیں اور ربیعہ اکرام علی! تمہاری آنکھوں کے دیپ تو میں نے اپنی محبتوں سے جلائے تھے اور انہیں رکھنے کا عہد بھی لیا تھا۔ پھر عہد شکنی کیوں کی تم نے؟

کیا تم نہیں جانتیں کہ میری زندگی کی ساری جدوجہد صرف تمہارے لیے ہے۔ میں زندہ بھی صرف اِس پر ہوں کہ ان کڑی مسافتوں کے بعد تم انعام کی صورت ملوگی۔ اور ربیعہ اکرام علی! اب تو وہ مقام کہ منزل دو گام نظر آتی ہے، پھر تم نے راستہ کیوں بدل لیا۔ تم مجبور نہیں ہو سکتیں، کبھی بھی نہیں۔ تمہارے لہجے کی بیزاری اور ناگواری اس بات کی گواہ ہے کہ تم نے وہ خواب سارے جو میں نے تمہاری آنکھوں سجائے تھے۔ وہ کسی اور کے توسط سے پا لیے ہیں۔

"شہروز احمد۔" اُس کے پورے وجود میں تلخی بھر گئی۔ "اپنے پرائے سب میں ایک تم ہی قابلِ اعتماد نظر آئے تھے اور میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی متاعِ عزیز امانت کے طور پر تمہارے سپرد کر دی۔ اگر جو تم خیانت کے مرتکب ہوئے تو خدا کی قسم میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"ثاقب حسن۔" دل نے ٹوکا۔ "یہ تم کیسی باتیں سوچنے لگے۔ ساری باتیں خود ہی فرض کر رہے، اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔ کوئی مجبوری کوئی مصروفیت کچھ تو ہو گا جو وہ لڑکی تمہاری بات نہ کر سکی۔ تم کیا جانو، اس کے حالات کیا ہیں؟ ہو سکتا ہے اُسے مشکلات کا سامنا ہو۔"

"نہیں۔" خود اپنی نفی کرنے لگا۔ "اُس کے لہجے کی بیزاری کچھ اور کہہ رہی تھی اور اُس روز انیلا نے بھی فون پر بتایا تھا کہ ربیعہ سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ کہ وہ کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ میں نے اِس بات پر توجہ محض اس لیے نہیں دی کہ وہ کچھ جانتی نہیں۔ میں نے سوچا تھا انیلا یقیناً مجھے ربیعہ سے بدظن کرنے کی خاطر ایسی بات کہہ رہی ہے ورنہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ سارا زمانہ بدل سکتا ہے ایک وہ نہیں۔ اور ایسا ہی یقین مجھے شہروز احمد پر بھی تھا۔"

"ثاقب حسن۔ اتنے بددل مت ہو یار۔" دل نے پھر سمجھایا۔ "جب تک اس سے تفصیلی بات نہ کر لو، کوئی رائے قائم مت کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ایک بزدل لڑکی ہے۔"

"ہاں وہ بہت بزدل ہے۔" اُس نے اعتراف کیا اور اسی ایک بات نے اُسے سہارا دیا۔ تو وہ اُس کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے لگا۔

"وہ بھی مجبور ہو سکتی ہے۔ بے بس بھی۔ اور ہو سکتا ہے کسی مشکل میں بھی گھری ہو۔ میں بھی اُن کی طرف سے لاپروا ہو گیا ہوں۔ صرف اسے یاد کر لینا یا سوچ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ مجھے اُس کی خبر لینی چاہیے تھی۔ اس تمام عرصے میں، میں صرف اپنے مسائل سے نکلنے کی سوچتا اور سعی کرتا رہا ہوں۔ اِس اطمینان کے ساتھ کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کر رہا ہوں۔ اس کے لیے نہیں، اس کے حصول کے لیے کرتا رہا۔" وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

"اُسے رہنے کے لیے صرف ایک چھت ہی تو درکار نہیں تھی۔ زندگی کی اور بھی بہت ساری ضروریات ہیں اور شہروز احمد ان ضروریات کو پورا کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی؟ ہو سکتا ہے، خفا ہو اور خفگی میں ہی مجھ سے بات کرنے سے منع کیا ہو۔"

"میرے خدا۔ ان تمام پہلوؤں پر تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔" وہ اندیشوں سے نکلا تو اُس کے لیے کڑھنے لگا تھا۔

اُس نے اپنی کتابِ زندگی سے وہ باب جس میں ثاقب حسن کا نام رقم تھا۔ پھاڑا تو نہیں لیکن بند ضرور کر دیا۔ اس عہد کے ساتھ کہ دوبارہ اُسے کبھی نہیں کھولے گی۔

یہ کام اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا کہ اس کی موجودہ زندگی میں ثاقب حسن کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ بہرحال اب اگر دخل تھا بھی تو اُس نے سوچ لیا تھا کہ جب بھی موقع ملا وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کرے گی۔ کہ جو زندگی، جو گھر اُس کا مقدر ہو چکا ہے، اسے اسی میں رہنے دے۔ وہ یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی۔ اور اگر نکالی بھی گئی تو دوبارہ ان راہوں پر کبھی نہ چل سکے گی۔ اس لیے وہ اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے۔

یہ فیصلہ اُس نے اپنے طور پر کیا تھا اور مطمئن بھی تھی۔ گو کہ نہیں جانتی تھی کہ شہروز احمد اُس کے اس فیصلے کا خیر مقدم کریں گے بھی کہ نہیں۔ حالانکہ گزشتہ کئی روز سے وہ ان کا ایک نیا روپ دیکھ رہی تھی۔ ان کا بے اختیار اُس کی طرف لپکنا۔ پہلے سے زیادہ خیال رکھنا اور اُن کی آنکھوں میں جو مخصوص رنگ اُتر آئے تھے جنہیں وہ کوئی نام دینا بھی چاہتی تو نہیں دے پا رہی تھی۔ ان ساری باتوں کا اس کے فیصلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

باوجود اس کے کہ شہروز احمد کی والہانہ نظریں اُس کی دھڑکنیں منتشر کرنے کے ساتھ ایک نیا احساس بخشتی تھیں۔ ان کی باتیں ڈسٹرب کرنے کے ساتھ سوچوں کے نئے در وا کرتیں۔ اس خیال کی گرفت زیادہ مضبوط تھی کہ وہ اس نام نہاد بندھن کے تقاضے نبھانے کی خاطر ایسا کرتے ہیں یا پھر ثاقب حسن کی خاطر۔ ورنہ حقیقت میں انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بہرحال اُس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں، اُس نے صرف اپنی ذات کو مدِنظر رکھا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اور وہ یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔

اس گھر میں اُسے جو محبتیں اور جو مقام ملا تھا، وہ اور کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ صرف شہروز احمد کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی کہ اُنہوں نے دُنیا داری کے لیے خیال رکھا۔ لیکن باقی لوگ جو کچھ نہیں جانتے تھے، وہ تو بے غرض محبتیں لُٹا رہے تھے۔ امّی، ندا، مہروز اور آپی سب ہی اُس کے گرویدہ تھے اور اتنی پیاری ہستیوں کو چھوڑنے کا تصور ہی لرزانے لگا تھا۔ اب اس مقام پر وہ وہی باتیں فرض کرنے لگی تھی جو شہروز احمد بہت پہلے سوچ رہے تھے۔

'ہو سکتا ہے ثاقب حسن باہر کی رنگینیوں میں کھو کر اُسے بھلا دے۔'

اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اور ان میں ثاقب حسن کا شمار بھی ہو سکتا ہے۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی لغزش جو بعد میں ندامت بن کر اُسے وہیں رُکنے پر مجبور کر دے اور کبھی وہ کوئی عذر تراشتے ہوئے کہے۔

'میرا انتظار مت کرنا بیٹا۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا'۔

ایسی بہت ساری باتیں تھیں جنہیں سوچ کر اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا تھا۔ اگر کوئی دھڑکا تھا تو شہروز احمد کی طرف سے کہ کہیں کسی دن وہ اُس کے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ نہ تھما دیں۔ اگر وہ جانتی کہ وہ بہت پہلے سے اس کے لیے اسی انداز سے سوچنے لگے ہیں جو وہ اب سوچ رہی ہے، تو وہ مکمل طور پر مطمئن ہو جاتی اور مکمل طمانیت کب، کیسے ملی ہے، جو اُسے مل جاتی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ عہدِ رفتہ سے ناتا ٹوٹا تو وہ اَب صحیح معنوں میں اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔ پہلے جو اُس کے اندر ایک جھجک تھی اور تکلف، تو وہ بہت حد تک نہیں رہا تھا۔ اب اُسے کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑتا تھا، وہ خود سے آگے بڑھتی اور ہر بات میں اپنی رائے بھی دینے لگی تھی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی اُس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ بنانا چاہتی تھی بلکہ اُس نے سوچ لیا تھا کہ جو مقدر میں ہوگا، وہ تو ہو کر رہے گا۔ پھر کیوں نہ اس وقت کو وہ خود اپنے لیے یادگار کر لے۔

؎ کوئی تشنگی نہ رہے کہ کچھ پایا نہیں
کوئی خلش نہ رہے کہ کچھ کیا نہیں!

اور جب سوچ لیا جائے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا، تو قبل از وقت تفکرات سے جان چھوٹ جاتی ہے۔ وہ بھی مگن تھی اور مصروف بھی۔ کہ ندا کے امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے اور امتحانوں کے فوراً بعد نہ صرف ندا بلکہ مہروز اور چھوٹی آپا کی شادی بھی طے پا گئی تھی۔ ندا کے جہیز اور مہروز کی بری کے سلسلے میں امی خاص طور سے اس سے مشورہ کرتیں اور اب وہ دامن نہیں بچاتی تھی بلکہ زیادہ تر کام اُس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔

اس میں یہ تبدیلی شہروز احمد کے لیے حیران کن تھی۔ کتنی خواہشیں تھیں جو اکثر ان کے اندر مچلا کرتیں کہ۔

کبھی بے خیالی میں ہی سہی، وہ چلتی ہوئی اُن کے پہلو میں آ بیٹھے۔

کبھی بے ساختہ ہنسے اور بے اختیار اُن کے کندھے پر پیشانی ٹکا دے۔

کبھی وہ اُٹھیں تو اُن کے کپڑے پریس کرتی ہوئی نظر آئے۔

اور ـــ

کبھی جو آفس میں دیر ہو جائے تو خفا ہو کر پوچھے۔

'کہاں رہ گئے تھے؟'۔

یہ ساری خواہشیں جو اُن کے خیال میں حسرت تو بن سکتی تھیں، پوری نہیں ہو سکتی تھیں، وہ سب پوری ہو رہی تھیں۔

صبح جب وہ سو کر اُٹھتے تو وہ اُن کے کپڑے پریس کر رہی ہوتی۔

وہ عادت کے مطابق چہل قدمی کے لیے لان میں نکل جاتے، تو کچھ دیر بعد ہی وہ چائے لیے ان کے پاس پہنچ جاتی۔

پھر اُن کے آفس جانے تک کسی نہ کسی بہانے اُن کے آس پاس موجود رہتی۔

اور جو کبھی آفس میں دیر ہو جاتی تو کئی بار فون کرتی۔

گو کہ وہ اُسے اسی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جب وہ اس روپ میں آئی تو حیران تھے۔ ٹوکا اس لیے نہیں کہ کہیں دوبارہ اپنے خول میں بند نہ ہو جائے۔

اس صبح لان میں اُن کے ساتھ اِدھر سے اُدھر چکر لگاتی ہوئی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران اچانک کہنے لگی۔

'کبھی آپ نے سوچا، وقت کی رفتار اچانک تھم جائے تو کیا ہو؟'۔

وہ قدم روک کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید جاننا چاہتے تھے کہ وہ درپردہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

...بن اُس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا تو کہنے لگے۔

'میں نے سوچا نہیں لیکن خواہش ضرور کی ہے۔'

'کیا مطلب؟'

'یہی کہ وقت تھم جائے اور جو چیز جہاں ہے ہمیشہ کے لیے وہیں رک جائے۔'

'میں سمجھتی تھی ایسی احمقانہ خواہشیں صرف میں ہی کرتی ہوں۔'

'ارے۔' وہ ذرا سا مسکرائے۔ 'یہ احمقانہ نہیں، انہونی خواہش ہے۔'

'انہونی۔' وہ پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔

'ایک بات بتائیں۔ آپ نے وقت تھم جانے کی خواہش کب اور کیوں کی؟' اُنہوں نے پوچھا تو وہ ...پ چاپ اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ اب انہیں کیا بتاتی کہ اس وقت بھی جب تم میرے سامنے میرے قریب ...ے ہو تو دل چاہ رہا ہے، وقت یہیں تھم جائے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے، ایک ...سرے کے قریب ہمیشہ کے لیے رُکے رہیں۔

'آپ نے جواب نہیں دیا؟' وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولے تو وہ کہنے لگی۔

'اگر یہی سوال میں آپ سے کروں کہ آپ نے یہ خواہش کب اور کیوں کی، تو؟'

'میں کبھی وقت آنے پر اس کا جواب ضرور دوں گا۔'

'میرا جواب بھی محفوظ ہے اور اب اندر چلیں۔'

'چلیں۔' وہ اُس کے ساتھ چل پڑے۔

اندر آئی تو سیدھی کچن میں چلی گئی۔ خانساماں ناشتا تیار کر رہا تھا۔ اُس نے سب چیزیں اُٹھا کر ٹیبل پر رکھیں۔ پھر خود ہی چائے دَم کرنے لگی۔ اتنے میں سب ڈائننگ روم میں آ چکے تھے۔ پھر جب خود...

'آپ شام میں ذرا جلدی آ جائیے گا۔ میں کچھ دیر کے لیے امّاں کے گھر جاؤں گی۔'

ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے وہیں رُک گئے۔ نظروں کا زاویہ بدل ...اُسے دیکھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے میں لگ گئی تھی۔

'کچھ دیر کے لیے کیوں؟ ابھی چلیں۔ شام میں واپسی پر میں آپ کو لیتا آؤں گا۔' اُس پر نظریں جما...

...وہ بولے۔

'نہیں ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ شام میں چلوں گی۔'

'ایز یو لائیک۔' انہوں نے کندھے اُچکا کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے۔

وہ اپنا کمرہ ٹھیک ٹھاک کر کے نکلی تو امّی کے پاس جا بیٹھی۔ اُن کے پاس آج کل صرف ایک ہی ...موضوع تھا۔ ندا اور مہروز کی شادی کا اور اب تو وہ بھی ہر بات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اِس وقت امّی نے ...دوپٹوں پر بیلیں اور گوٹہ کناری وغیرہ لگانے کی بات کی تو اُس نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔

'امی ـــ یہ کام تو میں بھی کر لیتی ہوں۔'

'ہاں ـ لیکن ـــ'

'لیکن کیا؟ ـ سارا وقت تو فارغ رہتی ہوں۔ اچھا ہے اس بہانے کچھ مصروفیت ہاتھ آ جائے گی۔' ...اصرار کرنے لگی۔ 'آپ ابھی دوپٹے وغیرہ نکال دیں۔' اُس کے اصرار پر امّی نے تین چار دوپٹے نکال ...دیے تو وہ کہنے لگی۔

'میں سلائی بھی اچھی کر لیتی ہوں ـــ اگر ندا پسند کرے تو اُس کے کچھ سوٹ بھی سی دوں گی۔'

'اچھا، لیکن پہلے شہروز سے پوچھ لو۔' امّی نے ـــــ ہنس کر کہا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

'کیوں؟ کیا وہ منع کریں گے؟'

'ہاں۔ اس کا کہنا ہے، جب درزی موجود ہیں۔ اور ہم انہیں افورڈ بھی کر سکتے ہیں تو پھر گھر میں سینے

کی کیا ضرورت ہے؟۔ اور اسے گھنٹوں مشین پر جھک کر بیٹھنا پسند بھی نہیں۔"
"مشین پر میں بیٹھوں گی، وہ تو نہیں بیٹھیں گے۔" اُس کی بات پر امّی نے ہنس کر اُس کا کندھا تھ[پتھپایا]
"بیٹا۔ جب وہ پسند نہیں کرتا تو رہنے دو۔"
"جی۔" اُس نے سر جھکا لیا۔ اُسی وقت ملازمہ نے آکر بتایا کہ کوئی انیلا بی بی آئی ہیں، اُس [کا]
دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔
"کون انیلا؟" امّی نے ملازمہ سے پوچھا تو وہ اپنے آپ پر قابو پاتی ہوئی جلدی سے بولی۔
"شاید میری دوست ہوگی۔ آپ کو یاد ہے، ایک بار بازار میں ملی تھی؟"
"اچھا اچھا۔" امّی نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "تم جاؤ بیٹا، یہ سب کام بعد میں دیکھ [لیں]
گے۔"
"جی۔" وہ دوپٹے وغیرہ وہیں رکھ کر اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ اُسے انیلا کا آنا بالکل بھی اچ[ھا]
نہیں لگا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ آ ہی چکی تھی تو ملے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو ا[سے]
دیکھ کر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجالی۔ اور بظاہر شکوہ کرنے لگی۔
"تمہیں اب فرصت ملی ہے؟"
"فرصت ہی فرصت ہے۔" انیلا ہنسی۔ "لیکن اس روز جلدی میں تمہارے گھر کا پتا لینا ہی بھول گئی تھ[ی]"
"پھر کیسے ملا میرا پتا؟"
"ثاقب بھائی سے معلوم ہوا۔" انیلا اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی[تو اُس]
کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر فوراً اپنے پیچھے دیکھا کہ کہیں امّی تو نہیں آرہیں۔ ادھر سے اط[مینان]
ہوا تو پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ بار بار ثاقب حسن کا نام لے اور کوئی سن نہ لے، اس سے کہنے لگی۔
"آؤ میرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"
"چلو۔" انیلا فوراً کھڑی ہوگئی۔
"ٹھہرو۔ پہلے میں چائے وغیرہ کا کہہ دوں۔"
وہ جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر ملازمہ سے چائے کا کہہ کر واپس آئی تو اسے لے کر اپنے کم[رے]
میں آگئی۔
"ہاں اب سناؤ اپنا حال احوال۔" اُس کے برابر بیٹھی تو بے تکلفی سے پوچھنے لگی کہ بہرحال اس سے [بات]
تو رہی تھی۔
"میں کیا سناؤں؟ تم اپنی کہو اچانک غائب ہوگئیں کہ کچھ پتا ہی نہ چلا؟"
"غائب نہیں ہوئی۔ یہاں آگئی۔" وہ خوامخواہ ہنسی۔
"اچھی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے اچھا گھر ہے۔" انیلا اُس کے بیڈ روم کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔ "ا[ور]
تمہاری ساس اور نند سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اچھی لگ رہی تھیں۔"
"ہاں۔ سب اچھے ہیں۔" اُس نے اطمینان کا مظاہرہ کیا۔
"تم خوش ہو؟" انیلا پتا نہیں کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ اُس نے سوچا یہ اچھا موقع ہے، وہ انیلا
سامنے اپنے آپ کو مطمئن اور خوش ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی کر دے جو اُس کے ذ[ریعے]
ثاقب حسن تک پہنچ کر اُسے اُس کی طرف سے بدظن یا متنفر کر دیں۔
"میں خوش ہوں انیلا۔ بے انتہا خوش۔ کبھی کبھی تو اپنے آپ پر بے انتہا رشک آنے لگتا ہے۔
لوگ اتنی محبت کرتے ہیں۔ اور شہروز کے بارے میں کیا کہوں۔ وہ تو دیوتا ہیں۔"
"واقعی؟" انیلا بغور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"ہاں تم ان سے مل کر دیکھو، تمہیں یقین آجائے گا۔ اتنے دھیمے مزاج کے اور بے حد محبت کرنے والے ہیں

مجھے تو تنگیٔ داماں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور پتا ہے، کبھی میں سوچتی ہوں، میں اتنی ڈھیر ساری
[محب]توں کے قابل تو نہیں تھی۔"
ملازمہ کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔ اُس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر اُسے جانے کے لیے کہا۔
"یہ اتنا تکلف؟" انیلا ٹرے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔
"کوئی اتنا تکلف نہیں ہے۔" اُس نے پوری ٹیبل کھینچ لی۔ "چلو اب تم تکلف مت کرنا اور ہاں آج
[س]ارا دن یہیں رہنا۔ شام میں شہروز آئیں گے، اُن سے مل کر جانا۔"
"مجھے فالتو سمجھ رکھا ہے کیا؟"
"فالتو کیوں ہونے لگی؟۔ اتنے عرصے بعد ملی ہو، جی بھر کے باتیں کریں گے۔"
"گئے دنوں کی؟" انیلا نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، اس لیے فوری طور پر وہ کوئی جواب
[ن]ہ دے سکی۔
"سنو۔" اُسے خاموش دیکھ کر انیلا کہنے لگی۔ "تمہیں کبھی ثاقب بھائی کا خیال آتا ہے؟"
"میں جھوٹ نہیں بولوں گی انیلا۔" وہ اُس کے آگے چائے کا کپ رکھتی ہوئی بولی۔ "شروع شروع
[م]یں اُس کا خیال آتا تھا، لیکن پھر بہت جلد اس گھر کی اور اس گھر میں رہنے والے تمام لوگوں کی محبتیں حاوی
ہوگئیں۔ اور پھر میں خود بھی گئے دنوں سے ناتا توڑنا چاہتی تھی۔ یوں وہ کہانی وہیں ختم ہوگئی اور میں
نے اس باب کو بند بھی کر دیا۔"
انیلا کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگی۔
"اسی میں بہتری تھی انیلا، میری بلکہ ہم سب کی۔ اگر میں ان چند دنوں کو اپنے اوپر طاری کر کے مسلسل
جلتی کڑھتی رہتی تو میرے ساتھ ساتھ سب کی زندگی جہنم بن جاتی۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں۔ اصل زندگی
تو یہ ہے۔ وہ تو ایک خواب تھا اور خواب کب تک ساتھ دیتے ہیں۔ اِدھر آنکھ کھلی، اُدھر غائب۔"
پھر وہ ایک پلیٹ اُٹھا کر اُس کے سامنے کرتی ہوئی بولی۔ "تم یہ لو ناں۔"
"نہیں بس ٹھیک ہے۔" انیلا نے چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر دو تین سِپ لینے
کے بعد بولی۔
"ثاقب بھائی کے بارے میں نہیں پوچھو گی؟"
"کیا پوچھوں؟" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر سرسری انداز میں بولی۔
"یہی کہ آج کل وہ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور کس حال میں ہیں؟"
"دیکھو انیلا۔ اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے اُس ثاقب حسن کے بارے میں پوچھوں جس سے
کبھی میں ملی تھی، تو آئی ایم سوری، میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی کیونکہ جس باب کو بند کر دیا ہے
اُسے دوبارہ کھولنا مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر تم صرف اپنے بھائی کے بارے میں بتانا چاہتی ہو تو ضرور بتا
دو۔ ویسے بھی بہنوں کی باتیں بھائیوں کے ذکر کے بغیر ادھوری ہوتی ہیں۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ
مسکرائی تھی۔ انیلا کچھ دیر تک چپ چاپ اُس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔
"تم نے تو بات ہی ختم کر دی۔ پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ثاقب بھائی تمہیں اب تک نہیں
بھلا سکے۔ تم نے تو اپنی زندگی کے اس باب کو بند کر دیا۔ اور اُنہوں نے تو کوئی دوسرا باب کھولا ہی نہیں۔"
اب خاموش رہنے کی باری اُس کی تھی۔ وہ جو بڑے اعتماد سے بول رہی تھی، ایک دم ہونٹ بھینچ کر
اُس کی طرف دیکھنے لگی۔
"وہ آج کل شکاگو میں ہوتے ہیں۔" انیلا اُس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہنے لگی۔ "تمہاری شادی کے
کچھ عرصے کے بعد ہی وہ چلے گئے تھے۔ میں نے اس وقت سوچا تھا کہ اب جب کہ تمہارے ملنے کی ساری امیدیں
دم توڑ گئی ہیں اور ثاقب بھائی بھی یہاں سے بہت دور جا رہے ہیں تو کچھ وقت تو لگے گا۔ پھر بھی وہ نارمل ہو[جائیں]

کے دُکھ بھلانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دن پہلے اُن کا فون آیا۔ وہ مجھ سے تمہاری باتیں کرنے لگے۔ کہنے لگے 'میں نے خواب میں دیکھا ہے، ربیعہ بہت پریشان ہے۔ تم پلیز اُس کے بارے میں جاکر معلوم کرو۔ اور میں اُن ہی کے کہنے پر تمہارے پاس آئی ہوں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"میں دوستی کے ناتے تم سے ملنا ضرور چاہتی تھی ربیعہ۔ لیکن تمہارے گھر نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں تم ڈسٹرب نہ ہوجاؤ۔ لیکن ثاقب بھائی کے مجبور کرنے پر مجھے آنا پڑا۔"

"میں تمہارے آنے سے ڈسٹرب نہیں ہوئی۔" اُس نے جھوٹ بولا۔ "تم ثاقب سے کہہ دو کہ خوابوں کی تعبیر اکثر برعکس ہوا کرتی ہے۔ اور ربیعہ بھی بے حد خوش ہے۔"

"تمہیں خوش دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔" انیلا اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"شکریہ۔" وہ مسکرائی۔ "اور سنو، اپنے بھائی سے کہنا میری فکر چھوڑ کر اپنے بارے میں سوچیں۔ اتنی طویل زندگی صرف یادوں کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اور کاش میرا بھائی یہ بات سمجھ لے۔" انیلا کے ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ تھی، وہ جانے کی بات کرنے لگی۔

"شہروز کے آنے تک رُکو ناں۔"

"نہیں بھائی۔ وہ تو شام میں آئیں گے۔ میں اب چلوں گی۔" انیلا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "شہروز بھائی سے میرا سلام کہنا۔ اور اگر مناسب سمجھو تو کبھی اُن کے ساتھ میرے گھر آنا۔"

"میں تمہارا دل رکھنے کے لیے ہاں نہیں کہوں گی کیونکہ تم جانتی ہو کہ میرا تمہارے گھر آنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔"

"ربیعہ۔" انیلا نے اُس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ "ایک طرف بھائی ہے، دوسری طرف تم۔ اور آج بھائی پر اپنی دوستی قربان کرتے ہوئے مجھے بے حد دُکھ ہو رہا ہے۔"

"پگلی۔" اُسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "اور بہت اچھی اچھی مل جائیں گی۔"

"لیکن اُن میں تم نہیں ہوگی۔"

"ہم نہیں ہوں گے، کوئی ہم سا ہوگا۔" وہ گنگنائی اور اُسے لے کر کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں امّی مل گئیں۔ انہیں دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

"کیا ہوا بیٹا؟۔ جا رہی ہو؟۔"

"جی۔" انیلا نے سلام کرنے کے بعد جواب دیا۔

"ابھی رُکو ناں۔ ویسے بھی کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔"

"بس آنٹی۔ پھر کبھی آؤں گی۔" اُس نے معذرت کی۔ پھر اُسے 'خدا حافظ' کہہ کر باہر نکل گئی۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر اُسے جاتے ہوئے دیکھا پھر امّی کو ملازمہ کے ساتھ مصروف دیکھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں آگئی۔

انیلا کے سامنے اُس نے بہت پُراعتماد ہو کر بے پناہ اطمینان کا مظاہرہ کیا تھا اور اُس کے جاتے ہی سارا اطمینان بھی رُخصت ہوگیا۔ گذشتہ کئی روز سے جو وہ یہ سوچ کر کہ 'جو ہوگا، دیکھا جائے گا'، بہت مطمئن اور مگن رہنے لگی تھی۔ اب وہ احساس بھی چھن گیا اور مسلسل ایک ہی جملے کی تکرار ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگی تھی۔

"اَب کیا ہوگا؟۔" اور وہ چاہنے کے باوجود 'جو ہوگا دیکھا جائے گا' کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن نہ کرسکی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔" دوپہر کے کھانے کے بعد حسبِ معمول جب وہ کچھ دیر سونے کی غرض سے لیٹی تو سوچنے لگی۔

"میں جب بھی مطمئن ہونے لگتی ہوں۔ اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کے لیے اپنائیت کا احساس جاگتا ہے تو کوئی ایسی بات کیوں ہوجاتی ہے، جو مجھ سے یہ احساس چھین کر یہ باور کراجاتی ہے کہ

بھی میرا نہیں۔ گذشتہ کئی روز سے میں یہ سوچ کر کہ اب مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا، کتنی مگن ...تی تھی۔ کہ آج انیلا چلی آئی۔"

"پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟۔"

وہ پھر اندیشوں میں گھرنے لگی۔

انیلا جب میرے بارے میں ثاقب حسن کو بتائے گی کہ میں اس گھر میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ ...نہیں اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟۔

کاش ثاقب حسن انیلا کی بات کو سچ مان کر خاموشی اختیار کرلے۔

کاش وہ مجھ سے تصدیق نہ کرائے۔ پتا نہیں میں اس سے یہ ساری باتیں کہہ سکوں گی یا نہیں؟۔

میرے خدا! مجھے مزید آزمائشوں میں مت ڈال۔"

وہ بہت آزردہ ہو رہی تھی اور آنے والے وقت کو سوچ کر خوفزدہ بھی۔ اور اسی طرح خوف اور ...ن میں گھری سوگئی۔

شام میں اُٹھی تو ذہن اسی طرح پریشان تھا اور دل بوجھل۔ کوئی اچھی بات سوچی ہی نہ گئی۔ اپنے ...ے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ خیال تھا نہانے سے کچھ فریش ہوجائے گی۔ لیکن ذرا بھی فرق نہیں ... آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنے آپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنی سی دیر میں چہرہ اُتر گیا تھا۔

جب پریشانیاں ہی میرا مقدر ہیں تو میں خوشیوں کا تعاقب کیوں کرتی ہوں؟۔" اُس نے سوچا اور ...ھ کر باہر نکل آئی۔ ندا ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

...س اچانک پریشانی میں اُلجھ کر اُسے یاد ہی نہیں رہا کہ اُس نے شہروز احمد کو جلدی آنے کا کہا تھا۔ ...ایدانہیں بھی یاد نہیں رہا تھا۔

لیکن نہیں۔ اُنہیں اچھی طرح یاد تھا اور وہ جان بوجھ کر نہیں آئے تھے۔ کیونکہ گذشتہ کئی روز سے وہ ...کا ایک نیا روپ دیکھ رہے تھے۔ ویسا ہی جیسا کہ وہ چاہتے تھے اور آج اُس کے کہنے کے ...وجلدی نہیں آئے تھے۔ چاہتے تھے کہ وہ اپنا حق استعمال کرتے ہوئے اُن سے بازپرس کرے، ...الڑے جھگڑے اور پھر خفا بھی ہو۔

بس اپنی اس خواہش کی تکمیل کی خاطر وہ معمول سے زیادہ لیٹ ہوئے۔ جس وقت وہ کمرے میں ...ا ہوئے وہ اُس طرح بیٹھی تھی کہ انہیں لگا جیسے ان ہی کا انتظار کر رہی ہو۔ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں ...دبا کر اُسے سلام کیا مگر اس کے اندر کا شور ہی اتنا زیادہ تھا کہ باہر کی نہ کوئی آہٹ سُنائی دی اور نہ ہی آواز۔ ...طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ وہ خفگی کا انداز سمجھتے ہوئے قدم بڑھا کر سامنے آ کھڑے ہوئے، ...ذرا سا چونکی اور یونہی کھڑی ہوگئی۔

...کیا سوچ رہی تھیں؟۔" وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

...کھڑی کیوں ہوگئیں؟ بیٹھ جائیں۔"

...کھانا۔؟۔" بس اسی قدر بولی۔

...چائے؟۔"

...پیوں گا لیکن ابھی فوراً نہیں۔"

وہ جس طرح کھڑی ہوئی تھی، اُسی طرح بیٹھ گئی۔ اُنہوں نے قدرے تعجب سے اُسے دیکھا۔ صبح سے ...مختلف لگ رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ جو اَب بات بے بات اُس کے ہونٹوں کو چھونے لگی تھی، اُس ...کا نام و نشان نہیں تھا۔ چہرے کی شادابی بھی ماند پڑ گئی تھی۔

...کیا ہوگیا ہے اسے؟۔" اپنے طور پر قیاس کرتے ہوئے جھک کر شوز اُتارنے لگے۔ اس کام سے ...ہو کر سیدھے بیٹھے تو کہنے لگے۔

"آئی ایم سوری ربیعہ۔ آپ کے کہنے کے باوجود میں جلدی نہ آسکا۔ آپ کو شاید آناں کر
تھا۔" اُس کے خاموشی سے دیکھنے پر بولے۔

"خفا ہیں؟"

"نہیں تو۔ میں کیوں خفا ہوں گی؟"

"خفگی کی بات تو ہے کہ آپ نے کہا اور میں پھر بھی نہیں آیا۔"

"شہروز احمد۔" پھر وہی اجنبیت، وہ انہیں دوبارہ اپنے خول میں بند ہوتی لگی۔ بے حد خا
سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

"میں نے شاید آپ کو بتایا تھا کہ میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتی۔"

"کسی سے بے شک خفا نہ ہوں۔ لیکن مجھ پر یہ حق استعمال کر سکتی ہیں۔" وہ ٹہیل پر ٹا
کرتے ہوئے بولے۔

"تم پر ہی تو حق نہیں ہے۔" اس نے سوچا اور اُن کے اُجلے اُجلے پیروں کو دیکھنے لگی۔

"اچھا۔ آپ چائے بنا کر لائیں۔ پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔" اُنہوں نے کہا تو وہ چپ
اُٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد چائے لے کر آئی تو وہ ڈریس چینج کر کے آرام سے بیٹھے تھے
نے خاموشی سے کپ اُنہیں تھمایا اور اپنا کپ لیے ہوئے دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک
خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ پھر وہ اُسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"ایک بات بتائیں۔ آج اس گھر میں کون سی غیر معمولی بات ہوئی ہے؟"

"غیر معمولی۔؟" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں غیر معمولی بات جو آپ کی پریشانی کا سبب بنی ہے۔"

"میں پریشان نہیں ہوں۔" وہ نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

"ربیعہ۔ میری طرف دیکھیں۔" وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ تو کہنے لگے۔

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ اپنے آپ کو تنہا مت کریں۔ کوئی بات، کوئی پریشانی ا
ہو، مجھ سے کہیں، پھر آپ کیوں نہیں کہتیں۔"

"کیا کہوں؟" وہ اُلجھ کر بولی۔ تو وہ اُٹھ کر اُس کے صوفے پر تھوڑے فاصلے سے آبیٹھے۔

"ہم نے پکی دوستی کی تھی ناں؟۔ اور دوستوں سے کوئی بات چھپایا نہیں کرتے۔"

وہ دزدیدہ نظروں سے اپنے اور اُن کے درمیان فاصلے کو دیکھنے لگی۔ بظاہر ایک یا ڈیڑھ
اور طے کرنے کا سوچو تو صدیوں کی مسافتیں۔

"ربیعہ۔" اُن کی پکار میں اصرار تھا۔ وہ اپنی ہمتیں مجتمع کر کے کہنے لگی۔

"آج انیلا آئی تھی۔ وہ میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔ میری دوست تھی اور۔ اور وہ ثا
کی بہن ہے۔"

ثاقب حسن کا نام جب بھی اُس کے ہونٹوں کو چھوتا تو بالکل غیر ارادی طور پر اُن کی پیشانی شک
ہو جاتی اور ہونٹ بھینچ جاتے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ اور وہ جو اس کی پریشانی شیئر کر
تھے، پہلے اپنے آپ کو سمجھانے لگے۔ کافی دیر بعد بس اِسی قدر کہہ سکے۔

"پھر۔؟"

"پھر یہ کہ اُسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"بظاہر تو مجھ سے ملنے آئی تھی لیکن باتوں باتوں میں اُس نے ثاقب حسن کا ذکر چھیڑ دیا تھا"

"کیا کہا ثاقب کے بارے میں؟"

پھ بھی کہا ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ یہاں اس کا ذکر ہو اور ہمارے علاوہ کوئی اور بھی اس کے
نہیں جانے۔ آپ پلیز شہروز احمد، کسی بھی طرح ثاقب حسن کو منع کریں کہ وہ میری رسوائی کا سامان
ے۔" وہ رونے لگی اور وہ خاموشی سے اُسے روتے ہوئے دیکھتے رہے۔

ربیعہ۔" اُس کے آنسوؤں نے تھمنے کا نام نہیں لیا تو انہیں ٹوکنا پڑا۔ "بس کریں، مت روئیں۔
نے آپ سے کہا تھا ناں کہ آپ پر کوئی الزام نہیں آنے دوں گا۔ تو میرا یقین کریں۔ ثاقب حسن کے
ی سے آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ خواہ کوئی علی الاعلان اُس کا نام لیتا ہوا ہی کیوں نہ اس
یں داخل ہو۔"

آپ کیا کریں گے؟" وہ بھیگی بھیگی پلکیں اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ کناروں پر پانی ٹھہرا ہوا
ع پر پھیلتا ہوا۔ دل چاہا اُس کی آنکھوں کا سارا پانی اپنی انگلیوں پر سمیٹ لیں۔ بے اختیار ہاتھ بڑھایا
لیکن پھر فوراً سنبھل گئے۔ لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

یہ میرا مسئلہ ہے، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟"

مجھے ڈر لگتا ہے۔"

کس سے؟"

پتا نہیں۔ لیکن میں ڈرتی ضرور ہوں۔"

اگر ڈرتی رہیں تو ہمیشہ اسی طرح پریشان رہیں گی۔ آج ثاقب حسن ہے تو کل کوئی اور ہو گا جس کا
آپ کو خوفزدہ کر دیا کرے گا۔"

اور کون ہو گا؟" وہ سہم کر پوچھنے لگی۔

کوئی بھی۔ ہو سکتا ہے میں۔ میرا مطلب ہے میرا نام بھی الزام بن سکتا ہے۔"

پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

وقت آپ کو سب سمجھا دے گا۔ چلیے اُٹھ کر منہ دھو کر آئیں اور اب میں آپ کو روتے ہوئے
یکھوں۔" اُنہوں نے کہا تو وہ اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ دھو کر واپس آئی تو دوبارہ اسی جگہ
گئی۔

اب جو میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنیں۔ اور میری باتوں پر عمل بھی کرنا ہے۔" وہ پیکٹ سے
یٹ نکالتے ہوئے بولے۔

جی۔" وہ پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے پہلے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگایا
و تین کش لینے کے بعد کہنے لگے۔

زندگی میں بہت سارے واقعات و حادثات ایسے رونما ہوتے ہیں، جن کے بارے میں کبھی تصو
نہیں کیا ہوتا۔ ایسی باتیں جو کبھی گمان میں بھی نہیں ہوتیں، وہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی باتوں کا سامنا
نے کے لیے گو کہ انسان پہلے سے تیار نہیں ہوتا، لیکن اُسے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ اور
ہیں کہ بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے مسلسل فرار کے راستے ڈھونڈتی ہیں۔ یاد رکھیں ربیعہ،
نا فرار چاہے گا، وہ اتنا ہی پھنستا چلا جائے گا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

یوں ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ جس راستے پر آپ کھڑی
یا کھڑی کی گئی ہیں، اُس میں کتنی دشواریاں ہیں؟۔ ہر دوسرے قدم پر ایک گہری کھائی اور ذرا سی
ت کا نتیجہ آپ سوچ سکتی ہیں کہ کیا ہو گا؟۔ آپ کو تو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے خاموش ہو کر سگریٹ کا آخری کش لیا پھر اُسے ایش ٹرے میں مسلنے کے بعد کہنے لگے۔

اپنے آپ کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی سے تیار کر لیں۔ آپ کو شاید
ہ نہیں سنے لیکن میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس سے زیادہ دشواریوں کا

سامنا کرنا ہوگا۔ اگر اسی طرح بزدلی کا مظاہرہ کرتی رہیں تو کیسے اُن دشواریوں سے نکلیں گی؟"
اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ آپ کا المیہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی کی ڈور پہلے آپ کی والدہ کے ہاتھ رہی۔ اُس کے بعد ثاقب حسن نے محبت میں کہہ لیں یا کمال ہوشیاری سے اپنے ہاتھوں میں ہوئے آپ کے دل پر ذہن پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ آپ کی اپنی کوئی سوچ نہیں۔ اگر بھی تو بہت محدود۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے ذہن کو دوسرے گرفت سے آزاد کرائیں، تب ہی آپ آنے والی دشواریوں کو قبل از وقت محسوس کر کے اُن کا سا کرنے بلکہ اُن کا مقابلہ کرنے کی تدابیر سوچ سکیں گی۔"

"آپ کا اشارہ کن دشواریوں کی طرف ہے۔؟" وہ اُلجھ کر پوچھنے لگی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی دیکھتے رہے پھر طویل سانس لیتے ہوئے بولے۔

"آئی ایم سوری ربیعہ۔ میں ان دشواریوں کی نشاندہی نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟"

"اِس کیوں کا جواب پھر کبھی زندگی میں موقع ملا تب دوں گا۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ بجائے اس کے کہ اپنے آج پر پریشان ہوں، کل کو سوچیں۔ اور کم از اندر خود فیصلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر ہی لیں۔" اُن کا اشارہ کس فیصلے کی طرف تھا، وہ سمجھ نہیں سکی۔ کہنے لگی۔

"میں آنے والے کل کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اور وہ مجھے اپنے آج سے زیادہ غیر محفوظ آتا ہے۔ اور جہاں تک اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی بات ہے، تو اس بارے میں امی یہی کہ گی کہ پہلے کسی نے مجھے فیصلے کا اختیار دیا نہیں اور اب یہ اختیار میرے پاس رہا نہیں۔"

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔" اُنہوں نے سوچا اور اُن کی نظریں اس کے جھکے ہوئے سر سے ہو ہوئی گود میں رکھے ہاتھوں پر جا ٹھہریں۔ مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پناہیں ڈھونڈتی ہولے لرز رہی تھیں۔

ایک نامعلوم سی اُداسی، سناٹا دھیرے دھیرے اُس کے وجود کا گھیراؤ کر رہا تھا۔ ایک دم بہت تنہا تنہا سی لگی۔ انہیں سچ مچ اُس پر ترس آنے لگا۔ تو اُس کے سامنے قالین پر گھٹنے ٹیک

"بی ایزی ربیعہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اُنہوں نے اُس کے لرزتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ کر حوصلہ دیا۔ تو اُس کی پلکوں پر اٹکے چند موتی ٹوٹ کر اُن کے ہاتھ کی پُشت پر آ ٹھہرے۔

"عجیب شخص ہے۔ کبھی ڈراتا ہے۔ اور کبھی حوصلہ دیتا ہے۔" اُس نے سوچا اور آہستگ سے اُن کا ہاتھ ہٹا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس نے شہروز احمد کا یقین کر لیا تھا کہ اس گھر میں اُس پر کوئی آنچ، کوئی الزام نہیں آئے گا خوا کوئی علی الاعلان ثاقب حسن کا نام لیتا ہوا کیوں نہ آ جائے اور اس یقین کے بعد وہ ایک بار پھر ہو گئی۔ وقت کو یوں بھی جیسے پَر لگ گئے تھے۔ ندا اور مہروز کی شادی قریب آ رہی تھی۔ اُس اپنے ذمّہ جو کام لیے تھے، وہ سہولت سے نپٹا دیئے تو امی اُس کی تیاری کے بارے میں پوچھ لگیں۔ وہ حیران ہوئی، اپنا تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

"بیٹا۔ تم ساتھ ساتھ اپنے کپڑے بھی لے کر درزی کو دے دیتیں تو اب تک سب تیار جاتے۔"

"ہاں۔ لیکن مجھے خیال ہی نہیں رہا۔"

"عجیب لڑکی ہو تم۔ ایسے موقعوں پر تو سب کو اپنی فکر رہتی ہے اور تم ہو کہ۔"

"لیکن امی۔ میں اور کپڑے لے کر کیا کروں گی؟ میرے پاس پہلے ہی اتنے ہیں اور ان میں کتنے تو ابھی میں نے پہنے بھی نہیں ہیں۔" وہ اُن کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔

"تو کیا تم وہ پہنو گی؟" امی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ہاں۔ وہ پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ ابھی شہروز کو فون کرو کہ شام میں جلدی فارغ ہو جائے سیدھا گھر آ جائے۔ پھر اس کے ساتھ بازار چلی جانا۔"

"جی۔" وہ سعادت مندی سے کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور ٹی وی لاؤنج میں آئی اور آفس کے نمبر ملانے لگی۔

"شہروز احمد اسپیکنگ۔" دوسری بیل پر ریسیور اُٹھنے کے ساتھ ہی اُن کی آواز سُنائی دی۔

"میں۔ ربیعہ۔" فوراً وہ یہی کہہ سکی۔

"جی فرمائیے۔"

"فرمانا نہیں عرض کرنا ہے۔ پہلے یہ بتائیے آپ مصروف تو نہیں۔"

"نہیں۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔"

"کوئی لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ بس یہ کہ امی کہہ رہی ہیں آپ شام میں ذرا جلدی آ جائیے گا۔" اُس نے امی کا نام لے دیا۔

"کیوں؟" وہ شاید اُس سے بات کرنے کے موڈ میں تھے، اس لیے پوچھ گئے ورنہ پہلے تو کبھی نہیں پوچھا تھا۔ 'او کے' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا کرتے تھے۔

"ہو گا کوئی کام جب ہی بُلایا ہے۔"

"امی کو بُلائیں، میں اُن سے پوچھ لیتا ہوں، کیا کام ہے؟"

"ارے نہیں۔ اُن سے نہیں پوچھنا ہے۔" وہ گھبرا گئی اور اُس کی گھبراہٹ محسوس کر کے اُنہوں نے بے ساختہ ہنسی کو بمشکل روکا۔

"امی سے نہیں پوچھنا، تو پھر کس سے پوچھنا ہے؟"

"مجھ سے۔" وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"لیکن ابھی تو آپ نے لاعلمی ظاہر کی تھی کہ اُنہیں کوئی کام ہو گا، جب ہی بلایا ہے۔"

"اُفوہ۔ آپ جرح بہت کرنے لگے ہیں۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔" وہ رہائی نہ پا کر مجبوراً بولی۔

"خبردار۔" اُنہوں نے رعب سے کہا۔ "پہلے بتائیے کیا کام ہے؟"

"مجھے ندا کی شادی کے سلسلے میں کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" وہ کچھ جھجک سی گئی۔

"کس کے لیے؟"

"اپنے لیے۔"

"اپنا خیال آ گیا آپ کو؟"

"مجھے اپنا خیال تھا لیکن انتظار میں تھی کہ کوئی اور خیال کرے۔"

"اور کون؟" اُنہوں نے جبراً کہا۔

"تم۔ تم۔ تم۔" دھڑکنوں نے شور مچا دیا اور اُنہوں نے یہی ایک لفظ سُننے کے لیے اپنا سانس روک لیا۔ کہیں کوئی آواز نہ ہو، کوئی آہٹ نہ ہو۔ فقط ایک لفظ اُس کے ہونٹوں سے چھو کر ان فضاؤں میں گیت بن کر بکھر جائے۔

"تم۔ تم۔ تم۔"

کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے۔ اُن کے کان منتظر تھے اور وہ بزدل لڑکی اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر سکی کہ دھڑکنوں میں اُٹھتے شور کو زبان دے سکتی۔ بہت آہستگی سے ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"میرے خدا — یہ میں کن راہوں پہ چلنے لگی ہوں۔ اگر شہروز احمد کو خبر ہو جائے تو پتا نہ سوچیں —" بقیہ سارا دن وہ اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہ شہروز جب آئے اس وقت سہ پہر ابھی پوری طرح نہیں ڈھلی تھی۔ انہوں نے آتے ہی ہونے کے لیے کہا اور خود امّی کے پاس جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ آئی تو اُسے دیکھتے ہوگئے۔ امّی سے اجازت لے کر اُس کے ساتھ باہر آئے تو وہ کہنے لگی۔

"آپ کچھ دیر آرام کر لیتے۔"

"نہیں بس ٹھیک ہے۔" اُس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر دوسری طرف سے سیٹ سنبھال لی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

دھیمے دھیمے سُر دِل کے تاروں کو چھیڑنے لگے تھے۔ کوئی خوبصورت ساگیت پتا نہیں انہوں لگا دیا تھا — یا خاص طور پر اس کے لیے — وہ سمجھ نہیں سکی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک خلش دِل میں جاگنے لگی تھی۔

"اے کاش —" انجانی خواہشات گھیراؤ کرنے لگیں "یہ سفر یونہی جاری رہے — کہیں ایک لیے بھی نہ رُکے۔ زندگی کی گاڑی کی طرح یہ گاڑی بھی یونہی ہمیشہ چلتی رہے — ماہ و سال بیت جا پھر صدیاں۔ کبھی جو مسافتوں کی تھکن اُتارنے کے لیے پل بھر کو کہیں رُکیں تو کوئی ہمیں منزل کی نوید دے کہ رُوح تک میں اُتری ساری تھکن پل میں اُتر جائے۔"

گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو وہ چونک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی — پھر اپنی طرف کا شیشہ نیچے اُتر آئی۔ وہ گاڑی لاک کر کے اُس کے پاس آئے تو کہنے لگے۔

"اب پوچھ سکتا ہوں، آپ کو کیا لینا ہے؟" ہونٹوں پر مُسکراہٹ مچل رہی تھی اور آنکھوں "فکر مت کیجیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لوں گی —" اس کے ساتھ ہی وہ بڑھا گئی۔

"ربیعہ —" وہ اس کے ہم قدم ہوتے ہوتے سنجیدگی سے کہنے لگے "اپنی حیثیت کا تعین اپنے تعلق کو سامنے رکھ کر کیجیے گا۔ اِس وقت آپ ربیعہ اکرام علی نہیں، ربیعہ شہروز احمد ہیں۔" ہونٹ دانتوں میں دبا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن دیکھ کر وہ کہنے لگے

"اگر آپ کو میری پسند پر اعتراض نہ ہو تو آپ کی شاپنگ میں اپنی مرضی سے کرلوں۔"

اُس نے سوچا، اچھا ہے وہ خود سے کچھ کہنے سے بچ جائے گی۔ اثبات میں سر ہلا کر ساتھ چل پڑی۔ پھر سارا وقت انہوں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے اس کا مو یا وہ جھنجھلائے۔ خود ہی کبھی سوٹ پسند کرتے، کبھی ساڑی۔ اور پیک کروانے سے پہلے پوچھتے 'ٹھیک ہے' اور وہ سر ہلا دیتی۔ شام سے رات ہوگئی۔ وہ ان کے ساتھ چلتے چلتے اور ان کا واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں لگ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے پورا بازار خرید ڈالیں گے۔

"بس اب واپس چلیں —" وہ قدم روک کر کھڑی ہوگئی۔

"ابھی سے — ؟"

"میرے خدا — چار گھنٹے ہوگئے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں ابھی سے — بس اب چلیں، گئی ہوں —"

"سوچ لیں، کوئی چیز رہ تو نہیں گئی ؟"

"نہیں —"

"چلیں پھر —" انہوں نے اپنی گاڑی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں پھر ایک طرف چل پڑے۔

"اور کہیں جانا ہے ؟" وہ گاڑی احتیاط سے نکال کر مین روڈ پر لاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"نہیں آپ سیدھا گھر چلیں —" انہوں نے ایک نظر اُسے دیکھا پھر کہنے لگے۔

"میں نے سُنا تھا خواتین شاپنگ کرتے ہوئے بہت خوش نظر آتی ہیں لیکن آپ کا موڈ مسلسل خراب رہا۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میرا موڈ خراب رہا ؟"

"میرا خیال ہے میں دیکھ سکتا ہوں اور محسوس بھی کر سکتا ہوں۔"

"اچھا —" وہ ہلکے سے ہنسی۔

"آپ کی ہنسی میری بات کا جواب نہیں۔"

"کون سی بات ؟" وہ انجان بنی۔

"یہی کہ آپ کا موڈ خراب رہا —"

"آپ کا وہم ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"چلیے مان لیتا ہوں —" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے "صبح فون پہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اپنا خیال تھا لیکن اس انتظار میں تھیں کہ کوئی اور خیال کرے۔ 'کوئی اور' کی نشاندہی کریں گی ؟"

کاش وہ نشاندہی کر سکتی — لیکن یہ خیال زیادہ زور آور تھا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کریں گے، اس لیے 'نہیں' کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اور پھر انہوں نے بھی مزید کوئی بات نہیں کی — وہ سفر جسے وہ طویل کرنا چاہتے تھے۔ اسپیڈ بڑھا کر منٹوں میں طے کر لیا۔ گھر کے سامنے گاڑی روکی تو وہ ان سے پہلے اُتر کر اندر آگئی —

اُس کی زندگی میں بڑا عجیب سا موڑ آگیا تھا — سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا کرے — شہروز احمد کے التفات کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ کبھی سوچتی شاید وہ اسی کے انداز میں سوچتے ہوئے بقیہ زندگی اس کی ہمراہی میں گزارنے کے متمنی ہیں — اور کبھی خیال آتا، سب دھوکا ہے — محض اِس خیال سے کہ امّی کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑے — اس کا اتنا خیال رکھنے لگے ہیں۔ بہرحال ان کے دل کا حال نہیں جانتی تھی۔ لیکن اپنے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اب ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ اختیار چھیننے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

"کاش کوئی تو ہو —" وہ اکثر سوچنے لگی تھی۔ "جو مجھے اس بیچ منجدھار سے نکال لے۔ کوئی ہو جس سے میں اپنا احوال کہہ سکوں" اور کوئی نہیں تھا۔

ایک بار شہروز احمد نے کہا تھا کہ انسان کو ہر دور میں کسی دوست، غمگسار اور ہمراز کی ضرورت رہتی ہے اور آپ نے تو ربیعہ اپنے آپ کو تنہا کر لیا ہے —"

ٹھیک کہا تھا انہوں نے، اور پھر انہوں نے اس کے ساتھ پکی دوستی کی تھی کہ آئندہ وہ انہیں اپنی پریشانی — اور کوئی بھی مسئلہ ہوگا تو کہہ سُنائے گی اور وہ انہیں بتانے بھی لگی تھی لیکن اب جو مسئلہ اُسے درپیش تھا، وہ پکی دوستی کے باوجود ان سے نہیں کہہ سکتی تھی — خود اپنے منہ سے کیسے کہہ دیتی کہ — "شہروز احمد — ہمارے درمیان جو رشتہ کچے دھاگے سے بندھا ہے۔ اسے مضبوط ڈوری سے باندھ دو۔ میں تم سے دُور جانا نہیں چاہتی — مجھے یہیں رہنے دو اپنے پاس۔"

خودداری بھی کوئی چیز ہے — دل لاکھ تڑپتا مچلتا رہے وہ خواہشات کے آگے بند تو باندھ سکتی تھی۔ انہیں دل کے اندر دفن بھی کر سکتی تھی لیکن خودداری کا جنازہ نکالنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

اس وقت وہ گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ امّی کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے

اسے بھی چلنے کے لیے کہا تھا لیکن وہ سر درد کی وجہ سے نہیں جا سکی تھی۔ امّی نے جاتے جاتے اسے تاکید کی تھی کہ وہ آرام کر لے اور وہ اس وقت سے اپنے کمرے میں لیٹی اپنے ساتھ ہونے والے حالات کو سوچ رہی تھی۔ دروازہ ہلکی سی دستک کے بعد کھلا تو اُس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ آنے والی ملازمہ تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بی بی! ثاقب صاحب کا فون آیا ہے۔" ملازمہ نے کہا تو فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی، پوچھا "کون ثاقب؟"

"پتا نہیں جی، وہ اپنا نام یہی بتا رہے ہیں۔ ثاقب حسن۔" ملازمہ نے سوچتے ہوئے بتایا لیا تو وہ چونک گئی۔

"تم نے کیا کہا اُن سے؟"

"میں نے انہیں بتایا ہے کہ گھر میں صرف آپ ہی ہیں۔"

"پھر۔؟" وہ ملازمہ سے استفسار کر رہی تھی۔ بلا سوچے اور سمجھے۔

"وہ کہنے لگے۔ بڑا ضروری پیغام دینا ہے، آپ ہی سُن لیں۔"

"اچھا۔ تم فون یہیں اُٹھا لاؤ۔" ملازمہ کے سامنے اُس نے سرسری انداز اختیار کیا جب کہ اندر ڈرنے لگی تھی۔ پھر اُس نے سوچا، یہ اچھا موقع ہے۔ کوئی ہے بھی نہیں، وہ ثاقب حسن سے صاف بات کرنے کے بعد منع کر دے کہ آئندہ اسے فون نہ کرے وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔

ملازمہ آئی تو اُس نے فون لے کر اسے جانے کے لیے کہا۔ اور جب وہ کمرے سے نکل گئی تو اُس نے ریسیور کان سے لگا کر ہلکی آواز میں کہا۔

"ہیلو کون۔؟"

"میں ہوں ربیعہ۔ ثاقب۔"

"کیسے ہو؟" بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"تمہارے اس سوال کا ایک ہی جواب ہوا کرتا ہے میرے پاس کہ تم بن اُدھورا ہوں۔"

اُس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

"ابھی ملازمہ نے بتایا تھا کہ گھر میں اس وقت صرف تم ہی ہو۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ تم سے تفصیلی بات ہو سکے گی۔"

وہ تھوک نگل کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"اس سے پہلے میں نے کئی بار فون کیا لیکن بات نہ ہو سکی بلکہ تم نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ بات نہیں کر سکتیں اور تمہارے اس جواب نے مجھے بہت ڈسٹرب کیا۔ ہیلو ربیعہ۔ تم سُن رہی ہو ناں۔"

"ہاں۔" ہاں کی صورت اُس کے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔

"تم بولتی کیوں نہیں؟ تمہاری خاموشی میرے اندر جنم لینے والے خدشات کو سچ ثابت کرنے لگی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ، تم کسی پریشانی کا شکار تو نہیں۔ کوئی مسئلہ یا پھر کوئی ایسی بات جو۔" آگے بولنے سے رُک گیا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ گئی۔

"اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر تم نے اپنا رویّہ کیوں بدل لیا ہے؟ میرا مطلب ہے میرے ساتھ۔" کچھ دیر رُک کر اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ تردید کرے۔ کہہ دے "تمہارا خیال غلط ہے۔" لیکن وہ خاموش تھی۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"تو میرے خدشات صحیح ہیں کہ تم نے میری جگہ شہروز احمد کو دے دی ہے۔ مجھے جب بتایا کہ تم نہ صرف یہ کہ گئے دنوں سے مکمل طور پر ناتا توڑ چکی ہو بلکہ اب بے حد خوش بھی ہو تو

اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا لیکن۔" لمحہ بھر رُک کر کہنے لگا۔ "بہر حال میں ان ساری باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن تم سُن لو کہ تمہارا اور میرا سنجوگ آسمانوں پر لکھا ہے۔ میں نے یہ بن باس صرف تمہارے لیے قبول کیا تھا کہ جلد سے جلد تمہیں پا سکوں اور کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں نے تمہارا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا تھا کہ یہ ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔ اور میں اپنے وعدے کا پکا ہوں۔"

"ثاقب حسن۔" اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے دل میں تمہاری محبت اب بھی اسی شدت سے زندہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی آنچ تم تک بھی ضرور پہنچتی ہوگی۔ پھر تم ربیعہ سراب کے پیچھے کیوں بھاگنے لگی ہو۔ شہروز احمد سراب ہی تو ہیں۔ یاد رکھو شہروز احمد کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار تو سکتے ہیں لیکن ایک عمر کی رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں تمہارے دل کی تختی پر میرا نام لکھا جا چکا ہے اور دھڑکنیں اسے شمار بھی کرتی ہیں۔ تمہاری آنکھیں بارہا میرے خواب سجا چکی ہیں۔ اور تم اپنے ہونٹوں سے اقرارِ محبت کے ساتھ پیمان بھی باندھ چکی ہو اور کوئی مرد اِتنا جی دار نہیں ہوتا۔ جو یہ ساری باتیں جاننے کے بعد بھی سائبانی میسّر کرے۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔ مرد بہت کم ظرف ہوتا ہے خود جو مرضی کرتا پھرے لیکن شریکِ حیات کے بارے میں اس کا تصور ہمیشہ اَن دیکھی اَن چھوئی کلی کا ہوتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔ اگر شہروز احمد نے تمہیں کوئی خواب دکھانے کی کوشش کی ہے تو آنکھیں بند کر کے ان کا یقین مت کر لینا۔ پہلے یہ ساری باتیں ضرور سوچنا۔ کب تک وہ تمہارے ماضی سے نظریں چرائیں گے۔ سال دو سال، اس کے بعد۔"

"پلیز ثاقب حسن۔" اُس نے ٹوک دیا۔

"کیوں؟ کیا میری باتیں بہت بُری لگ رہی ہیں۔؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ تم نے ساری باتیں خود سے فرض کر لی ہیں ورنہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم خواب دکھانے یا سجانے کی بات کرتے ہو جب کہ شہروز احمد نے تو کبھی اس حد کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کی جو اوّل روز سے اُن کے اور میرے درمیان قائم ہوئی تھی۔"

"پھر تمہارا رویّہ مجھ سے اتنا اُکھڑا اُکھڑا سا کیوں ہے؟"

"یہ میری مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟"

"تم خود سمجھ سکتے ہو اور تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نام نہاد بندھن کے متعلق صرف شہروز احمد ہی جانتے ہیں۔ اُن کے علاوہ کسی کے علم میں یہ بات نہیں ہے اور میں چاہتی بھی نہیں کہ کسی کو معلوم ہو۔ ایسے حالات میں تم ہی بتاؤ جب گھر کے دوسرے افراد کے سامنے تمہارا فون آئے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تو کیا؟"

"ہاں بس اتفاق تھا کہ جب بھی تمہارا فون آیا، کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود تھا۔ اس لیے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں بات نہیں کر سکتی۔" اُس نے جھوٹ بولا۔

"اور جو انیلا نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔" وہ مکمل اطمینان چاہتا تھا۔

"ہاں انیلا سے میں نے ایسی ہی باتیں کی تھیں جو اُس نے تم تک پہنچائیں کیونکہ میرا خیال تھا مجھے ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔"

"تمہارا خیال تھا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنا پریشان ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ثاقب حسن؟" وہ اندر کی تلخی کو بمشکل لہجے میں اُترنے

سے روک سکی۔

"پریشانی کی بات تو تھی۔"

"نہیں ثاقب حسن۔" اُس نے مزید اپنے آپ کو کچھ کہنے سے باز رکھنے کی خاطر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا ورنہ دِل تو چاہ رہا تھا صاف کہہ دے۔ "تم میرے گرد اتنا مضبوط جال بُن گئے ہو کہ جس میں سے نہ میں خود نکل سکتی ہوں اور نہ کوئی مجھے نکال سکتا ہے۔"

"آئی ایم سوری ربیعہ۔" اُس کے لہجے میں ندامتیں سمٹ آئی تھیں۔ "میں نے تم پر شک کیا۔ مجھے معاف کر دینا پلیز۔ اصل میں تم سے دُوری نے مجھے بہت وہمی بنا دیا ہے۔ ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو جائے اور ویسا نہ ہو جائے۔ بہرحال تم نے میرے سارے خدشات دُور کر دیے ہیں اور میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کسی خدشے کو دل میں جگہ نہیں دوں گا۔"

وہ خاموش رہی۔

"سنو۔ تم خفا تو نہیں ہو ناں؟"

"نہیں۔ تم جانتے ہو، مجھے رُوٹھنا نہیں آتا۔"

"جانتا ہوں لیکن مجھ سے رُوٹھ سکتی ہو مگر ابھی نہیں جب تمہارے سامنے آؤں تب' تاکہ منانے میں آسانی ہو۔" وہ خوشدلی سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے رُوٹھنے نہ دینا۔ کیونکہ اپنے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اگر ایک بار رُوٹھ گئی تو پھر نہیں مانوں گی۔"

"میں تمہارا یقین غلط ثابت کر دوں گا۔ اچھا اب اجازت دو۔" اور وہ جیسے انتظار میں تھی۔ فوراً 'خدا حافظ' کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ ایک دم ہر طرف جیسے خاموشی چھا گئی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ اور پھر خاموشی میں اُبھرتی اُس کی آواز کی بازگشت۔

"یاد رکھو ربیعہ۔ شہروز احمد کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار تو سکتے ہیں لیکن ایک عمر کی رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔"

"میرے خدا۔" اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمہارے دل کی تختی پر میرا نام لکھا ہے اور کوئی مرد اتنا جی دار نہیں ہوتا جو یہ ساری باتیں جاننے کے باوجود بھی سائبانی میسّر کرے۔"

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا۔ اور پھر روکتے روکتے بھی پلکوں سے نیچے چھلکنے لگا تھا۔ کچھ وقت پہلے وہ سوچ رہی تھی۔ کوئی تو ہو جس سے وہ اپنا احوال کہہ سکے جو اسے بیچ منجدھار سے نکال لے۔ کوئی ہمدرد۔ غمگسار، کوئی ہمراز مگر کوئی نہیں تھا۔

لیکن نہیں، شاید وہ بھول گئی تھی، ایک ہمراز تھا ثاقب حسن۔ جس نے ابھی ابھی اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔ وہ ساری باتیں جنہیں یا تو اُس نے سوچا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی بہرحال حقیقت وہی تھی جو ابھی ثاقب حسن نے کہی تھی کہ کوئی مرد اتنا جی دار نہیں ہو سکتا۔

"ثاقب حسن، تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کتنے بہت سارے دن بیت گئے۔ خواب سجانے تو وہ عرصہ ہوا چھوڑ ہی چکی تھی اور اب سراب کے پیچھے بھاگنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ شہروز احمد اس کے لیے کس انداز سے سوچتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جی داروں کی فہرست میں سب سے اُوپر شہروز احمد اپنا نام لکھ چکے ہیں۔

اُس نے ثاقب حسن کی کہی بات کو حقیقت جان کر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اس کی حیثیت شہروز احمد کے نزدیک خوبصورت کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکی تھی۔ جبھی تو اپنے گرد بُنے جال اور اس کی مضبوطی کو اِتنی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ اگر اس

کے دل میں اس جال سے نکلنے کی کوئی خواہش تھی بھی تو دم توڑ گئی تھی۔ اور ایک بار پھر وہ اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہوئے دوبارہ اسی پرانے حصار میں مقید ہو گئی۔ جہاں اس کے سارے احساسات پر برف کی تہیں جم گئیں۔ جیسے شہروز احمد کی نگاہوں کی تپش بھی نہ پگھلا سکی۔ وہی تکلف، وہی جھجک اور وہی ہر بات میں دامن بچا لینا۔ یہاں تک کہ گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اُٹھے۔

دُوسرے شہروں میں رہنے والے عزیز رشتہ دار شادی میں شرکت کے لیے آئے تو ظاہر ہے اُن کے لیے رہنے کا انتظام گھر میں ہی کیا گیا۔ کچھ دن پہلے سے ہی گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور گھر ایک دم بھرا بھرا لگنے لگا تھا۔ یہاں ایک بار پھر شہروز احمد کو بار بار وہی جملے بولنے پڑے جو ابتدائی دنوں میں کہا کرتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"اتنی لاتعلق سی کیوں ہیں؟"

"سب لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے؟" وغیرہ وغیرہ اور اسے پتا نہیں پروا نہیں تھی کہ سب اس کے بارے میں کیا سوچیں گے یا احساس نہیں تھا جو وہ شہروز کے جھنجھلانے اور خفا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ان سب میں شامل نہ کر سکی۔ رات میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گاتیں تو وہ الگ تھلگ سی بیٹھی بس انہیں دیکھتی رہتی۔ یہ خیال بھی آتا کہ ایسا ہی ہنگامہ امّاں کے گھر بھی ہوگا۔

کتنا ارمان تھا اسے چھوٹی آپا کی شادی کا اور اُس نے سوچا تھا کہ ان کی شادی میں بھرپور خوشی منائے گی لیکن اب اتفاق ایسا تھا کہ چھوٹی آپا کی شادی اسی گھر میں ہو رہی تھی اور اس گھر کی بڑی بہو ہوتے کے ناتے اسے یہیں سے شرکت کرنی تھی۔ ایک بار اُس نے دبے لفظوں میں شہروز سے کہا بھی کہ وہ امّاں کے گھر چلی جاتی ہے لیکن انہوں نے نرمی سے سمجھا دیا کہ اس گھر میں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔

چھوٹی آپا کی مہندی لے کر جب وہ سب کے ساتھ امّاں کے گھر گئی تو ایک دم سے ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر وہ صرف چھوٹی آپا کی بہن بن گئی۔ اور اُس وقت تو شہروز کی کزنز حیران رہ گئیں، جب وہ کلثوم اور ہما کے ساتھ مل کر گانے کے ساتھ ساتھ ان سب پہ ہوٹنگ کرنے لگی تھی۔ واپسی میں سب نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔

"واہ بھابی۔ آپ تو چھپی رستم نکلیں۔"

"کمال ہے۔ میں تو سمجھی تھی، آپ کو گانا بالکل نہیں آتا ہوگا، جبھی ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔"

"اب پتا چلا، آپ کو دیور سے زیادہ بہن کا خیال تھا۔"

سب اُس کے گرد گھیرا بنائے اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہی تھیں۔ اور وہ نروس ہو کر راہِ فرار ڈھونڈ رہی تھی۔ شور سن کر شہروز اس طرف آئے اور اُسے لڑکیوں کے گھیرے میں پریشان کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"خیریت۔۔؟"

"بالکل خیریت نہیں ہے۔ وہ بھی آپ کی ربیعہ کی۔" ان کی چچازاد حنا نے شوخی سے کہا تو وہ اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے ربیعہ؟"

"اِن سے نہیں، ہم سے پوچھیں۔" شہلا انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی۔ "ہم اتنے دنوں سے بھابی سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمارے ساتھ گائیں لیکن انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ یوں پوز کرتی رہیں، جیسے انہیں گانا آتا ہی نہ ہو۔ لیکن اپنے گھر جاتے ہی یہ ہمیں چھوڑ کر اپنی بہنوں کے ساتھ مل گئیں۔ اور نہ صرف گانے گائے بلکہ ہم پہ ہوٹنگ بھی کی۔"

"اچھا۔" اُنہوں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "پھر اب آپ سب ان سے کیا چاہتی ہیں؟"

"ہم ان سے گانا سنیں گے۔" سب کورس کے انداز میں بولیں۔

"لیکن مجھے گانا نہیں آتا۔" وہ بے بسی اور مدد طلب نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"واقعی ربیعہ کو گانا نہیں آتا۔" انہوں نے کہا تو سب اُن کے پیچھے پڑ گئیں۔

"جی ہاں، آپ اِن کا ساتھ نہیں دیں گے تو کون دے گا۔ چلیے اب آپ گانے میں بھی اِن کا ساتھ دیجیے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب آپ سمجھتے ہیں۔ چلیں بیٹھیں۔" وہیں قالین پر انہیں بٹھا کر باقی سب بھی دائرے کی شکل بیٹھ گئیں۔ اور ہلکے ہلکے تالیاں بجانے لگیں۔ تالیوں کی آواز سُن کر مہروز جو اپنے کمرے میں چچازاد اور ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ بیٹھا تھا، سب کو لے کر نکل آیا۔ اور وہ جو اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی، ان سب لڑکوں کو دیکھ کر پھر ہمت ہار بیٹھی۔

"میں نہیں گاؤں گی۔" سرگوشی میں وہ بولی۔

"گانا تو پڑے گا۔ ورنہ یہ سب چھوڑیں گے نہیں۔" انہوں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

"یہ آپ دونوں کیا سازش کر رہے ہیں؟ جلدی سے شروع کریں۔" شہلا انہیں سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر زور سے بولی۔ تو وہ مسکراتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے ہی شروع کیا۔

ع زندگی کی نہ ٹوٹے لڑی، پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی

اُس کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اِسے گانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ اتنی نروس ہو رہی تھی ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی

پھر اُسے اشارہ کیا تو اپنی بے بسی پر اُس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔

اُن آنکھوں کا ہنسنا بھی کیا، جن آنکھوں میں پانی نہ ہو

شہلا کے کہنی مارنے پر وہ ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئی۔

وہ جوانی، جوانی نہیں، جس کی کوئی کہانی نہ ہو
جینے مرنے کی کس کو پڑی، پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی
پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی
آج سے اپنا وعدہ رہا، ہم ملیں گے ہر اک موڑ پر
دل کی دُنیا بسائیں گے ہم غم کی دُنیا کا در چھوڑ کر

ٹوٹ جائے گی ہر ہتھکڑی پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی
پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی

بے تحاشا تالیوں کے ساتھ 'واہ واہ' ہونے لگی اور وہ موقع غنیمت جان کر اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ دل پھر حقائق سے نظریں چُرا کر انجانے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ لیکن وہ بار بار دل کا کہا نہیں مان سکتی تھی۔ اس کے تڑپنے مچلنے کے باوجود اپنے حصار سے نہیں نکلی۔

"چار دن کی چاندنی سے اپنے من میں اُجالا کرنے سے کیا فائدہ جب کہ آگے وہی اندھیری راتیں ہوں" اُس نے سوچا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔ اسے یاد آیا ایک بار شہروز احمد، چھوٹی آپا سے کہہ رہے تھے "خوشیاں مقدر سے مِلا کرتی ہیں اور جب کوئی خوشی دروازے پر دستک دے تو دروازہ بند نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں کیوں دروازہ بند کر رہی ہوں؟" اُس نے سوچا۔ "باہر ایک نہیں ڈھیروں خوشیاں میری منتظر ہیں۔ سب لوگوں کی بے حد وحساب محبتیں اور مجھے خاص اہمیت دینا۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو

دیکھ کر اپنے آپ پر رشک کرتی۔ پھر میں اتنی آزردہ کیوں ہو رہی ہوں؟ کیوں نہیں بڑھ کر اپنے دامن میں ساری خوشیاں سمیٹ لیتی۔ کون جانے پھر کبھی ایسے لمحات زندگی میں آئیں گے بھی کہ نہیں۔"

اس نے کروٹ بدل کر اندھیرے میں دروازے پر نظریں جما دیں۔ سٹنگ روم سے سب کے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ سب بے حد محبت کرنے والے اچانک اس پر ہنسنے لگے ہوں۔ اُس کے گرد بُنے جال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور پھر اُونچے اُونچے قہقہے۔

"میرے خدا۔" وہ تکیے پر بے بسی سے سر پٹختے ہوئے اپنے اندر اُٹھتی درد کی لہروں سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

پھر اگلے دو دن بے حد مصروفیت میں گزرے۔ وہ بہت خاموشی سے گھر کے اندر کے چھوٹے موٹے کام کرتی رہی۔ مہمانوں کا خیال رکھنا، اپنی نگرانی میں اُن کے کمروں کی صفائی اور پھر کچن میں دیکھنا۔ کبھی کسی وقت سب لڑکیاں اُسے اپنے پاس بٹھاتیں بھی تو وہ بس کچھ دیر کو اُن کا ساتھ دیتی پھر کسی کام کا بہانہ کر کے اُٹھ جاتی۔

اس کا وجود گہری خاموشیوں کی زد میں تھا۔ بظاہر بہت پُرسکون نظر آتی تھی لیکن اگر کوئی اس کے اندر جھانک کر دیکھتا تو جانتا کہ وہ کتنے طوفانوں میں گھری ہے اور کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ سب اپنے آپ میں مگن اور مصروف۔ شام میں کیا پہننا ہے؟ کون سے پارلر جانا ہے؟ ہر ایک کو یہی فکر تھی۔ وہ ساری افراتفری۔ لڑکیوں کا ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگنا دیکھتی رہی۔ کبھی وقت کوئی اس کے قریب رُک کر پوچھتی۔

"بھابی۔ آپ شام میں کیا پہنیں گی؟" اور اس کا جواب سُنے بغیر غائب۔ جیسے پوچھنا فرض تھا۔ جواب سے کوئی غرض نہیں۔

اور ان بہت سارے لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو۔۔ بے پناہ مصروفیت کے باوجود اس سے باخبر تھا۔ اُس کے ہر پل سے آگاہ۔ جبھی تو بارات جانے سے کوئی دو گھنٹے پہلے وہ اپنا ہر کام چھوڑ کر اس کے پاس چلے آئے۔ وہ اس وقت شہلا کے بال بنا رہی تھی۔

"ربیعہ۔ میرے ساتھ آئیں۔" انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ابھی آتی ہوں۔" وہ جلدی جلدی شہلا کے بالوں میں پنیں لگانے لگی۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا پھر اُسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

"دوسروں کا بہت خیال ہے آپ کو؟" کمرے میں آتے ہی کہنے لگے۔

"جی۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"اسی حلیے میں بارات کے ساتھ جائیں گی؟" وہ شہادت کی انگلی اُٹھا کر اُس کے سراپے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"نہیں تو۔" وہ بوکھلا کر فوراً کہہ گئی۔

"پھر اب تک تیار کیوں نہیں ہوئیں؟"

"ابھی تو بہت وقت ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"صرف دو گھنٹے۔" انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی اس کے سامنے کی۔ "اور کیا اتنا وقت آپ کو تیاری کے لیے نہیں چاہیے؟"

"میرا خیال ہے، میں جلدی تیار ہو جاتی ہوں۔ یعنی بہت کم وقت میں۔"

"جی ہاں۔ آپ کی کم وقت کی تیاری میں دیکھ چکا ہوں۔ اور اس وقت آپ شاپنگ کے لیے نہیں جا رہی ہیں بلکہ۔"

"اُفوہ۔ آپ میری فکر کیوں کرتے ہیں؟" وہ خوامخواہ جھنجھلا گئی۔ وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"سچ کہیں، کیا آپ کے اندر یہ خواہش نہیں تھی کہ کوئی آپ کی فکر کرے۔؟"
اُس کے اندر اُٹھتے سارے طوفان جو یقیناً اُس کی ہستی کو مکمل طور پر توڑ دینے کے درپے اچانک ٹھہر گئے۔ اور وہ پوری آنکھیں کھولے بے خیالی میں اُن کی طرف دیکھے گئی۔

"مجھے آپ کی فکر ہے۔" وہ کہنے لگے۔ "اور آپ صرف ایک بات کا خیال رکھ لیں کہ آج آپ کو صرف میرے حوالے سے دیکھیں گے، تو پلیز مہروز کی شادی پر مسز شہروز احمد کو جیسا نظر چاہیے، آپ۔" وہ بات پوری کیے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ اُس نے بہت خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی تھی۔

پھر جب باہر جلدی جلدی کا شور مچنے لگا، تب وہ پوری سج دھج کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ اس وقت اپنے چچا جان کے ساتھ مل کر مہروز کو سہرا باندھ رہے تھے، اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

اوّل روز وہ اسی روپ میں اُنہیں اپنے بیڈروم میں نظر آئی تھی۔ اور اس وقت کیونکہ دل میں یہی خیال تھا کہ وہ ان کے دوست کی امانت ہے، اس لیے بہت سرسری انداز میں اُسے دیکھا تھا اب اگر دوست کا خیال تھا بھی تو اس سے کہیں زیادہ اپنی خواہشات تھیں جنہوں نے دوسرے ہر خیال پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ دل کے آس پاس گھنٹیاں بجنے لگیں تو وہ اپنا کام چھوڑ کر بے اختیار اُ کی طرف لپکے۔

"تھینک یو۔" اُس کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں بولے اور وہ ہمیشہ کی طرح نروس نہیں ہوئی مسکرا کر ان کا شکریہ قبول کیا۔ اصل میں تیار ہوتے ہوئے وہ مسلسل اپنے گرد کھنچا حصار توڑ کی کوشش کرتی رہی تھی، سوچا۔

"یہ جو کچھ وقت میری دسترس میں ہے، کیوں نہ اسے امر کر دوں۔ ایک بے ضرر سی خواہش ہے شہروز احمد کی کہ مجھے سچ مچ اُن کی مسز نظر آنا چاہیے۔ اور یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں ہے جو میں مان نہ سکوں۔ آخر وہ بھی تو مجھے برداشت کر رہے ہیں۔" یہی سب سوچتے ہوئے اُس نے اپنے گرد کھنچا حصار بالآخر توڑ ہی ڈالا۔ اور کمرے سے نکلنے سے پہلے یہ تہیہ بھی کیا تھا کہ کسی قدم ڈگمگائے گی نہیں، جبھی اب اُن کے تھینک یو کہنے اور والہانہ نظروں سے دیکھنے پر ہلکے سے مسکرا

"ایک بار پھر شکریہ اور اب آگے بڑھ کر مہروز سے اپنا نیگ وصول کریں جیسے آپی اور ند کر رہی ہیں۔" وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی سب کے درمیان میں سے راستہ بناتی ہوئی آپی اور ند کے ساتھ شامل ہو گئی۔

پھر اگلے تین چار دن میں اس نے خوب انجوائے کیا۔ چھوٹی آپا امّاں کے گھر سے وداع کر یہاں آگئیں۔ اگلے دن ولیمے کی تقریب ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی، جہاں سے ندا رُخصت ہو کر سسرال سدھاری۔ یوں اپنے والد کے بعد سے جو ذمّہ داریاں شہروز احمد کے کندھوں پر آ پڑی تھ ان سے وہ بہت احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو گئے۔ کچھ دن تک گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہا جب زندگی معمول پہ آئی تو ایک نئی اُلجھن اُس کی منتظر تھی۔ جسے وہ شادی کے ہنگاموں اور مہمانو کی آمدورفت کی وجہ سے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اور اب جب فراغت ملی تو اُس نے نہ صرف محسو کیا بلکہ خاص طور پہ کئی دن تک نوٹ بھی کرتی رہی۔ کہ

مہروز کچھ بجھا بجھا سا اور چھوٹی آپا اُکھڑی اُکھڑی سی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ابتدائی دن میں دونوں کے درمیان کیا رنجش ہو گئی ہے جب کہ یہ دن تو ہر فکر سے آزاد ہو کر ہنسنے ہنسانے کے ہیں اور پھر مہروز کے مزاج میں تو ویسے بھی بہت شوخی ہے، وہ کیوں اتنا سنجیدہ ہو رہا ہے اُس نے سوچا چھوٹی آپا سے بات کرے لیکن پھر اپنی سوچ کی نفی کر دی۔ ہو سکتا ہے وہ اُس کی مداخلت پسند نہ کریں۔ ویسے بھی ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ آج ایک دوسرے سے خفا ہیں تو کل مان بھی جائیں گے۔ اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن

اس وقت نہ صرف یہ کہ اُس کی کوشش ناکام رہی بلکہ اُسے شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جب چھوٹی آپا کا نامناسب رویہ سب پر ظاہر ہو گیا۔

چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے کے بعد سب سٹنگ روم میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ امّی مہروز کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

"بیٹا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ تم دونوں کا دعوتوں کا سلسلہ ختم ہو اور اب میرا خیال ہے بلکہ میں چاہتی ہوں تم دونوں کہیں گھوم پھر آؤ۔" ان کا اشارہ ہنی مون کی طرف تھا۔

"بالکل یہی تمہارے آزادی سے گھومنے پھرنے کے دن ہیں۔" شہروز کہنے لگے۔ "کہیں باہر جانا چاہو تو میں اس کا انتظام بھی کر دیتا ہوں اور اپنے ملک میں بھی پُر فضا اور خوبصورت مقامات کی کمی نہیں ہے جیسے تم دونوں پسند کرو۔"

"صوفیہ سے پوچھ لیں۔ یہ کہاں جانا پسند کریں گی۔" مہروز نے بات صوفیہ پر ڈال دی اور شہروز کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ ناگواری سے بولیں۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"کیوں بیٹا؟" امّی کے شفیق لہجے کے باوجود وہ بدتمیزی سے بولیں۔

"بس نہیں جانا۔"

"لیکن بیٹا۔"

"میں نے کہا ناں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

کچھ دیر تک تو سب اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ شاید حیران بھی تھے اور حیرت کی بات تو تھی ہی کہ گذشتہ دو سالوں میں اُس نے کبھی کسی کو اس لہجے میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ اپنے آپ میں بے حد ندامت محسوس کرتے ہوئے کنکھیوں سے باری باری سب کو دیکھا۔ مہروز سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شہروز کی نظریں صوفیہ کے پیچھے بند دروازے پر جمی تھیں اور امّی مہروز کے جھکے ہوئے سر پر نظریں جمائے جیسے صورتحال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس کا خیال تھا ابھی صوفیہ کی بابت اس سے سوال کیے جائیں گے لیکن سامنے امّی تھیں۔ جہاندیدہ خاتون۔ وہ صوفیہ کے غیر مناسب رویّے کا ذمّہ دار اُسے نہیں ٹھہرا سکتی تھیں۔ ہاں اگر ان کی جگہ کوئی اور روایتی ساس ہوتی تو وہ پہلے اسے ہی لتاڑتی لیکن امّی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، مہروز سے کہنے لگیں۔

"مہروز۔ تم نے صوفیہ سے کیا کہا ہے؟" وہ جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلانے لگا۔

"پھر وہ خوش کیوں نہیں ہے؟۔ میں پہلے دن سے اسے اُکھڑا اُکھڑا محسوس کر رہی ہوں۔"

"آپ اُسی سے پوچھیں۔" مہروز آہستہ آواز میں بولا۔

"اس سے نہیں۔ میں تم سے پوچھوں گی یقیناً تم نے کوئی ایسی بات کی ہو گی۔"

"نہیں امّی۔" وہ فوراً بول پڑا۔ "میں خود نہیں سمجھ پا رہا۔ وہ ایسا کیوں بی ہیو کر رہی ہیں۔"

"بیٹا۔ کوئی وجہ تو ہو گی ناں۔" امّی نرم پڑتے ہوئے بولیں۔

"یقیناً ہو گی۔ اور بخدا میں نہیں جانتا کہ کیا وجہ ہے۔ ان کا رویہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے آپ ان سے پوچھ لیں۔ اگر میری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو آپ کو اختیار ہے جو چاہے سزا دے لیجیے گا۔"

امّی خاموش رہ کر جانے کیا سوچنے لگیں کہ وہ کہنے لگا۔

"آپ ربیعہ بھابی سے پوچھیں۔ ہو سکتا ہے۔"

"ربیعہ سے کیوں پوچھوں؟" امّی نے فوراً ٹوک دیا۔ "ربیعہ کا تمہارے معاملے سے کیا تعلق؟"

صوفیہ تمہاری بیوی ہے اور اس کے بارے میں میں تم سے سوال کروں گی۔"

"آئی ایم سوری امی — میرا مطلب ہے —"

"تمہارا مطلب جو بھی ہو، ایک بات یاد رکھو۔ آئندہ اپنے کسی معاملے میں ربیعہ کو گھسیٹنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ اگر صوفیہ کی بہن ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم صوفیہ کی بابت اس سے سوال کرو یا الزام دو۔"

"آئی ایم سوری اگین —" وہ بے حد نادم نظر آرہا تھا۔

"میرے خدا — میں اس قابل تو نہیں ہوں۔ پھر یہ سب کیوں مجھے اہمیت دے کر اتنا معتبر کر دیتے ہیں۔" اس نے سوچا اور ڈرتے ڈرتے شہروز احمد کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ تب وہ اپنے اندر ہمت پیدا کرتی ہوئی امی سے کہنے لگی۔

"امی — آپ نے مہروز کی بات پوری نہیں سنی — اس کا مطلب ہے، ہو سکتا ہے میں بہن ہونے کے ناتے صوفیہ آپی کے رویے کے بارے میں کچھ قیاس کر سکوں۔"

"یقیناً مہروز یہی کہنا چاہتا تھا۔" شہروز نے اس کی تائید کی، پھر کہنے لگے۔ "بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی کسی لڑکی کو نئے گھر میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔" اور پھر ماحول کو خوشگوار کرنے کی غرض سے بولے۔

"اور مہروز — تم یوں سر جھکا کر مت بیٹھو۔ جانے کی تیاری کرو صوفیہ کو ہم راضی کریں گے۔"

"نہیں بھائی جان — میں ایسی تفریح نہیں چاہتا جس میں وہ زبردستی میرا ساتھ دینے پر مجبور کی گئی ہو!" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے بولا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ میں شاید زندگی میں پہلی بار آپ کی کسی بات کو ریجیکٹ کر رہا ہوں۔"

اس کا خیال تھا شادیوں سے فارغ ہونے کے بعد جب زندگی معمول پر آجائے گی، تب وہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چلی جائے گی لیکن چھوٹی آپا کے رویے نے گھر کے ماحول میں جو تناؤ پیدا کر دیا تھا، اس نے اس نے اپنا جانا ملتوی کر دیا۔ حالانکہ وہ تو فرار کی راہیں ڈھونڈنے میں ماسٹر تھی لیکن یہاں کوشش کے باوجود وہ فرار کی راہ اختیار نہ کر سکی گو کہ چھوٹی آپا کے نامناسب رویے کی ذمہ دار وہ نہیں تھی، پھر بھی وہ گلٹی فیل کرتی۔

کئی بار چھوٹی آپا سے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں لیکن انہوں نے اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ کبھی ٹال جاتیں اور کبھی ڈانٹ دیتیں۔ وہ پریشان رہنے لگی۔ اکثر سوچتی، "چھوٹی آپا خوش نصیب ہیں جنہیں اتنا اچھا سسرال ملا۔ اگر کوئی مجھے یہ یقین بخش دے کہ میں ہمیشہ یہیں رہوں گی تو بخدا میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگوں۔"

اس روز وہ ایک دن کے لیے اماں کے گھر آئی تو کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"اماں چھوٹی آپا اچھا نہیں کر رہیں۔"

"کیا؟ کیا کر رہی ہیں؟" اماں اچنبھے سے پوچھنے لگیں۔

"ان کا رویہ مہروز کے ساتھ انتہائی غیر مناسب ہے۔ اور کسی کسی وقت تو امی کے سامنے بھی بدتمیزی کر جاتی ہیں۔"

"اور مہروز اس کے ساتھ کیسا ہے؟" اماں فوراً چھوٹی آپا کو الزام دینے کے بجائے مہروز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"مہروز بہت اچھا ہے اماں۔ یہ اس کی شرافت ہے کہ چھوٹی آپا کی ہر بات اور ہر زیادتی برداشت کر رہا ہے ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو —" وہ خاموش ہو گئی تو اماں کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"میں نے بھی محسوس کیا ہے اور تمہارے ابا میاں نے بھی۔ کبھی جب دونوں ساتھ آتے ہیں۔ تو

ی اکھڑی سی نظر آتی ہے۔ میرا خیال تھا مہروز ٹھیک نہیں ہے لیکن اب جو تم مہروز کی تعریف
ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟"
ی بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی اماں۔"
نے صوفیہ سے پوچھا نہیں۔"
ں بار پوچھنے کی کوشش کی لیکن یا تو ٹال جاتی ہیں یا ڈانٹ دیتی ہیں اور اماں اُن کے اس رویے
ے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔"
رمندگی کی بات تو ہے۔ کیا سوچتے ہوں گے تمہارے سسرال والے کہ ایک بہن کیسی ہے اور دوسری
" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ "شروع ہی سے الگ مزاج ہے اس کا، میرے ساتھ بھی
درازی کر جاتی تھی۔"
ن اماں، آپ انہیں سمجھائیں تو سہی۔"
ری کہاں مانتی ہے، تمہارے ابا میاں سے کہوں گی، وہی سمجھائیں گے۔ مہروز تو ٹھیک ہے
ے کے ساتھ؟" اماں پھر مہروز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔
لیکن اگر ان کا یہی رویہ رہا تو —" وہ پھر اپنے خدشات کو زبان پر آنے سے روک گئی تھی۔
م میں شہروز آئے تو وہ ان کے ساتھ واپس آگئی حالانکہ انہوں نے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔
ں بتایا کہ انہیں ابھی کسی کام کے سلسلے میں کہیں اور جانا ہے۔ وہ پھر بھی ساتھ چل پڑی۔ اسے
ر وہ باہر ہی سے چلے گئے تھے۔
ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں سلام کرتی ہوئی ان کے پاس آبیٹھی۔
را خیال تھا، آج تم وہیں رہو گی؟"
دہ تو تھا لیکن آپ کی تنہائی کے خیال سے چلی آئی۔"
یتی رہو۔" امی اس کے جواب سے خوش ہوئیں، پھر کہنے لگیں۔ "میں تنہا تو نہیں تھی، صوفیہ
ہے۔"
اپنے کمرے سے کب نکلتی ہیں؟"
ب اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے گی تو میرے پاس بھی بیٹھے گی۔"
حیران ہوئی امی کو اب بھی اس سے شکایت نہیں تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مہروز خاصا غصے
ے کمرے سے نکلا اور باہر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگا۔
ا۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ رات میں دیر سے آؤں گا۔"
بات تم اپنی بیوی کو بتاؤ۔" امی نے رسان سے کہا۔
ے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں دیر سے آؤں یا آؤں ہی ناں۔"
ں کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی نظروں نے دروازے تک اس
ب کیا۔ پھر طویل سانس لے کر وہ سر جھکا گئی۔
ا۔ شہروز کہاں رہ گیا ہے؟" امی اسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔
ی کام سے گئے ہیں۔"
چھا تم جا کر کچن دیکھو۔ میں جب تک نماز پڑھ لوں۔" وہ چپ چاپ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ پھر
کھانا صرف اس نے اور امی نے کھایا۔ چھوٹی آپا بلانے کے باوجود نہیں آئیں اور شہروز اور
چھ پتا نہیں تھا۔ کب آتے ہیں؟
ھانے کے بعد وہ کچھ دیر امی کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ہر طرف خاموشی کی چادر تنی
ہونے لگی۔ ساتھ ہی نامعلوم اداسی پر پھیلائے چلی آئی۔
ہی بلامقصد کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ تاریکی

نے باہر کے ماحول کو کچھ پُراسرار بنا دیا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر آسمان پر نظریں دوڑانے لگی۔ اِکا دُکا ستارے جو پلکیں جھپکتے ہوئے گہرے بادلوں میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اُس نے ٹھنڈی گرل پر پیشانی ٹکا کر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ دروازے پر آہٹ سن کر فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی۔ دروازے پر چھوٹی آپا کھڑی تھیں کچھ پریشان سی۔ آنکھوں کی سرخی اُن کے روتے رہنے کی چغلی کھا رہی تھی۔

"آئیے چھوٹی آپا۔" وہ انہیں پریشان دیکھ کر لپک کر اُن کے پاس آئی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں بیڈ پر بٹھاتی ہوئی خود بھی اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟۔" ایک دم اُن سے بڑی بن گئی۔ نرمی سے اُن کا ہاتھ دبا کر پوچھا۔

"وہ — وہ — مہروز —" وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

"کیا ہوا مہروز کو؟۔"

"وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

"کسی کام سے گئے ہیں؟۔" وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

"نہیں —"

"پھر —؟۔"

"غصے میں گئے ہیں — مجھ سے خفا ہو کر۔"

"آپ کیوں انہیں غصہ دلاتی ہیں؟۔ کیوں خفا کرتی ہیں انہیں؟۔"

"میں کیا کروں ربیعہ — مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔" اس کے ساتھ ہی چھوٹی آپا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔ وہ اُن کے رونے سے پریشان تو ہوئی لیکن فوراً چُپ نہیں کرایا۔ کچھ دیر تک اُن کی سسکیاں سنتی رہی۔ پھر ہلکے ہلکے اُن کا کندھا تھپتھپانے لگی

"بس کریں چھوٹی آپا۔ اس طرح نہ روئیں — مجھے بتائیں، مہروز کیوں خفا ہو کر گئے ہیں۔"

"انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔" چھوٹی آپا روتے ہوئے بولیں۔

"میرا خیال ہے آپ تو اکثر ہی اُن کے ساتھ کہیں بھی جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔"

"ہاں — اس لیے کہ میں اُن کے ساتھ نہیں چل سکتی — اور یہ بات میں نے شادی سے پہلے ہی اُن پر واضح کر دی تھی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ "مجھے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے اپنا آپ بڑا عجیب سا لگتا ہے — بہت کمتر۔ اور لوگوں کی نظریں جس انداز سے اُن پر سے ہوتی ہوئی مجھ پر ٹھہرتی ہیں، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔"

"آپ لوگوں کی پروا کیوں کرتی ہیں؟۔ صرف مہروز کی پروا کریں۔ انہوں نے تو آپ سے کبھی کچھ نہیں کہا ناں — بلکہ وہ تو آپ کے رویے سے اتنے پریشان رہنے لگے ہیں۔"

"صرف میرے رویے سے نہیں ربیعہ — مجھے لگتا ہے میرا ساتھ بھی اُن کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔"

"آپ کا ساتھ؟۔"

"ہاں — زبردستی جو مسلط کی گئی ہوں اُن پر — میرا خیال ہے شہروز بھائی نے مجھ پر ترس کھا کر —"

"نہیں چھوٹی آپا۔" اُس نے فوراً ٹوک دیا۔ "آپ کا خیال غلط ہے۔ کسی نے آپ پر ترس نہیں کھایا۔ خود مہروز نے پہلے آپ کو پسند کیا۔ اُس کے بعد امی کو اپنی پسند سے آگاہ کر کے آپ کے رشتے کے لیے ہمارے گھر بھیجا تھا۔"

"کیا —؟۔" چھوٹی آپا ایکدم سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ہاں چھوٹی آپا — میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ بہت یقین سے بولی۔

"جھوٹ کہتی ہو تم — اگر ایسی بات ہوتی تو تم پہلے ہی مجھے بتاتیں۔"

"پہلے مجھے خود معلوم نہیں تھا — یہ تو ابھی تین چار روز پہلے شہروز نے بتایا ہے کہ جس روز مہروز مجھے اماں کے گھر سے لینے آیا تھا، اُسی روز اُس نے آپ کا نام لے دیا تھا اور جب امی نے اُس کی شادی کی بات چھیڑی تو اُس نے آپ کا نام لے دیا تھا —"

چھوٹی آپا اب بھی غیر یقینی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں — وہ اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی —

"اگر میرا یقین نہیں ہے تو شہروز سے یا پھر مہروز سے پوچھ لیں۔" چھوٹی آپا نے اُسی کا یقین کر لیا۔ وہ پھر رونے لگیں۔

"ارے — اب کیا ہوا؟۔"

"میں بہت بُری ہوں ربیعہ — مہروز کی محبت کو دکھاوا اور ترس سمجھ کر مسلسل اُن سے لڑتی اور اُن کی ہر بات ریجیکٹ کر کے انہیں خفا کرتی رہی ہوں۔ لیکن میں خود بھی کبھی چین سے نہیں رہی۔ ہر پل یہ احساس رہتا ہے کہ میں اچھا نہیں کر رہی، پھر بھی پتا نہیں کیوں؟۔"

"آپ کا اتنا قصور نہیں ہے چھوٹی آپا — اصل میں ہمیں اور خاص کر آپ کو جن حالات کا سامنا رہا اور جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا، اس میں کسی کی محبت کا یقین مشکل ہی سے آتا ہے۔ پھر منفی سوچوں نے بھی آپ کی زندگی کو تلخ بنا دیا۔ اور اپنے ساتھ ساتھ آپ نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر حال ابھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا — آپ تلافی کر سکتی ہیں۔"

"مجھے تو یہ سوچ سوچ کر شرمندگی ہو رہی ہے کہ سب لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟۔" چھوٹی آپا واقعی نادم ہو رہی تھیں۔

"کسی نے کوئی غلط بات کبھی نہیں سوچی ہو گی — یہ سب بہت بڑا ظرف رکھتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بے پناہ وسعتیں ہیں — آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے اُکھڑے رویے کو محسوس کرنے کے باوجود کبھی کسی نے آپ پر جتایا نہیں — آپ کو ٹوکا نہیں بلکہ امی تو مہروز کو ڈانٹتی ہیں کہ اُسی نے کچھ کہا ہو گا — جبھی آپ اُکھڑی اُکھڑی سی رہتی ہیں۔"

"اب میں کیا کروں؟۔" چھوٹی آپا پُرسوچ انداز میں پوچھنے لگیں۔

"آپ کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا — بس اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار ہی سب کے دلوں میں آپ کا ایک خاص مقام بنا دے گا — ویسے بھی سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس آپ نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ آپ سمجھنے لگیں گی تو دیکھیے گا، اس گھر کے در و دیوار تک میں محبتوں کی مہک رچی بسی ہے۔"

"مہروز بہت غصے میں گئے ہیں۔" چھوٹی آپا کو مہروز کا خیال آنے لگا۔

"چلیں — اب آئیں تو آپ اُن سے معافی مانگنے کے ساتھ یہ یقین بھی دلا دیجیے گا کہ آئندہ آپ اُن کی کسی بات کو رَد نہیں کریں گی اور صرف یہی نہیں مہروز کو آپ کی محبت کا یقین بھی ملنا چاہیے۔ آپ تو خوش قسمت ہیں چھوٹی آپا — اتنے چاہنے والے لوگ ہر کسی کو نہیں ملتے۔"

"صرف میں نہیں تم بھی —"

"ہاں — میں بھی —" وہ افسردگی سے مسکرائی — پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "چلیں آپ منہ ہاتھ دھو لیں۔" چھوٹی آپا اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئیں — اور جب منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ہوئی واپس کمرے میں آئیں تو اسی وقت شہروز آ گئے — چھوٹی آپا پر نظر پڑی اور اُن کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پوچھنے لگے —

"خیریت — ؟۔"

"جی —" چھوٹی آپا آہستہ سے 'جی' کہہ کر کمرے سے نکلنے لگیں کہ انہوں نے پکار لیا۔

"صوفیہ۔ یہاں آئیں۔" وہ پلٹ کر اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔

"یہاں آکر بیٹھیں۔" انہوں نے کہا تو وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی، اُن کے پاس آ بیٹھیں۔

"روتی رہی ہیں؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ اور ایک یہی شخص جس کے سامنے بات بنانا یا جھوٹ بولنا انتہائی مشکل کام تھا۔ سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

"یونہی نہیں۔" وہ فوراً بول پڑی "مہروز خفا ہو کر گیا تھا۔ یہ اسی لیے رو رہی تھیں۔"

"یہ خوب ہے۔ پہلے اُسے خفا کرتی ہیں، پھر روتی ہیں۔"

"میں اب انہیں خفا نہیں کروں گی۔" چھوٹی آپا زعم سے بولیں۔

"واقعی۔" وہ بغور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولے اور ان کے اثبات میں سر ہلانے پر کہنے لگا "چلیے وہ نالائق میرے ساتھ آیا ہے جا کر یہ بات اُس سے بھی کہہ دیں۔"

"وہ بہت زیادہ غصّے میں تو نہیں ہیں۔" چھوٹی آپا نے سہم کر پوچھا۔ تو وہ مسکراہٹ دبا کر بولے "بہت زیادہ غصّے میں ہے۔"

"عجیب ہیں آپ۔ خوامخواہ انہیں ڈرا رہے ہیں۔" وہ آگے بڑھ آئی۔ "آپ جائیں چھوٹی آپا کچھ نہیں ہو گا۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔" چھوٹی آپا اُس کا ہاتھ پکڑ کر لیتی گئیں۔

اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو مہروز جوتوں سمیت صوفے پر نیم دراز تھا۔ اگر وہ اکیلی ہوتیں تو شاید وہ اسی طرح لیٹا رہتا لیکن ساتھ ربیعہ کو دیکھ کر فوراً اُٹھ بیٹھا۔

"آیئے بھابی، بیٹھیں۔"

"میں بیٹھنے نہیں آئی۔ یہ تمہاری زوجہ محترمہ یہاں آنے سے ڈر رہی تھیں۔ انہیں چھوڑنے آئی ہوں۔"

"کیوں؟ میں آدم خور ہوں کیا؟"

"پتا نہیں۔ ویسے شہروز نے ابھی اِن سے یہی کہا ہے کہ تم آدم خور بن چکے ہو۔"

"اچھا۔" وہ ہنسا۔ "اِن سے کہہ دیں، اگر میں آدم خور ہوا بھی تو انہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"یہ بات تم خود ان سے کہہ دو۔" اُس نے چھوٹی آپا کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آئی تو شہروز اسٹڈی میں جا چکے تھے۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر اُن کے بند دروازے کو دیکھا۔ پھر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ پر آ لیٹی۔

اُس رات کی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ وہ کمرے سے نکلی تو مہروز اور چھوٹی آپا پہلے ہی سے امّی کے پاس موجود تھے۔ اور چھوٹی آپا کے چہرے پر اُتری دھنک رنگوں کی برسات دیکھ کر وہ جان گئی کہ اُس کی وہ بہن جس کے لیے وہ اپنے دل میں درد رکھتی تھی اور چاہتی تھی اُن کے سارے ولدر سمیٹ لے قدرت نے بڑی فیاضی سے انہیں محبتوں کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ طمانیت کا احساس لیے ان سب کے درمیان آ بیٹھی۔ چھوٹی آپا کہہ رہی تھیں۔

"امّی۔ آپ نے مجھے ٹوکا کیوں نہیں؟۔ مجھے سرزنش کیوں نہیں کی؟"

"میں چاہتی تھی تمہیں خود احساس ہو اور خود سے جو احساس جاگے، وہ زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ بہ نسبت دوسروں کے احساس دلانے سے۔"

"آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ناں؟"

"میری جان، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ پھر بھی اگر تمہارا اطمینان میرے ہاں کہنے سے ہو گا تو ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" امّی شفقت سے مسکرائیں۔ اسی وقت شہروز صبح کی چہل قدمی کے

ے بعد اندر آئے تو ماحول کا جائزہ لینے کے بعد مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہاں بھئی مہروز۔ اب ہنی مون کا کیا پروگرام ہے؟"

"صوفیہ سے پوچھیں۔" اُس نے پھر بات صوفیہ پر ڈال دی اور شہروز کے سوالیہ نظروں سے یکھنے پر وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ہم کہیں نہیں جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"بس یہیں رہیں گے امّی کے پاس؟"

"بیٹا میرے پاس تو تمہیں رہنا ہی ہے۔ اچھا ہے کچھ دنوں کے لیے گھوم پھر آؤ۔" امّی نے کہا تو ہروز فوراً اُن کی تائید کرنے لگا۔

"بالکل۔ بالکل، زیادہ نہیں، بس دو تین مہینے۔" سب کے ہنسنے پر سر کھجاتا ہوا بولا۔ "نہیں شاید پھ غلط کہہ گیا۔"

"زیادہ بوکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جا کر تیاری کرو۔" شہروز کے کہنے پر وہ دونوں ایک دوسرے واشارہ کرتے ہوئے اُٹھ کر چلے گئے۔

"میرا خیال ہے، میں ذرا ناشتے کا انتظام دیکھ لوں۔" وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ بہت دنوں سے جو چھوٹی آپا کے رویّے کی وجہ سے دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔ وہ ہٹ گیا تو وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سوس کرنے لگی۔ دل میں ہلکا سا بھی خوشی اور طمانیت کا احساس جاگے تو ہر شے نکھری ہوئی لگنے لتی ہے۔ وہ بھی خوش تھی اور ناشتے کی ٹیبل سجاتے ہوئے ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہی تھی۔

پھر شام میں وہ ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ شہروز کے ساتھ اُنہیں چھوڑنے ائیرپورٹ آئی ھی۔ مہروز کی شوخیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اور چھوٹی آپا کا وہ ایک نیا روپ دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی دن یں کتنی بدل گئی تھیں۔ آنکھوں میں جیسے کسی نے ستارے بھر دیے ہوں۔ اُنہیں خدا حافظ کہتے ہوئے ں نے دل ہی دل میں اُن کے لیے بے شمار دُعائیں مانگ ڈالیں۔

"کہیں اور چلنا ہے؟" واپسی میں شہروز اس سے پوچھنے لگے۔

"نہیں۔ امّی اکیلی ہوں گی۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔" انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جسے سوس کیے بغیر وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتی ہوئی بولی۔

"پتا ہے شہروز۔ آج میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔"

"کیوں؟"

"چھوٹی آپا کو مطمئن اور خوش دیکھ کر۔ آپ شاید اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اُن کی طرف سے کتنی پریشان ھی۔ ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کوئی طوفان اُٹھ کھڑا ہو۔ اور۔"

"اور یہ ربیعہ بیگم۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر کہنے لگے کہ "آپ کے سارے احساسات دوسروں کے لیے بیدار ہوتے ہیں۔ کوئی خوش تو آپ بھی خوش، کوئی پریشان تو آپ اس سے زیادہ پریشان۔ کسی لا زندگی میں طوفان آنے والا ہے تو دھڑکا آپ کو لگتا ہے۔ نیندیں حرام ہو جاتی ہیں آپ کی۔ میں پوچھتا ہوں خود اپنے لیے آپ کے احساسات کیوں نہیں جاگتے؟۔ آپ کو اپنا خیال کیوں نہیں آتا۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ خود آپ کی زندگی میں کتنا بڑا طوفان آنے والا ہے؟"

"شہروز احمد۔" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اُس نے پلکوں کے دَر بند کر لیے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

شہروز احمد کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ تب انہوں نے اسپیڈ آہستہ کرتے ہوئے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کیے چُپ چاپ بیٹھی تھی۔ ملکے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا جبھی وہ جان نہیں سکے کہ وہ ضبط کی جانے کن منزلوں

سے گزر رہی ہے۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ؟" وہ دوبارہ ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے، مخاطب کرتے ہوئے بولے تو وہ آنکھیں کھول کر کچھ دیر تک سامنے دیکھتی رہی۔

پھر کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں، مجھے کتنے بڑے طوفان کا سامنا کرنا ہے۔"

"اچھا۔" وہ یوں ہنسے جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہے ہوں اور وہ پروا نہ کرتی ہوئی بولی۔

"میرے لیے اگر خوشیوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ کی خوشیوں میں بھی شریک نہ ہوں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ کے لیے خوشیوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں؟"

"کون کہے گا؟ میں خود سمجھتی ہوں۔" وہ زہر خندسی بولی۔

"غلط سمجھتی ہیں آپ۔" وہ بڑے جم کر بولے تھے۔

"میں اس وقت بحث نہیں کروں گی اور پلیز آپ بھی اس وقت میری ذات کو موضوع نہ بنا وہ بات ختم کرتی ہوئی بولی۔

"کیوں ڈرتی ہیں آپ؟"

"نہیں۔ بلکہ چھوٹی آپا کے حوالے سے جو خوشی ملی ہے، میں اُسے دیر تک محسوس کرنا چاہتی

"ایک بات کہوں؟" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولے۔ "آپ صوفیہ کو چھوٹی آپا کہنا چھوڑ د

"کیوں۔ ؟" وہ گردن موڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیونکہ مہروز آپ کا دیور ہے اور اس رشتے سے آپ کو صوفیہ کا نام لینا چاہیے۔"

"آپ بھول رہے ہیں، چھوٹی آپا سے میرا رشتہ اٹوٹ ہے اور اس حوالے سے میں مہروز کو بھائی کہہ سکوں گی لیکن۔" وہ خاموش ہو گئی اور اُس کا مطلب سمجھ کر انہوں نے بھی ہونٹ بھینچ لی

"بڑے سنگدل ہو شہروز احمد۔" رات میں وہ سوچ رہی تھی "جب کبھی میں اپنی ذات سے نظریں دوسروں کی خوشیوں میں خوش ہونے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم مجھے میرا احساس دلاتے ہوئے تلخ سامنے لا کر میری خوشی چھین لیتے ہو۔ تم سے میری ذرا سی خوشی بھی برداشت کیوں نہیں ہوتی؟"

"نہیں ربیعہ۔" وہ جیسے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ "میں تمہارے دامن میں دوسروں کی نہیں، تم خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے لیے خوش ہو، اپنے لیے مطمئن۔"

"اپنے لیے۔" اُس نے دُکھ سے سوچا۔ "اپنے لیے خوش ہو سکتی تھی اگر جو تم درمیان میں یا پھر اب ثاقب حسن کا خیال نہ ہوتا، جس نے میرے حصول کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔"

"میرے خدا۔" اُس نے اُن تلخ سوچوں سے فرار کی خاطر تکیہ سر کے نیچے سے کھینچ کر منہ پر

بہت بور کر دینے والے دنوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ گھر میں سارا دن بس وہ اور امی ہوتیں اور ا بھی وہ کتنی باتیں کر سکتی تھی۔ کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھ کر اُٹھ جاتی۔ کام کرنے کے لیے ملازم مو وہ بے کار اِدھر سے اُدھر چکراتی رہتی۔ کسی کسی دن ندا اور سلمان آجاتے تو کچھ رونق ہو پھر وہی خاموشی۔ اماں کے گھر بھی وہ محض امی کے اکیلے ہونے کے خیال سے نہیں جا پا رہی تھی او تھا کہ ان دنوں شہروز بھی بہت مصروف تھے۔ رات کو اتنی دیر سے آتے کہ بس چند رسمی باتیں ساتھ کر سکتے، پھر سونے چلے جاتے اور وہ جو صرف بوریت سے بچنے کی خاطر دوپہر میں لمبی نیند ہوتی، رات میں دیر تک جاگتی رہتی تھی۔

کتنے بہت سارے دن اِسی طرح گزر گئے۔ اور اب تو وہ چھوٹی آپا اور مہروز کی شدت

کم از کم اس جان لیوا تنہائی سے چھٹکارا ملے اور وہ دونوں پورے ڈیڑھ مہینے بعد آئے۔

وہ چھوٹی آپا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُن کی سفید رنگت سُرخی مائل ہو کر ان میں مزید نکھار پیدا کر رہی تھی۔ ہونٹوں یاں مسلسل چٹختی ہوئیں اور ذرا ذرا سی بات پر بے ساختہ ہنسی جلترنگ بجا دیتی۔ چاہنے کا خوشگوار ں اور چاہے جانے کا زعم اُن کی آنکھوں میں خمار بن کر اُترا تھا۔

دوپہر میں اُس نے امی کے کہنے پر شہروز کو فون کر کے اُن دونوں کے آنے کا بتایا، جبھی وہ شام ذرا جلدی آگئے۔

آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟" ان دونوں سے مل کر بیٹھے تو کہنے لگے۔

بس صوفیہ نے کہا، اچانک سب کے سامنے جا کھڑے ہوں گے۔" مہروز والہانہ نظروں سے صوفیہ ن دیکھتا ہوا بولا۔ تو وہ چھیڑنے کی غرض سے کہنے لگے۔

اور تم نے صوفیہ کی بات مان لی؟"

کیا کروں بڑے بھائی، جان پیاری ہے۔" اُس نے ذومعنی بات کی تو شہروز بے ساختہ ہنس دے۔

اچھا کیا۔ تم لوگ آگئے، ربیعہ بہت بور ہو رہی تھیں۔"

آپ کے ہوتے ہوئے؟" اب مہروز نے اُنہیں چھیڑا۔

یار میں بہت مصروف رہا۔" وہ سادگی سے بولے۔ "آج تمہارے آنے کا سن کر جلدی آگیا تو گیارہ بج جاتے ہیں۔"

خیریت ہے؟"

ہاں۔ وہ جو نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے، اس کی وجہ سے۔ پھر ادھر جی ایم بھی اپنی والدہ کی علالت جہ سے چھٹی پر چلا گیا۔" وہ دونوں بزنس کی باتیں کرنے لگے۔ تو وہ چھوٹی آپا کے ساتھ اُٹھ کر اُن رے میں چلی آئی۔

پھر جہاں مہروز کے آنے سے شہروز پر کام کا پریشر کم ہوا وہاں چھوٹی آپا کے آنے سے اُس کی بوریت دور ہو گئی۔ بلکہ گھر کی خاموش فضاؤں میں بھی ارتعاش پیدا ہو گیا۔ چھوٹی آپا کا ہر انداز اس سے مختلف ظاہر ہے ان کے اندر نہ کوئی ڈر تھا نہ خوف اور نہ ہی وہ اس کی طرح یہاں مہمان تھیں۔ یہ اُن کا اپنا تھا، اس لیے نہ تکلف، نہ جھجک۔ بہت بے تکلفی اور آزادی سے ہر جگہ اُٹھتی بیٹھتیں۔ نہ بے ساختہ ی کو لگام دیتیں۔ اور نہ اُونچی آواز میں اپنے آپ کو بولنے سے روکتیں۔ اور اُن کی آواز سے ہی ہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

امی کے پاس بیٹھتیں، تو ڈھیروں باتیں کیے چلی جاتیں۔ ندا کی، آپی کی، مہروز اور شہروز کی، سب بچپن کے قصے اور پتا نہیں کیا کیا۔ اتنا تو وہ دو سالوں میں کسی کے بارے میں نہیں جان سکی تھی، چھوٹی آپا دو مہینوں میں جان گئی تھیں۔

ایک دن امی کہنے لگیں۔ "تم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو۔ ربیعہ کے ٹھہرے ئے مزاج اور خاموشی نے اس گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھا اور تم نے۔"

میں نے کیا کیا؟" چھوٹی آپا فوراً پوچھنے لگی تھیں۔

تم نے خوشگوار سی ہلچل مچا دی اور سچ پوچھو بیٹا تو مجھے تمہاری مچائی ہوئی ہلچل اچھی لگ رہی ہے۔"

ہر گز۔" چھوٹی آپا نے خوشی کا اظہار امی کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

صبح جب شہروز آفس جا رہے تھے اس وقت اُس نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ شام میں اماں کے گھر جائے گی۔ اور کچھ دن وہیں رہے گی۔ وہ کیونکہ جلدی میں تھے، اس لیے کوئی تبصرہ نہیں کیا

تھا۔ اُن کے جانے کے بعد اُس نے امّی سے بھی اجازت لے لی اور اسی وقت اپنا بیگ تیار
"سُنا ہے، تم اپنے میکے جا رہی ہو؟" چھوٹی آپا اُس کے کمرے میں آتی ہوئی بولیں تو وہ
"اپنے نہیں۔ آپ کے میکے جا رہی ہوں۔" وہ بھی مذاق کے موڈ میں آ گئی۔
"میرے کیوں؟"
"بس آپ کی امّاں اور بہنوں سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"
"اچھا۔" چھوٹی آپا ہنستی ہوئی اُس کے بیڈ پہ اوندھی لیٹ گئیں۔ پھر اس کا بیگ دیکھ کر
لگیں۔ "زیادہ دن رہو گی؟"
"ہاں، کم از کم ایک ہفتہ تو رہوں گی۔"
"سچ میرا بھی بڑا دل چاہتا ہے۔ دو ایک دن امّاں کے پاس رہ آؤں۔"
"میں ہو کر آ جاؤں، پھر چلی جائیے گا۔" اُس نے جیسے اُن کی مشکل آسان کی۔
"چلی تو جاؤں گی لیکن رہنا مشکل ہے۔"
"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔
"مہروز اجازت نہیں دیتے۔ کہتے ہیں بے شک روز چلی جاؤ لیکن وہاں رہنے کی بات مت
"اچھا۔" وہ مسکرائی۔ "آپ کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی ہو گی۔"
"یہی کہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں جب میں نہیں تھی تب؟ کہتے ہیں تب کی بات اور تھ
آپا اِٹھلائیں، پھر کہنے لگیں۔
"سنو، تمہیں کیسے شہروز بھائی اتنے دن رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں؟"
وہ جواب سے بچنے کی خاطر اُن کی بات اَن سُنی کرتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ چھوٹی
اپنی بات دُہرانے جا رہی تھیں کہ فون کی بیل سن کر "مہروز کا فون ہو گا" کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں
نے شکر کیا اور جو بلا مقصد الماری کھول کر کھڑی تھی، اُسے بند کر کے واپس پلٹی اور سوچنے لگی
چیزیں بیگ میں رکھنی ہے۔ ابھی اسی طرح کھڑی تھی کہ چھوٹی آپا دوبارہ آ گئیں، اُس سے کچھ فا
کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئیں۔ اس نے پہلے سرسری انداز سے ان کی طرف دیکھا لیکن
گئی۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اُلجھن تھی، کچھ غیر یقینی اور کچھ ملامت بھی۔
"کیا بات ہے چھوٹی آپا۔ خیر تو ہے ناں؟" وہ اُن کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھنے لگی، ا
جواب نہیں دیا۔
"مہروز کا فون تھا؟ کیا کہہ رہے تھے؟" وہ اُن کے قریب جا کر پوچھنے لگی۔
"مہروز کا فون نہیں تھا۔" چھوٹی آپا اُس پر نظریں جمائے ہوئے بولیں۔
"پھر۔؟"
"ثاقب حسن تھا۔" ٹھہرا ہوا کاٹ دار لہجہ اُس کے پورے وجود کو ہلا گیا۔
"کیا؟" اُس کی رنگت ایک دم زرد پڑ گئی۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اُن کی طرف
مڑتی ہوئی بولی۔
"میں کسی ثاقب حسن کو نہیں جانتی۔"
"یہ بات تم اُس سے کہو جو جانتا نہ ہو اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ کبھی میں اس معاملے میں
ہمراز رہی ہوں۔"
"یہ کبھی کی بات ہے۔ اب میرا اُس سے کیا واسطہ؟" وہ بظاہر بے نیازی سی بولی۔
"کاش ایسا ہی ہوتا ربیعہ۔ لیکن ثاقب حسن کا لہجہ بتا رہا تھا کہ تم دونوں نے اس پُرانے تعلق
قائم رکھا ہوا ہے۔"

"نہیں۔" وہ بے بسی سے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔
"تم جھٹلا نہیں سکتیں۔ اور میں خود چاہنے کے باوجود نہیں جھٹلا پا رہی کیونکہ میری آواز پر تمہارا گمان
کر کے وہ بے تابی سے کہہ رہا تھا۔
"سنو ربیعہ۔ یہ میں ہوں ثاقب حسن۔ تمہارے لیے بہت اچھی خبر ہے کہ میں بہت جلد واپس
آنے والا ہوں۔ اور کہہ رہا تھا کہ ہماری منزل اب بہت قریب آ گئی ہے۔"
وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔
"آنسو بہا کر سمجھتی ہو اپنے گناہوں پر پردہ ڈال لو گی۔" یہی بات ایک بار امّاں نے کہی تھی۔ اُس وقت
جب انیلا اپنی والدہ کو لے کر آئی تھی، ثاقب حسن کا پروپوزل لے کر اور اب چھوٹی آپا کہہ رہی تھیں، ان
کا لہجہ بھی امّاں سے مختلف نہیں تھا۔ رگوں میں خون منجمد کرتا ہوا۔
"یہ گناہ عظیم ہی ہے ربیعہ کہ تم اپنے شریف اور عزت دار شوہر کو دھوکا دے رہی ہو۔ اسی کے گھر
میں رہ کر پرانی محبت کو زندہ رکھتے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی۔ میں پوچھتی ہوں کیا کمی دی ہے تمہیں شہروز
بھائی نے یا خود اُن میں کیا کمی ہے جو تم اُن پر ثاقب حسن کو فوقیت دے رہی ہو۔ ارے اِن کا
نہیں تو کم از کم اپنے بوڑھے باپ کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔"
"بس کریں چھوٹی آپا۔" وہ اور شدت سے رونے لگی۔
"کیا بس کروں؟ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔ دیکھنے میں کس قدر معصوم اور سیدھی سادی لگتی
ہو۔ بخدا کوئی اور اگر ایسی بات کرتا تو میں یقین بھی نہ کرتی لیکن اپنے کانوں سے سُنی جھٹلا نہیں سکتی۔"
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔
"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ان دو سالوں میں کسی اور کو معلوم نہیں ہوا ورنہ تم یہاں نظر نہ آتیں۔
اور اب تو مجھے تمہارے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل بھی خطرے میں نظر آنے لگا ہے کیونکہ ایسی باتیں
ہمیشہ چھپی نہیں رہ سکتیں۔ جس روز کسی دوسرے کے علم میں یہ بات آئی، اُس روز ایک طوفان اُٹھ
کھڑا ہو گا۔ اور پھر تم سوچ سکتی ہو کیا ہو گا۔ جس عزت سے ہم اس گھر میں لائے گئے ہیں، اس سے
کہیں زیادہ ذلت سے دُھتکارے جائیں گے۔ ہاں بھلا ایسی لڑکیوں کو کون اپنے گھر میں رکھے گا جو۔"
چھوٹی آپا کا گلا رُندھ گیا۔ اُن کے لہجے میں دُکھ اور تاسف اور جانے کیا کچھ تھا۔ وہ تڑپ گئی لیکن
اُن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اپنی بے گناہی کا ثبوت اور اپنی صفائی میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن
وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔ چھوٹی آپا اگر یقین کر بھی لیتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ قصوروار تو پھر بھی ٹھہرائی جاتی۔ اور
پھر زندگی تو داؤ پہ لگ ہی چکی تھی۔
دو سال کم نہیں ہوتے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر گھڑی کسی ہمدرد، غمگسار کی ضرورت محسوس کرتی
رہی تھی۔ کوئی تو ہو جو میرا ہاتھ تھام کر بیچ منجدھار سے نکال لے اور کوئی نہیں تھا یا پھر وہ اتنی خوفزدہ
تھی کہ کسی پر اعتماد ہی نہیں کیا۔ اپنے آپ کو تنہائیوں کے حصار میں مقیّد کر کے شاید کسی معجزے کی منتظر
تھی۔ اور معجزہ تو نہیں ہوا، لیکن وہ ہو گیا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ چھوٹی آپا کی نظریں اس کے پورے
وجود کو چھلنی کر رہی تھیں۔ اُسے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تو وہیں پلنگ پر ڈھے گئی۔
"روتی کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اب وہ آ رہا ہے جس کے ساتھ پتا نہیں کیا کیا منصوبے
بنا رکھے ہیں اور جس نے منزل قریب ہونے کی نوید دی ہے۔"
اُس نے پیشانی بیڈ کی پٹی پر ٹکا لی تو چھوٹی آپا زور سے پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ کچھ
دیر تک منہ پر ہاتھ رکھے سسکیوں کو اندر ہی اندر دبا کر روتی رہی، پھر سر اٹھا کر دیکھا اور چھوٹی آپا
کو موجود نہ پا کر جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
پھر نہ سسکیاں رکیں نہ آنسو۔ وہ شاید اس طرح کبھی نہیں روئی تھی، جس طرح اب رو رہی تھی۔

چھوٹی آپا نے تو اُسے خود اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔ اُس کا ذہن بالکل ماؤف ہوگیا۔ کوئی بات سو گئی۔ بس ایک خیال کہ اچھا نہیں ہوا، اُسے رُلاتا گیا۔ یونہی روتے روتے اُسے نیند آگئی۔ حالانکہ سونے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن شاید نیند کو اس کی بے بسی پر رحم آگیا تھا۔ جو یوں بے وقت مہربان گئی۔ دوپہر کے کھانے پر پتا نہیں کسی نے اُسے اُٹھایا نہیں یا بند دروازے کو پیٹا گیا، اسے با خبر نہیں ہوئی۔ جب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ تب خود سے آنکھ کھُلی۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھ کے پپوٹے بے حد بوجھل۔ کچھ دیر تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آدھ کھُلی آنکھوں سے سامنے دیو کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہوا تو صبح کی باتیں یاد آنے لگیں۔

چھوٹی آپا کی چبھتی ہوئی نظریں اُن کا چھلنی کر دینے والا لہجہ اور باتیں، کیا کیا نہ کہا تھا انہوں نے اگر گھما پھرا کر بات نہ کرتیں تو تین لفظ کہہ دیتیں۔ آوارہ۔ بدچلن۔ بدکردار۔

اُس کی آنکھوں میں پھر پانی جمع ہونے لگا۔ تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے بیگ پر نظر پڑی تو یاد آیا اُسے امّاں کے گھر جانا ہے۔ کوئی اور بات ہوتی تو شاید وہ اپنا جانا ملتوی کر دیتی لیکن اب چھوٹی آ فرار کی خاطر وہ جلدی سے اُٹھی اور اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو دی کی آواز پر ٹھٹک گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بڑھ کر دروازہ کھ سامنے شہروز کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ پلٹی اور سیدھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ بالوں میں کرتے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اتنے سے وقت میں برسوں کی بیمار لگی تھی۔ چہرہ زرد اور آنکھیں سُرخ اور سوجھی ہوئی تھیں۔

اپنے آپ کو نارمل پوز کرنے کے لیے میک اپ کا سہارا لیا۔ چہرے کو تو کسی حد تک نارمل میں کامیاب ہوگئی لیکن آنکھوں کی سُرخی نہ چھپا سکی۔ ویسے بھی اس کی یہ کوشش فضول تھی۔ شہروز ا ایک نظر میں ہی جان گئے تھے کہ وہ کسی قیامت سے گزر چکی ہے۔

اور ایک قیامت تو خود ان پر بھی گزر رہی تھی کہ صبح آفس میں فون پر ثاقب حسن نے انہیں اط دی تھی کہ وہ بہت جلد آنے والا ہے۔ ساتھ ہی یہ یاد دہانی بھی کرائی کہ اس کی ایک امانت اُن کے پا ہے۔ وہ بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ حالانکہ یہ تو اول روز سے تھا کہ ثاقب حسن کو آنا ہے لیکن وہ غیر ارادی طور پر کسی اور بات کے منتظر تھے اور بہت سا باتیں انہوں نے سوچ بھی لی تھیں۔

لیکن ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں اور زندگی کے اس موڑ پر وہ بے حد حیران تھے جس انہیں انتہائی بے بس اور مجبور بنا دیا تھا۔ دن میں کئی بار سوچا کہ وہ ربیعہ کو لے کر کہیں دور چلے جا کسی ایسی جگہ جہاں تک ثاقب حسن کبھی بھی رسائی حاصل نہ کر سکے۔ لیکن کیا ربیعہ اُن کا ساتھ دے گ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے ان گزرے دو بر کا ہر پل سوچ ڈالا لیکن کوئی ایسا لمحہ گرفت میں نہیں آیا۔ جب ربیعہ نے ہمیشہ اُن کے ساتھ رہنے خواہش کا اظہار کیا ہو۔ اُس کے برعکس وہ لاتعلق سی رہی، اپنے خول میں بند۔ کبھی انہوں نے احسا دلایا تو کچھ وقت کے لیے خول سے باہر نکل آئی۔ اس کے بعد پھر اپنی پرانی ڈگر پہ چلنے لگی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ وقت گزار رہی ہو اور منتظر ہو اس وقت کی جب اسے اس زندگی سے نجات ملے اور اب اسے اس زندگی سے نجات ملنے والی تھی۔ آفس سے گھر آتے ہوئے انہوں نے تھا کہ وہ اُسے ثاقب حسن کی آمد کے بارے میں بتلاتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیں گے اور اس کے تا سے ہی جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ خوشی محسوس کرتی ہے یا اس کے برعکس کوئی تاثر اس کے چہر پر اُبھرتا ہے۔

جب اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا تو ایک نظر اسے دیکھ کر ہی وہ ٹھٹک گئے تھے۔ زرد رنگ

ـے ساتھ چہرہ اُترا ہوا اور بے تحاشا سُرخ آنکھیں اس کی شدتِ گریہ کی چغلی کھا رہی تھیں۔ حالانکہ وہ فوراً ہی ـٹ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور کتنی دیر تک وہیں رہی۔ اس دوران وہ قیاس کرتے رہے کہ اُس کے ـونے کا سبب کیا ہوگا؟

ہوسکتا ہے ثاقب حسن نے اسے بھی فون پر اپنے آنے کے بارے میں بتایا ہو اور وہ بھی ان کی طرح ڈسٹرب ہوگئی ہو، اس آخری خیال نے ان کے لیے سوچوں کے نئے در کھول دیے۔ اور ابھی وہ نئی سوچوں میں اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ وہ آگئی۔

"کیا پروگرام ہے؟" وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"میں نے صبح آپ سے کہا تھا ناں کہ میں امّاں کے گھر جاؤں گی۔" اُس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

"ہاں۔" وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولے۔ "چلیں۔"

"آپ چائے وغیرہ پینا چاہیں تو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "آپ نے امّی سے کہہ دیا ہے؟"

"جی۔ ابھی جاتے ہوئے پھر کہہ دوں گی۔"

"چلیں پھر۔"

وہ بیگ اٹھا کر اُن کے پیچھے چل پڑی۔ دل ہی دل میں دُعا کر رہی تھی کہ چھوٹی آپا سے سامنا نہ ہو۔ اور اُن کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر شکر کیا۔ پھر امّی سے کہہ کر اُن کے ساتھ باہر آگئی۔

"کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے؟" گھر کے راستوں سے نکل کر گاڑی مین روڈ پر آئی تو اس سے پوچھنے لگے۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی، یہ شخص کیسے جان لیتا ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"نہیں تو۔"

"پھر آپ روئیں کیوں؟"

"اگر میں کہوں کہ میں نہیں روئی۔"

"تو میں جان جاؤں گا کہ کوئی بات ایسی ہے جو آپ مجھے بتانا نہیں چاہ رہیں۔ اور جسے چھپانے کے لیے آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ "وجہ نہ بتائیں لیکن اعتراف تو کرلیں۔"

"اعتراف بھی کرتی ہوں۔ اور وجہ بھی بتا دیتی ہوں۔"

"آج ثاقب حسن کا فون آیا تھا۔" وہ اس سے آگے بھی بتانا چاہتی تھی۔ ساری بات، لیکن کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ انہوں نے سوچا، وہ بھی بتا دیں کہ ثاقب کا فون اُن کے پاس بھی آیا تھا۔ لیکن پھر خاموش رہے کہ پہلے اس کی بات سُن لینی چاہیے اور وہ بس ایک جملہ کہہ کر خاموش ہوگئی تھی۔ بالآخر انہیں پوچھنا پڑا۔

"کیا رونے کی وجہ ثاقب حسن کا فون ہے یا اُس نے کوئی ایسی بات کی جو۔!"

"نہیں شہروز احمد۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "یہ صحیح ہے کہ اس کا فون مجھے پریشان کر دیتا ہے۔ اور پھر میں سنبھل بھی جاتی ہوں لیکن آج تو وہ انجانے میں مجھے پاتال میں دھکیل گیا ہے۔ جس سے میں کبھی نہیں نکل سکتی۔" کچھ دیر رُک کر کہنے لگی۔ "پتا ہے آج اس کا فون چھوٹی آپا نے ریسیو کیا تھا اور وہ چھوٹی آپا کی آواز پر میرا گمان کر کے پتا نہیں کیا کیا کہہ گیا۔"

"میرے خدا۔ ایک آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔" انہوں نے سوچا۔ ابھی ایک پل میں انہوں نے کیا کچھ نہ سوچ ڈالا تھا کہ وہ اس کے آنے کا سُن کر پریشان ہوگی اور کہے گی، اسے نہیں آنا چاہیے۔ اور اگر وہ آ ہی رہا ہے تو مجھے کہیں اور لے چلو۔ کہیں دور جہاں تک اُس کی رسائی ممکن نہ ہو لیکن وہ اس کے آنے سے

نہیں، اس بات سے پریشان تھی کہ صوفیہ تک بات پہنچ گئی تھی اور یقیناً رُسوائی کا خوف اُسے رُلا رہا تھا۔

"صوفیہ نے کیا کہا؟۔ کیا وہ ثاقب کے بارے میں جانتی ہیں؟" وہ پوچھنے لگے۔

"ہاں۔ میں نے بہت پہلے انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ لیکن بعد کے حالات نہیں جانتیں۔"

"یہ تو واقعی بہت بُرا ہوا۔ پھر کیا کہا انہوں نے؟۔"

"بہن ہونے کے ناتے بہت کچھ۔ بہت ملامت کی اور ایسی باتیں جنہوں نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔"

"آپ نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟"

"کیا کہتی؟۔ اور پھر اچانک ہی ایسی صورتحال ہو گئی تھی کہ میں کچھ کہتی بھی تو وہ یقین نہ کرتیں۔"

"صاف کہہ دیتیں کہ آپ کسی ثاقب حسن کو نہیں جانتیں۔"

"میں نے یہی کہا تھا لیکن۔" وہ ہونٹ بھینچ کر سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

انہوں نے گھر کے سامنے گاڑی روکی پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ کسی طرح صوفیہ کے سامنے آپ کی پوزیشن صاف کر دوں۔"

"مشکل ہے۔" وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"ناممکن تو نہیں۔ بہرحال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اور رونا بالکل نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اوکے؟۔" انہوں نے مُسکرا کر حوصلہ دیا تو وہ طویل سانس لیتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئی۔ پھر وہ اُس کے ساتھ اندر آئے تو ایک کپ چائے پینے تک ہی بیٹھے اور اسے پھر آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

اُس کی پریشانی صرف اتنی نہیں تھی کہ چھوٹی آپا کچھ جان گئی تھیں بلکہ اس سے زیادہ تو وہ اس بات سے پریشان تھی کہ ثاقب حسن آنے والا تھا۔

'اِتنی جلدی دو سال بیت گئے'۔ رات میں وہ سونے کے لیے لیٹی تو سوچنے لگی حالانکہ جب جاتے ہوئے ثاقب حسن نے اُس سے کہا تھا کہ دو سال پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے تو وہ اس سے اُلجھ پڑی تھی۔ کہ وہ اتنے بہت سارے دن کیسے گزارے گی۔ وہ بھی کسی دوسرے کے گھر میں اور اب جبکہ ان دو سالوں میں وہ اس گھر اور اس کے مکینوں سے مانوس ہو کر اُن کی محبتوں میں ہار گئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہمیشہ یہیں رہے تو لگ رہا تھا جیسے دو سال پلک جھپکتے میں گزر گئے ہوں۔

"تو کیا اب واقعی میں اس گھر میں چند دن کی مہمان ہوں؟۔" اس خیال نے اُسے بے حد آزردہ کر دیا۔

"میرے خدا۔ کس قدر کٹھن مراحل میرے منتظر ہیں۔" وہ سوچنے لگی۔ "جب ثاقب حسن کے کہنے پر شہروز احمد میرے ہاتھوں میں آزادی کا پروانہ تھمائیں گے۔ تو میں کس طرح سب کا سامنا کر سکوں گی۔ اور کیا جواز پیش کروں گی اور اب جب کہ چھوٹی آپا ثاقب حسن کے آنے کے بارے میں جان گئی ہیں تو میں کسی طرح بھی اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکوں گی۔

صرف میں ہی نہیں۔ امّاں اور ابّا میاں بھی لوگوں کی باتوں کا نشانہ بنیں گے۔ کس کس کا منہ بند کریں گی امّاں اور کیا جواب دیں گی۔" یہ سب باتیں سوچتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُس نے کبھی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچانے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر اب کیوں وہ سب کے لیے تکلیف کا باعث بننے جا رہی تھی۔

"تم نے سوچا، میرے ماتھے پر طلاق کا لیبل لگتے ہی لوگ کیسی کیسی باتیں کرنے لگیں گے؟" اس نے ثاقب حسن سے کہا تھا۔

"صرف چند دن۔ پھر جب ہم دونوں خوشگوار زندگی گزاریں گے تو وہی لوگ ہم پر رشک کیا کریں

گے۔" ثاقب حسن نے بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اسے آنے والے دنوں کے خواب دکھائے تھے۔

[او]ر اس وقت وہ یقیناً بہل گئی تھی کیونکہ اس کا دل اور دماغ اس کی گرفت میں تھا لیکن اب وہ اس کی [گ]رفت سے آزاد تھی۔ گئے دنوں سے مکمل طور پر ناتا توڑ کر طے کر چکی تھی کہ دوبارہ ان راہوں پر کبھی نہیں چلے [گ]ی خواہ ثاقب حسن اس کے راستے پر اپنا دل نکال کر کیوں نہ رکھ دے۔ اُس نے ایک بار پھر اپنا محاسبہ [ک]یا۔ ہر طرح سے دل کو ٹٹول کر دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ اُس کی ہلکی سی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ اس کے [بر]عکس وہ شخص اپنی ذات کی تمام تر اچھائیوں سمیت اس کے دل کے ہر خانے میں موجود تھا، جس نے [د]و سال تک پوری ایمانداری سے اُس کی پاسبانی کی تھی۔

"شہروز احمد۔" اس کے دل میں ہلکا ہلکا درد جاگنے لگا۔ "میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ محبت بھی [ن]ہیں۔ بس مجھے اپنی پاسبانی میں رہنے دو۔"

"یاد رکھو ربیعہ۔ شہروز احمد کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے بڑھ کر ہرگز نہیں [ہ]وگی۔" ثاقب حسن جیسے سامنے آن کھڑا ہوا، نہایت سفاکی سے کہتا ہوا۔

"وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار تو سکتے ہیں لیکن ایک عمر کی رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔ آخر کب [ت]ک تمہارے ماضی سے نظریں چرائیں گے۔"

وہ پریشان ہو گئی۔ تلخ حقائق کو سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن دامن نہیں بچا سکی۔ تھک گئی تو تکیے [م]یں منہ چھپا کر رونے لگی۔

پھر جتنے دن امّاں کے گھر رہی یوں ہی چُپ چاپ گم صم سی ہر وقت سوچوں کے بھنور میں پھنسی اپنے [آ]پ سے اُلجھتی رہی۔ کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ کھانے پینے کا، نہ کپڑے بدلنے کا۔ جہاں [بی]ٹھتی، کتنی کتنی دیر تک وہیں بیٹھی رہتی۔ امّاں، کلثوم یا ہُما میں سے کوئی اسے مخاطب کرتا تو بس 'ہوں [ہا]ں' کر کے خاموش ہو جاتی۔ خود سے بات کرنا تو جیسے بھول گئی تھی۔ بس ایک دھڑکا جو ہر غیر مانوس [آ]ہٹ یا دستک پر اسے چونکا دیتا۔ "کہیں میری قسمت کا فیصلہ تو نہیں ہو گیا۔" حالانکہ شہروز ہر روز شام میں [کچ]ھ دیر کے لیے آتے تھے۔ پھر بھی وہ خوفزدہ رہی اور اندر کے خوف نے اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج [ک]ر دیا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہی۔

"ایسا تو ہونا ہی تھا۔" آخری بار اُس نے سوچا تھا۔ "میری زندگی میں یہ موڑ تو دو سال قبل ہی لکھ [د]یا گیا تھا۔ اور جس کے بارے میں مجھے باخبر بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر میں اپنے آپ کو تیار کیوں نہ کر سکی؟ کیوں نہ اُسے مقدر جان کر قبول کر لیا؟۔"

"کیوں اس حقیقت سے نظریں چُرا کر ایک بار پھر غلطی کر بیٹھی؟"

"کیوں نئے راستوں پر قدم رکھے جو کسی منزل کا پتا نہیں دیتے؟۔"

"ربیعہ اکرام علی! سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے اور اب اپنی غلطیوں کا [خ]میازہ تو تمہیں بھگتنا ہی ہے۔" دل و دماغ نے فیصلہ دے دیا۔ اور وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔ یوں [ل]گا اس پر زندہ لاش کا گمان ہونے لگا۔ سارے احساسات ایک ایک کر کے گہری نیند سو گئے۔

نہ رُسوائیوں کا ڈر رہا، نہ ملامتوں کا خوف۔

نہ کھو دینے کا غم، نہ پا لینے کا کوئی احساس۔

نہ دھڑکنوں میں سرگوشیاں، نہ سماعتیں کسی آہٹ کی منتظر۔

کچھ بھی نہیں۔ بس ایک سناٹا اندر باہر ہر طرف۔ وشت کی سی ویرانی آنکھوں میں اُتری تو ٹھہر گئی۔ [ک]وئی پکارتا تو خالی خولی نظروں سے دیکھے جاتی۔ کوئی بُلاتا تو کسی روبوٹ کی طرح پاس جا کھڑی ہوتی۔ [ا]پنا کوئی سوچ نہیں، کوئی مرضی نہیں۔ جس نے جو کہہ دیا، کر لیا، مان لیا۔

[ت]ین دن سے اُس کی یہی حالت تھی۔ امّاں پریشان ہو گئیں۔ اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"
"کیا ہوا ہے مجھے؟" اُلٹا اُن ہی سے پوچھنے لگی۔
"شہروز تو تمہیں اچھا بھلا یہاں چھوڑ گئے تھے۔ پھر یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔ نہ ٹھیک سے کھاتی پیتی ہو، نہ بولتی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"پتا نہیں۔" (خود اپنی خبر نہیں)
"سنو۔" اماں قریب ہو کر سرگوشی میں بولیں "کوئی خوشی کی خبر تو نہیں؟"
"خوشی کی خبر۔؟" وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"میرا مطلب ہے، نئے مہمان کی آمد؟" اماں نے مسکرا کر کہا۔ اور اگر کوئی احساس زندہ ہوتا تو اُس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا۔ لیکن وہ سارے احساس کھو چکی تھی۔ اماں کی بات پر چپ چاپ اُن کی طرف دیکھے گئی۔
"دو سال بھی تو ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو۔ میں تو ہر وقت دُعا کرتی ہوں، اللہ تعالیٰ تمہاری گود ہری کرے۔" اماں کہنے لگیں "یہ بھی اللہ کا شکر ہے۔ سسرال والے اچھے ہیں، کوئی طعنے نہیں دیتے"
اُس نے یونہی سر جھکا لیا۔
"آج شہروز آئے تو اُس سے کہتی ہوں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ دیکھو تو رنگت بھی کتنی زرد ہو رہی ہے۔"
اماں کی باتوں کا اِس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
شام میں شہروز آئے۔ آتے ہی اُسے چلنے کے لیے کہا۔ ویسے بھی اُسے یہاں آئے ہوئے آج آٹھ دن ہو گئے تھے، وہ جس طرح کھڑی تھی، اسی طرح بیگ اُٹھا کر لے آئی۔ انہوں نے سرتا پا اس کا جائزہ لیا، پھر کہنے لگے۔
"جائیے۔ پہلے اپنا حلیہ ٹھیک کر کے آئیں۔" وہ اسی طرح بیگ لیے ہوئے واپس اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ڈریس چینج کر کے آئی تو وہ اماں سے اجازت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔
"بیٹا۔ اِسے کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔ بہت کمزور لگ رہی ہے۔" اماں شہروز کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ انہوں نے جی بہتر کہا۔ پھر سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اسے لے کر باہر آ گئے۔
راستے میں کئی بار انہوں نے اُسے مخاطب بھی کیا۔ کوئی بات بھی کی لیکن وہ نہ تو متوجہ ہوئی، نہ اُن کی بات کا جواب دیا۔ اُس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، اُن کی آواز سُن ہی نہ سکی تھی۔ گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے ٹی وی لاؤنج میں چھوٹی آپا سے سامنا ہو گیا۔ اِسے دیکھ کر چھوٹی آپا نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ عام حالات میں یقیناً اس کے دل کو دھچکا لگتا لیکن اس وقت کیونکہ وہ ہر احساس سے عاری تھی اس لیے اُن کی اس حرکت کو خاموشی سے دیکھا جب کہ شہروز احمد محسوس کر گئے تھے، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ اُسے بٹھا کر خود سامنے بیٹھے تو کہنے لگے۔
"کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہیں؟"
اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"صوفیہ نے اچھا نہیں کیا لیکن۔"
"کیا کیا انہوں نے؟" وہ سادگی سے پوچھنے لگی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے، پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔
"اچھا ہوا، آپ نے دیکھا نہیں۔ بہرحال اگر آپ محسوس بھی کریں تو نظر انداز کر دیں۔ میں نہیں چاہتا اس آخری وقت میں یہاں آپ کی دل آزاری ہو۔"
اُس کے جھکے ہوئے سر سے ہوتی ہوئی اُن کی نظریں اُس کے ہاتھوں پر جا ٹھہریں۔ وہ شہادت کی اُنگلی سے بائیں ہتھیلی پہ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ طویل سانس لیتے ہوئے بولے۔

"آپ کو شاید یاد ہو۔ میں نے بارہا آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس گھر کی چار دیواری میں آپ پر کبھی کوئی الزام نہیں آنے دوں گا۔ اور آخری بار تو میں نے یہاں تک کہا تھا کہ خواہ ثاقب حسن ہی کیوں نہ یہاں تک چلا آئے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔
"عجیب اتفاق ہے۔ بلکہ المیہ کہنا چاہیے کہ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو اس آخری وقت میں ثاقب حسن غلطی کر گیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ثاقب حسن کا بھی قصور نہیں ہے۔ صوفیہ اور آپ کی آواز اتنی ملتی ہے کہ بعض اوقات تو میں بھی دھوکا کھا جاتا ہوں۔ بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" اُن کے خیال میں اُس کی پریشانی، خاموشی اور گم صُم ہو جانا صرف اسی بات کی مرہونِ منت تھی کہ صوفیہ نے ثاقب حسن کا فون ریسیو کر لیا تھا۔
"چلیے امّی سے مل لیں۔ انہوں نے صبح کئی بار مجھے تاکید کی تھی کہ آج میں آپ کو ضرور لے آؤں۔" وہ خاموشی سے اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑی۔
امّی اور اُن کے ساتھ چھوٹی آپا اور مہروز بھی لاؤنج میں موجود تھے۔ وہ سلام کرتی ہوئی امّی کے پاس بیٹھ گئی۔
"جیتی رہو بیٹا۔ خوش رہو۔" امّی نے ہمیشہ کی طرح محبت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا تو وہ چونک گئیں۔ زرد رنگت، اُترا ہوا چہرہ اور سیاہ حلقوں کے درمیان آنکھیں بے حد ویران سی۔ امّی تشویش سے پوچھنے لگیں۔
"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"
"جی۔"
"بیمار رہی ہو کیا؟"
"نہیں۔"
"پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" امّی نے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔
"کیا ہوا ہے مجھے؟" وہ اُن سے پوچھنے لگی۔
"بیٹا۔ صحت کی طرف سے لاپروائی اچھی نہیں ہوتی۔ دیکھو تو کتنی کمزور ہو رہی ہو۔" پھر شہروز کو مخاطب کر کے کہنے لگیں "شہروز! تم ربیعہ کا خیال نہیں رکھ رہے۔ صبح ہی جا کر ڈاکٹر سے چیک اَپ کراؤ۔" خوابیدہ احساسات پہ محبتوں کی پھوار برسنے لگی اور اِس سے پہلے کہ کوئی احساس بیدار ہوتا، وہ خفگی سے کہنے لگے۔
"یہ خود بہت لاپروا ہیں۔"
"یہ لاپروا نہیں ہے۔" امّی نے اُس کی طرف داری کی تو وہ کہنے لگے۔
"آپ نہیں جانتیں۔ ابھی کچھ دن پہلے میرے عزیز دوست ثاقب حسن کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ڈھنگ سے اُس کی بات ہی نہیں سُنی۔ بس [illegible] فون بند کر دیا حالانکہ میں انہیں خاص طور سے بتا کر گیا تھا کہ کسی بھی وقت اُس کا فون آئے گا۔" اُن کی بات پر وہ تو چونکی ہی، چھوٹی آپا بھی چونک کر دیکھنے لگی تھیں۔
"کوئی کام ہو گا اُسے جبھی فون بند کر دیا ہو گا۔ ورنہ یہ اتنی غیر ذمہ دار نہیں ہے۔" امّی نے پھر اُس کی حمایت کی تو وہ جھنجھلا کر بولے۔
"مزید کیا کہوں؟ آپ ان کا قصور مانیں گی ہی نہیں۔"
"بالکل۔" امّی اس کا کندھا تھپک کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگیں "بہرحال تم صبح اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا۔"

"اور آپ نے مجھے ثاقب حسن کے فون کے بارے میں بتایا بھی نہیں تھا۔" امّی کے جانے کے بعد وہ اسے مخاطب کر کے قدرے اُونچی آواز میں کہنے لگے۔ مقصد چھوٹی آپا کو سنانا تھا او بالکل نہیں سمجھی کہ وہ اس طرح علی الاعلان ثاقب حسن کے بارے میں گفتگو کیوں کر رہے ہیں۔ کہنے لگے۔

"آج آفس میں اس کا فون آیا تھا۔ بہرحال اچھی خبر یہ ہے کہ آپ کے کہنے پر نادیہ کے وا اُس کی شادی ثاقب سے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں اور وہ جلد واپس آنے والا ہے۔"

کچھ کہنے کے لیے اُس کے ہونٹ نیم وا ہوئے تھے کہ وہ آنکھوں سے اسے خاموش رہنے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"وہ فون پر آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ اب اُس کی منزل قریب ہے اور ساتھ میں شکریہ بھی چاہتا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی بات ہی نہیں سُنی۔"

وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کنکھیوں سے چھوٹی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔ جو شہروز کی بات پُوری توجہ سُن رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر اُلجھن کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

"خیر اب آئے گا تو آپ اس سے معذرت کر لیجیے گا۔" اُس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑے ہو اُس نے انہیں کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا پھر خود بھی اُٹھ کر اُن کے پیچھے چل پڑی۔ کمرے آئی تو وہ کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے میں نے صوفیہ کو شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔ اب وہ آپ سے دوبارہ ثاقب کے بارے میں ضرور پوچھے گی تو پلیز آپ اپنے ذہن کو ذرا حاضر رکھ کر اسے کوئی فرضی کہانی سُنا گا۔" وہ خاموشی سے اُن کی طرف دیکھے گئی۔

"کوئی کہانی بھی میں ہی گھڑ کر بتاؤں۔۔؟"

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"پھر اِس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا آپ پر کوئی الزام نہیں آنے دوں گا۔ اور میں اپنا وعدہ نبھایا ہے۔"

"پھر بھی شہروز احمد۔" وہ سر جُھکا گئی۔ "میں تو شاید کبھی بھی چھوٹی آپا کو۔"

"آپ نے شاید اس بات کا بہت زیادہ اثر لے لیا ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگے۔ آپ کو دیکھیں، کیا حال کر لیا ہے۔ امّی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ افسردگی سے مُسکرائی۔

"بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔ اور پلیز چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لینا چھوڑ دیں ورنہ حالات کا مقابلہ کیسے گی۔ زندگی میں تو بڑے بڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرار حاصل کرنے یا آنکھیں بند کر لینے امتحان یا آزمائشیں ٹل نہیں جاتیں۔ بلکہ اور دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہاں اگر بندہ ہمت اور حوصلہ کرے تو ان آزمائشوں سے آسانی سے تو نہیں، پھر بھی گزرا جا سکتا ہے۔" قدرے توقف کے کہنے لگے۔ "ان دو سالوں میں میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو اِتنا پُراعتماد بنا دوں کہ آپ جرأ سے حالات کا مقابلہ کرنا سیکھ جائیں۔ لیکن آپ نے شروع دن سے جو حصار اپنے گرد کھینچ لیا اس سے نکلنے کو تیار ہی نہیں ہوئیں۔"

"اپنے گرد حصار کھینچنا اور اس میں مُقید رہنا میری مجبوری تھی۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

ہیں جانتا ہوں آپ کس قدر مجبور تھیں اور ہیں؛ اس لیے میں آپ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ صوفیہ ت سے سر ٹکا کر اس پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔ "بہرحال اب جب وقت گزر ہی چکا ہے۔ ں کہوں گا اس تمام عرصے میں اگر میری کوئی بات آپ کو بُری لگی ہو تو۔"

نہیں شہروز احمد۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "آپ نے تو اکثر مجھے مایوسیوں کی انتھاہ گہرائیوں سے نکالا ہے۔ جب بھی اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے اندھیروں میں بھٹکنے لگی تو روشنی کی کرن پ ہی کی طرف سے آئی۔ اور میں جو زندہ سلامت نظر آ رہی ہوں تو آپ ہی کی وجہ سے میں تو گرتی ہوئی ر تھی۔ آپ نے بہت حوصلہ اور سہارا دیا ورنہ کب کی ڈھے گئی ہوتی۔"

وہ اُس کی طرف دیکھے گئے۔ سر جھکائے اپنے ناخنوں کو چھیڑتی ہوئی بہت عام سے لہجے میں کر رہی تھی جیسے وقتِ رُخصت کوئی بھی اس طرح کی رسمی باتیں کرتا ہے۔

"نہیں ربعہ۔" اس کے خاموش ہوتے پر سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے لے۔ "میں سمجھتا ہوں، میں نے آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اوّل روز جس طرح آپ مجھے نظر تھیں، ابھی بھی بالکل ویسی میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ گزرتے ماہ و سال نے آپ کا کچھ بھی نہیں ڑا۔ وہی لہجہ، اوّل روز والا۔ کچھ سوچتا، کچھ اُلجھتا ہوا۔ جیسے آپ سمجھ نہیں پا رہیں کہ آپ کے ساتھ ہوا ہے۔ یا اگر سمجھ رہی ہیں تو یقین نہیں کر رہیں۔"

وہ ذرا سا سر اُونچا کر کے، اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ اگر جو کوئی احساس زندہ ہوتا تو دل میں ضرور درد ا کہ یہ شخص جو رگِ جاں سے قریب تر ہے، اس سے جُدائی کے خیال سے کس قدر آزردہ نظر آ تھا۔

"میرا خیال ہے آپ نے میری بساط اور تصوّر سے بڑھ کر میرے لیے کیا۔ یہی کیا کم ہے کہ دو ل کے عرصے میں مجھے آپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ جب کہ میں نے بارہا آپ کو شکایت مواقع فراہم کیے۔ کبھی اپنے روّیے سے، اور کبھی اپنی باتوں سے۔ اور رہا یہ سوال کہ میں اوّل روز ی نظر آئی تھی، اب بھی ویسی ہی نظر آ رہی ہوں، تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جب میں یہاں آئی ا تو میرے دل میں نہ کوئی خواہش تھی، نہ اُمنگ، نئے سفر کا کوئی نیا احساس نہیں جاگا تھا۔ اور نہ ہی ڑکنوں نے کوئی راگ الاپے تھے۔ اس کے برعکس کھو دینے کا احساس حاوی تھا اور اب بھی ا ہی ہے۔"

وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"کیا اب بھی کھو دینے کا احساس ہے؟"

"ہاں۔" وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔ "اس گھر میں مجھے بے پناہ نیں ملی ہیں۔ امّی، آپی، مہروز اور ندا (اُن کا نام نہیں لیا) سب نے بہت خلوص سے چاہا مجھے۔ یہ چاہتیں کھو دینے کا احساس ہر بات پر حاوی ہے۔"

"یہ چاہتیں آپ کا حق تھیں۔ اس لیے کہ ایک تو آپ شہروز احمد کے حوالے سے یہاں آئیں دوسرے آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو۔"

دروازے پر دستک کی آواز سے اُن کی بات وہیں رہ گئی۔

"کون ہے؟۔ آ جاؤ۔" انہوں نے کہا تو مہروز ذرا سا دروازہ کھول کر سر اندر کرتا ہوا بولا۔

"آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھانا۔؟"

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر آئیے۔"

"چلیں ربعہ۔" انہوں نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

رات اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔ ابتدائی پہر میں اِدھر اُدھر سے کوئی آواز سنائی دے جا
پھر رفتہ رفتہ ساری آوازیں جیسے تھک کر سوگئیں۔ وہ بھی تھک گئی تھی۔ سونے کی بہت
کی لیکن نیند کسی طرح مہربان نہ ہوئی۔ حالانکہ ذہن بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی خیال
ایک بے قراری سی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اُٹھ بیٹھی۔ تکیہ اُونچا کر کے اس پر
کمر ٹکاتے ہوئے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کوئی چیز واضح نہیں نظر آرہی تھی۔ اُس
بیڈ کی پٹی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ باہر سے کہیں زیادہ تاریکی اُس کی پلکوں کے اندر اُتر آئی
اُسے لگا جیسے وہ اندھیری راہوں میں بھٹک گئی ہو۔ کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔ اور کوئی نہیں تھا
میں ایک چراغ ہی رکھ دے، جس کی مدھم لو میں وہ اپنا راستہ پالے۔
اس گہری خاموشی میں اچانک ہلکا ہلکا شور سُنائی دینے لگا تو اُس نے چونک کر آنکھیں
دیں۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ کیسا شور ہے؟ جب غور کیا، تب جانا کہ آس پاس کہیں
ریکارڈ بج رہا تھا گو کہ آواز بہت آہستہ تھی جیسے سُننے والے نے صرف اپنے لیے آن کیا ہو لیکن
تنہائی اور گہری خاموشی کے سبب وہ صاف سُن سکتی تھی۔

ہمیں کوئی غم نہیں تھا غمِ عاشقی سے پہلے
نہ تھی دُشمنی کسی سے تیری دوستی سے پہلے

"کون ہے؟" وہ خاموشیوں سے پتا پوچھ رہی تھی۔

ہے یہ میری بدنصیبی تیرا کیا قصور اس میں
تیرے غم نے مار ڈالا مجھے زندگی سے پہلے

بہت آہستگی سے بیڈ سے نیچے اُتر آئی اور دبے پاؤں آ کر کھڑکی سے پردے ہٹا
بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا چاند ایک دم نظروں کی زد میں آگیا۔

میرا پیار جل رہا ہے ارے چاند آج چھپ جا!
کبھی پیار تھا ہمیں بھی تیری چاندنی سے پہلے
میں کبھی نہ مسکراتا، جو مجھے یہ علم ہوتا!
کہ ہزاروں غم ملیں گے مجھے اک خوشی سے پہلے

"ارے۔" وہ ایک بار پھر چونکی۔ "یہ آواز تو شہروز احمد کے کمرے سے آرہی ہے۔"
آہستہ روی سے چلتی ہوئی اسٹڈی روم کے دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک
رہی۔ اس کے بعد ایک اور غزل تھی۔ پھر ٹیپ بند کرنے کی آواز آئی تو وہ اُلجھتی ہوئی دوبارہ بیڈ پر آگئی۔
صبح آفس جاتے ہوئے شہروز اس سے کہہ گئے تھے کہ "وہ کچھ ضروری کام دیکھ کر دو گھنٹے
واپس آجائیں گے۔ پھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔" اس نے بس اُن کی بات سُن لی
اور اُن کے جانے کے کچھ دیر بعد چھوٹی آپا اُس کے پاس آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ
اس سے کیا بات کریں گی۔
"اماں کے گھر سب ٹھیک ہیں؟" چھوٹی آپا بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔
"ہاں۔ اماں آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔ کسی وقت ہو آئیے ان کے پاس۔"
"ہاں جاؤں گی۔" چھوٹی آپا اپنی کلائی میں پڑے کنگن کو چھیڑتے ہوئے بولیں۔ اُن کا
ہوا تھا۔ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھی رہیں۔ ان کا انداز بتا رہا تھا جیسے بات کرنے کے لیے
ڈھونڈ رہی ہیں۔
"سنو۔" کافی دیر بعد بولیں۔ "شہروز بھائی اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ب؟" وہ انجان بن گئی۔
"کل شام۔ جب تم پر خفا بھی ہو رہے تھے۔"
"ہاں وہ۔" وہ جیسے یاد کرتی ہوئی بولی۔ "ثاقب حسن کے بارے میں بات کر رہے تھے۔"
"کون ثاقب حسن؟"
"اُن کا ایک دوست ہے اور چھوٹی آپا اس نام کا صرف ایک ہی شخص نہیں ہے اس پوری دنیا
۔"
"ہاں لیکن۔"
"لیکن کیا؟" وہ چھوٹی آپا کو اُلجھتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"وہ فون پر اُس روز اتنی بے تکلفی سے تمہارا نام لے رہا تھا کہ۔"
"کیا آپ کو اس پر اسی کا گمان ہوا۔" وہ فوراً بولی۔ تو چھوٹی آپا اپنی جگہ چور سی بن گئیں۔
"آئی ایم سوری ربیعہ۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت غلط قسم کی باتیں کہہ دی تھیں
ل ہیں۔"
"جانے دیں چھوٹی آپا۔" وہ اُن کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ "محض غلط فہمی کی بنا پر یہ سب ہوا،
آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو یقیناً ایسی ہی باتیں کہہ جاتی۔"
"تمہیں دکھ تو ہوا ہوگا۔" وہ اُس کی طرف دیکھ کر بولیں۔
"ہاں دکھ تو ہوا۔ لیکن خیر چھوڑیں اس قصے کو۔" وہ موضوع بدلتی ہوئی بولی۔ "یہ بتائیں میر
ندا تو نہیں آئی۔"
"نہیں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے؟"
"نہیں، بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ بہت دنوں سے آئی نہیں۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔
"ی کے پاس چلیں۔ وہ اکیلی بیٹھی ہوں گی۔"
"امی کلام پاک کی تلاوت کر رہی ہیں، تم بیٹھو۔" چھوٹی آپا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔
پھر کہنے لگیں۔ "یہ بتاؤ، تم نے مجھے معاف کیا یا نہیں؟"
"چھوٹی آپا۔ اب چھوڑیں اس بات کو۔ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی میل نہیں۔"
"سچ کہہ رہی ہو نا؟"
"ہاں۔" وہ ہلکے سے مسکرائی تو چھوٹی آپا نے اُس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔
"تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔ نہ خود خفا ہوتی ہو نہ کسی کو خفا دیکھ سکتی ہو۔"
اسی وقت لاؤنج سے باتوں کی آواز آنے لگی تو چھوٹی آپا خاموش ہو کر سُننے کی کوشش کرنے لگیں۔
"میرا خیال ہے ندا آئی ہے۔" وہ کہنے لگی۔
"ارے ہاں۔ اسی کی آواز ہے۔ چلو ابھی تم اسے یاد بھی کر رہی تھیں۔"
وہ چھوٹی آپا کے ساتھ اُٹھ کر کمرے سے نکلی تو ندا اسی طرف آرہی تھی۔ اُس نے بے اختیار
اپنے بازو پھیلا دیے۔ ندا اس کے سینے سے لگی تو وہ کہنے لگی۔
"ابھی ابھی میں نے تمہیں یاد کیا تھا۔"
"آپ نے یاد کیا اور میں آگئی۔" ندا کھلکھلا کر ہنسی پھر چھوٹی آپا کے گلے لگتی ہوئی بولی۔
"آپ کیسی ہیں صوفیہ بھابی؟"
"ایک دم فرسٹ کلاس۔ البتہ ربیعہ کچھ بیمار ہے۔"
"ارے کیا ہوا بھابی؟" ندا اُسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔ "آپ تو واقعی بہت
اور الگ رہی ہیں۔ خیر تو ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں بھئی ۔ تم سب کو تو یونہی وہم ہوگیا ہے ۔" پھر بات بدلتے ہو
"اکیلی آئی ہو؟ ۔ سلمان نہیں آئے تمہارے ساتھ ؟ ۔"
"وہ مجھے باہر ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں ۔"
"کیوں ؟ ۔"
"وہ کسی ضروری کام سے جا رہے تھے ۔ شام میں اطمینان سے آئیں گے ۔"
"اچھا ۔ تم بیٹھو تو ۔ اُس وقت سے کھڑی ہو اور یہ امّی کہاں ہیں ؟ ۔" وہ اُسے صو
ہوئی امّی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی ۔
"امّی ابھی آ رہی ہیں ۔ میں ان سے مل چکی ہوں ۔" ندا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس
اُسی وقت فون کی بیل بجی تو چھوٹی آپا اُٹھ کر چلی گئیں ۔ کچھ دیر بعد واپس آئی، تو کہنے
"ربیعہ ۔ شہروز بھائی کا فون ہے ۔ تمہیں بُلا رہے ہیں ۔"
وہ ندا سے "ابھی آتی ہوں" کہہ کر فون سننے چلی گئی ۔
"ربیعہ ۔" اُس کے ہیلو کہنے پر انہوں نے شاید اپنے اطمینان کے لیے اس کا نام لیا ۔
"جی میں ہوں ۔"
"کیا کر رہی تھیں ؟ ۔"
"کچھ نہیں ۔ ابھی ندا آئی ہے ۔ اُس کے پاس بیٹھی تھی ۔"
"اچھا ۔" وہ "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گئے ۔ کتنی دیر گزر گئی ۔ وہ اُن کے بولنے کی منتظر
وہ پتا نہیں یونہی خاموش تھے یا کسی کام میں مصروف ہو گئے تھے ۔
"ہیلو ۔" وہ کریڈل پہ ہاتھ مار کر بولی ۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے ؟ ۔"
"وہ ایسا ہے ربیعہ کہ ۔" پھر خاموشی ۔ اور وہ اُلجھنے لگی ۔
"شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت نہیں آ سکتے اور یہ کہ میں ڈاکٹر کے پاس ا
ساتھ چلی جاؤں یا آپ شام میں آئیں گے، تب لے جائیں گے ۔"
"نہیں، یہ بات نہیں ہے ۔" وہ اُس کی پوری بات سننے کے بعد بولے ۔
"پھر ۔ ؟ ۔" اُن کے خاموش رہنے پہ کہنے لگی ۔ "پلیز شہروز احمد جو بھی بات ہے، ک
میں بہت اُلجھن محسوس کر رہی ہوں ۔"
"بات یہ ہے ربیعہ ۔ کہ ثاقب حسن یہاں آ چکا ہے ۔ اور وہ ابھی ابھی میرے پاس سے
گیا ہے ۔"
کچھ دن پہلے اگر وہ یہ اطلاع دیتے تو یقیناً وہ زلزلوں کی زد میں آ جاتی ۔ اور اب جب کہ
احساسات گہری نیند سو چکے تھے ۔ تو نہ دل کسی خوف سے دھڑکا اور نہ سائبان چھن جا
خیال آیا ۔ اندر کہیں شاید آزردگی سمٹی تھی، وہ بھی لہجے میں نہیں اُتری، جبھی سہولت سے ک
"پھر ؟ ۔"
اُس کے "پھر" کہنے سے شہروز احمد واقعی بوکھلا گئے ۔ ان کے خیال میں اگر وہ اور کچھ نہ بھ
تو خاموشی ضرور اختیار کر لے گی لیکن وہ تو ایک لفظ کہہ کر اب اُن کے بولنے کی منتظر تھی ۔
"آپ جانتی ہیں ۔" وہ کہنے لگے ۔ "دو سال پہلے، اُس نے مجھے آپ سے شادی کر
لیے کہا اور مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ جب وہ واپس آئے گا تو میں آپ کو چھوڑ دوں گا ۔ ایک
اُس نے اپنی امانت کے طور پہ آپ کو ۔"
"میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں ۔" وہ اُن کی بات کاٹ کر بولی ۔
"ابھی وہ اسی سلسلے میں آیا تھا ۔" کچھ دیر رُک کر کہنے لگے ۔ "اور میں کیونکہ وعدے کی ز

ہوں، پابند شخص ہوں، اس لیے آپ بتائیں، میں اُسے کیا جواب دوں ؟ ۔"
روز احمد ۔ دو سال قبل جب آپ دونوں کے درمیان کوئی بات طے ہوئی تھی، تو کیا اُس وقت
جود تھی ۔ ؟ مجھ سے پوچھا تھا کسی نے ؟ ۔ نہیں ناں تو پھر اب مجھے کیوں گھسیٹ رہے
ں لیے کہ میں سمجھتا ہوں، آپ کی آئندہ زندگی اور خواہشات کا دار و مدار میرے جواب پر ہے ۔"
اہشات ؟ ۔" اُس کے ہونٹوں نے تلخ ہنسی کو چھوا ۔ "عرصہ ہوا ساری خواہشات اپنی موت
ئیں ۔ آپ کن خواہشات کی بات کرتے ہیں اور پھر یہ بات دو سال پہلے آپ نے کیوں
؟ ۔ شہروز احمد ! جب اس وقت خیال نہیں کیا تو اب کیوں ؟ ۔"
ں وقت میں آپ کو نہیں جانتا تھا ۔"
ب جانتے ہیں ۔ ؟ ۔" وہ ۔ بے دھڑک پوچھ گئی ۔ اِس وقت وہ صرف ربیعہ اکرام علی تھی ۔ ہر
سے عاری ۔ نہ گزری محبتوں کا خیال تھا اور نہ نئی محبتوں کا احساس، نہ ملامتوں کا ڈر، نہ رسوائیوں
ں کچھ بھی باقی نہیں تھا ۔
ں تلخ یادوں سے گھبرا کر دُعا کرتے ہیں کہ "الٰہی چھین لے مجھ سے حافظہ میرا" اور اُس نے تو
ی دُعا نہیں مانگی تھی، پھر پتا نہیں کیسے ہر احساس کھو بیٹھی ۔ زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ
ہروز اس سے پوچھتے تو شاید وہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے کہہ دیتی ۔ "میں
آپ کا ساتھ چاہتی ہوں ۔" اور اب شہروز احمد یہی ایک جملہ سننے کے نہ صرف منتظر تھے،
رت سے دُعا مانگ رہے تھے کہ وہ ایسا ہی کہہ دے پھر خواہ ثاقب حسن انہیں وعدہ خلاف
خیانت کا الزام اُن کے سر رکھے، وہ اسے صاف جواب دے دیں گے، لیکن وہ کہہ رہی تھی ۔
ہروز احمد ۔ آپ ہوں یا ثاقب حسن، دونوں کے نزدیک میری حیثیت کسی بے جان اور
تی کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں ہے ۔ ایسا کھلونا جسے خریدنے کی ثاقب حسن طاقت نہیں رکھتا
ر آپ کیونکہ صاحبِ ثروت تھے، اس لیے اُس نے آپ کا سہارا لیا کہ اسے خرید کر سنبھال رکھو ۔
با سجا دو اور جب میں گردشِ دوراں سے نکل کر آؤں تو اسے میرے حوالے کر دینا ۔ اور
نے مان لیا ۔ وہی کیا جو اُس نے کہا ۔"
بیعہ ۔" وہ شاید اُس کے اس طرح بولنے سے حیران ہوئے تھے ۔ کچھ کہنا چاہا کہ وہ پھر بول پڑی ۔
یں اس وقت بھی جب آپ دونوں کے درمیان کوئی بات طے ہوئی تھی، اس سے بے خبر
ر میں اب بھی بے خبر رہنا چاہتی ہوں ۔ اگر کاتبِ تقدیر نے میری ڈور آپ دونوں کے ہاتھوں
ماہی دی ہے، تو پھر آپ با اختیار ہیں، جو چاہیں کریں ۔"
یں یہ اختیار آپ کو دے رہا ہوں ۔"
جھے ؟ ۔" وہ رو پڑی ۔ جانے کس جذبے کے تحت ۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں حلق
لہ سا اٹک گیا کہ پھر وہ پکارتے رہ گئے ۔ اور وہ ایک لفظ نہ بول سکی ۔
اہستگی سے ریسیور رکھ کر دوسرے راستے سے اپنے کمرے میں آ گئی ۔ وہ جانتی تھی کہ
ر چھوٹی آپا کسی وقت بھی اُسے پکارنے لگیں گی، اس لیے جلدی سے منہ دھو کر اپنے آپ کو
کرتی ہوئی دوبارہ ان دونوں کے پاس آ بیٹھی ۔
جب کہ شہروز احمد اُلجھ کر رہ گئے تھے ۔ اُس کی باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کر پائے کہ آخر وہ کیا
ا ہے ۔
ملکہ بے خبر تھی اور اب بھی بے خبر رہنا چاہتی ہوں ۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے یہی کہا تھا
سر چکرانے لگے ۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے اور ثاقب حسن کو ایک ہی قطار میں کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ غالباً یہ ہے کہ گزر تو جاتی ہے، کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی کے ساتھ میں ہوں یا ثاقب حسن۔" اُن کے اندر ایک دم ڈھیر ساری تلخی بھر گئی۔

"ربیعہ اکرام علی۔" دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔ "تمہارے نزدیک کی شخصیت خواہ کتنی ہی قدر آور کیوں نہ ہو، میں اپنے آپ کو اس قطار میں کھڑا نہیں میرے نزدیک وہ ایک مُرد، ضمیر شخص ہے جو اپنی محبت واں رکھنے میں کوئی عار نہیں سمجھ

وہ ایک پل میں فیصلہ کر کے اُٹھے اور آفس سے نکل آئے۔ تمام راستہ وہ یہ سوچتے اپنا فیصلہ ایک دم سے کیسے سُنا سکیں گے۔ گھر میں داخل ہوئے تو صورتحال انہیں اپنے حق میں صبح آفس جاتے ہوئے وہ اُس سے کہہ کر گئے تھے کہ اس وقت آ کر اُسے ڈاکٹر کے پاس گے اور امّی کے علم میں بھی یہ بات تھی اور اس لحاظ سے اُسے اس وقت تیار ہونا چاہیے وہ صبح والے حلیے میں بیٹھی تھی۔ اُن کے اندر ٹوٹ پھوٹ تو تھی ہی، اسے دیکھ کر شدّت سے چہرہ بھی سُرخ ہو گیا۔

"ربیعہ —" اتنی اُونچی آواز میں پکارا کہ وہ تو سہم کر کھڑی ہوئی ہی، ندا اور چھوٹی آپا بھی اُٹھ

"میں صبح آپ سے کہہ کر گیا تھا کہ میں اس وقت آؤں گا اور میں اپنے بہت سے ... چھوڑ کر آیا ہوں۔"

اُس کے سر جھکانے پر اور اُونچی آواز میں کہنے لگے۔

"ایک دفعہ کی کہی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ کو ہر بات بار بار کہنی پڑتی ہے اتنا فالتو شخص نہیں ہوں کہ اپنی ساری زندگی آپ کو ذرا ذرا سی بات سمجھانے میں گزار اُن کی اُونچی آواز سن کر امّی اپنے کمرے سے نکل آئیں اور وہ اُن کا خیال کیے بغیر کہنے

"حد ہوتی ہے برداشت کی اور میں نے دو سال تک آپ کی یہ لاپروائیاں برداشت اِس اُمید پر کہ شاید آپ سنبھل جائیں۔ اپنی ذمّہ داریاں سمجھیں، میرے وقت کا احساس لیکن آپ کو کسی بات کا کوئی احساس نہیں — اور میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ فرام ہیئر —"

"شہروز —" امّی نے آگے بڑھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں پکارا۔

لیکن وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ اس سے زیادہ اُونچی آواز میں بولے۔

"گیٹ لاسٹ ربیعہ۔ میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا۔"

اس کے ساتھ ساتھ اس گھر کے در و دیوار بھی حیران تھے جنہوں نے کبھی شہروز احمد آواز میں بولتے نہیں سُنا تھا

"شہروز بیٹا آرام سے۔" امّی نے انہیں غصّے پر قابو پانے کے لیے کہا لیکن غصّہ کہا یہ تو وہ وقت تھا جس کے تصور سے گذشتہ دو برسوں میں بارہا وہ اندر تک لرزے۔

"آپ ان کی طرف داری نہ کریں امّی — میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے طلاق دیتا ہوں۔"

"شہروز احمد —" امّی کی چیخ نما آواز اُن سے کہیں اُونچی ہو گئی۔ "روک لو اپنی آواز کو۔"

"اور اے کاش اُوپر والا قوتِ گویائی چھین لے ہمیشہ کے لیے۔" انہوں نے سوچا ا

ربیعہ اکرام علی ضرور قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی تھی کہ چاہنے اور کوشش کے باوجو "نہیں" تک نہ کہہ سکی۔

"میں — تمہیں — طلاق دیتا ہوں ربیعہ —" امّی کے منع کرنے کے باوجود دوسری بار

ے ساتھ چھوٹی آپا بھی چیخ پڑیں۔

نہیں شہروز بھائی — خدا کے لیے۔"

اور شاید یہی قیامت کی گھڑی ہے۔ در و دیوار لرزتے ہوئے، پیروں کے نیچے زمین زور زور چکر کھاتی ہوئی اور چھت ابھی اس کے سر پر آ گرے گی۔

ابھی شاید صور پھونکنے کی آواز آئے گی اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ کچھ بھی۔

ماؤف ذہن کے ساتھ اُس نے ہر شے کو اپنی جگہ سے کھسکتے دیکھا۔

لیکن نہیں۔ ہر شے تو اپنی جگہ پر موجود تھی۔ زلزلوں کی زد میں تو وہ خود تھی کہ آخری بار جیسے صور پھونکا گیا۔

نہیں — تمہیں — طلاق — دیتا ہوں — ربیعہ —"

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

آخری بار "طلاق" کے الفاظ کہہ کر وہ ثاقب حسن جیسے لوگوں کی قطار سے نکل کر گویا سُرخرو ہو گئے۔ ن اُس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ وہ جو روزِ ازل سے اُن کے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دی گئی تھی۔ ب تو سچ مچ شجرِ ممنوعہ ہو گئی تھی۔

امّی — ندا — اور چھوٹی آپا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور ان سب نظروں سے بچنے ن خاطر وہ پلٹے اور قدم بڑھانا چاہتے تھے کہ امّی کی آواز —

"شہروز احمد —" اور اس کے ساتھ ہی وہ گرتی ہوئی نظر آئیں۔ اُنہوں نے بھاگ کر انہیں بازوؤں یں تھام لیا۔

"تم میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ شہروز احمد، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" امّی اُن کے تھ جھٹک کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تو انہوں نے ندا کو اشارہ کیا جو بھاگ کر پانی لے آئی اور گلاس ن کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"ربیعہ — میری بچّی —" امّی کے حواس بحال ہوئے تو اسے پکارا اور وہ گم صم سی کھڑی تھی، اُس سافر کی طرح جس کا تمام مال و متاع راستے میں ہی لُوٹ لیا گیا ہو۔ اُس کی خالی خالی نظریں دل میں ترازو ہو کر رہ گئیں۔

"میری بچّی — میرے پاس آؤ —" امّی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈھے گئی۔ تب امّی اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رو پڑیں۔

"شہروز احمد — اس بے زبان بچّی پر تم نے جو ظلم کیا ہے، اُس کے لیے تو خُدا بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ ارے کوئی شکایت تھی تو مجھ سے کہتے، یوں کھڑے کھڑے فیصلہ سُنا دیا۔ مجھے بتاؤ کیا منہ دِکھاؤں گی۔ اس کے ماں باپ کو؟"

"شہروز بھائی — ربیعہ بھابی یہاں سے نہیں جائیں گی۔ میں انہیں نہیں جانے دوں گی۔" ندا بھی رونے لگی۔ اور چھوٹی آپا حیران کھڑی تھیں۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک جو کچھ ہوا ہے، یہ حقیقت ہے یا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہیں۔

شہروز اُن کی کیفیت سمجھ رہے تھے — بڑھ کر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔ سارے ناتے توڑ کر خود بھی آزردہ کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو چھوٹی آپا کو اُن پر رحم آیا۔ لیکن پھر بہن کی محبت حاوی ہو گئی۔ بہت آہستگی سے اپنے کندھے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر ربیعہ کی طرف بڑھ گئیں۔ اُس کی کلائی تھام کر اُٹھایا۔ پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ اس کی ویران آنکھوں کے سمندر خشک ہو گئے تھے کہ زندگی کے اتنے بڑے المیے پر کوئی بوند ڈھونڈے سے نہ ملی۔ سُوکھے ہونٹ ایک دُوسرے میں مدغم جیسے اب کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ چھوٹی

آپا کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر پلٹیں اور کہنے لگیں۔

"امّی ـ اب ربیعہ کے لیے کیا حکم ہے ؟"

اور امّی نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔

اس نے اس مہربان عورت کو روتے ہوئے خاموشی سے دیکھا جو قصوروار نہیں تھیں، پھر ب اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھیں۔ اور قصوروار تو کوئی بھی نہیں تھا، خود وہ بھی نہیں، پھر بھی ا پہ چڑھائی گئی۔

"میرے کمرے میں چلو۔" چھوٹی آپا نے اُس کا کندھا ہلا کر کہا تو آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے اپنا ہاتھ اُن کی گرفت سے چھڑا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میں جا رہی ہوں ـ اور مجھے تو جانا ہی تھا۔" الفاظ ہونٹوں سے ٹوٹنے لگے۔

"نہیں بھابی ـ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔" ندا روتے ہوئے بولی۔ "امّی، بھائی جان خدا کے انہیں روکیں۔"

"کس ناتے ؟" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ انہوں نے سر جھکا لیا۔

اور اُس نے آخری نظر ان درودیوار پر ڈالی جن میں محبتوں کی چاشنی رچی بسی تھی۔ پھر اپنا رُخ لیا۔ اُن کے قریب سے گزرنے لگی تو لمحہ بھر کو ٹھہر گئی۔

"شہروز احمد ـ جب فیصلہ خود ہی کرنا تھا تو فیصلے کا اختیار مجھے سونپ کر کچھ وقت کا اطمینان کیوں بخش انہوں نے ایک دم سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

"کیسے جاؤ گی ؟" چھوٹی آپا پیچھے سے پکار کر کہنے لگیں۔ وہ اَن سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔

"ربیعہ ـ" امّی نے پکارا تو اُس کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔ "رُک جاؤ، اس طرح مت جاؤ ـ اور تم کیوں جا رہی ہو؟ یہ گھر تمہارا ہے۔"

"بیگم صاحبہ ـ فرار حاصل کرنے یا آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت بدلتی نہیں ہے اور نہ ہی بد سکتی ہے۔" وہ پلٹ کر بولی ـ وہی باتیں جو گزشتہ دو برسوں میں شہروز احمد نے بارہا اس سے کہی تھیں۔

"لیکن بیٹا، اس طرح تو مت جاؤ۔"

"پھر ـ ؟"

"ہمیں الزام دو، گالیاں دو اور میں تمہیں شہروز احمد کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت بھی دیتی ہوں۔"

"اپنی حرماں نصیبی کا الزام میں آپ کو کیوں دوں ؟ ـ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ سب کی محبتیں یاد رہیں گی ـ خُدا حافظ ـ"

وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئی ـ اور شہروز احمد اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنے مجبور اور بے بس نہ ہوئے تھے، جتنا وہ اب اپنے آپ کو محسوس کر رہے تھے ـ اُن کی اوّلین محبت، اُن کی زندگی اُن کے سامنے دُور جا رہی تھی اور وہ اُسے روکنے پر قادر نہیں تھے۔ گلاس ڈور سے باہر نظریں دوڑائیں۔ وہ حرماں نصیب لڑکی گیٹ سے نکل رہی تھی۔

دو سال قبل وہ اُن کے ساتھ اُن کے وجود کا سہارا لیے ہوئے اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ راہداری میں اس کے لیے پھولوں کا فرش بچھایا گیا تھا۔ اور بے شمار پھولوں کی پتیاں اس پر نچھاور کی گئی تھیں پھر اس تمام عرصے میں کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ اُن کے ساتھ ساتھ چلی تھی۔ کبھی کوئی دن نہیں تھا، جو وہ اُن کے بغیر کہیں گئی ہو۔ ہمیشہ اُن کے قدم سے قدم ملا کر اس گھر کی دہلیز پار کی اب تنہا جا رہی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ پتا نہیں راستوں سے آشنا تھی بھی کہ نہیں۔ اس

بے سروسامانی کا خیال آیا تو کہنے لگے۔

"صوفیہ ـ ڈرائیور سے کہیں اُسے چھوڑ آئے۔"

اور چھوٹی آپا اس تمام عرصے میں پہلی بار ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"بھابی ـ" ندا خود رونا بھول کر اُن کی طرف بڑھی۔ اور امّی کی نظریں شہروز احمد پر جا ٹھہریں ـ جو قصوروار نہیں تھے لیکن سارا الزام اپنے سر رکھ کر مجرم بنے کھڑے تھے۔ امّی کو بے حد خاموش نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُن کا سر مزید جھک گیا۔

"اِس طرح سر مت جھکاؤ شہروز احمد ـ" امّی کا ٹھہرا ہوا سرد لہجہ دل میں ترازو ہو گیا۔ اس لہجے میں وہ اُسی وقت بات کیا کرتی تھیں، جب کوئی بات اُنہیں بہت دُکھ پہنچاتی تھی۔

"مرد ہو اور مردانگی کے زعم میں ایک کمزور لڑکی پر جو ظلم کیا ہے، اُس پر سر اُٹھا کر فخریہ اعلان کرو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"امّی پلیز ـ" اُنہوں نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں بالوں میں پھنسائیں تو ہتھیلیوں سے آنکھیں ڈھک گئیں۔

"مت کہو مجھے امّی اور اس سے پہلے کہ میں تمہارے سر سے ہمیشہ کے لیے دستِ شفقت کھینچ لوں، میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔"

انہوں نے سوچا، اُس وقت ان کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے اور اپنی سوچ پر فوراً عمل کرتے ہوئے، وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ـــــ کمرے سے اور پھر گھر سے بھی نکل آئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر کچھ دیر سوچتے رہے کہ کہاں جانا چاہیے۔ اس حال میں آفس نہیں جانا چاہتے تھے۔ اور دوست تھے بھی تو یہ ایسا وقت تھا کہ سب اپنے آفس میں مصروف ہوں گے۔ پھر کسی خاص جگہ کا تعین کیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گھر کے سامنے والی روڈ سے نکل کر دائیں طرف مُڑے تو وہ انہیں دُور سے نظر آ گئی۔ تیز چلنے کی کوشش میں اس کی چال متوازن نہیں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سہارا دیے ہوئے ہو۔ حالانکہ ان کا اس کے پیچھے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ ابھی تو انہیں اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اب جب وہ نظر آ گئی تھی تو وہ اپنے آپ کو نہ روک سکے۔ بے اختیار اسپیڈ بڑھا کر گاڑی اُس کے قریب لے جا کر روک دی۔ اور وہ جو اپنے خیال میں چل رہی تھی۔ گاڑی کی آواز پر رُک گئی۔ اُن پر نظر پڑی تو خاموشی سے دیکھے گئی۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا۔ البتہ آنکھیں شکوہ کناں تھیں۔

"آئیے ـ آپ کو چھوڑ دوں ـ" آواز کے بوجھل پن کو چھپا نہ سکے۔

اور اب جب کہ وہ نام نہاد بندھن بھی نہیں رہا تھا تو وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنا اندر اُن پر عیاں ہونے دے۔ آخر کار وہ اجنبی ہی تو ہو گئے تھے، پھر کیوں دل کی کوئی بات، کوئی جذبہ اُن تک پہنچے۔ ذرا مُنہ موڑ کر چل دیتی تو کسی جذبے کا اظہار ہو جاتا ـ اور بولتی تو آواز میں شکستگی سمٹ آتی۔ اس لیے دونوں باتوں سے گریز کیا۔ اِسی طرح کھڑی رہی، بس پلکوں کو جھکا لیا تھا۔

"آئیے ربیعہ ـ" اصرار میں اسرار پوشیدہ تھا۔ "آپ پلیز یہ مت کہہ دیجیے گا کہ کس ناتے ؟ ـ کوئی ناتا، کوئی تعلق تو پہلے بھی ہمارے درمیان نہیں رہا ـ پھر بھی ہم ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ یہ آخری سفر اور سہی ـ"

"ہاں ـ ایک آخری سفر اور سہی ـ" انتہائی دُکھ سے سوچتے ہوئے اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جس پر اُسے چلنا تھا ـ اسے شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا ـ اور پھر اُسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ یونہی خاموشی سے سر جھکائے ہوئے بیٹھ گئی۔ تمام راستہ پھر اُنہوں نے کوئی بات نہیں کی اور وہ تو تھی ہی خاموش جب کہ کہنے کو دونوں کے پاس بہت کچھ تھا ـ وہ ساری باتیں جو دو برسوں میں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے کہی نہ جا سکیں، وہ باتیں کہنے کو دل

مچل رہے تھے۔ لیکن اب دسترس میں نہ وقت تھا، نہ اختیار، نہ کوئی فائدہ ــ اس لیے تمام راستہ تڑ مچلتے دل کو سنبھالنے میں کٹ گیا۔ اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور اُس کے اُترنے کا انتظار کرنے لگے جب کہ وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اُترنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"آپ کا گھر آگیا ہے ــ" اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا تو اُس نے ذرا سا سر اونچا کر کے اپنے گھر بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھوں پر نظریں جماتی ہوئی بولی ــ

"گذشتہ دو برسوں میں شہروز احمد، آپ نے ہر مقام پر مجھے حوصلہ دیا۔ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آ دی۔ اب اِتنا بتا دیں، میں اپنے والدین سے کیا کہوں ؟۔"

"آپ سارا الزام مجھ پر رکھ سکتی ہیں ۔" اس کی ویران آنکھیں جو اس تمام عرصے میں ایک ایک بو کو ترستی رہی تھیں۔ ایک دم ڈھیر سارے پانی سے بھر گئیں۔ کنارے، پلکیں اور پھر رُخسار بہ چلے گئے ۔

"میں نہیں جانتی اَب اس مقام پر آپ کے احساسات کیا ہیں؟۔ آپ خوش ہیں یا ناخوش ۔ اپنے بارے میں، میں کہوں گی کہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا ۔ میری زندگی کے ساتھ یہ بھیانک کھیل کھیلنے اور میری قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہ ثاقب حسن کو تھا اور نہ آپ کو ۔"

"آپ جو چاہیں کہہ سکتی ہیں ــ میں آپ کا مُجرم ہوں کیونکہ ثاقب حسن کی بات مانتے ہوئے مجھے آ کا خیال تک نہیں آیا تھا ــ اس وقت میرا خیال تھا، میں ایک شخص کی زندگی بچانے کے لیے اُس کے ساتھ نیکی کر رہا ہوں ــ نہیں جانتا تھا کہ میری یہ نیکی دوسری طرف کسی کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگی ۔" یوں ہی ذرا سی گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے بے تحاشا بہتے آنسوؤں نے دل میں ہلچل مچا دی۔ اور محض اسے حوصلہ دینے کی غرض سے کہنے لگے ۔

"آپ خوامخواہ اندیشوں میں گھر رہی ہیں۔ اب جب ثاقب حسن آ ہی گیا ہے تو ــ"

اُنہیں اپنی بات روکنی پڑی کیونکہ اُس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا، پھر دروا کھول کر نیچے اُتر گئی اور جب تک اُن کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں سُنی ۔ امّاں کے درواز پر دستک نہیں دی۔

دروازہ امّاں ہی نے کھولا تھا ۔ اس پر سرسری سی نظر ڈال کر اُس کے پیچھے دیکھنے لگیں۔ اُن کے خیال میں شہروز ہوں گے ۔ لیکن باہر دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آیا ۔ تو تعجب سے پُوچھنے لگیں۔

"اکیلی آئی ہو ؟۔"

"ہاں امّاں ــ" اُس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

"خیر تو ہے ؟۔ کون چھوڑ کر گیا ہے ؟۔"

"کوئی نہیں امّاں ــ میں خود سب چھوڑ آئی ہوں ــ وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہوں ۔"

"کیا کہہ رہی ہے ؟۔" امّاں آواز دبا کر بولیں ــ اور اُسے کلائی سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا ۔ پھر دروازہ بند کر کے اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئیں ۔

"اب بتا، کیا کہہ رہی تھی ؟۔"

"کیا بتاؤں امّاں ؟۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی ــ اور امّاں کو اس کے رونے سے زیادہ اس کی بات پریشان کر رہی تھی۔ اُسے چارپائی پر دھکیلتی ہوئی بولیں ۔

"آخر بتا تو، ہوا کیا ؟۔"

"شہروز نے مجھے طلاق ـــــ" آنسوؤں کے درمیان بس اس قدر کہہ سکی ۔ اور امّاں نے ا سینہ پیٹ لیا ۔

"کیوں ــ کیوں ؟۔" اس لفظ کی سنگ باری تو اُس پر ہونی ہی تھی ۔ وہ اور شدّت سے رو لگی ۔ تو امّاں اُس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر سر اُونچا کرتے ہوئے بولیں ۔

"کیا کیا ہے تو نے ؟۔" گویا انہیں یقین تھا کہ اسی نے کچھ کیا ہے ۔

"امّاں ــ" وہ بے بسی کی تصویر بن گئی ۔

"بول کیا کیا ہے جو اُس نے یوں دھتکار دیا ۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا ــ" اُس نے چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا ۔

"پھر کیا اُس کا دماغ خراب ہو گیا تھا ــ میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں شہروز اور اس کی ماں سے ۔"

"خدا کے لیے امّاں ــ" اُس نے امّاں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے ــ "آپ وہاں نہ جائیں ۔ کسی سے کچھ نہ پوچھیں ۔"

"کیوں ؟۔ کیوں نہ پوچھوں ؟۔ میری ایک اور بیٹی وہاں بیٹھی ہے ۔ کل کو اسے بھی یوں تین کپڑوں میں چھوڑ گئے تو ؟۔"

"نہیں امّاں ــ چھوٹی آپا کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا ۔"

"پھر تیرے ساتھ کیوں ہوا ؟۔"

"میری قسمت خراب ہے ۔"

"قسمت کو الزام مت دو ربیعہ ــ سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہوئی تھی ؟۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں امّاں ؟۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا ۔ کوئی جھگڑا بھی نہیں ۔ بس ذرا سی بات پر شہروز غصّے میں آ گئے ۔"

وہ شہروز پر کوئی الزام نہیں رکھنا چاہتی تھی اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا دامن کیسے بچائے ؟۔

"ذرا سی بات پر اتنی بڑی باتیں اور اتنے بڑے فیصلے نہیں ہوا کرتے ــ ضرور کوئی اور بات ہو گی ۔" پھر امّاں پُرسوچ انداز میں کہنے لگیں ۔

"ابھی کل ہی تو تو یہاں سے گئی ہے ــ اُس وقت تو شہروز ٹھیک ٹھاک تھے ۔ ہاں البتہ تو ــ"

"میں ــ ؟۔" وہ اپنی طرف اشارہ کیے امّاں کو دیکھے گئی ۔

"ہاں ــ تم ٹھیک نہیں تھیں ــ تم ہفتہ بھر یہاں رہیں ۔ اور میں نے محسوس کیا تم بہت بُجھی بُجھی اور پریشان سی تھیں ۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی ــ اور امّاں، آپ میرے منہ سے کیا سُننا چاہتی ہیں ؟۔ جب کوئی بات نہیں ہے تو میں کیسے آپ کو کوئی من گھڑت کہانی سُنا دوں ؟۔" اُس نے سسکتے ہوئے ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لی ۔

کتنا دل چاہ رہا تھا امّاں ہر بات سے نظریں چُرا کر صرف اُس کا دُکھ محسوس کریں ۔ اُس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بعد میں سوچیں ــ پہلے اُسے سمیٹیں ــ کسی ننھی بچّی کی طرح اسے اپنی آغوش میں بھر لیں ــ تو وہ اپنے سارے دُکھ آنسوؤں میں بہا دے لیکن امّاں کتنی سنگدل نظر آ رہی تھیں، اُسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہو ۔ اسی وقت کلثوم اور ہُما کالج سے لوٹیں ۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھیں ۔ لیکن جب اُس کی سُرخ آنکھوں اور بھیگتے چہرے پر نظر پڑی تو دونوں ٹھٹک کر رُک گئیں ۔ اشارے سے امّاں سے پوچھا کہ کیا ہوا ؟۔ جواب میں امّاں نے ایسی تیز نظروں سے گھُورا کہ دونوں گھبرا کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں ۔

"کیا ہوا آپی ؟۔" کلثوم نے سرگوشی میں پوچھا تو اُس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں ۔

"آپی پلیز ــ روئیں تو نہیں ــ" ہُما اُس کے گلے میں بازو ڈالتی ہوئی بولی ۔

"روئے کیسے نہیں ــ رونا تو اب اِس کے مقدر میں لکھا ہے ۔" امّاں بڑبڑاتی ہوئی سر پکڑ کر، دُوسری چارپائی پر ڈھے گئیں ۔ اُس نے ذرا سی پلکیں اُٹھا کر امّاں کی طرف دیکھا ۔ پھر مہربان آغوش میں سمٹنے کی حسرت لیے، وہاں سے اُٹھ کر چھوٹے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا ۔

اب وہ تقدیر کی ستم ظریفی پر رونے کو تنہا تھی۔ کوئی روکنے اور چپ کرانے والا نہ تھا، اس لیے وہ خوب روئی، یہاں تک کہ آنکھیں خشک ہوگئیں۔ تڑپتا مچلتا دل، ایک درد سے ناتا جوڑ کر ٹھہر گیا۔ کھردری چارپائی پر لیٹی تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا جبھی کوئی بات سوچی ہی نہ گئی۔ کچھ دیر تک خود اپنے ہاتھوں سے سر دباتی رہی، پھر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔

دوپہر میں ہما نے دروازے پر دستک دے کر اُسے کھانا کھانے کے لیے کہا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی نہ بھوک تھی اور نہ کچھ کھانے کی خواہش۔ اور وہ امّاں کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہما اور کلثوم نے وقفے وقفے سے دستک دے کر اسے پکارا اور پھر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر شاید انہوں نے اسے سوتا سمجھ لیا تھا۔ جب کہ وہ نیند کو آوازیں دے رہی تھی کہ وہی مہربان ہوجائے جو وہ غافل ہوسکے۔ ہر دُکھ، ہر پریشانی سے اور خود اپنے آپ سے، لیکن سب کی طرح شاید نیند بھی خفا تھی کہ مہربان ہو کے نہ دی۔

دوپہر ڈھلی اور پھر سہ پہر نے بھی شام کے دھندلکوں میں پناہیں ڈھونڈلیں۔ کمرے میں پہلے ہی اُجالا برائے نام تھا۔ اور اب شام کے بڑھتے سایوں نے اُسے بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک بار اُس نے سوچا کہ اُٹھ کر لائٹ جلا دے لیکن اُٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کمرے سے باہر برآمدے میں سے کسی کسی وقت امّاں کی آواز سُنائی دے جاتی۔ اس کے بعد پھر خاموشی۔ پتا نہیں ہما اور کلثوم کہاں تھیں، جن کی کوئی آواز، کوئی آہٹ سُنائی نہیں دی۔ اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی ان لڑکیوں کی جلترنگ بجاتی ہنسی بھی خاموش تھی۔ کتنی دیر گزر گئی، وہ اندھیرے میں کبھی دیوار پر نظریں جماتی اور کبھی چھت پر۔

"ربیعہ اکرام علی۔" اس کے اندر کی لڑکی دھیرے دھیرے پکارنے لگی۔

"ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اور تم جانتی بھی تھیں کہ تمہیں ان دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہے پھر تم نے اپنے آپ کو پہلے سے ان راستوں سے گزرنے کے لیے تیار کیوں نہیں کیا؟"

"میں شاید کسی معجزے کی منتظر تھی۔" اُس نے سوچا۔

"بیوقوف لڑکی۔ معجزے کہاں ہوتے ہیں بھلا۔ انسان اپنے زورِ بازو یا پھر قوتِ ارادی سے حالات بدلتا ہے۔ اور تم تو سدا کی بزدل ہو۔"

"ہاں۔ نہ صرف بزدل بلکہ" وہ اپنے بارے میں اعتراف کرنے جا رہی تھی کہ دروازے پر ہوتی دستک نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے کچھ خوفزدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"ربیعہ بیٹا۔ دروازہ کھولو۔" ابا میاں کا نرم لہجہ اس کے تن میں نئی رُوح پھونک گیا۔ پھر بھی وہ فوراً اُٹھ نہ سکی۔

"ربیعہ۔ میری بچی۔ دروازہ کھولو۔" ابا میاں کی آواز میں اُس کے دُکھ کا احساس تھا اور وہ نرمی جسے وہ امّاں کے لہجے میں ڈھونڈتی رہی تھی۔ بہت آہستگی سے چارپائی سے اُٹھی اور بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"بیٹا۔ کیا میری بات بھی نہیں مانوگی؟" ابا میاں دُکھ سے بولے تو اُس نے تڑپ کر دروازہ کھول دیا۔ چھن سے بڑے کمرے کی روشنی اس کے پیروں میں بچھ گئی یوں جیسے تاریک راہوں میں کوئی چراغ جل اُٹھے۔

"بیٹا۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھی تھیں؟"

"ہر طرف اندھیرے ہی ہیں ابا میاں۔" اُس نے کہا اور پلٹ کر دوبارہ چارپائی پر جا بیٹھی۔

"لو۔ میں روشنی کیے دیتا ہوں۔" ابا میاں نے بٹن آن کیا پھر اُس کے سامنے آبیٹھے۔ سُرخ آنکھوں پر بھاری پپوٹے، چہرہ زرد اور اُترا ہوا۔ اُن کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کیا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے اس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ

بنا لیا۔

"میں ساری عمر یہ سمجھتا رہا کہ تمہاری ماں ایک عقلمند عورت ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ میں کتنا غلط سمجھا اُسے۔ اس جیسا کم عقل اور بیوقوف شاید ہی کوئی ہو۔"

اُسے حیرت ہوئی کہ ابا میاں اس سے کوئی سوال کرنے کے بجائے امّاں کی بات کررہے تھے۔

"نیک بخت جانتی بھی ہے کہ ہر انسان کا مقدّر اُوپر والا خود رقم کرتا ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس حقیقت سے نظریں چُراجاتی ہے۔" اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں آج اُس نے تمہارے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑکا ہوگا۔"

"نہیں ابا میاں۔" وہ بمشکل اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کرسکی۔ "امّاں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیٹا کہ تم اب بھی ماں کی طرفداری کررہی ہو ورنہ وہ خود اعتراف کرچکی ہے کہ اُس نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"اُن کا ردِعمل فطری تھا۔"

"یقیناً فطری ہوگا لیکن پہلے اُسے ضبط سے کام لے کر تم پر گزرنے والی قیامت کا احساس کرنا چاہیے تھا۔ باقی ساری باتیں تو بعد میں بھی ہوسکتی تھیں۔"

"ابا میاں۔" وہ سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ "آپ مجھ سے پوچھیں گے نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

"میری جان۔" ابا میاں نے اُس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس سے بڑا المیہ اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے آج جانا کہ تمہاری ماں بیٹیوں کی پیدائش پر آزردہ کیوں ہوجایا کرتی تھی۔" ابا میاں کا لہجہ بھیگا اور پھر آنکھیں اُس کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تو شفاف قطرے اُس کے بالوں میں گرنے لگے۔

"بیٹا۔ میں تم سے نہ کوئی سوال کروں گا، نہ الزام دوں گا اور الزام تو میں شہروز احمد کو بھی نہیں دے سکتا کہ میں نے اُسے ہر مقام پر بہت اچھا پایا ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"شاید اُوپر والے کو ہماری آزمائش مطلوب ہے اور بیٹا میں تم سے یہی کہوں گا کہ اس آزمائش میں صبر کا دامن تھامے رکھنا۔"

"ابا میاں۔" وہ رو پڑی۔ "میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔"

"میں جانتا ہوں۔ یہ زخم گہرا ہے، پھر بھی یہ سوچ لو کہ ہوسکتا ہے اسی میں کوئی مصلحت ہو۔" پھر اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "رو مت۔ مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ چلو اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ، پھر ہم ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

"مجھے امّاں سے ڈر لگتا ہے۔" وہ سر جھکا کر بولی تو ابا میاں ہنس پڑے۔

"وہ تمہاری ماں ہے بیٹا۔ اور پھر ابھی تم نے خود کہا تھا کہ ان کا ردِعمل فطری تھا۔ چلو اُٹھو، اب وہ کھانے پر تمہارا انتظار کررہی ہیں۔"

وہ کچھ ڈرتی ہوئی اُٹھ کر ابا میاں کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ بڑے کمرے میں امّاں واقعی دسترخوان پر بیٹھی، دونوں باپ بیٹی کا انتظار کررہی تھیں۔ اُس نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا اور منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے باہر نکل آئی۔ کلثوم اور ہما کچن میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ اُسے دیکھ کر دونوں کھڑی ہوگئیں اور جب وہ منہ دھوکر آئی تو وہ دونوں اُس کے ساتھ اندر آئیں۔

دن بھر وہ یونہی بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے تھے۔ جب شام اُترنے لگی تو کلفٹن پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ اس وقت انہیں اپنا آپ کسی آوارہ پنچھی کی مانند لگ رہا تھا جس کا آشیانہ کسی ستمگار پرندے کی مکّاری کی نذر ہوگیا ہو اور وہ ٹھکانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہو۔ زندگی

میں بہت سارے مقام یا موڑ ایسے آئے تھے، جب انہوں نے اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کیا۔ اور سوچا تھا کہ وہ حالات کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکیں گے۔ لیکن ہمیشہ ہی ایسے مقام پر امّی نے اُنہیں حوصلہ دیا۔ اس طرح کہ وہ حالات کو شکست دینے کے قابل ہوسکیں اور آج جو زندگی میں موڑ آیا تھا، اُس نے تو انہیں بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور ستم یہ کہ حوصلہ دینے والی ہستی بھی اُن سے خفا تھی۔

دن بھر پریشانیوں اور لامتناہی سوچوں نے اُن کے ذہن کو تھکا دیا تھا اور پھر سارا دن کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھوک کے باوجود کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ ویٹر کے آنے پر اُسے صرف چائے لانے کے لیے کہا۔ اور پھر کُرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر شیشوں سے باہر دیکھنے لگے۔ نیلے پانیوں سے اُٹھتی شوریدہ سر لہریں ایک دُوسرے کے تعاقب میں بھاگتی ہوئی بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک اس منظر کو سرسری نظر سے دیکھتے رہے، پھر اچانک یوں لگا جیسے کوئی حرماں نصیب لڑکی ان لہروں کے تعاقب میں دُور تک چلی جا رہی ہو۔

"ربیعہ۔۔" بے اختیار پُکار بیٹھے پھر فوراً سنبھل کر پہلے اپنے اطراف دیکھا پھر دوبارہ اس منظر کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

"میرے خدا۔" طویل سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

"میں یقیناً اپنے حواس کھو رہا ہوں۔" اُنہوں نے سوچا اور چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر ایک کے بعد دوسرا کپ، پھر تیسرا۔ وہ مسلسل وقفے وقفے سے چائے منگوا کر پیتے رہے۔ اور جب رات کی سیاہی نے ہر طرف اپنے پر پھیلا دیے، اس وقت وہ چائے کے ساتھ سگریٹ کا پورا پیکٹ خالی کر چکے تھے۔ گھڑی میں وقت دیکھا، نو بج رہے تھے۔ ویٹر کو بُلا کر بل پے کیا اور اپنے وجود میں بے پناہ تھکن لیے باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی پھر شفاف سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ وہ گھر جانا چاہتے تھے۔

دل چاہ رہا تھا، کچھ وقت کے لیے ہر بات بُھلا کر چُپ چاپ سو جائیں لیکن امّی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے خواہش کے باوجود وہ فوراً گھر نہ جا سکے۔ دو گھنٹے مزید گاڑی دوڑاتے رہے اور جب یہ یقین ہوگیا کہ امّی سو چکی ہوں گی۔ تب گھر کی راہ لی۔ اُن کا یقین غلط نہیں تھا۔ امّی اور شاید مہروز اور صوفیہ بھی سو چکے تھے۔ کیونکہ لاؤنج کے علاوہ باقی تمام لائٹیں آف تھیں۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلے آئے۔ دروازہ بند کر کے لائٹ آن کی پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ کتنے لمحے یونہی چُپ چاپ سرک گئے۔ لاشعوری طور پر شاید منتظر تھے کہ کوئی کسی بھی بہانے کوئی آواز پیدا کر کے اُنہیں متوجہ کرے گا۔ جیسے کہ وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی کسی بہانے اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرتی تھی اور پھر وہ اُٹھ کر اسٹڈی میں چلے جایا کرتے۔

انہیں اپنے قریب آہٹ کا احساس ہوا تو آنکھیں کھول کر دیکھنے لگے۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھیں۔ انہیں حیرت تو ہوئی لیکن اظہار نہیں کیا، اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"آپ سوئیں نہیں؟" کوئی جواب نہیں آیا تو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"میں جانتا ہوں، سب مجھ سے خفا ہوں گے لیکن۔۔"

"آپ کے لیے کھانا لاؤں؟" صوفیہ ان کی بات کاٹتی ہوئی بولیں۔

"ارے۔۔" وہ ایک دم سر اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ "آپ اب تک صرف اس لیے جاگ رہی ہیں کہ مجھ سے کھانے کا پوچھ سکیں۔"

"کیا کچھ اور بھی پوچھ سکتی ہوں؟" صوفیہ نے براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ نظریں چُراتے ہوئے بولے۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں خود بہت ڈسٹرب ہوں۔"

"صرف ایک بات بتا دیں شہروز بھائی۔ یہ سب اچانک ہوا یا آپ پہلے سے کوئی فیصلہ کر چکے تھے؟"

"صوفیہ پلیز۔ میں نے کہا ناں ابھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔" پھر جھک کر شوز اُتارتے ئے بولے۔ "جائیں جا کر سو جائیں۔"

"اور کھانا۔۔؟"

"کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہ بتائیں امّی کیسی ہیں؟"

"امّی ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ شدید شاک میں ہیں۔" صوفیہ نے کہا۔ تو وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے ے پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

"او کے۔ میں اب سوؤں گا۔" صوفیہ نے بس لمحہ بھر کو ان کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے پھر انہیں ب بغیر کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ انہوں نے بڑھ کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ پھر الماری میں ے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلے گئے۔ ڈریس چینج کر کے نکلے تو بے خیالی میں سیدھے اسٹڈی م میں داخل ہو گئے۔ لیکن۔۔ فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اب بھلا یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوبارہ کمرے میں آتے ہوئے ایک نیا دُکھ ساتھ تھا۔ کتنی دیر تک کھڑے خالی بیڈ کو دیکھتے رہے۔ پھر آ کر جب اس پہ لیٹے تو اُس کی مہک رُوح کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔

صبح حسبِ معمول ان کی آنکھ کُھل گئی۔ سر بے حد بھاری ہو رہا تھا اور جلتی ہوئی آنکھیں بخار کا پتا دے ہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر سوچتے رہے کہ اس وقت اُنہیں امّی کا سامنا کرنا چاہیے یا نہیں۔ رات صوفیہ نے بتایا تھا کہ امّی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ انہیں دیکھنے کو بے چین ہو گئے۔ پھر اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اُن کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتی ہیں، انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلے اور سیدھا اُن کے کمرے کا رُخ کیا۔ مہروز امّی کے پاس موجود تھا انہیں دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور امّی جو تکیے کے سہارے بیٹھی تھیں، انہیں دیکھ کر منہ موڑ گئیں۔ اُن کے دل کو دھچکا لگا پھر بھی آگے بڑھ آئے۔

"آپ کی طبیعت۔۔" اتنا کہا تھا کہ امّی بول پڑیں۔

"مہروز اس سے کہو میرے کمرے سے چلا جائے۔"

"آپ کی خفگی بجا امّی۔ لیکن میری بات تو سُنیں۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سُننی۔"

"آپ نہیں سُنیں گی تو کون سُنے گا؟" وہ بیڈ کے پاس نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھے اور اُن کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں یقیناً قصوروار ہوں۔ آپ جو چاہیں سزا دے لیں لیکن اس طرح منہ نہ موڑیں۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں امّی۔ اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ اور آپ نے تو ہمیشہ مجھے سہارا دے کر کمزور ہونے سے بچایا ہے۔ اس وقت بھی مجھے آپ کا سہارا چاہیے۔ بس ایک بار میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیں۔"

"بہت خوب۔" امّی کے لہجے میں طنز سمٹ آیا۔ "گویا شاباش دوں تمہیں۔ بڑا کارنامہ جو انجام دیا ہے تم نے۔"

"شاباش نہیں امّی۔" اس اُونچے پورے توانا مرد نے امّی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ "مجھے ٹوٹنے سے بچا لیں۔ میں اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔ اگر آپ نے نہ سمیٹا تو بالکل ہی بکھر جاؤں گا۔"

اور امّی ماں تھیں۔ اولاد ہزار غلطیاں کرے پھر بھی ماں نہ صرف چشم پوشی کرتی ہے بلکہ فراخ سینے میں بھی چھپا لیتی ہے اور یہاں تو شہروز احمد تھے جن کی سعادت مندی اور نیک سیرت پر انہیں ہمیشہ فخر رہا تھا۔ لیکن اب ستم یہ تھا کہ وہ اگر خطا کار تھے، قصوروار تھے تو اُن کے نہیں بلکہ اس لڑکی کے جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اس جیسا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

"شہروز احمد۔" امّی نے سیدھے بیٹھتے ہوئے اپنے پیروں پہ رکھے ہوئے اُن کے سر پہ اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔ "مجھے کم از کم تم سے ایسی کسی بات کی توقع ہرگز نہیں تھی۔"
"مجھے معاف کر دیں امی۔ میں یقیناً غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔"
"میں کیا معاف کروں بیٹا۔ معافی اُس سے مانگو، جس کے ماتھے پر داغ لگا کر تم نے اس سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔"
امی کی آواز بھر آ گئی۔ تو انہوں نے اُن کا ہاتھ اپنی جلتی آنکھوں پر رکھ لیا۔ کاش وہ بتا سکتے کہ انہوں نے اُس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ ظلم تو خود اُن پر ہوا ہے۔ زندگی اُن کی تباہ ہوئی ہے۔ وہ جو عزیز تر ہو گئی تھی۔ کبھی اُن کے جذبوں کو جان ہی نہ سکی۔ جبھی تو بنا احتجاج کیے چپ چاپ چلی گئی۔
"شہروز۔" امی نے پُرسوچ انداز میں پکارا۔ تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
"بیٹا۔ جو کچھ ہوا ہے، کیا تم اُس پر نادم ہو۔؟" انہوں نے سر جھکا لیا تو کہنے لگیں۔
"بیٹا۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی راستہ تلاش کرو۔"
"کیسا راستہ؟" وہ بالکل نہیں سمجھے۔
"ربیعہ کی واپسی کا راستہ۔ ہاں بیٹا، معلوم کرو اس کی واپسی کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟"
"یہ ممکن نہیں ہے امی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔
"کیوں ممکن نہیں ہے؟ اگر تم چاہو تو۔"
"صرف میرے چاہنے سے کیا ہوگا؟" وہ بے اختیار کہہ گئے۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولے۔
"میرا مطلب ہے امی، جب تک دونوں فریق نہ چاہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور میرا خیال ہے ربیعہ دوبارہ یہاں آنے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔"
"آپ کا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔" مہروز جو اب تک خاموش بیٹھا تھا، کہنے لگا۔ "میں سمجھتا ہوں اگر ربیعہ بھابی اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو مصالحت کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔"
"مصالحت کی صرف ایک راہ ہے اور وہ ہم سب جانتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔
"شہروز احمد۔" وہ جانے لگے تو امی نے پکار لیا۔ "غلطیوں کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے بیٹا۔ میں جانتی ہوں، تم اُس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے۔ اور جو غلطی تم نے کی ہے خواہ غصے میں یا جذبات میں، وہ تمہیں ایک عمر سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم اپنا ظرف بڑا کر لو؟"
"آپ ماں ہیں۔ اور آپ سے زیادہ مجھے کون جان سکے گا بھلا۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سننا چاہتی ہیں تو میں یہی کہوں گا۔ پہلے ربیعہ سے معلوم کر والیں۔ میں اپنا ظرف بڑا رکھوں گا۔" انہوں نے کہا اور پھر رکے نہیں۔ تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئے۔ امی نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگیں۔ مہروز کچھ دیر تک اُن کے بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب وہ اسی طرح بیٹھی رہیں تو پوچھنے لگا۔
"آپ کیا سوچنے لگیں؟"
"میں اسی مسئلے پر سوچ رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ پتا نہیں یہ ہماری آزمائش ہے یا کسی گناہ کی سزا۔"
"آپ پریشان نہ ہوں امی۔" مہروز نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "اب جب کہ بھائی جان نے آمادگی ظاہر کر دی ہے تو باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں پہلے صوفیہ کے ذریعے ربیعہ بھابی کا خیال معلوم کروالوں پھر اس کے بعد مل کر کوئی حل تلاش کریں گے۔"
"یہ صوفیہ ہے کہاں؟"
"میرا خیال ہے، کچن میں ہوں گی۔ میں دیکھتا ہوں۔"
مہروز اُن کے پاس سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آیا تو صوفیہ ٹیبل پر ناشتا لگاتی ہوئی نظر آئیں۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

"ناشتا تیار ہے۔ امی اور شہروز بھائی کو بلا لیں۔" پھر خود ہی کہنے لگیں۔ "میرا خیال ہے امی کو اُن کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔"
"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم امی کا ناشتا اُن کے کمرے میں لے جاؤ، میں شہروز بھائی کو دیکھتا ہوں۔"
مہروز وہیں سے پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو وہ امی کے لیے ناشتا لے کر جا رہی تھی۔
"کیا کہا شہروز بھائی نے؟" رک کر پوچھنے لگی۔
"کہہ رہے ہیں میں ناشتا نہیں کروں گا۔"
"کیوں؟ انہوں نے تو رات بھی کچھ نہیں کھایا۔"
"میں کیا کہہ سکتا ہوں، تم خود پوچھ لینا لیکن پلیز پہلے میرے ساتھ آ کر ناشتا کرو۔" وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ امی کو ناشتا دے کر واپس آئی تو مہروز اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔
"تم نے شہروز بھائی سے ناشتے کے لیے اصرار نہیں کیا؟" وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"اصرار کیا ہے، لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔"
"عجیب آدمی ہیں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑائی پھر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
"پتا ہے صوفیہ۔" وہ اپنے کپ میں چائے ڈالتا ہوا بولا۔ "شہروز بھائی اپنے کیے پر بہت نادم ہیں۔"
"اب ان کی ندامت کس کام کی؟" وہ ہاتھ ملتے ہوئے انداز میں بولیں۔
"میری بات سنجیدگی سے سنو۔" وہ کہنے لگا۔ "شہروز بھائی نہ صرف نادم ہیں بلکہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ربیعہ بھابی کو دوبارہ اس گھر میں لے آئیں۔"
"کیا ایسا ممکن ہے؟" وہ فوراً پوچھنے لگی۔
"ہاں۔ کچھ دشواریاں تو ہیں لیکن بہرحال ممکن ہو سکتا ہے۔"
"کیسے؟"
"یعنی جو راستہ یا طریقہ ہمارے مذہب نے بتایا ہے اس طریقے سے کہ پہلے ربیعہ بھابی کا کسی اور جگہ نکاح ہو اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد علیحدگی اور پھر۔"
"تم اُسے بہت آسان سمجھ رہے ہو؟" وہ بات کاٹ کر مایوسی سے بولی۔
"میں نے آسانی کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا، پہلے ہی کہا ہے کہ کچھ دشواریاں ہیں۔"
"کچھ نہیں مہروز بہت دشواریاں ہیں۔ فرض کرو اگر ربیعہ دوسری شادی کر بھی لے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوسرا شخص اُسے چھوڑ دے گا؟"
"یہ ساری باتیں بعد کی ہیں، پہلے تم ایک کام کرو۔"
"کیا۔؟" وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔
"ربیعہ سے پوچھو، کیا وہ میرے بھائی کی خطا معاف کر کے دوبارہ اُسے قبول کرنے کو تیار ہے؟"
وہ فوراً کچھ نہ کہہ سکی۔ بس خاموشی سے اُس کی طرف دیکھے گئی تو وہ کہنے لگا۔
"کیا یہ بہت مشکل کام ہے؟"
"ربیعہ سے معلوم کرنا مشکل تو نہیں ہے لیکن فوری طور پر ممکن بھی نہیں ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "پتا ہے مہروز، میں رات بھر نہ صرف ربیعہ بلکہ اماں اور ابا میاں کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ پتا نہیں، ان سب پر کیا گزری ہوگی؟ میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں وہاں جاؤں اور ان سب کے دکھ میں شریک ہوں لیکن۔"
"لیکن کیا؟"
"لیکن میں ابھی وہاں نہیں جا سکتی۔ گو کہ وہ میرے ماں باپ کا گھر ہے۔ پھر بھی اس گھر کی فرد ہونے کے ناتے میں تم سب کی طرح گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ جیسے میں قصوروار ہوں۔ میں اپنے اندر اماں کی

سوالیہ اور کھوجتی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی۔ اور اگر میں ہمت کر بھی لوں تو کیا کہوں گی؟
یہ سب کیسے ہوا؟" اُس کی آواز بھر آگئی۔ آنکھوں میں پانی اُتر آیا تو ٹیبل پر پیشانی رکھتے ہوئے بولی۔
"یہ سب اچھا نہیں ہوا مہروز۔ کم از کم ربیعہ کے ساتھ تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت بزدل لڑکی
ہے۔ کبھی بھی حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"صوفیہ پلیز۔" مہروز اُس کے رونے سے پریشان ہوا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آیا اور اُس
کے کندھے تھامتا ہوا بولا۔

"رؤو مت۔ تمہارے رونے سے ہمارے اندر جرم کا احساس سوا ہو جاتا ہے۔"
"میں کسی کو الزام تو نہیں دے رہی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔
"تم بہنوں کی یہی بات تو ہمیں مارے ڈال رہی ہے۔ سنا ہے ربیعہ بھابی بھی کچھ کہے بنا چلی گئیں۔"
"کیا کہتی وہ؟"
"کچھ بھی۔ کم از کم احتجاج تو کرتیں۔"
"وہ شروع سے ایسی رہی ہے۔ اپنے حق کے لیے بھی کبھی زبان نہیں کھولی۔"
"چلو ان کے حق کے لیے ہم لڑیں گے۔" وہ اُسے اُٹھاتا ہوا بولا۔ "منہ ہاتھ دھو کر امّی کے پاس جاؤ۔"
"میرا خیال ہے، میں پہلے شہروز بھائی کو چائے دے دوں۔" اُس نے دوپٹے کے پلو سے
آنکھیں اور چہرہ صاف کیا پھر کپ میں چائے بنانے لگی۔

"سنو، شہروز بھائی نے مجھے تو سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ اگر تم سے بھی سخت لہجے میں بات کریں تو
بُرا مت منانا۔" مہروز نے کہا تو وہ افسردگی سے مسکرائی اور چائے کا ایک کپ اٹھا کر "اُسے ابھی آ رہی
ہوں" کہہ کر ڈائننگ روم سے نکل آئی۔

اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔ اُس نے انہیں متوجہ کرنے کے
لیے دروازے پر دستک دی۔ اور جب انہوں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا تو وہ آگے بڑھ آئی۔
"میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں۔" انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول
پڑی۔

"میں انکار نہیں سنوں گی۔ اُٹھ کر چائے پئیں۔ میں آپ کے لیے ناشتا بھی لا رہی ہوں۔"
"نہیں صوفیہ۔" انہوں نے روک دیا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔ "چائے میں پی لیتا ہوں لیکن
ناشتے کا تکلف رہنے دیں۔ مجھے بالکل خواہش نہیں ہے۔"
"بہت ساری باتیں خواہش کے برعکس کرنی پڑتی ہیں شہروز بھائی۔" وہ اُن کے ہاتھ میں کپ تھماتی ہوئی
بولی۔

"ہاں۔ لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب بندہ بالکل بے بس و بے اختیار ہو۔ خیر چھوڑیں، یہ بتائیں
امّی نے ناشتا کر لیا۔؟"
"جی۔"
"اور آپ نے۔؟"
"میں اور مہروز بھی اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔"
"اچھی بات ہے۔ اب مہروز سے کہیں آفس جائے تو پہلے سائٹ کا چکر لگا لے۔" پھر خالی
کپ اُسے تھماتے ہوئے بولے۔ "اب میں سو رہا ہوں، کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔"
"ٹھیک ہے۔ لیکن دوپہر کے کھانے کے لیے میں آپ کو ضرور اُٹھاؤں گی۔" پھر ان کا جواب سنے
بغیر کمرے سے نکل گئی۔

اس رات کی سحر جب ہوئی تو اُسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ امّاں جب اُسے اُٹھانے آئیں تو وہ نیم بیہوش تھی

ہیں جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔
ربیعہ۔" امّاں نے کتنی آوازیں دے ڈالیں۔ اور جب اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ بخار
ہی تھی۔ امّاں پریشان ہو گئیں۔ اُونچی آواز میں ابّا میاں کو پکارا۔
م علی۔ دیکھو تو ربیعہ کی کیا حالت ہو رہی ہے؟" ابّا میاں بھاگے آئے۔
ہوا؟"
ہیں جل رہی ہے۔"
ملے سے کام لو نیک بخت۔ تم اس کے پاس بیٹھو، میں کسی ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں۔" ابّا میاں نے
شانی چھو کر دیکھی، پھر ان ہی پیروں سے باہر نکل گئے۔ جب کہ امّاں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے
اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔
ے اللہ۔ یہ میری بچی کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔؟" امّاں کو اس تمام عرصے میں پہلی بار
اس پر رحم آیا بلکہ اُس کے دُکھ کا احساس بھی ہوا۔ کبھی اس کی پیشانی چومتیں اور کبھی اس کے
وجود کو اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش۔ بار بار منتظر نظروں سے دروازے کی طرف بھی
ا تھیں۔ ابّا میاں کافی دیر بعد آئے۔ وہ بھی بغیر ڈاکٹر کے۔
وقت کوئی ڈاکٹر نہیں ملا۔" مایوسی سے بولے اور کچھ کہنے کی کوشش میں امّاں کا منہ بس
گیا۔
صبر کرو۔ ڈاکٹر اپنے وقت پر ہی آئیں گے۔ پھر میں کسی کو لے آؤں گا۔"
ن اکرام علی۔ اس کی حالت تو دیکھو۔" امّاں سچ مچ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ اور پریشان تو
بھی تھے لیکن وہ اظہار کر کے امّاں کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔
رکی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔" پھر کلثوم کو بلا کر کہنے لگے۔ "بیٹیا، ٹھنڈا پانی اور
را لے آؤ۔"
ثوم یہ دونوں چیزیں لے کر آئی تو ابّا میاں پانی میں کپڑا بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنے لگے۔ اسی
ی آپا جیسے رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئیں۔
سے آئی ہو؟" امّاں انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔
صم کے ساتھ۔"
ا مطلب ہے، گاڑی ہے تمہارے پاس؟"
ں۔" بڑی آپا کی نظر ربیعہ پر پڑی تو چونک کر پوچھنے لگیں۔ "امّاں! ربیعہ کو کیا ہوا؟"
لک کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔ جاؤ عاصم سے کہو، ذرا رُکے، ہم ربیعہ کو کسی ڈاکٹر کے پاس
یں گے۔"
صم اندر ہی آ رہے ہیں۔ لیکن اسے ہوا کیا؟۔ یہ تو برسوں کی بیمار لگ رہی ہے۔" امّاں نے
ت کا جواب نہیں دیا۔ ربیعہ کا سر اپنی گود سے ہٹا کر تکیے پر رکھا، پھر چارپائی سے اُتر
یاں کی مدد سے اسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ اُسے پکارتی بھی جا
ہیں۔
یعہ۔ میری بچی۔ ہوش میں آؤ۔"
پ ہٹیں امّاں۔ میں اُسے سہارا دیتی ہوں۔" بڑی آپا نے بچہ کلثوم کی گود میں دے دیا۔ پھر
ہٹا کر انہوں نے ربیعہ کو چارپائی سے نیچے کھڑا کیا اور اپنے سہارے باہر تک لے آئیں۔
خیریت۔؟" عاصم جو گاڑی لاک کر کے آ رہے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر قدرے پریشانی سے
لگے۔
بیعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔ آپ پلیز جلدی سے

گاڑی کھولیں۔" بڑی آپا نے کہا تو عاصم بھائی نے فوراً لاک کھول کر ان کے لیے دروازہ کھول دیا۔ رہ ربیعہ کو لے کر بیٹھ گئے اور امّاں جلدی جلدی کلثوم کو کچھ ہدایات دے کر اُن کے پاس آ بیٹھیں جب کہ بڑی آپا چکّر کاٹ کر اگلی سیٹ پر جا بیٹھیں۔

"کہاں چلیں۔۔؟" عاصم اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"بیٹا۔ میں تو یہاں کے تمام کلینک دیکھ کے آیا ہوں، سب بند ہیں۔" ابا میاں نے بتایا تو بڑی آپا کہنے لگیں۔

"میرا خیال ہے عاصم ڈاکٹر شہر یار کے کلینک چلتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی مل جائے گا۔" عاصم بھائی نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"امّاں۔ یہ ربیعہ کب سے آپ کے پاس ہے؟۔ اور اس کی یہ حالت۔" بڑی آپا گردن موڑ کر پیچھے دیکھتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

"کوئی ہفتہ بھر سے میرے پاس ہے اور رات تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔" امّاں نے مختصر بات بنائی۔

"پھر یہ اچانک کیا ہوگیا ہے؟" بڑی آپا کو تشویش ہوئی۔

"پتا نہیں۔" پھر امّاں محض بڑی آپا کے سوالوں سے بچنے کی خاطر اُن کی طرف سے رُخ موڑ کر ربیعہ کو آوازیں دینے لگیں۔

"امّاں۔" ان کی اتنی آوازوں کے جواب میں اُس نے صرف ایک بار اُنھیں پکارا پھر بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر شہر یار اس وقت خودکشی سیریس کیس کے سلسلے میں موجود تھے اور وہ کیونکہ عاصم کے دوستوں میں سے تھے، اس لیے فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"یہ میری سسٹر ہے شہر یار۔" وہ جب ربیعہ کا چیک اَپ کر رہے تھے، تو عاصم بھائی اُنھیں ربیعہ کے بارے میں بتانے لگے۔

"کوئی شاک لگا ہے انہیں۔" ڈاکٹر شہر یار سیدھے کھڑے ہوئے تو سرسری انداز میں بولے۔ پھر سسٹر کو اسے انجکشن لگانے کے لیے کہا۔ اور خود کاغذ پر میڈیسن لکھنے لگے۔

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟۔" بڑی آپا پوچھنے لگیں۔

"نہیں۔" انہوں نے تسلّی دی پھر میڈیسن والی پرچی عاصم بھائی کو دیتے ہوئے اُنہیں میڈیسن لانے کے لیے کہا اور جانے لگے تو عاصم بھائی بھی اُن کے ساتھ باہر نکل گئے۔

"کیا خیال ہے امّاں۔ میں یہاں سے شہروز کو فون نہ کر دوں؟" بڑی آپا لاعلمی کی بناء پر کہنے لگیں۔

"کیوں؟۔ اُسے فون کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" امّاں تلخی سے بولیں۔

"امّاں انہیں معلوم تو ہو کہ ان کی بیوی ہاسپٹل میں ہے۔" امّاں کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھیں کہ ابا میاں نے روک دیا اور خود ہی آواز دبا کر کہنے لگے۔

"بیٹا۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" بڑی آپا کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی امّاں اور کبھی ابا میاں کی طرف دیکھنے لگیں۔

"شہروز نے اُسے طلاق دے دی ہے۔"

امّاں نے گویا دھماکا کر دیا تھا کہ کتنی دیر تک بڑی آپا بے حس و حرکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امّاں کو دیکھتی رہی تھیں۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

کافی دیر بعد جب بڑی آپا اپنے آپ کو سنبھال کر کچھ سمجھنے کے قابل ہوئیں تو اُنہوں نے دیکھا، ابا میاں سر جھکائے کمرے سے باہر جا رہے ہیں۔ اُن کی نظریں ابا میاں سے ہٹ کر پہلے بیڈ پر بے سُدھ لیٹی ربیعہ پر ٹھہریں، پھر امّاں پر جم گئیں۔ امّاں اچانک بہہ آنے والے آنسوؤں کو دوپٹے میں جذب کر رہی تھیں۔ بڑی آپا کو ایک بار پھر دھچکا سا لگا۔ اُنہوں نے تو ہمیشہ امّاں کو حالات سے مردانہ وار مقابلہ کرتے دیکھا تھا۔ پھر اب یہ کون سا مقام تھا، کیسے حالات تھے جنہوں نے اُنہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔؟

"امّاں۔" بڑی آپا بیڈ کے گرد چکّر کاٹ کر اُن کے پاس آ کھڑی ہوئیں اور اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "یہ سب کیسے ہوا امّاں؟۔ کیوں ہوا؟۔ کیا قصور تھا ربیعہ کا؟"

"میں کیا بتاؤں بیٹا؟" امّاں گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "یہ تو کہتی ہے، کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بس معمولی سی بات پر۔ تم ہی بتاؤ، کیا معمولی سی بات پر اتنی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔؟"

بڑی آپا نفی میں سر ہلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"کب ہوا یہ سب؟"

"کل۔ کل دن میں آئی ہے۔" پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "اور اس سے پہلے یہ ایک ہفتہ میرے پاس رہ کر گئی ہے۔ پرسوں شام میں شہروز خود اسے لینے آئے تھے۔ اس وقت بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جس سے میں سمجھتی کہ دونوں میں کچھ رنجش ہے۔ بہت خوشی سے اِسے لے کر گئے تھے۔ اور کل گیارہ بجے پھر میرے کمرے میں موجود تھی۔ اکیلی تین کپڑوں میں۔"

"آپ نے کسی سے تصدیق بھی کی یا جو اُس نے کہا یقین کر لیا۔؟" بڑی آپا پُرسوچ انداز میں پوچھنے لگیں۔

"میں کل ہی اس کے سسرال جانا چاہتی تھی تاکہ اُن سے اِس کا قصور پوچھ سکوں لیکن اِس نے منع کر دیا۔"

"صوفیہ بھی نہیں آئی؟۔"

"نہیں۔ اور اب تو مجھے اُس کی طرف سے بھی دھڑکا لگا ہوا ہے۔"

"پھر اُس کی طرف سے تو آپ فکرمند نہ ہوں۔" بڑی آپا اندر ہی اندر خود پریشان ہونے کے باوجود امّاں کو تسلّی دینے لگیں۔

"کیسے فکرمند نہ ہوں؟۔ جب اس کے ساتھ وہ لوگ ایسا سلوک کر سکتے ہیں تو پھر صوفیہ تو الگ مزاج کی ہے۔ ذرا سی بات پر ہتھے سے اُکھڑ جاتی ہے۔ اور وہ لوگ کہاں برداشت کریں گے؟"

"پھر۔ اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے۔ آپ دل پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ اور ہاں ابھی عاصم کے سامنے ربیعہ سے متعلق کوئی بات مت کیجیے گا۔"

"میں نہ بھی کروں تو کب تک چھپی رہے گی؟۔ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں بھلا۔" امّاں پھر رونے لگیں۔

"امّاں۔ آپ روئیں تو نہیں۔"

"تو پھر کیا کروں؟" امّاں بے بسی سے بولیں۔

"ذرا صبر سے کام لیں۔ ابا میاں اور عاصم کو جانے دیں، پھر میں یہیں سے صوفیہ کو فون کر کے اصل بات معلوم کروں گی۔" پھر محض امّاں کو تسلّی دینے کی غرض سے کہنے لگیں۔ "ہو سکتا ہے ربیعہ کے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ اور ایسی کوئی بات نہ ہو۔"

"خدا کرے، ایسا ہی ہو۔" امّاں کو اندھیروں میں ہلکی سی کرن نظر آئی تو وہ آنسو پونچھ کر بڑی آپا کی بات کی روشنی میں نئے سرے سے سوچنے لگیں۔

وہ تو اکثر ہی اماں کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ ہفتہ دس دن وہیں رہتی، پھر آجاتی۔ اور اب بھ کے گھر گئی تھی۔ اگر یہ یقین ہوتا کہ ہمیشہ کی طرح ہفتہ دس دن کے بعد آجائے گی تو گھر کا نظام اس چلتا رہتا۔ لیکن المیہ تو یہ تھا کہ یقین تو دُور کی بات ہلکا سا آسرا بھی نہیں تھا۔ جب ہی تو گھر کے یک نے جیسے ماتمی لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ امی اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں تھیں۔ اسی طرح شہ کمرے میں بند تھے۔ مہروز البتہ آفس جا چکا تھا۔ اور اب صوفیہ اکیلی تھی۔ در و دیوار سے ٹپکتی وحش درمیان، اِدھر سے اُدھر ٹکراتی ہوئی۔

گو کہ مہروز جاتے ہوئے اُسے خاصا حوصلہ دے گیا تھا اور کچھ نئے راستوں کی نشاندہی بھی جس پر چل کر ربیعہ دوبارہ یہاں آسکتی تھی۔ اور مہروز کے سامنے تو وہ خاصی بہل بھی گئی تھی لیکن جو میں سوچنے بیٹھی تو اسے ہر بات ناممکن نظر آئی۔ ربیعہ سے اگر اس کا ناتا صرف اس گھر کے حوالے ہوتا تو شاید وہ صرف انسانیت کے ناتے اس کا دُکھ محسوس کرتی اور ہوسکتا ہے، کچھ دن کے بھی جاتی لیکن اِس سے ناتا ازل سے تھا۔ ایسا رشتہ جسے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی تھی۔ اِس کے لوگ لاکھ اُس سے ناتا توڑیں، وہ اس سے جڑی ہوئی تھی۔

ربیعہ اس سے بہت چھوٹی نہیں تھی۔ صرف سال ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ پھر بھی اُسے چ کہتی تھی اور ’چھوٹی‘ کے ساتھ ’آپا‘ کے اضافے نے ہی اُسے معتبر کیا تھا۔ کہ ہمیشہ ہر مقام پر وہ پو کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ اُس کے سامنے کوئی ننھی منّی سی بچی ہو اور پھر وہ سب بہنوں میں تھی انتہائی ڈرپوک اور بُزدل سی۔ کبھی اپنے جائز حق کے لیے بھی زبان نہ کھولی تھی۔ جبھی صوفیہ کو عزیز رہی۔ اُسے یاد آئے بچپن کے وہ دن جو اُن دونوں نے ساتھ گزارے تھے۔

”کِس قدر معصوم ہوا کرتی تھی وہ؟“ اُس نے سوچتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکا آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ بیتے سارے موسم نگاہوں میں آسمائے۔

بچپن اور مٹی کے گھروندے۔

لڑکپن اور گڑیا کی شادی۔

جوانی۔ اور۔ اور۔ ایک نام ذہن میں آیا ہی تھا کہ فون کی بیل نے سوچوں کو منتشر کر دیا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شاید کوئی آکر فون اٹینڈ کر لے لیکن کوئی نہ ناچار خود ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ریسیور کان سے لگایا تو بڑی آپا کی آواز سُنائی دی۔

”بڑی آپا۔ یہ آپ ہیں۔؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ وہ انجانے اندیشوں میں گھر کر پوچھ

”کیا ٹھیک ہے؟“ بڑی آپا اُلٹا اُس سے پوچھنے لگیں۔

”آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟“ اُس نے سوچا ہوسکتا ہے۔ بڑی آپا اس سارے قصّے ہوں اور یونہی فون کیا ہو، اس لیے پوچھنے لگی۔

”ہاسپٹل سے۔“

پتا نہیں بڑی آپا کا جواب۔۔۔ متوقع تھا یا غیر متوقع ۔۔۔۔ وہ پریشان ہوگئی۔

”خیریت؟ کون ہے ہاسپٹل میں؟“

”ربیعہ۔“

”ربیعہ۔؟“ اُس نے دہرایا۔ پھر چیخ پڑی۔ ”کیا ہوا اُسے؟“

”تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ اُسے کیا ہوا ہے؟“ بڑی آپا نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”بڑی آپا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”مجھے بتاؤ صوفیہ، اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کیا خطا ہوئی ہے اس سے جس کی اِتنی بڑ دے ڈالی شہروز احمد نے؟“

”بڑی آپا۔ میں کیا بتاؤں آپ کو؟“ وہ رونے لگی۔ ”سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ہم سب دیکھتے رہ۔ اور جہاں تک خطا کی بات ہے تو میں تو خود اس وقت سے سوچ رہی ہوں کہ اُس سے کیا خطا ہوئی؟“

شہروز سے نہیں پوچھا تم نے؟“

پوچھا تھا۔ لیکن اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کہنے لگے، ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی بات ر سکتے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”مجھے تو لگتا ہے بڑی آپا، وہ خود بھی پچھتا ہیں۔“

ہونہہ۔ پچھتا رہے ہیں۔“ بڑی آپا دانت پیس کر بولیں۔ ”محض دھوکا اور دِکھاوا۔ مجھے تو حیرت ہے۔ دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے۔ اچھے خاصے میچور لگتے ہیں۔“

خیر چھوڑیں۔ مجھے ربیعہ کے بارے میں بتائیں۔ کیا ہوا ہے اُسے؟ میرا مطلب ہے اُس کی تشویشناک تو نہیں ہے؟“ صوفیہ نے دانستہ اس پہلو سے گریز چاہا۔

بے ہوش ہے ابھی تک۔“

ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

بی اماں تو کمزوری بتائی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ بتا سکیں گے۔“

اماں اور ابّا میاں تو بہت پریشان ہوں گے۔“

ظاہر ہے تم خود سوچ سکتی ہو۔“ بڑی آپا نے کہا۔

بڑی آپا، اب اس کا کیا ہوگا؟“ چھوٹی آپا آنے والے حالات سے خوفزدہ تھیں۔

یہ تو بعد کی بات ہے، اس وقت تو دُعا کرو۔ وہ جلدی سے اچھی ہو جائے۔ بالکل زرد ہو رہی۔ اچھا میں پھر بات کروں گی۔“

بڑی آپا نے سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتی رہی، پھر کریڈل کر جیسے ہی پلٹی، ٹھٹھک گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جہاں وہ بیٹھی تھی، اب وہاں شہروز احمد بیٹھے تھے۔ پہلے اُس نے سوچا چپ چاپ کمرے میں چلی جائے۔ لیکن پھر اپنی سوچ کی نفی کرتی ہوئی اُن کے سامنے جا بیٹھی۔

کس کا فون تھا؟“ صوفے کی پشت سے سر ٹِکا کر نظریں اُس پر جماتے ہوئے وہ پوچھنے لگے۔

بڑی آپا کا۔“ وہ براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس پوری دُنیا میں وہی تو تھے، جن کے انداز اور لہجے میں اُس نے ہمیشہ بڑے بھائی کی شفقت اور رعب پایا تھا۔ ن کے سامنے ہمیشہ ہی وہ بے بس ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی چاہنے کے باوجود اُن کی آنکھوں میں نہ ملی۔ سر جھکا کر ناخنوں سے کھیلتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

کیا کہہ رہی تھیں؟“

کوئی خاص بات نہیں۔“

اچھا۔“ وہ افسردگی سے مُسکرائے۔ ”حیرت ہے کہ آپ کے لیے یہ بہت عام سی بات ہے کہ آپ ن اس وقت ہاسپٹل میں جانے کِس حال میں ہیں؟“

”شہروز بھائی۔“ وہ ایک دم سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”بات یہ ہے صوفیہ بی بی کہ میں آپ کی چیخ نما آواز سُن کر اپنے کمرے سے نکلا تھا اور اُس وقت سے یہیں موجود ہوں۔“

”جب آپ نے ساری باتیں سُن لی ہیں تو۔“

”صرف آپ کی۔“ وہ اُس کی بات کاٹ کر بولے۔ ”دوسری طرف کون، کیا کہہ رہا تھا“

”آپ کے لیے جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔" وہ طویل سانس لے کر کھڑے ہوگئے پھر جاتے جاتے کہنے لگے "آپ پریشان نہ ہوں، وہ جلد ٹھیک ہوجائے گی۔"

اور وہ پریشان کیسے نہ ہوتی۔ اب تو اُسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ دل چاہ رہا تھا، ابھی اسی وقت ربیعہ کے پاس چلی جائے لیکن مصلحت کا تقاضا اس کے برعکس تھا کہ اب وہ صرف ربیعہ کی بہن بن کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس گھر کی بہو ہونے کے ناتے کچھ حد بندیاں اس پر لاگو تھیں، جس کی پاسداری اس کا فرض تھا اور فرض سے غفلت کا انجام وہ دیکھ ہی چکی تھی۔ فی الحال تو وہ یہی جانتی تھی کہ شہروز احمد یان کی کسی بات سے غفلت کی بنا پر یہ سزا ربیعہ کا مقدر ٹھہری ہے۔

تین دن بعد جب وہ ہاسپٹل سے گھر آئی تو زندہ لاش کی مانند ہوچکی تھی۔ زرد رنگت کے ساتھ آنکھوں کے گرد گھرے سیاہ حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ ایک دوسرے سے یوں گلے ملے کہ جدا ہونا بھول گئے۔ پتا نہیں ذہن بیدار تھا یا نہیں۔ شاید نہیں تھا جبھی تو چپ چاپ ایک ایک کو دیکھتی رہتی۔ اماں بات کرتیں تب۔ کلثوم اور ہما کچھ کہتی تب۔ اور ابا میاں بولتے تب بھی بس چپ چاپ سنتی رہتی۔ اگر کسی وقت زیادہ دیر تک پلکیں نہ جھپکاتی تو اماں دہل کر اُسے جھنجھوڑ ڈالتیں۔

"ربیعہ۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کیوں اس طرح بیٹھی ہو؟" وہ حیران ہوتی اور کچھ کہے بغیر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیتی۔

کوئی ہفتے بھر بعد صوفیہ آئی تو اماں نے اسے گھیر لیا۔ سوال پر سوال اور اُن کے سارے سوالوں کے جواب میں اس نے آنکھوں دیکھا احوال کہہ سنایا۔ آخر میں کہنے لگی۔

"اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی اماں۔ شہروز بھائی کچھ بتاتے ہی نہیں۔ ہاں اگر ربیعہ نے آپ کو بتایا ہو تو۔"

"وہ کچھ بتانے کے قابل ہو تب ناں۔ ایک دم گم صم ہوکر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی ابھی منع کیا ہے کہ اسے کسی بات پر مجبور نہ کریں۔"

"ہے کہاں وہ؟" صوفیہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"اندر چھوٹے کمرے میں ہے۔"

"میں مل لوں اس سے۔" صوفیہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا اس سے۔" اماں نے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"ربیعہ۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پکارا۔ اور اس کے قریب جاکر بیٹھی تو دُکھ کی شدید لہر اُس کے پورے وجود میں سرایت کرگئی۔

یہ وہ ربیعہ تو نہیں تھی۔ ان چند دنوں میں کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تو بمشکل اپنے آپ پر قابو پاکر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی۔

"کیسی ہو ربیعہ؟"

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔؟" صوفیہ نے اس کے ملگجے کپڑوں اور اُلجھے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "چلو اُٹھ کر نہالو۔ میں تمہارے لیے کپڑے نکالتی ہوں۔"

"نہیں۔" اس کے ہونٹوں سے سسکی کی صورت 'نہیں' نکلا۔

"کیا نہیں۔؟" اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے صوفیہ نے پیار سے پوچھا تو وہ پھر ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ کچھ دیر تک تو صوفیہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اُسے بولنے پر آمادہ نہیں دیکھا تو کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں ربیعہ۔ تم اس وقت شدید شاک میں ہو۔ وہ بات جس کا کبھی گمان بھی نہ ہو، اچانک

…ے تو کرب سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ تم پر جو قیامت ٹوٹی ہے اور جس کرب سے تم گزر رہی ہو، اس …ب کو احساس ہے۔"

…اس کی آنکھوں میں پہلے ڈھیر سارا پانی جمع ہوا، پھر مچلا اور پھر پلکوں کی منڈیروں سے چھلک کر رُخساروں …نے لگا تھا۔ صوفیہ نے اُسے رونے سے منع نہیں کیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

…صرف تمہارا نہیں، ہم سب کا دُکھ ہے۔ تم اپنے آپ کو تنہا مت سمجھو۔ ایسا کروگی تو یہ دُکھ ناسور بن …ئے گا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ دُکھ کا یہ سمندر تنہا پار کرلوگی؟۔ نہیں میری جان، تم بہت کمزور ہو۔ کتنے ہاتھ پاؤں …ؤ گی، بالآخر تھک جاؤ گی۔ اور تھکنے کی صورت میں جانتی ہو کیا ہوگا؟"

…جانتی ہوں۔" آنسوؤں کی آمیزش آواز میں بھی تھی۔

…کیا ہوگا؟"

…دُکھوں کا دہکتا الاؤ مجھے جلا کر راکھ کردے گا۔"

…نہیں میری بہن۔" صوفیہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "اس طرح ہمت نہ ہارو۔ زندگی یہیں پر …ختم نہیں ہوجاتی۔ اور بہت سے راستے ہیں۔ کچھ دیر کو اپنی ذات سے ہٹ کر سوچو۔ اماں، ابا اور ہم سب …کس قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔"

…دُکھ تو اسی بات کا ہے چھوٹی آپا کہ میں نے تو کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا۔ کسی کو دُکھ دینے کے بارے …سوچا تک نہیں اب میری ہی ذات سب کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی ہے۔"

…تمہاری ذات نہیں، تمہاری حالت۔" صوفیہ نے فوراً ٹوکا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو، زندگی کی طرف آؤ۔ …زندگی میں بہت سارے امتحان ہمارے منتظر رہتے ہیں۔ اور عقلمندی اپنے آپ کو ان کے حوالے کردینے …میں نہیں ہے بلکہ اُن کا سامنا کرنے اور مقابلہ کرنے میں ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"تم اگر اسی طرح اس واقعے کو مسلسل اپنے آپ پر طاری کرکے بیٹھی رہو گی تو کبھی بھی نارمل نہیں ہوسکو …گی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ بھول جاؤ سب کچھ۔ کیونکہ فوری طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہوں …گی کہ بھلانے کی کوشش کرو۔ اور اس کوشش میں کامیابی اسی صورت ممکن ہے کہ تم اپنے ذہن کو دوسری …باتوں میں مصروف رکھو۔" صوفیہ نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"میں کیا کروں چھوٹی آپا؟۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ بہت بے بس نظر آرہی تھی۔

"وہی کام جو کبھی ہم تم مل کر کیا کرتے تھے بلکہ اکثر تم میرے حصے کا کام بھی کرلیا کرتی تھیں۔" صوفیہ گئے …دنوں کو یاد کرکے مسکرائی۔ پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس کمرے سے باہر نکلو تو کرنے کو بہت کچھ نظر آئے گا۔ گھر کے کام کم تو نہیں ہوتے۔ کلثوم اور …ہما کالج چلی جاتی ہیں تو اماں بے چاری۔"

"مجھے احساس ہے۔" وہ فوراً بولی۔ "لیکن میں کیا کروں چھوٹی آپا کہ میں اپنے اندر بالکل ہمت نہیں …پاتی۔ ذرا سی کھڑی ہوتی ہوں تو آنکھوں سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں الگ سن ہوجاتے ہیں۔"

"کمزوری کی وجہ سے۔ تم دوا پابندی سے استعمال کرو۔ اور ہاں، اماں بتا رہی تھیں، تم ڈھنگ سے …کھاتی پیتی بھی نہیں ہو۔ اس طرح تو اور کمزور ہوجاؤ گی۔" صوفیہ نے اُسے پیار سے سمجھایا۔

"کیا کروں، کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"جسے دسترخوان پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو، وہ اکیلا کچھ نہیں کھا سکتا۔ چلو اُٹھ کر …منہ ہاتھ دھولو۔ پھر سب ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔"

"مجھے سب کا سامنا کرتے ہوئے بہت عجیب سا لگتا ہے چھوٹی آپا، اندر ہی اندر یہ احساس کچوکے …لگاتا ہے کہ میں اس گھر کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے چلی آئی ہوں۔ اماں کی آہیں، کلثوم اور ہما کا مجھے …دیکھ کر ایک دم خاموش ہوجانا اور ابا جان کی جھکی کمر۔"

"ایسا سب تمہاری حالت کے پیشِ نظر ہے ۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ شاید تمہیں ان کا ہنسنا بولنا تمہیں لگے گا۔ اس لیے تمہیں دیکھ کر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ اگر تم ان سب کے ساتھ شریک اُن میں اُٹھو بیٹھو، تب تمہیں احساس ہو گا کہ اس پوری دنیا میں تمہارے لیے سب سے بڑھ کر ہمدرد غم خوار اسی گھر کے لوگ ہیں ۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"ماں باپ کا دل اور دامن بہت وسیع ہوتا ہے ربیعہ، شاید اس پوری کائنات سے زیادہ وسیع کبھی اولاد کی خوشیاں مانگنے کے لیے پھیلتا ہے اور کبھی اُن کے دکھ سمیٹنے کے لیے۔ تم اماں سے یا ابا میاں سے کہہ دیکھو۔ اپنے دل کی ساری باتیں، پھر دیکھنا وہ تمہارے دکھ کیسے سمیٹتے ہیں۔ تم خفا نہیں ہو ربیعہ، اگر خطاوار ہوتی تب بھی اماں ابا نے ہی تمہیں گلے لگانا تھا۔" وہ خاموش رہی تو صوفیہ نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھا دیا۔

"چلو کھانا پک چکا ہوگا۔ تم جب تک منہ ہاتھ دھولو، میں دسترخوان لگاتی ہوں۔"

پھر اُسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر صوفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہی کمرے سے باہر لے آئی۔

ثاقب حسن اپنے منصوبے کی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ دو سال پہلے اُس نے ربیعہ کو پانے کا جو منصوبہ بنایا تھا۔ اُس وقت اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی اور بغیر کسی پریشانی کا سامنا کیے، ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شہروز احمد کی شرافت سے فائدہ اُٹھاتے وقت بھی خاصا غیر یقینی تھا۔ ایک طرح سے اُس نے رسک ہی لیا تھا۔

کامیابی یا ناکامی؟ اُس نے سوچا تھا۔

کامیابی کی صورت میں واہ واہ۔

اور۔۔

ناکامی کی صورت میں ربیعہ کو حاصل کرنے کے لیے گذشتہ دو سالوں کے دوران اور بہت سے طریقے سوچ چکا تھا۔ لیکن شاید اُس کی قسمت اچھی تھی کہ اُسے ان طریقوں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی یہاں اُسے اپنی کامیابی پر خوشی کے ساتھ ساتھ شہروز احمد پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اُنہوں نے بغیر کسی تردد صرف اُس کے کہنے پر ربیعہ کو چھوڑ بھی دیا۔

"دو سال کم نہیں ہوتے۔" وہ سوچنے لگا۔ "اور حیرت ہے کہ اتنا عرصہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے شہروز احمد، ربیعہ کو نظر انداز کرتے رہے جب کہ۔۔"

"بھائی۔" انیلا نے اس کے کمرے میں جھانک کر پکارا تو اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ ناگواری سے اُس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"کیا ہے؟"

"کھانا لگ چکا ہے۔ آجائیے۔"

"اچھا۔" وہ طویل سانس لے کر اُٹھا۔ اور انیلا کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں آگیا۔ ایک نظر ڈائننگ ٹیبل پر ڈالی، پھر ابا کی کرسی خالی دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"ابا کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟"

"نہیں۔ کہہ رہے ہیں بھوک نہیں ہے۔" اماں نے سالن کا ڈونگا اُس کے سامنے رکھتے ہوئے

"خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اُن کی۔" اُس کے لہجے میں تشویش در آئی۔

"ہاں، ٹھیک ہیں۔ اب تم تو شروع کر دیا یونہی سوال جواب کیے جاؤ گے؟"

"لگتا ہے، آپ کو بھوک زیادہ لگی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ پھر اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگا

"اماں کو بھوک زیادہ نہیں لگی بلکہ انہیں غصہ آرہا ہے۔" انیلا نے کچھ ڈرتے ڈرتے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے مخاطب کر کے کہا۔

"کس بات پر؟ کیا ابا سے لڑائی ہو گئی ہے؟" وہ پوچھنے لگا۔

"لڑائی تو نہیں، شام میں خوب گرما گرم بحث ہوئی ہے۔"

"انیلا۔" اماں نے ٹوکنے کے ساتھ اُسے گھور کر بھی دیکھا تو وہ مدد کے لیے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اُسے مت ٹوکیے اماں۔ چلیے آپ ہی بتائیے کیا بات ہے؟ واقعی ابا غصے کی وجہ سے کھانا نہیں کھا رہے ہیں؟" وہ کھانا چھوڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے نہیں پتا۔"

اماں کچھ بتانے پر آمادہ نظر نہیں آئیں تو وہ پھر انیلا کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلو انیلا۔ تم بتاؤ، کیا بات ہوئی؟"

"بات تو بڑے خوشگوار انداز میں شروع ہوئی تھی بھائی۔" وہ اماں کے گھورنے کے باوجود مزے لے لے کر بتانے لگی۔ "یعنی آپ کی شادی کی بات ہو رہی تھی اور جب ابا نے اپنی بھتیجی کا نام لیا تو اماں کو اپنی بھانجی یاد آگئی۔ بس دونوں میں بحث شروع ہوگئی جو کسی بھی نتیجے پر پہنچے بغیر یوں ختم ہوئی کہ ابا منہ سر لپیٹ کر پڑ گئے اور اماں آپ کے سامنے موجود ہیں۔"

"ہوں۔" اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر پانی کا گلاس اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد خالی گلاس کو قدرے زوردار آواز کے ساتھ ٹیبل پر رکھتا ہوا، اماں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"نہ کسی کی بھانجی۔ نہ کسی کی بھتیجی، شادی میں اپنی پسند سے کروں گا۔"

"کیا ہے تمہاری پسند؟ میرا مطلب ہے کون ہے؟" اماں فوراً پوچھنے لگیں۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے انیلا سے فارغ ہولیں۔" اُس نے فی الحال ٹالنے کی غرض سے، انیلا کی آڑ لی۔

"ہم انیلا اور تمہاری شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں تاکہ گھر ایک دم خالی نہ ہو جائے۔" اماں نے اپنی رائے فیصلہ کن انداز میں سنائی۔

"ٹھیک ہے اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو ایسا ہی ہو جائے گا۔ پھر بھی انیلا کی کہیں بات تو طے ہونے دیں۔"

"انیلا کی بات طے سمجھو۔"

"کہاں؟" اُس کی لاعلمی بجا تھی۔ کہ وہ دو سالوں میں گھر سے باہر صرف ذاتی غرض کے لیے ہی پریشان رہا تھا۔

"منصور کے ساتھ۔ اُس کے گھر والے اصرار بھی بہت کر رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے، وہ اچھا لڑکا ہے۔"

"ہاں۔" وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔ "ہے تو واقعی اچھا لڑکا، لیکن آپ نے پہلے مجھ سے ذکر نہیں کیا کبھی؟"

"لو، کہاں رہتے ہو تم؟ کتنی بار تو تمہیں بتایا ہے۔ پتا نہیں کن کاموں میں اُلجھے رہتے ہو کہ ڈھنگ سے بات بھی نہیں سنتے۔"

"آپ کو پتا تو ہے۔ اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس طرف سے مطمئن ہوں گا، تب کسی اور طرف دھیان دے سکوں گا۔"

"یہ تو ہے۔" اماں نے فوراً اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔ پھر اسی طرح نرمی سے کہنے لگیں۔ "بہر حال اب

یاد رکھنا، ہم منصور کے گھر والوں کو ہاں کہہ رہے ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں تمہاری بھی کہیں بات طے ہو جائے تو۔۔"

"آخر تان وہیں آ کر ٹوٹی یعنی بھانجی یا بھتیجی۔۔؟" چھوٹے بھائی عاقب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے شرارت سے کہا۔ تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"اِن دونوں میں سے کوئی نہیں۔"

"بھائی۔۔ تو پھر جلدی سے اپنی پسند بتائیے۔" انیلا اُس کی پسند جاننے کو بے چین تھی۔ اور وہ ابھی اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ہی ربیعہ کا نام لینا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا جو بات کل کرنی ہے، وہ آج ہی کیوں نہ کرے؟۔ سب اصرار بھی کر رہے ہیں۔

"تم جانتی ہو اُسے۔ بلکہ امّاں بھی جانتی ہیں۔" وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولا۔

"کون؟۔" انیلا ذہن پر زور دینے لگی۔

"ربیعہ۔" وہ اطمینان سے کہہ کر لاپروا نظر آنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔

"ربیعہ؟۔" انیلا نے دہرایا۔ پھر اُس کی دماغی حالت پر شبہ کرتی ہوئی کہنے لگی۔ "لیکن بھائی، اُس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔"

"کون؟۔ وہ لڑکی جس کے ہاں ہم ثاقب کے باہر جانے سے پہلے گئے تھے؟۔" امّاں یاد کرتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

"ہاں وہی ربیعہ۔" اُس کا اطمینان ابھی تک برقرار تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ اُس کی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن آپ لوگ نہیں جانتے کہ اُسے طلاق ہو چکی ہے۔"

"کب؟۔" انیلا کی چیخ نما آواز میں تاسف تھا۔ جب کہ امّاں ناگواری سے کہنے لگیں۔

"تو تم اُس طلاقن سے شادی کرو گے؟۔"

"جی۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ ایک بار جس کے گھر سے خالی ہاتھ لوٹ آئی ہوں، دوبارہ وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"لیکن امّاں۔ اب آپ وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گی۔"

"میں جانتی ہوں۔ اب میرا بیٹا بڑا آدمی جو بن گیا ہے، اب کوئی خالی ہاتھ کیوں لوٹائے گا، لیکن سن لو کہ میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مت جائیے گا۔ لیکن پھر آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟۔"

"میں ربیعہ سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور وہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کرسی کو پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے دھکیل کر ڈائننگ روم سے نکل آیا۔

انیلا کو اُس کے غصّے کا اندازہ تھا، اس کے باوجود اس کے پیچھے چلی آئی۔

"تم کیوں آئی ہو؟" وہ اُسے اپنے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کڑے تیوروں سے پوچھنے لگا۔

"یونہی۔"

"یونہی یا ربیعہ کے بارے میں پوچھنے۔۔؟۔"

"جب آپ کو پتا ہے کہ اُس کے بارے میں جانے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا تو پھر اس طرح جرح کیوں کر رہے ہیں؟۔"

"کیا جاننا چاہتی ہو؟۔"

اُسے نرم پڑتے دیکھ کر انیلا فوراً کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ربیعہ کو طلاق ہو گئی ہے؟۔"

"میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔"

"اسی شہر میں تو ہم بھی رہتے ہیں۔ ہمیں تو نہیں معلوم ہوا۔ بہرحال یہ بتائیے کب اور کیوں؟۔"

"کب اور کیوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔"

"ایسے ہی چلی جاؤں۔" وہ بھی ڈھیٹ بن گئی۔

"پھر مزید کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟۔"

"مزید یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا واقعی آپ اس کے لیے سنجیدہ ہیں۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟۔ میں مذاق کر رہا ہوں؟۔"

"پھر بھی بھائی۔ اب حالات وہ نہیں ہیں۔ اور پھر میرا خیال ہے امّاں تو کسی صورت نہیں مانیں گی۔"

"امّاں کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ میں اس کے علاوہ اور کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ بات تم بھی امّاں کو اچھی طرح سمجھا دینا۔"

"وہ تو میں سمجھا دوں گی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہوا؟۔ کیونکہ وہ تو اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔" اُس کے سامنے ربیعہ سے آخری مُلاقات کی جیسے فلم چلنے لگی کہ ربیعہ تو اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش و خرم تھی۔۔ پھر اب!

"تمہیں یہ سب سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ چلو اب جاؤ یہاں سے، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اسی طرح اُلجھتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اور وہ جب تنہا ہوا تو پھر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جو کبھی رگِ جاں سے قریب تھی اور جس کے حصول کی پہلے خواہش تھی، پھر مقصد اور اب ضد۔

اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے پھر شہروز احمد کا خیال آیا تو اُس نے سوچا کہ جب سے انہوں نے اُسے فون پر ربیعہ کو چھوڑ دینے کا بتایا۔ اس کے بعد سے وہ اُن کے پاس گیا ہی نہیں۔

"کیا سوچتے ہوں گے شہروز احمد۔" وہ سوچنے لگا۔ "اپنا کام نکل گیا۔ تو پھر شکل ہی نہیں دکھائی۔ کم از کم مجھے خود جا کر ان کا شکریہ تو ادا کرنا ہی چاہیے تھا۔ آخر انہوں نے۔" وہ پتا نہیں کیوں ہنسا۔ پھر اگلے دن اُن کے پاس جانے کا پروگرام بناتا ہوا سو گیا۔

صوفیہ کے سمجھانے کا اس پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ کسی کسی وقت کمرے سے نکلنے لگی تھی۔ شروع میں ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ جھجک سی تھی۔ انتظار میں رہتی کہ امّاں اِدھر اُدھر ہو جائیں تاکہ کمرے سے نکلتے ہوئے اُن سے سامنا نہ ہو۔ لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہر بار ایسا ممکن نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ بہت احتیاط کرتی، کمرے سے نکلتی تو کچن میں، کچن سے فارغ ہوتی تو باتھ روم۔۔ اور امّاں نادان نہیں تھیں۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے پہلے خود ہی اس کے راستے سے ہٹ جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کے قریب آنے لگیں۔ زیادہ کوشش یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں پہلے جیسا محسوس کرنے لگے۔

"ربیعہ۔ یہ چاول چُن دو۔"

"بیٹیا۔ اگر تمہاری طبیعت اچھی ہو تو روٹی ڈال دو۔"

روزمرہ کے عام سے جملے بولتے بولتے ایک دن اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بیٹا۔ بیٹیاں پرائی ضرور ہو جاتی ہیں لیکن ان کے دُکھ سُکھ پرائے نہیں ہوتے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے نہیں کہو گی، سنو گی تو کس سے کہو گی؟۔ اور پھر تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سمجھتی ہوں۔۔" قدرے توقف کے بعد آہ بھر کر بولیں۔

"سُنا ہے، اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ پتا نہیں اس میں کیا مصلحت ہے؟۔ بہرحال

یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اِسی طرح جس طرح کلثوم اور ہُما کا ہے۔ تم اپنے آپ کو اجنبی کیوں سمجھتی ہو؟"
اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگیں۔

"میں جانتی ہوں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور اگر تم قصوروار ہوتیں، تب بھی اس گھر کے دروازے تم پر بند تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بیٹیوں کے لیے کبھی دروازے بند نہیں ہوتے۔"

"میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا اماں۔" اُس نے پہلی بار لب کشائی کی، ساتھ آنسو بھی بہہ نکلے۔

"کیا اچھا، کیا بُرا، یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ تم زیادہ دل پر بوجھ مت ڈالو۔ ہو سکتا ہے، آگے اچھا ہی اچھا ہو۔" اماں نے اُس کے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کیے، پھر اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

"تم تو میری بڑی صابر بیٹی ہو۔"

اُس نے سینے میں کروٹیں لیتے درد سے بے چین ہو کر اماں کی گود میں سر رکھ لیا تو ایک دم جیسے پناہوں میں آ گئی۔

پھر اُسی روز خود اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ اپنے رویّے سے گھر والوں کو مزید پریشان کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ان حالات سے جن کا کہ اُسے پہلے سے علم تھا، سمجھوتا نہیں کر پا رہی، لیکن اماں اور ابا میاں کی خاطر اسے اپنے آپ کو ضرور سنبھال لینا چاہیے۔ اس خیال کے تحت اپنے آپ کو معمول پر لانے کی کوشش کی تو لگا جیسے اپنی ہستی کے پرخچے اُڑ جائیں گے بھلا یہ بھی ممکن ہے کہ۔

پیروں تلے تپتی ریت ہو اور جسم و جاں جلنے سے محفوظ رہیں۔
دل میں سمندر مچلتا ہو اور آنکھوں میں بوند نہ اُترے۔
یادوں کے دریچوں پر مسلسل دستک ہوتی رہے۔ اور وہ ہر بار بہری بن جائے۔

کب تک اور کہاں تک وہ سماعتوں پر پہرے بٹھائے اور کون کون سا دریچہ بند کرے۔ ایک دریچہ بند کرتی ہے تو دُوسرا کُھل جاتا ہے۔

سرگوشیوں کی گمبھیرتا ہے اور وہ ہے۔ کس قدر زورآور ہے وہ شخص کہ دُور ہو کر بھی کس قدر قریب کہ ہر دم، ہر پل ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ اسی آنگن کے اسی دروازے سے نکلتے ہوئے تو اُس نے کہا تھا۔

"جب تک کچھ حق رکھتا ہوں، اُسے استعمال بھی کروں گا۔"

"شہروز احمد۔" گہرے دُکھ کے احساس میں گِھر کر اُس نے سوچا۔ "کاش تم سچ مچ اپنا حق استعمال کرتے۔ تو کوئی تیسرا شخص ہمارے راستے الگ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن تمہارے لیے میری ذات میں شاید کوئی کشش نہیں تھی۔ جبھی تو اتنی آسانی سے اپنے حقوق سے دستبردار ہوئے اور میرے حقوق کو بے دردی سے پامال کیا۔"

"ربیعہ۔"

اپنے نام پر سوچوں کے بھنور سے نکلتے ہوئے اُس نے چونک کر دیکھا۔ اُس کے سامنے انیلا اپنی اماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ پہلے اُسے شبہ ہوا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب انیلا اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کے برابر بیٹھی تو حقیقت کا احساس جاگا۔

"تم۔ ؟" ناگواری کی تیز لہر اُس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ جسے محسوس کیے بغیر انیلا خوش دلی سے بولی۔

"ہاں۔ میں اور دیکھو اماں بھی آئی ہیں۔"

اُس نے سرسری سی نظر اس کی اماں پر ڈالی اور اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ بڑے کمرے میں کلثوم نظر آئی تو اُس سے کہنے لگی۔

"سنو میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں لیٹنے جا رہی ہوں۔ تم پلیز کسی کو میرے پاس مت آنے دینا۔"

"میں آپ کا سر دبا دوں آپی۔" کلثوم نے ہمدردانہ پیشکش کی۔

"نہیں۔" وہ جلدی سے کہہ کر چھوٹے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کر کے چارپائی پر بیٹھی تو فوری طور سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی خیال۔ بس اندر ہی اندر بے حد گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ ں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنساتی ہوئی ہلکے سے بڑبڑائی۔

"یہ انیلا کیوں آئی ہے؟" اور اپنے آپ سے کیے گئے اس سوال کے ساتھ ہی ذہن بہت ساری ں تک اچانک رسائی حاصل کر گیا۔

ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس کی عدّت کے دن ختم ہوئے تھے۔ تو کیا ثاقب حسن نے سچ مچ کسی خاص مقصد انیلا اور اپنی اماں کو بھیجا ہے؟

"نہیں۔" اُس کا سر آہستہ آہستہ نفی میں ہلنے لگا۔ اور آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔

"کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔" اُس کا دل چاہا چھوٹی آپا کی طرح سارے لحاظ بھلا کر یہ حدیں پھلانگتی ہوئی ثاقب حسن کی والدہ کے سامنے جا کھڑی ہو اور صاف لفظوں میں کہہ دے۔

"میں کبھی بھی آپ کے بیٹے کو قبول نہیں کروں گی۔"

اور اتنی باحوصلہ تو وہ کبھی بھی نہ تھی۔ کتنی بار دروازے تک جا کر پلٹ آئی۔ بالآخر اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی۔

"میں بہت۔ بہت بزدل ہوں۔"

"اور میں آپ کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بھی کسی بھی مقام پر۔" قریب ہی جیسے کوئی سرگوشی کرنے لگا تو وہ چونکی اور ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی

"شہروز احمد۔"

"زندگی میں بہت ساری باتیں ہماری مرضی کے خلاف ہو جاتی ہیں۔" آوازوں کی بازگشت نے اسے گرفت میں لیا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اُن پر کُڑھتے رہیں یا فرار کے طریقے سوچتے رہیں۔ اس کے برعکس ہمیں جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کا سامنا کرنا چاہیے۔"

"میں کیسے سامنا کروں؟ اتنی جرأت مند نہیں ہوں میں۔" کاش وہ چیخ چیخ کر رو سکتی۔ لیکن منہ پر ہاتھ رکھ کر اُس نے اپنی چیخوں کو دبا لیا تھا۔

کافی دیر بعد کلثوم نے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ اُسے پکارا تو اُس نے جلدی سے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے دروازہ کھولا تو کلثوم اس کے لیے چائے لیے کھڑی تھی۔

"آئی ایم سوری آپی۔ مجھے چائے لانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں مہمانوں کو۔" وہ پتا نہیں کیوں کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اُس نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ چپ چاپ اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ لے کر پلٹی اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

"آپی۔ کوئی اسپرین وغیرہ لیں گی؟" کلثوم پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ اور سنو ابا میاں آ گئے کیا؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں آئے۔"

"اچھا۔" وہ خاموش ہو کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔

کلثوم کچھ دیر تک کھڑی اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی،

اگلے دو تین روز تک وہ انتظار کرتی رہی کہ اماں کسی بہانے اس کے سامنے انیلا کا ذکر چھیڑیں گی۔ اُس کی والدہ کی آمد کا مقصد بھی بتائیں گی۔ اس دوران وہ مسلسل اُن کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ بیٹھے

بیٹھے سوچوں میں گم ہو جاتیں۔ تو کبھی اُن کا سر اثبات میں ہلنے لگتا اور کبھی نفی میں یوں جیسے وہ کوئی ف نہ کر پا رہی ہوں۔ پھر اچانک چونک کر اس کی طرف بھی دیکھنے لگتی تھیں۔ ایسے میں وہ پوری طرح اُن کی متوجہ ہو جاتی کہ شاید ابھی کچھ کہیں گی لیکن تین چار روز تک انہوں نے خود سے کچھ نہیں کہا۔ تب وہ ہمت کر گئی۔

"امّاں۔ انیلا کیوں آئی تھی؟" اُس نے پوچھ کر سر جھکا لیا تو امّاں کتنی دیر تک اُسے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

"بیٹا۔ بات ہے تو قبل از وقت۔ لیکن ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے۔" قدرے توقف بولیں۔ "وہ ایک بار پھر تمہارے لیے سوالی بن کر آئی تھیں۔"

یہ جواب اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ پھر بھی وہ یوں دیکھنے لگی جیسے امّاں نے کوئی انہونی دی ہو۔

"آپ نے کیا جواب دیا انہیں؟" خدشوں میں گھر کر اُس نے پوچھا۔

"ابھی تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"امّاں۔" وہ اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر منت سے بولی۔ "میری ایک بات مانیں امّاں، آپ ا صاف جواب دے دیں۔"

"کیوں بیٹا؟"

"بس امّاں۔ اب میرا دل اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آپ میرے بارے میں نہ سوچیں۔ کوئی نہ کریں۔ میں یہیں رہوں گی۔ ہمیشہ آپ کے پاس۔" امّاں اس کی کیفیت سمجھتی تھیں، اس لیے فور پر اُسے سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بس ہلکے ہلکے اُس کے ہاتھ تھپکنے لگی تھیں۔

ثاقب حسن کا خیال تھا کہ اسے ربیعہ کو شہروز احمد سے آزاد کرانے میں دشواری کا سامنا ہو گا لیکن وہ مرحلہ بہت آسانی سے طے ہو گیا تو اُس نے سوچا کہ اب آئندہ تو اُس کے لیے آسانیاں ہی آسا ہوں گی۔ وہ ربیعہ کی عدت کے دن پورے ہوتے ہی اپنی امّاں کو اس کے ہاں بھیجے گا، جہاں اُ امّاں اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے بہت فکر مند ہوں گی۔ اور بغیر کوئی سوال جواب کیے فوراً ہامی بھر لیں

لیکن جب اُس کی امّاں نے ربیعہ کے ہاں سے واپسی پر بتایا کہ انہوں نے ابھی کوئی جواب نہیں اور یہ کہ سوچنے کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کریں گے۔" تو اُسے خاصی حیرت ہوئی۔ امّاں کے سامنے کچھ نہیں بولا۔ لیکن موقع ملتے ہی انیلا کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

"سنو انہوں نے سوچنے کو وقت کیوں مانگا ہے؟" خاصی تشویش سے پوچھنے لگا۔

"ظاہر ہے بھائی وہ بیٹی والے ہیں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔" انیلا نے اپنے طور پتے کی بات کی لیکن وہ جھنجھلا گیا۔

"تم نے غالباً ان پر میری حیثیت واضح نہیں کی ہو گی۔"

"کیوں نہیں۔ امّاں نے سب کچھ بتایا۔"

"کیا۔ کیا بتایا؟"

"یہی کہ آپ دو سال باہر رہ کر آئے ہیں۔ اور اب ماشاءاللہ مالی طور پر اتنے مستحکم ہو چکے ہیں وسیع پیمانے پر اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔"

"پھر انہوں نے اعتراض کیوں کیا؟"

"اعتراض تو کوئی نہیں کیا۔" پھر وہ مشکوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی ہوئی پوچھنے لگ "ویسے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"نہیں۔ پریشان نہیں ہوں۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگا جیسے کسی بھی چیز اُٹھا کر پٹخ دینے کا ارادہ ہو۔

"صبر سے کام لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انیلا نے کہا اور اُٹھ کر جانے لگی کہ وہ روک کر پوچھنے لگا۔

"ربیعہ کے بارے میں تو بتاؤ۔ اُس سے تمہاری کیا باتیں ہوئیں؟"

"کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ وہ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی اور پھر آخر وقت تک باہر نہیں نکلی۔"

"تمہیں دیکھ کر اُس کے تاثرات کیا تھے؟" وہ ہر بات جاننا چاہتا تھا۔

"پتا نہیں، میں بالکل نہیں سمجھ سکی وہ خوش تھی یا ناخوش۔" قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔ "ویسے بیمار لگ رہی تھی۔ کمزور اور زرد سی۔"

"بیمار لگ رہی تھی۔" وہ انیلا کو جاتے دیکھ کر بڑبڑایا اور پھر لیٹا تو مسلسل اُسی کے بارے میں سوچتے بہت ساری باتیں۔ جنہیں خود ہی فرض کرتا اور خود ہی جھٹلاتا رہا تھا۔ آخر میں اُس نے سوچا، وہ کس ربیعہ کے بارے میں معلوم کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہروز احمد کا خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، وہ جانتے ہوں۔

اس روز بھی وہ اُن کے پاس جانے کا صرف پروگرام ہی بنا سکا تھا۔ اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے نہیں سکا تھا۔

گلے روز اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بہانے اُن کے آفس جا پہنچا۔

سنجیدگی کے حصار میں مُقید شہروز احمد اپنی گریس فل شخصیت کے ساتھ بے حد خاموش نظروں سے ن کی طرف دیکھنے لگے اور اگر جو وہ دیدہ ور ہوتا تو جان لیتا کہ متاعِ عزیز لُٹا کر وہ شخص کس قدر تنہا تنہا لگ رہا تھا لیکن اس وقت ثاقب حسن صرف اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار تھا۔

"بیٹھو۔" اس کی آمد پر کوئی مُسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر نہیں مچلی۔ اسی طرح سنجیدگی سے سامنے الی کُرسی کی طرف اشارا کیا تو وہ بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا؟" وہ پوچھنے لگے۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔" وہ اُن کی سنجیدگی سے مرعوب ہو کر بولا۔

"کس بات کا؟" وہ اپنی توجہ سامنے کھلی فائل پر مرکوز کرتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔

"جو امانت میں نے آپ کو سونپی تھی، وہ آپ نے بخوشی لوٹا دی۔"

"بخوشی؟" انہوں نے سوچا اور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا، جب وہ بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو کہنے لگا۔

"آپ جانتے ہیں کہ ربیعہ۔"

"ثاقب حسن۔" انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر سختی سے اُسے ٹوک دیا۔ "میں اس لڑکی ربیعہ اکرام علی سے تعلق نہ کوئی بات سنوں گا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔"

ثاقب حسن ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر سر جھکا گیا۔ اور کسی اور موضوع پر بات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کہنے لگے۔

"میں آئندہ کبھی تم سے ملنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہر وہ راستہ بھول جاؤ جو میری طرف آتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے باہر جانے والے دروازے کی طرف اشارا کر دیا۔ ان کے ہونٹ بھینچ گئے تھے جب کہ ہر انداز پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

"گیٹ لاسٹ فرام ہیئر ثاقب حسن۔"

وہ اس وقت کچن میں پیڑھی پر بیٹھی چاول چُن رہی تھی، جب صوفیہ آئی۔ پہلے اندر جا کر امّاں سے ملی۔

پھر اُس کے پاس چلی آئی۔ بے خیالی میں وہ اسے دیکھے گئی جب کہ ذہن کہاں سے کہاں بھٹک گیا کہ اسی طرح وہ خود آیا کرتی تھی اور چھوٹی آپا اکثر اُسے اسی پیڑھی پہ بیٹھی ملتی تھیں۔ کس قدر عجیب بات تھی کہ سب کچھ ویسا ہی تھا، بس دونوں کی جگہیں بدل گئی تھیں۔

"یوں کیا دیکھ رہی ہو؟" صوفیہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھتی ہوئی پیار سے پوچھنے لگی۔

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ اس لیے نظر جم کر رہ گئی۔" اُس نے بروقت اپنے آپ کو سنبھالا۔ "اور یہ آپ یہاں کیوں بیٹھ گئیں، اندر چلیں ناں۔"

"بس یہیں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی اماں کے پاس پڑوس والی خالہ بیٹھی ہیں۔"

"پھر یہ پیڑھی لے لیجیے۔" وہ اپنے نیچے سے پیڑھی نکالنے لگی کہ اُس نے روک دیا۔

"بیٹھی رہو تم۔ میں آرام سے بیٹھی ہوں۔ اور یہ تم کیا پکانے جا رہی ہو؟"

"چاول چڑھا رہی تھی۔ آپ کیا کھائیں گی؟"

"کچھ بھی بلکہ جو تم پکا رہی ہو، وہی کھاؤں گی۔"

اُس نے آخری نظر چاولوں پر ڈالی پھر اُنہیں دھونے میں لگ گئی۔ اس کام سے فارغ ہو کر دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی جیسے ہی پلٹی صوفیہ ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"سنو۔ یہ تمہارے لیے ہے۔"

"کیا ہے اس میں؟" پتا نہیں اس کا دل کیوں اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"پتا نہیں۔ اسے تمہاری امانت کہہ کر دیا گیا ہے، اگر میں کھول کر دیکھ لیتی تو خیانت ہو جاتی۔"

"کس نے دیا ہے؟" اِسے اپنا یہ سوال انتہائی فضول لگا۔

"شہروز بھائی نے۔" شہروز کا نام لیتے ہوئے صوفیہ خوامخواہ نظریں چرا گئی۔

"پتا نہیں چھوٹی آپا۔ مجھے یہ لینا بھی چاہیے یا نہیں۔" وہ اُلجھنے لگی۔ "آپ پہلے اماں سے پوچھ لیں۔"

"بیوقوف ہو تم۔ ہو سکتا ہے اس میں ایسی کوئی چیز ہو جسے تم اماں تو کیا مجھ سے بھی چھپانا چاہو۔" صوفیہ نے زبردستی لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھمایا۔ پھر کہنے لگی۔ "پہلے تم خود اِسے دیکھ لینا پھر اگر مناسب سمجھو تو۔"

"صوفیہ۔" اماں اندر سے آواز دے رہی تھیں۔ صوفیہ اُس کا ہاتھ تھپکتی ہوئی اُٹھ کر اماں کے پاس چلی گئی تو وہ کچھ دیر تک یونہی گم صم کھڑی بند لفافے کو دیکھتی رہی۔ پہلے خیال آیا وہ اسے اسی طرح رکھ دے اور فراغت کے وقت اطمینان سے دیکھے لیکن تجسس غالب آ گیا۔ اور وہ وہیں بیٹھ کر لفافہ کھولنے لگی۔

سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں ایک چیک آیا جس کے بارے میں فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی کہ آیا یہ کیا چیز ہے اور اُسے سمجھنے کے بجائے اُس نے دُوسرا کاغذ نکالا۔ تہہ شدہ کاغذ جیسے ہی کھولا تو اس میں سے ایک تصویر اُس کی گود میں آ گری۔ اُس نے بس سرسری نظر تصویر پہ ڈالی، پھر تیزی سے تحریر پہ نظریں دوڑانے لگی۔

"میری زندگی کا سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا اور عجیب اتفاق یا شاید المیہ یہ ہے کہ آج پہلی بار جسے لکھ رہا ہوں، اُس کے بارے میں یہ یقین بھی نہیں ہے کہ وہ اسے پڑھنا گوارا بھی کرے گی یا نہیں۔"

اِس کے بعد باقاعدہ خط کا آغاز یوں تھا جیسے سوچتے اور اُلجھتے ہوئے لکھا گیا ہو۔

"القاب کیا لکھوں؟

میرا مقصد آپ کو گزری کوئی بات یاد دلانا ہرگز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے گذشتہ

دو برسوں کو کسی بھیانک خواب سے تعبیر کیا ہو اور اب اپنے آپ کو آنکھ کھلنے کا بہلاوا دے کر مطمئن ہوں لیکن میں اپنے آپ کو ایسا کوئی بہلاوا نہیں دے سکتا۔ میری زندگی میں یہ دو برس اٹل حقیقت کی طرح موجود ہیں۔ جس کا ہر پل، ہر لمحہ شاید اس لیے میرے دل اور ذہن پر نقش ہوا تاکہ بقیہ تمام عمر مجھے یہ احساس دلاتا رہے کہ میں دُنیا کا احمق ترین انسان ہوں جو اپنے ہاتھوں اپنی متاعِ عزیز لٹا بیٹھا۔

بہرحال اپنی ذات سے قطع نظر مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ سے نکاح کے وقت مہر کی جو رقم سوا لاکھ مقرر ہوئی تھی، میں اس کا چیک بھیج رہا ہوں۔ یہ آپ کا حق ہے جسے ادا کرنا میرا فرض تھا اور آپ جانتی ہیں، میں اپنے فرائض سے کم ہی غافل ہوتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک گھر کے کاغذات ہیں جو میں نے آپ کے لیے، آپ ہی کے نام سے بنوایا تھا۔ اور آپ کے لیے ایک خوبصورت گھر بنانے کا ارادہ میں نے اسی روز کر لیا تھا جس روز آپ برف کا گھروندا بنا کر اس میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہی تھیں۔ اس وقت آپ کی آنکھوں میں جو رنگ اُترے تھے، وہ میں کبھی فراموش نہیں کر پایا اگر یقین نہ ہو تو یہ تصویر دیکھ لیجیے۔

مزید کیا لکھوں؟ بس آپ سے اتنا پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آپ خود تو چلی گئیں۔ لیکن اپنے وجود کی مہک کو ہمارے آس پاس کیوں چھوڑ گئیں؟ اسے بھی ساتھ لے جاتیں کہ شاید اس طرح زندگی کچھ سہل ہو جاتی۔

شہروز احمد"

اُس نے بے حد سناٹوں میں گھر کر خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھا اور گود سے تصویر اُٹھا کر دیکھنا چاہتی تھی کہ دل میں مچلتا سمندر اس تیزی سے آنکھوں میں سمایا کہ ہر طرف دُھند ہی دُھند سما گئی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

"میرے خُدا۔" اُس نے پلکوں کو بار بار جھپکا تو آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔ دُھند کے بعد یکلخت جیسے موسلادھار بارش ہونے لگی تھی۔ بے خیالی میں وہ آنکھوں کے بجائے بار بار تصویر پر ہاتھ پھیر کر اُسے صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ربیعہ۔" کافی دیر بعد صوفیہ اُسے پکارتی ہوئی آئی اور اسے یوں زاروقطار روتے دیکھ کر پہلے ٹھٹکی، پھر اس کے پاس بیٹھتی ہوئی قدرے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ اِس طرح کیوں رو رہی ہو؟"

"میں رو رہی ہوں۔؟" اُسے شاید اپنی آنکھوں سے برستی برسات کی خود خبر نہیں تھی۔ صوفیہ کے پوچھنے پر ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا تو حیران ہو کر بے بسی سے بولی۔

"پتا نہیں چھوٹی آپا۔ میں کیوں رو رہی ہوں؟"

"پگلی چلو اُٹھو یہاں سے۔"

"نہیں آپا۔ ابھی تو میں نے چاول بھی نہیں چڑھائے۔"

"چڑھ جائیں گے چاول بھی۔ تم اندر چلو۔" صوفیہ زبردستی اُسے اُٹھا کر اندر لے گئی۔ اپنے رومال سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ تب اُس نے بہت خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"شہروز احمد نے یہ تصویر بھیجی ہے اور یہ چیک۔" اُس نے لفافے میں سے نکال کر چیک بھی اُس کی طرف بڑھایا۔ البتہ خط اور مکان کے کاغذات چھپا گئی۔

"تصویر تو اچھی ہے۔" صوفیہ نے تصویر پر سرسری نظر ڈالی۔ پھر چیک دیکھتے ہوئے پوچھ
"یہ چیک کیسا ہے؟"
"مہر کی رقم ہے۔ یہ آپ اماں کو دے دیجیے۔ اور ان سے کہیے، یہ شہروز احمد کو واپس کر
"کیوں؟"
"میں سمجھتی ہوں، اس پر میرا کوئی حق نہیں۔ ویسے بھی میں یا ہم میں سے کوئی ان پیسوں
کرے گا۔ بہتر ہے انہیں شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔"
"اور اگر شہروز احمد نے واپس نہ لیے تب۔۔؟"
"تب میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ صوفیہ کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔
دِل کی ندی جسے اُس نے بڑی دقتوں سے پُرسکون کیا تھا۔ اس میں شہروز احمد نے بڑی خا
سے ایک کنکر اُچھال کر یوں ہلچل مچا دی تھی کہ اگلے کئی دن تک وہ بے حد ڈسٹرب رہی۔
اس دوران انیلا ایک بار پھر اپنی اماں کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن وہ ان دنوں ذہنی طور پر کچھ
مفلوج ہو رہی تھی۔ کہ نئی صورتِ حال کے بارے میں سوچ ہی نہ سکی۔ اُس کی سوچوں کا محور شہ
کی طرف سے بھیجے گئے۔ مکان کے کاغذات اور مہر کا چیک تھا۔ وہ یہ دونوں چیزیں انہیں لوٹانا چا
تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے ان تک پہنچائے۔ صوفیہ کے ذریعے یہ کام ہو سکتا تھا لیکن
نہیں چاہتی تھی کہ صوفیہ ان دونوں کے درمیان پیامبر بن کر رہ جائے۔ وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ
تھی جس سے یہ بات ہمیشہ کے لیے یہیں ختم ہو جائے۔
مہر کی رقم کا چیک اُس نے صوفیہ کے ذریعے اماں کو دے دیا تھا۔ اور اماں نے ابا میاں
دکھایا تو انہوں نے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ تمہارا ہے، ہم اسے اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ تم اسے جیسے چاہو تصرف میں لے آؤ
اور وہ کیا کرتی۔ پہلے ہی اس شخص کی اتنی مقروض تھی جس نے ان دو برسوں میں پتا نہیں
اپنی امی کے سامنے جوابدہی سے بچنے کی خاطر اس کے لیے اِتنا کچھ کیا تھا یا کسی اور جذبے کے تح
بہر حال وہ اپنے آپ کو حقدار ہرگز نہیں سمجھتی تھی۔
"دو برس کم نہیں ہوتے۔" وہ سوچتی۔" اور اتنا عرصہ میں اس شخص کے گھر بہت آرام سے رہ
میری بساط سے بڑھ کر مجھے ہر شے ملی۔ لوگ تو مہمانداری بھی دو ہفتے سے زیادہ نہیں نبھا سکتے۔ جب
اُس نے دو سال تک مجھے برداشت کیا۔ اور ان دو سالوں میں جتنا مجھ پر خرچ ہوا، اس کا اگر حساب
بیٹھوں تو مہر کی رقم سے کہیں زیادہ وہ مجھ پر لٹا چکا ہے۔"
بہت سوچنے کے بعد اُس نے چیک اور گھر کے کاغذات انہیں آفس کے پتے پر رجسٹری
ساتھ میں ایک اضافی کاغذ جس پر اُس نے لکھا تھا۔

"شہروز احمد!
جب ناتے توڑے جائیں، وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں 'شجرِ ممنوع' کا لفظ آ جائے تو
پھر کوئی بھی ربط نہیں رہنا چاہیے۔ یہ بات اگر آپ بھی سوچ لیتے تو یقیناً مجھے یہ چیزیں
نہ بھجواتے۔ بہر حال آپ نے انہیں میرا حق قرار دیا ہے اور میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی حقدا
نہیں سمجھتی۔ اس لیے واپس کر رہی ہوں۔ سنبھال کر رکھیے، شاید کہیں اور کام آ جائے لیکن
نہیں شہروز احمد، زندگی میں پھر کبھی کوئی ثاقب حسن ایسی کوئی خواہش لے کر آئے تو اُس کی
بات ماننے سے پہلے ایک بار مجھے ضرور سوچ لیجیے گا۔ مجھے یعنی ربیعہ اکرام علی کو جس نے ایک
صرف زندگی نہیں ہاری۔ کہ یہ اختیار میں نہیں ورنہ اور سب تو۔۔
ربیعہ"

ایک بوجھ، سا اُتار کر وہ مطمئن ہونے جا رہی تھی کہ نئی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی بات اس
ک بڑھ چکی تھی کہ اس روز اماں، ابا میاں، بڑی آپا اور عاصم بھائی، ثاقب حسن کے گھر جا رہے
۔ وہ پہلے اپنی بے خبری پر حیران ہوئی، پھر بے طرح پریشان۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو
م بھائی کی گاڑی میں جاتے دیکھا، پھر کلثوم کو پکڑ لیا۔
ثنو۔ یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟"
آپ کی دوست انیلا کے گھر۔" کلثوم نے دانستہ ثاقب حسن کا نام نہیں لیا۔
کیوں؟" وہ سب سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔
آپی۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ سیدھی سی بات ہے، اس روز انیلا اور اُن
والدہ، اماں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ اسی لیے آج سب گئے ہیں۔" کلثوم اس
چھوٹی تھی۔ پھر بھی یوں بات کی جیسے بہت بڑی ہو۔
لیکن اماں کو نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ پُرسوچ انداز میں آہستہ سے بولی۔
کیوں؟"
میں نے منع کیا تھا انہیں۔ پھر وہ کیوں گئی ہیں؟ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھتیں؟ کیا اب بھی
یرے ساتھ پہلے والا سلوک کریں گی۔ لیکن اب میں وہ نوعمر لڑکی نہیں ہوں کہ اماں جب، جہاں جس
ساتھ چاہیں، مجھے رُخصت کر دیں۔" وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر رو دینے کو ہو گئی۔
آپ پریشان نہ ہوں آپی۔ اماں آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گی۔" کلثوم اس کے کندھے
اتھ رکھ کر اُس کی آزردگی کم کرنے کی غرض سے کہنے لگی۔" ابھی تو سب لوگ یونہی اُن کے بُلانے پر
ے ہیں۔ کوئی بھی بات آپ سے پوچھے بغیر تو طے نہیں ہو گی ناں۔" اُس نے خاموش اور سرد نظروں سے
وم کو دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر اُٹھ کر اندر چلی گئی۔
یہ صحیح ہے کہ اُس نے ثاقب حسن سے محبت کی تھی لیکن یہ دو سال پہلے کی بات تھی۔ اُس وقت اس
زندگی اس گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ اور اس چار دیواری سے باہر اگر اُس نے کچھ دیکھا تھا تو اسکول
پھر کالج، اس سے ہٹ کر وہ نہیں جانتی تھی کہ دُنیا میں اور کیا کچھ ہے۔ بچپن سے زندگی کو ایک ہی
ں میں دیکھتے دیکھتے شاید وہ اُکتا چکی تھی۔ جبھی تو وہ ثاقب حسن کے متوجہ کرنے پر فوراً اُس کی طرف کھنچی
ا۔ کچی عمر اور کچا ذہن جس پر بہت جلدی ثاقب حسن نے اپنا رنگ جمایا۔ کہ وہ صرف اسی کے بارے میں
وچنے لگی۔ اگر درمیان میں یہ دو سال اس طرح نہ آئے ہوتے تو یقیناً وہ اب بھی اِسے ہی سوچتی۔ لیکن
ن دو سالوں نے اسے بہت کچھ سمجھایا اور سکھایا تھا۔
ابتدائی عرصے میں اس نے بہت نادانی سے سوچا تھا کہ دو سال بعد وہ بڑے آرام سے ثاقب حسن کی
ہو جائے گی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ وہ ثاقب حسن سے متنفر ہوتی گئی۔ وہ اسے انتہائی خود غرض
سان نظر آیا۔ جو اپنی خواہشات کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور پھر شہروز احمد بھی اُس کے
سامنے رہے تھے۔ جن کی گریس فل اور قد آور شخصیت' مقابل کو تمام محاذوں پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتی تھی۔
رمقابل وہ تھی ربیعہ اکرام علی جو کسی معمولی سی شے میں، معمولی سی خوبصورتی دیکھ کر بھی متاثر ہوتی تھی۔ اور
ہروز احمد نہ تو خود معمولی تھے۔ اور نہ اُن کی شخصیت عام سی، پھر وہ کیسے نہ متاثر ہوتی؟
کتنا عرصہ اس شخص کو سوچتی رہی، جو نظروں سے دُور تھا، اس کے برعکس، ہر سوچ پر وہ حاوی اور قابض
ا جو نظر کے سامنے تھا اور اُس نے اُسی شخص کے ساتھ زندگی تمام ہونے کی بے شمار دُعائیں مانگی تھیں،
ن پتا نہیں اتنی شدت سے مانگی گئی دُعائیں مستجاب کیوں نہیں ہوئیں؟ بہر حال شہروز احمد کے گھر سے
تے ہوئے اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس گھر میں گزرے دو سال کا ہر پل اس کے لیے زادِ راہ ہے۔
وہ اپنی آئندہ زندگی میں کبھی کسی مرد کو داخل نہیں ہونے دے گی۔ لیکن اس سوچ پر قائم رہنا اس کے

اختیار میں نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرا، اماں اور ابا میاں کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اُسے اپنی سوچوں کا انداز بدلنا پڑا۔ وہ سوچتی۔

"پتا نہیں، زندگی کتنی طویل ہے اور طویل عرصے تک وہ اماں کے گھر بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ آج نہیں تو کل اماں ______________ ضرور اس کے بارے میں سوچیں گی اور وہ بہت زیادہ عرصہ تک اماں کو مایوس بھی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ ابا میاں کی ذمہ داریاں اسی پر ختم نہیں ہو جاتیں اس کے بعد کلثوم اور پھر ہما بھی ہے۔" اس انداز سے سوچتے ہوئے اگر کبھی ثاقب حسن کا خیال آ جاتا تو وہ فوراً سر جھٹک دیتی تھی کیونکہ اس کا خیال بلکہ اسے یقین تھا کہ کسی اور جگہ تو شاید وہ سمجھوتہ کر لے لیکن ثاقب حسن کے ساتھ وہ کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کر سکے گی۔ اس کے ساتھ خوش رہنا تو دور کی بات

اماں وغیرہ رات آٹھ بجے کے بعد واپس آئیں۔ اُس کے بعد بڑی آپا اور عاصم بھائی کے ساتھ بہت دیر تک شاید مشورہ وغیرہ کرتی رہیں۔ اس دوران وہ اپنے چھوٹے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔ بلکہ بڑی آپا کے جانے کے بعد بھی وہ باہر نہیں نکلی۔ البتہ صبح جب ابا میاں آفس چلے گئے، وہ پہلی فرصت میں اماں کے پاس آ بیٹھی۔

"اماں! میں نے آپ سے کہا تھا، انیلا کی والدہ کو صاف جواب دے دیں۔ پھر آپ اُن کے گھر کیوں گئیں؟" وہ سہولت سے اماں سے پوچھنے لگی کیونکہ اب وہ پہلے والی ربیعہ نہیں تھی۔ حالات نے اس کے ماتھے پر پہلے شادی شدہ اور پھر طلاق یافتہ کا لیبل لگا کر اور کچھ نہیں تو خود اپنے بارے میں سہولت سے پوچھنے کا حق تو دے ہی دیا تھا۔

"بیٹا۔" اماں اُس کی بات سن کر کہنے لگیں۔ "کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم تم سے ضرور پوچھیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو اتنی جلدی کیا ہے؟۔"

"اب یہ مت کہہ دینا کہ تم ہم پر بوجھ ہو۔"

"میں ایسا نہیں کہہ رہی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ پہلے کلثوم اور ہما کے بارے میں سوچیں بلکہ پہلے ان دونوں کے فرض سے سبکدوش ہوں، میرا کیا ہے، میں تو اپنے نصیب کی خوشیاں وصول کر چکی۔"

"تُو کیا جانے ابھی تیرے نصیب میں اور کتنی خوشیاں ہیں۔" اماں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا، پھر کہنے لگیں۔

"کلثوم اور ہما کے بارے میں بھی سوچیں گے لیکن بیٹا یہ تو نہیں ہو سکتا ناں کہ پیام تمہارے لیے آئے اور بات ہم اُن کی کریں۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ اللہ کی مہربانی ہے جو اتنی جلدی دوبارہ بات بن رہی ہے۔ ورنہ آج کل تو کنواری لڑکیوں کے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔ کہاں۔" اماں دانستہ خاموش ہو گئیں۔ اور اُن کی بات سمجھ کر اُس کے اندر جیسے الاؤ دہکنے لگا۔

"ویسے بھی تمہاری اماں کو اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش ہوگی۔" کس قدر مکاری سے ثاقب حسن نے کہا تھا۔

"واقعی داد دینی پڑے گی۔ کتنا مکمل پلان بنایا تھا ثاقب حسن نے۔" اُس نے سوچا، پھر اماں کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"اماں ___ میرا جواب ابھی سن لیجیے۔ میں ثاقب حسن سے شادی نہیں کروں گی۔"

"آخر کیوں؟۔" اماں اُلجھ کر بولیں۔

"آپ خود سوچیں، پہلے تو آپ انہیں انکار کر چکی ہیں۔ اور اب ہامی بھر یں گی۔"

"پہلے حالات اور تھے۔" اماں نے دانستہ اپنی بات کی اہمیت جتائی۔

"کس کے، ہمارے یا اُن کے؟۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے میں طنز سمٹ آیا۔

"دونوں کے۔" خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی اماں اس کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔ پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ کہ ثاقب حسن کی والدہ شاید جواب لینے آ گئیں۔ اور وہ کیونکہ کے سامنے مسلسل انکار کر رہی تھی۔ اس لیے اماں انہیں کوئی مثبت جواب نہ دے سکیں اور ماں ہی صاف لفظوں میں انکار کیا۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور اگلے ہی دن صوفیہ کو بلوا بھیجا کہ شاید وہ ربیعہ کو سمجھا سکے۔

حسبِ عادت شہروز احمد صبح لان میں چہل قدمی کے بعد وہیں لان چیئر پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگے تھے۔ موسمِ بہار کی آمد آمد تھی۔ چاروں طرف لگے مختلف اقسام کے پودوں پر کلیاں چٹکنے کو بے تاب تھیں۔ اور بادِ صبا کے نرم جھونکے احساسات کو نرمی سے چھو رہے تھے۔

انہوں نے بے دلی سے روزمرہ والی خبروں پر نظریں دوڑائیں۔ پھر اخبار رول کر کے دوسری چیئر پر پھینکا اور پیر چپلوں سے نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے یونہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس وقت وہ بالکل خالی الذہن تھے۔ کوئی خیال، کوئی سوچ نہیں، لیکن جب سامنے ادھ کھلی کلی پر نظریں ٹھہریں تو جانے کیسے بہت ساری سوچیں ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگیں۔

"میں چاہتی ہوں کوئی اور میرا خیال کرے۔" کتنے مان سے اُس نے کہا تھا۔ انہیں یاد آنے لگا، مہرو کی شادی میں اپنے گرد کھینچے حصار سے نکل کر وہ کتنی اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ کبھی تھکی تھکی سی کبھی ایک دم فریش ہو کر اپنی ہنسی سے جلترنگ بجاتی ہوئی۔

"تھک گئی ہیں؟۔" انہیں اپنا پوچھنا یاد آیا۔

"ہاں۔" اس کا اعتراف۔ "دِل چاہ رہا ہے، چُپ چاپ سو جاؤں اور ایک طویل مدت تک مجھے کوئی نہ چھیڑے۔ کوئی نہ اُٹھائے۔"

"فرار چاہتی ہیں۔"

"ہاں۔"

"فرار کا یہ راستہ بزدلانہ ہے۔"

"اور میں بزدل ہوں۔"

"تم واقعی بزدل تھیں ربیعہ اکرام علی۔" سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے انہوں نے اندر ہی اندر اُسے مخاطب کیا تو وہ جیسے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے شہروز احمد؟۔"

"میں۔" اُن کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ اور ابھی اپنی صفائی میں کہنے کو الفاظ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ "چائے" کی آواز پر چونک گئے۔ گردن موڑ کر دیکھا، صوفیہ چائے لیے قریب ہی کھڑی تھی۔

"آپ کیا سوچ رہے تھے؟۔" وہ چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے پوچھنے لگی۔ پھر قریب رکھی چیئر پر بیٹھی تو معنی خیز لہجے میں بولی۔

"اور کِسے سوچ رہے تھے؟۔"

"میں کچھ بھی اور کسی کو بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ یہ بتائیں، آج آپ اتنی صبح کیسے اُٹھ گئیں؟۔" اُنہوں نے ایک دم سنبھل کر بات کا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا۔

"آج مجھے جانا ہے اس لیے۔"

"کہاں؟۔"

"اماں کے گھر۔ پتا نہیں کیوں بلوایا ہے انہوں نے۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

"کافی دنوں سے آپ گئی نہیں ہیں، اسی لیے بلوایا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کوئی اور بات بھی ہوگی۔ کیونکہ اماں نے کہا ہے، کچھ دن رہنے کے لیے آؤ لیکن وہ خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔

"لیکن کیا۔۔؟" انہیں پوچھنا پڑا۔

"مہروز اجازت نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں شام میں واپس آجانا۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"اگر واقعی اماں نے کسی کام سے بلایا ہے تو مجھے رکنا چاہیے۔ ورنہ پھر شام میں واپسی پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں مہروز کو سمجھا دوں گا۔ وہ منع نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اسے آپ کو اتنا پابند نہیں کرنا چاہیے۔"

"تھینک یو شہروز بھائی۔ لیکن پلیز مہروز کو شبہ نہ ہو کہ میں نے آپ سے کہا ہے۔"

"او، کے۔" وہ کھل کر مسکرائے، پھر بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر خالی کپ اسے تھما دیا، وہ اٹھنے لگی تھی کہ اچانک پتا نہیں کیا خیال آیا، پوچھنے لگی۔

"ایکسکیوز می شہروز بھائی۔ کیا میں آپ سے ربیعہ کے متعلق کوئی بات کر سکتی ہوں؟"

"نہیں۔" سختی سے کہہ کر انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ تو وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اپنے اندر ہمت پیدا کرتی ہوئی کہنے لگی۔

"ایک بات کہنے سے میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتی شہروز بھائی، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے آپ دونوں کے درمیان کوئی تیسرا شخص بھی رہا ہے۔"

انہوں نے یکدم چونک کر ربیعہ کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"کیا آپ اس کی نشاندہی کریں گے، کون ہے وہ؟" وہ ان کے انداز کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی

"یہ سراسر آپ کا وہم ہے صوفیہ بی بی ورنہ۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال کرتی، تیز قدموں سے اندر چلے گئے جب کہ وہ پتا نہیں کیوں الجھ گئی۔

ابا میاں آفس چلے گئے۔ کلثوم اور ہما کالج اور اماں ابھی دوپہر کے لیے سبزی گوشت وغیرہ لانے کے لیے نکلنے ہی والی تھیں کہ صوفیہ آگئی۔ فوری طور پر اماں جانے کا خیال چھوڑ کر صوفیہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ربیعہ کہاں ہے؟" وہ بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔

"صفائی میں لگی ہے۔"

"میں پہلے اس سے مل لوں۔" وہ اٹھنے لگی کہ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی آجائے گی وہ، تم بیٹھو۔" پھر سرگوشی اور رازداری سے کہنے لگیں۔ "میں نے تمہیں اسی سلسلے میں بلایا ہے۔"

"کوئی خاص بات ہے اماں؟" اس نے بھی آواز دھیمی کر لی۔

"ہاں۔ اصل میں اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔"

"کہاں سے؟ میرا مطلب ہے، کون لوگ ہیں؟" وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔

"تمہیں یاد ہوگا، دو سال پہلے ربیعہ کی سہیلی انیلا اپنے بھائی کا پیغام لائی تھی۔ وہی اب دوبارہ آئے ہیں۔"

"ثاقب حسن۔" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھنے لگی جب کہ اماں کہہ رہی تھیں۔

"پہلے کی بات اور تھی، لڑکا کماتا نہیں تھا۔ اور سر پر ذمہ داریاں بھی بہت تھیں، اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لڑکا دو سال باہر رہ کر اچھا خاصا کما لایا ہے۔ یہاں اپنا بزنس شروع کیا ہے۔ بڑی بہنوں کی شادیاں کر چکا ہے۔ ایک بس انیلا رہ گئی ہے، اس کی شادی بھی اس کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔"

"پھر۔؟" اماں کی اتنی تفصیل پر وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

"پھر یہ کہ مجھے اور تمہارے ابا میاں کو بلکہ بڑی اور عاصم کو بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن ربیعہ نہیں مان رہی۔"

"کیا کہتی ہے؟"

"یہ تم ہی اس سے پوچھو، بلکہ اسے سمجھاؤ۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ربیعہ کو آتے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"آپ کب آئیں چھوٹی آپا؟" ربیعہ ہاتھ سے جھاڑو پھینک کر اس کے گلے لگ گئی۔

"بس ابھی ابھی آئی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیں، میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔"

وہ تیز قدموں سے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اماں اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا۔ تم دونوں بیٹھو، میں ذرا سودا سلف لے آؤں۔"

"جلدی آجائیے گا اماں۔" اس نے اماں کے پیچھے جا کر دروازہ بند کیا، پھر واپس آکر صوفیہ کے پاس بیٹھی اور پوچھنے لگی۔

"کس کے ساتھ آئی ہیں؟"

"مہروز چھوڑ کر گئے ہیں۔" صوفیہ نے پتا نہیں کیا جاننے کی کوشش میں مہروز کا نام لیتے ہوئے نظریں اسی پر جمی رہنے دیں۔ اور ربیعہ اکرم علی نے اس تمام عرصے میں صرف اپنے جذبات کی پردہ پوشی ہی تو سیکھی تھی۔ بے حد عام سے لہجے میں بولی۔

"مہروز اندر نہیں آئے؟"

"نہیں۔ وہ یہاں آنے سے خائف ہیں۔"

"کیوں؟" وہ جان کر بھی انجان بنی۔

"وہ سمجھتے ہیں شہروز بھائی نے جو کچھ کیا، اس کے لیے اماں ان سے بازپرس کریں گی اور۔"

"نہیں چھوٹی آپا۔" وہ درمیان میں ٹوکتے ہوئے بولی۔ "ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، کسی دوسرے کو اس کی جگہ کٹہرے میں کھڑا کرنا زیادتی ہے۔ آپ انہیں یقین دلائیں کہ یہاں ان سے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔" قدرے توقف کے بعد سوچتی ہوئی کہنے لگی۔

"پتا ہے چھوٹی آپا، جب آپ کی شادی ہوئی تھی اور شروع میں آپ کا رویہ مہروز کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس وقت مہروز نے مجھ سے پوچھنا چاہا تھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں اور پتا ہے، اس وقت آپ کی ساس نے سختی سے مہروز کو ٹوکا تھا اور سمجھایا تھا کہ صوفیہ کے کسی عمل کی ذمہ دار میں نہیں ہوں، اس لیے وہ مجھے اپنے معاملے میں نہ گھسیٹے۔ اسی طرح چھوٹی آپا، میں سمجھتی ہوں، ہمیں مہروز سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور پھر وہ اس گھر کا داماد ہے۔ کب تک وہ آپ کو باہر دروازے پر چھوڑ کر جائے گا؟"

"چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، ثاقب حسن کا کیا قصہ ہے؟" صوفیہ نے اچانک بغیر کسی تمہید کے پوچھ لیا تھا، وہ حیران ہوئی، شپٹائی بھی، پھر بھی انجان بن کر بولی۔

"کیسا قصہ؟"

"سُنا ہے موصوف نے پھر پروپوزل بھیجا ہے؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیرانگی سے بولی۔

"بھئی جیسے بھی معلوم ہوا ہو، تم میری بات کا جواب دو۔"

"ہاں ــ" ہاں کی صورت اُس نے سینے میں دبی سانس خارج کی، پھر کہنے لگی۔ "ٹھیک سُنا ہے آپ نے۔"

"میرا خیال ہے لگن سچی ہے اس کی اور اس تمام عرصے میں وہ تمہارے ملن کی دُعائیں مانگتا رہا ہے جب ہی یہ سب ــ" نہ جانے طنز تھا یا کیا تھا۔

"چھوٹی آپا ــ پلیز ــ" اُس نے ٹوک دیا۔ "مت ایسی باتیں کریں ــ میں اس کا نام بھی نہیں سُننا چاہتی ــ اور آپ اماں کو سمجھائیں کہ وہ کم از کم ثاقب حسن کے بارے میں نہ سوچیں۔"

"کیوں؟"

"آپ خود سوچیں، کیا یہ بات مناسب ہے کہ جو شخص پہلی بار اس گھر سے ریجیکٹ کیا گیا، دوسری بار اسے پذیرائی ملے ــ"

"مناسب اور نامناسب کی بات چھوڑو ربیعہ ــ یہ سوچو کہ اماں نے تمہیں ساری زندگی تو اس گھر میں نہیں بٹھائے رکھنا ــ کہیں نہ کہیں تو تمہاری بات کرنی ہے ــ پھر ثاقب حسن میں کیا بُرائی ہے؟"

"بُرائی ــ" اُس کے اندر کی تلخی ایک دم ہونٹوں پر سمٹ آئی تھی جسے روکنے کی خاطر وہ خاموش ہو کر سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

"دیکھو ربیعہ، یہاں سے کوئی اُسے بُلانے نہیں گیا ــ بلکہ وہ خود خواہش مند ہے۔"

"پھر بھی چھوٹی آپا، مجھے منظور نہیں ــ اوّل تو میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی ــ لیکن اگر اماں کی یہی مرضی ہے تو پھر ان سے کہہ دیجیے ــ وہ اور جہاں بھی کہیں گی، میں اُن کی بات مان لوں گی لیکن ثاقب حسن سے نہیں ــ مجھے اس سے نفرت ہے ــ"

گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے آخری الفاظ وہ بلا ارادہ کہہ گئی تھی ــ صوفیہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر بے حد سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"اس نفرت کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"ہیں؟" اُس نے چونک کر سر اُٹھایا تو صوفیہ براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"جس وقت تمہاری شادی ہوئی بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک تم ثاقب حسن ہی کو سوچتی تھیں، پھر یہ نفرت کیسے اور کب وجود میں آئی؟"

"پتا نہیں ــ" وہ راہِ فرار ڈھونڈنے لگی۔

"نہیں ربیعہ، یوں دامن مت بچاؤ ــ مجھے بتاؤ، اصل بات کیا ہے یا پھر جو میں سمجھی ہوں وہ سنو۔"

"کیا سمجھیں آپ ــ؟" وہ اندر ہی اندر ڈرنے لگی۔

"اس تمام عرصے میں ربیعہ، میں نے تمہارے اور شہروز بھائی کے بارے میں بہت سوچا ہے اور یہ بھی کہ غلطی کس سے ہوئی؟ ــ لیکن اپنے اپنے مقام پر تم دونوں ہی مجھے بے قصور نظر آئے۔"

صوفیہ سوچ سوچ کر بولنے لگی۔

"جب تم دونوں بے قصور تھے تو قصوروار کون تھا؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں اُٹھنے لگا اور اس نہج پر سوچتے ہوئے مجھے گمان ہوا کہ کوئی تیسرا شخص تم دونوں کے درمیان موجود رہا ــ شروع دن سے اور وہ تیسرا شخص، ثاقب حسن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب میں کڑی سے کڑی ملاتی ہوں تو وہی سامنے آتا ہے ــ" وہ سانس روکے صوفیہ کی طرف دیکھ رہی تھی اور صوفیہ مزید تفصیل میں جاتی ہوئی کہنے لگی۔

"شادی سے پہلے وہی تمہاری زندگی میں آیا اور مجھے تمہارا اس کے لیے تڑپ تڑپ کر رونا یاد ہے ــ شادی کے بعد بھی تم اُسے نہیں بھولی تھی ــ شاید تمہیں یاد ہو، ایک بار میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی ــ پھر ایک دفعہ اتفاق سے میں نے اس کا فون ریسیو کیا تھا اور میری آواز پر تمہارا ...کر کے اُس نے تمہیں واپسی کی نوید دی تھی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"مزید سننے کا حوصلہ رکھتی ہو تو سنو، اب بھی سب سے پہلے اسی کا پروپوزل آیا ہے ــ کیوں؟ اُسے معلوم ہوا کہ شہروز بھائی نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟ یہ ساری باتیں شاہد ہیں کہ تمہارا اس سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا۔" وہ جھٹلانا چاہتی تھی لیکن آواز حلق تک آ کر ساتھ چھوڑ گئی۔

"اعتراف کرلو ربیعہ کہ تم نے ثاقب حسن کے ساتھ مل کر شہروز احمد کو دھوکا دیا ہے ــ؟"

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں ــ لیکن صوفیہ پر اُس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوا، کہنے لگی۔

"جب اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکی ہو تو پھر کیوں روتی ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے ــ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تم ثاقب حسن کے پروپوزل سے انکار کر کے کسے دھوکا دینا چاہتی ہو ــ آپ کو یا ہم سب کو ــ" کچھ دیر خاموش رہ کر تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

"معاف کرنا ربیعہ ــ مجھے شروع سے تم پر رحم آیا کرتا تھا کہ تم کس قدر بے وقوف اور بزدل سی ہو ــ نہیں زندگی میں آنے والی دشواریوں اور امتحانوں کا سامنا کیسے کرسکو گی؟ ــ لیکن تم نے تو کمال کر ...اس خوبصورتی سے ساری دشواریاں اور سارے امتحان شہروز احمد کے راستے میں ڈال کر خود ...اف نکل آئیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ــ قابلِ رحم تم نہیں، وہ شخص شہروز احمد ہے جو اب بھی ...اری پردہ پوشی کر رہا ہے ــ ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سارے شہر میں تمہارا اشتہار لگوا دیتا ــ یہ ...کی شرافت ہے کہ خاموشی سے تمہیں الگ کر دیا۔" صوفیہ تلخی سے بولتی چلی گئی۔

"چھوٹی آپا ــ" وہ بڑی دقتوں سے بول پائی ــ "آپ کی باتوں میں ذرا بھی صداقت نہیں ہے ــ"

"یہی سچ ہے جو میں کہہ رہی ہوں ــ" صوفیہ پتا نہیں کیسے اتنی کٹھور بن گئی۔ "تم میری کون کون ...بات جھٹلاؤ گی ــ؟"

"میں آپ کی کوئی بات نہیں جھٹلاؤں گی، لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔" وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی۔

"پھر کیا چاہا تھا تم نے؟" صوفیہ کٹیلے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"میں چاہتی تھی ثاقب حسن درمیان سے ہٹ جائے لیکن ــ"

"لیکن اُس نے شہروز احمد کو ہٹا کر دم لیا۔" صوفیہ بات کاٹتے ہوئے ملامت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی کہ وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔

"بہر حال میں تو یہی کہوں گی کہ غلطی تمہاری ہے اور اس کی سزا اماں ابا کو نہیں بھگتنی چاہیے، خود بھگتو۔"

"کیسی سزا ــ؟" وہ سہم کر پوچھنے لگی۔

"اماں اور ابا میاں تمہارے لیے بہت پریشان ہیں، تمہیں ان کی پریشانی دور کرنی چاہیے۔"

"میرے اختیار میں کیا ہے چھوٹی آپا؟" وہ بے بسی سے روتے ہوئے بولی۔

"تمہارے ہی اختیار میں ہے ــ جب تم اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہو اور سزا کے لیے بھی تیار ہو تو ثاقب حسن کو سزا کے طور پر ہی قبول کر لو۔"

"میرے ناکردہ گناہوں کی اتنی بڑی سزا ــ؟" اُس کے آنسو جو پل بھر کو ٹھہرنا چاہ رہے تھے، پھر بہہ نکلے۔

"میں نے تو یونہی ایک بات کہی ہے ورنہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب
اچھی اُمید رکھو، ہو سکتا ہے تمہارے نصیب میں حقیقی خوشیاں اسی کے حوالے سے لکھی
"چھوٹی آپا۔" وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔ "آپ نے سارے الزام میرے سر رکھ کر مجھ
نہیں کہنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ جائیے، کہہ دیجیے گا اماں سے کہ ربیعہ سزا کے لیے تیار
ہر کڑی سزا کے لیے تیار ہے ربیعہ۔" پھر اُٹھ کر اپنی پناہ گاہ کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر بولی
"کبھی فرصت ملے تو شہروز احمد کا محاسبہ بھی ضرور کیجیے گا کہ اس سارے قصے میں اُن کا کردار
بہت قابلِ رحم ہے ناں وہ شخص۔"

اماں اُس کے لیے جتنی فکرمند تھیں، اب اتنی ہی مطمئن ہو گئی تھیں کہ انہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا
اُس نے اماں کے سامنے ہامی بھرتے ہوئے یہ شرط رکھی تھی کہ "اس کی شادی کے لیے کوئی ہنگامہ نہیں
اماں خود بھی ایسا ہی چاہتی تھیں لیکن اُن کا خیال تھا، ثاقب حسن کے گھر والے نہیں مانیں گے کیونکہ ان
پہلے بیٹے کی شادی ہے اور وہ جی بھر کے ارمان نکالنے کی بات کریں گے۔ لیکن جب اماں نے ثاقب
کی والدہ سے بات کی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ کچھ عجیب سے انداز میں کہنے لگیں۔
"ظاہر ہے ایک طلاق یافتہ لڑکی کی دوبارہ شادی میں دھوم دھڑکا اچھا بھی نہیں لگتا۔" گویا پہلے ہی
پر جتا دیا کہ ان کی بیٹی طلاق یافتہ ہے۔ اماں نے ان کی بات محسوس ضرور کی لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے آ
مطمئن کیا کہ آج کل تو لوگ کنواری بالیوں میں بھی سو عیب نکالتے ہیں۔ اور پھر ربیعہ تو۔ بہرحال
باتیں ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اماں نے تو اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا لیکن وہ کسی طرح بھی خود کو نہیں سمجھا پا رہی تھی۔ پتا نہیں
اُسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کر سکے گی۔ کتنے اندیشوں میں تو وہ پہلے بھی نہیں گھری تھی
اب اُسے پریشان کر رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی اور دہلتی ہوئی گھر میں ہونے والی غیر محسوس
ہلچل کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی اور محسوس کرتی رہی۔ بولنے کا حق رکھتی تھی لیکن جب ہتھیار ڈالے تو
سی لیے۔ زیادہ تو وہ پہلے بھی نہیں بولتی تھی لیکن اب تو لگتا جیسے قوتِ گویائی سے محروم ہی ہو گئی ہو
آنکھوں میں ایک موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ وہی اُداسیوں کا موسم جو مدتوں سے تعاقب کرتا چلا آ رہا تھا۔
"آپی۔" کلثوم اور ہما باقاعدہ پروگرام کے تحت اُس کے پاس آ بیٹھیں۔ "آپ ہم سے کچھ ناراض
"نہیں تو۔" اُس نے حیران ہو کر باری باری دونوں کو دیکھا۔
"پھر آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھتی بھی نہیں ہیں۔" اُس نے خاموشی
سر جھکا لیا۔
"ہم آپ سے چھوٹے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ ہم آپ کے دُکھ محسوس
کر سکتے ہیں۔ یہ جو آپ چُپ چاپ دِل پر بوجھ لیے پھرتی ہیں، تو آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ہم اس سے
ہیں۔ نہیں آپی، ہمیں سب خبر ہے۔" قدرے توقف کر کے کلثوم کہنے لگی۔ "اب کچھ ہی دنوں
آپ نیا گھر بسانے جا رہی ہیں، تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ آپ دل کا سارا بوجھ یہیں چھوڑ جائیں؟"
"کلثوم ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ہما کہنے لگی۔ "گزری باتوں کو بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اور آ
کے لیے تو بھول جانا اور بھی ضروری ہے۔"
یہ دونوں جو اس سے چھوٹی تھیں، اُسے سمجھانے کی کوشش میں کیا کہہ رہی تھیں، اُسے حیرت
اور ندامت بھی۔ بڑی مشکل سے سر اُٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔
"میں گزری باتیں یاد نہیں کرتی۔"
"پھر کیا بات آپ کو آزردہ رکھتی ہے؟"

کوئی بات نہیں۔ بس کچھ انجانے اندیشے پریشان کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کسی بھی نئی جگہ
سے پہلے اندیشے تو گھیرتے ہی ہیں۔"
آپ اپنے اندیشوں میں مت گھریں۔ انشاء اللہ آپ بہت خوش رہیں گی۔" ہما بہت پیار سے اُسے
لگا کر بولی تو کلثوم نے بھی اُس کی ترجمانی کی۔
ں نے ان دونوں کو مطمئن کرنے کی خاطر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا تو چھوٹی آپا کی
ت یاد آئی۔
اچھی اُمید رکھو، ہو سکتا ہے تمہارے نصیب میں حقیقی خوشیاں ثاقب حسن کے حوالے سے لکھی
"
ہ کیا اچھی اُمید رکھتی، کوئی اچھی بات تک تو سوچی نہ گئی۔ البتہ اُس رات اُس نے شدت سے عہدِ رفتہ
ل جانے کی دُعا مانگی تھی۔ ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو نئی زندگی میں ثاقب حسن کے
یڈجسٹ کرنے کی پوری کوشش کرے گی کہ کچھ بھی سہی وہ بہرحال اب اس کا مجازی خدا بننے جا رہا
۔
ھر یہ چند دن گزرتے پتا بھی نہیں چلا اور ایک شام گھر کے افراد کے علاوہ چند قریبی عزیزوں کی موجودگی
ہ ایجاب و قبول کے مراحل سے گزر کر ثاقب حسن کے سنگ رُخصت ہو گئی۔

وفیہ کے حوالے سے مہروز کا بہرحال اس گھر سے ایک رشتہ تھا، وہ بھی نازک سا اور ربیعہ کے
یں اس کی موجودگی ضرور تھی۔ ابا میاں نے صوفیہ کے ذریعے بصد اصرار بلوایا تھا۔ وہ آ تو گیا تھا
ب میں مکس اپ نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی کوئی زیادہ ہلا گلا تو تھا نہیں۔ کھانے کے بعد جیسے
ہ رُخصت ہوئی تو باقی لوگوں نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔ وہ بہت ریزرو لیا کرتے تھے، اس کے
ام راستہ صوفیہ نے محسوس کیا، وہ کچھ خاموش اور تھمائے جیسے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گئے
تک اُس کے بھائی کی منکوحہ تھی، وہ آرج کو
و چھیڑا نہیں۔ جس خاموشی سے رہا تو اب آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟"
گیا۔ وہ اس کے ساتھ جانے۔ آپ ثاقب حسن کو شروع سے جانتے تھے؟"
ہ پڑھنے میں مصروف تھیں، کے بعد انہوں نے 'الف' سے 'یے' تک ساری داستان کہہ سنائی۔
پ نے کھانا کھا لیا آپی، کہ وہ بزدل لڑکی اعتراف کر گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھے
ں بیٹا۔ بھوک بجھے تھے۔
ر شہروز بھائی۔" میرا خیال تھا، میں ایک مجبور اور بے بس شخص کی مدد کر کے نیکی کما رہا ہوں۔ لیکن
ا کا تو کچھ پتا نہیں ہوتا ہے جیسے میں نے زندگی میں سب سے بڑا گناہ کیا ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔"
ے۔ "وہ تنہا جس کی کوئی معافی نہیں۔" اُس کے اندر بے حد آزردگی سمٹ آئی۔ دل چاہا چیخ چیخ کر
ا وہاں بتا دے اور اپنا ہاتھ سامنے بیٹھے شخص کے گریبان تک لے جائے، زیادہ نہیں، بس اتنا
ر کہاں چلے۔
ا کیا کہہ سکیں میری بہن کی زندگی سے کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا؟"
لتے ہو یکن وہ کچھ نہیں بولی۔ نہ شکوہ، نہ شکایت اور نہ ہی کوئی ملامت۔ چُپ چاپ اُٹھ کر ان کے
رے سے نکلی تو یہ احساس پوری طرح غالب آ کر اندر ہی اندر کچوکنے لگا تھا کہ ثاقب حسن اور
شہروز احمد کی طرح وہ بھی ربیعہ کی مجرم ہے۔

وہ بڑی سادگی سے تیار ہوئی تھی اور جو برائے نام میک اَپ کیا تھا، وہ بھی آنسوؤں کی نذر ہو گیا

"مہروز کہاں ہے؟" امّی کو اچانک خیال آیا تو پُوچھنے لگیں۔
"اپنے کمرے میں۔"
"تم بھی تھک گئی ہو گی۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔"
"آپ کھانا نہیں کھائیں گی؟"
"نہیں بیٹا۔ اِس وقت نہیں، البتہ شہروز کا خیال رکھنا، آئے تو کھانا وغیرہ پوچھ لینا۔"
"جی بہتر۔" وہ اُٹھ کر اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ بہت آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھ
کر اندر جھانکا، مہروز تکیے میں مُنہ چھپائے لیٹا تھا۔ وہ سمجھ گئی اس وقت وہ کوئی بات نہیں کرے
اسی طرح آہستگی سے دروازہ بند کر کے وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔
عجیب سا پُراسرار ماحول ہو گیا تھا اس گھر کا۔ ہر شخص ایک دُوسرے سے نظریں چُرائے اپنے آپ
کو مُجرم تصوّر کرتا۔ جیسے وہی اس گھر کی بربادی کا ذمّہ دار ہو۔ ابھی ابھی وہ خود بھی ایسا ہی محسوس کرنے
لگی تھی۔ جیسے ربیعہ کی شادی میں شرکت کر کے وہ کسی بڑے جُرم کی مُرتکب ہوئی ہو۔
"میں نے ایسا نہیں چاہا تھا چھوٹی آپا۔" تنہائی اور خاموشی میں سِسکتی ہوئی سرگوشی اُسے اپنے
آس پاس سُنائی دی۔
"میرے ناکردہ گناہوں کی اتنی بڑی سزا۔" اور پھر۔
"کبھی فرصت ملے تو شہروز احمد کا محاسبہ بھی ضرور کیجیے گا کہ اس سارے قصّے میں ان کا کیا کردار
تھا۔ بہت قابلِ رحم ہے ناں وہ شخص۔"
اُس نے طویل سانس لے کر صوفے کی پُشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور ابھی
ان آوازوں سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ شہروز احمد آ گئے۔ اُنہوں نے شاید اُسے نہیں دیکھا تھا۔ سید
ہلچل کو لطفی آنکھوں چلے گئے۔ اور وہ اُن کے قدموں کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر اُنہیں دیکھنے لگی۔ پھر کچھ
سی لیے۔ زیادہ تو وہ پہلے بھی نہیں بولتی تھی دروازے پر ناک کیا اور 'کم اِن' کی آواز پہ اندر داخل ہو گئی۔
آنکھوں میں ایک موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ وہی اُداسیوں بھرا اُس پر ڈال کر پوچھنے لگے۔
"آپی۔" کلثوم اور ہما باقاعدہ پروگرام کے تحت اُس کے پاس گئے۔
"نہیں تو۔" اُس نے حیران ہو کر باری باری دونوں کو دیکھا۔
"پھر آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھتی ہیں ٹو چھ لوں۔"
سر جھکا لیا۔ آپ کو زحمت ہو گی۔" وہ اُٹھ
"ہم آپ سے چھوٹے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں
کر سکتے ہیں۔ یہ جو آپ چُپ چاپ دِل پر بوجھ لیے پھرتی ہیں، تو آپ کیا سمجھ
ہیں۔ نہیں آپی، ہمیں سب خبر ہے۔" قدرے توقف کر کے کلثوم کہنے لگی باتھ روم سے پانی گر
آپ نیا گھر بسانے جا رہی ہیں، تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ آپ دل کا سارا بوجھ یہیں لفافے سے جھانکتے
"کلثوم ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ہما کہنے لگی۔ "گزری باتوں کو بُھلا دینا ہی اچھا ہو شہروز احمد کا نا
کے لیے تو بُھول جانا اور بھی ضروری ہے۔"
یہ دونوں جو اس سے چھوٹی تھیں، اسے سمجھانے کی کوشش میں کیا کہہ رہی تھیں کے ہاتھ میں کا
اور ندامت بھی۔ بڑی مشکل سے سر اُٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔
"میں گزری باتیں یاد نہیں کرتی۔"
"پھر کیا بات آپ کو آزردہ رکھتی ہے؟"

"یہ آپ کے پاس کیسے آیا؟"
"بھیجنے والے نے بھیجا اور مجھ تک پہنچ گیا۔" عام سے لہجے میں کہتے ہوئے چائے کا کپ اُٹھا
کر صوفے پر جا بیٹھے۔
"کِس نے بھیجا تھا آپ کو؟" وہ پتا نہیں کِس پر شک کر رہی تھی۔ انہوں نے ٹٹولتی نظروں سے
اُس کی طرف دیکھا۔ پھر سابقہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولے۔
"ثاقب حسن نے۔"
"آپ یا وہ۔ میرا مطلب ہے آپ دونوں ایک دُوسرے کو کیسے جانتے ہیں؟"
"صوفیہ۔ بیٹھ جائیں آرام سے۔ اور یہ بتائیں آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟" اُسے اُلجھتے دیکھ
کر نرمی سے بولے تو وہ اُن کے سامنے رکھی میز کے پاس نیچے قالین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی پھر کہنے
لگی۔
"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا پوچھنا چاہتی ہوں؟!"
"اگر ثاقب حسن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہیں تو ابھی کچھ دن پہلے ہماری مُلاقات ہوئی ہے۔
وہ بھی بزنس کے حوالے سے۔ غالباً وہ اس فیلڈ میں نیا ہے لیکن۔"
"شہروز بھائی پلیز۔" وہ جو بغور اُنہیں دیکھ رہی تھی، ٹوک گئی۔ "مت جھوٹی کہانیاں سُنائیں
مجھے، میں صرف سچ سُننا چاہتی ہوں۔"
"کیسا سچ۔؟"
"میں نے اُس روز آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے لگتا ہے، آپ کے اور ربیعہ کے درمیان کوئی
تیسرا شخص بھی تھا اور آپ نے اس بات سے انکار کیا تھا لیکن جب میں نے ربیعہ سے پوچھا تو۔"
"تو اُنہوں نے اعتراف کر لیا ہو گا۔" اس تمام عرصے میں آج پہلی بار ربیعہ کا نام سُن کر اُنہوں نے
فوراً موضوع ختم کرنے کا اشارا نہیں دیا جیسا کہ اکثر سختی سے ہونٹ بھینچ لیا کرتے تھے، اس کے
برعکس طویل سانس لیتے ہوئے یوں نظر آنے لگے جیسے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گئے
ہوں۔
"جب وہ اعتراف کر چکی ہیں تو اب آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟"
"صرف اِتنا بتا دیں کہ کیا آپ ثاقب حسن کو شروع سے جانتے تھے؟"
"ہاں۔" اور اس 'ہاں' کے بعد انہوں نے 'الف' سے 'ے' تک ساری داستان کہہ سنائی۔
اب کیا چھپاتے جب کہ وہ بُزدل لڑکی اعتراف کر گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھے
گئی۔ جو کہہ رہے تھے۔
"شروع میں میرا خیال تھا، میں ایک مجبور اور بے بس شخص کی مدد کر کے نیکی کما رہا ہوں۔ لیکن
اب احساس ہوتا ہے جیسے میں نے زندگی میں سب سے بڑا گناہ کیا ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔"
"ہاں۔ جس کی کوئی معافی نہیں۔" اُس کے اندر بے حد آزردگی سمٹ آئی۔ دل چاہا چیخ چیخ کر
در و دیوار ہلا دے اور اپنا ہاتھ سامنے بیٹھے شخص کے گریبان تک لے جائے، زیادہ نہیں، بس اتنا
پوچھے۔
"تمہیں میری بہن کی زندگی سے کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا؟"
لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ نہ شکوہ، نہ شکایت اور نہ ہی کوئی ملامت۔ چُپ چاپ اُٹھ کر ان کے
کمرے سے نکلی تو یہ احساس پُوری طرح غالب آ کر اندر ہی اندر کچوکنے لگا تھا کہ ثاقب حسن اور
شہروز احمد کی طرح وہ بھی ربیعہ کی مُجرم ہے۔

وہ بڑی سادگی سے تیار ہوئی تھی اور جو برائے نام میک اَپ کیا تھا، وہ بھی آنسوؤں کی نذر ہو گیا

تھا۔ انیلا اور اُس کی بڑی بہنوں نے حجلۂ عروسی میں سیج پر بٹھا کر جب اُس کا جائزہ لیا تو وہ کسی طرح بھی دُلہن نظر نہیں آ رہی تھی۔

"اِس کا میک اَپ تو ٹھیک کرو، اس طرح اگر ثاقب نے دیکھ لیا تو ڈر جائے گا۔" پہلا ریمارکس جو سُننے کو مِلا، اُس نے اُسے عہدِ رفتہ میں دھکیل دیا۔ کِس طرح ندا اور آپی نے اِسے سنوارتے ہوئے سراہا تھا۔ اَن کے بے ساختہ تعریفی جُملے ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگے تھے کہ انیلا کی پُکار نے چونکا دیا۔

"ربیعہ۔ تم مُنہ دھو لو، میں تمہارا میک اَپ کر دیتی ہوں۔"

وہ چُپ چاپ اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ دھو کر واپس آئی تو انیلا میک اَپ بکس کھولے، بیٹھی تھی۔ اُس نے قدرے جھجکتے ہوئے کمرے میں کھڑی لڑکیوں کا جائزہ لیا اور اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ پھر انیلا کا ہاتھ چلنے لگا اور باقی سب کی زبانیں۔ ہر کوئی مشورہ دے کر اپنے آپ کو ماہر بیوٹیشن ثابت کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔

اتنی آوازوں میں اُس کا دل گھبرانے لگا، کاش وہ انیلا سے کہہ سکتی، ان سب کو باہر بھیج دو لیکن درمیانی دو سالوں نے اس کے سارے مان چھین لیے تھے۔ اس لیے چُپ چاپ اپنا تماشا دیکھتی رہی۔ آخری ٹچ دے کر انیلا نے دادطلب نظروں سے اپنی بہنوں اور کزنز کی طرف دیکھا۔ تو کچھ نے بے دلی سے سراہا۔ اور ایک نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"رُوپ نہیں آیا۔"

"رُوپ کیسے آئے گا، کوئی پہلی بار تھوڑی دُلہن بنی ہے۔" یہ آواز پتا نہیں کس کی تھی، اُس کے دل میں ترازو ہو گئی۔ ابھی سنبھلی بھی نہیں تھی کہ تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ ایک اور آواز۔

"گویا سارے رُوپ پہلے ہی لُٹا آئی ہیں۔"

"اور کیا۔"

"بے چارے ثاقب بھائی۔"

"کتنے شاندار لگ رہے ہیں آج۔"

"چلو نظر لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔"

"ہاں نظر بٹو کا ساتھ جو ہو گیا۔"

سب کی مشترکہ ہنسی نے کمرے کے اندر شور برپا کر دیا تھا جس میں انیلا کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ جو سب کو خاموش کرانے کے ساتھ کمرے سے جانے کا کہہ رہی تھی۔ جب کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو اس کا ہاتھ تھپک کر ندامت سے بولی۔

"پلیز ربیعہ۔ تم خیال مت کرنا۔" وہ خود اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی، نظر اُٹھا کر انیلا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تو پیشانی گھٹنوں پر ٹیک لی۔ اسی وقت اس کی ساس اندر آئیں اور سب لڑکیوں کو جانے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اُس نے کچھ ڈرتے ڈرتے سر اُونچا کیا۔ پھر کمرے میں کسی کو موجود نہ پا کر اطمینان بھرا سانس لیتی ہوئی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

وہ خالی الذہن سی اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ کمرہ خاصا کشادہ اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ لیکن کسی چیز نے اُسے سحر زدہ نہیں کیا، نہ اس کی توجہ کھینچی۔ حالانکہ وہ تو کسی معمولی سی شے میں معمولی سی خوبصورتی دیکھتے ہی اس میں مگن ہو جاتی تھی۔

لیکن اب شاید وہ جان گئی تھی کہ ہر خوبصورت شے درحقیقت خوبصورت نہیں ہوتی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

شے پر سرسری نظر ڈال کر اُس نے دوبارہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکائی ہی تھی کہ کمرے سے باہر بھاری قدموں
...بھرنے لگیں۔ اُس کے اندر یہاں سے وہاں تک سناٹوں کا راج تھا۔
...ے خُدا۔ کوئی شور اُٹھے، کوئی ہلچل مچے، کچھ تو ہو، آخر میں اتنی مایوس اور دلگرفتہ سی کیوں
...ب زفاف کی یہ آہٹیں میرے احساسات کی کلیوں کے کِھلنے کا سبب کیوں نہیں بنتیں؟" اس کی
...یں نمی اُترنے لگی۔ اور پلکوں تک آنے کو تھی کہ دروازہ کُھلنے کی آواز پر اُس نے ساری نمی ایک پل
...نے اندر اُتار لی۔
...ہ۔" ثاقب حسن اُس کے سامنے بیٹھا تو کہنے لگا۔ "لگتا ہے تمہیں دیکھے ہوئے زمانہ بیت گیا۔
...مجھ سے مت چھپو۔ پلیز یہ سارے نقاب ہٹا دو۔"
...نے ذرا سا سر اُونچا کیا۔ لیکن چہرے پر آنچل ویسے ہی رہنے دیا، جسے اُلٹنے میں ثاقب حسن
...ہیں کی۔ اُس کے چہرے پر نظر پڑی تو کتنی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔
...ہ ربیعہ تو نہیں تھی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی گندمی رنگت کی شادابی جانے کہاں کھو گئی تھی"
...بصورت آنکھوں کے گرد حلقے جو میک اَپ کے باوجود چُھپے نہیں رہ سکے تھے۔
...یہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ شہادت کی اُنگلی اُس کی تھوڑی کے نیچے ٹکا کر اس کا چہرہ اُونچا
...بولا۔ تو وہ ذرا سی پلکیں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔
...ں نے تمہیں آزمائشوں میں دھکیل دیا تھا۔" وہ کہنے لگا۔ "لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میرا منتخب کیا
...ہ، پُرخار سہی بالآخر کٹ گیا۔ اگر میں یونہی تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیتا تو مِلن کی یہ رات ہماری
...ں کبھی نہ آتی۔"
...کوشش کے باوجود آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو نہ روک سکی جو دُوسرے ہی پل رخساروں پر
...ئی تھی اور ثاقب حسن یقیناً اس وقت اپنی جیت اور پا لینے کے نشے میں سرشار تھا جبھی ان
...نکھوں کا اصل سبب نہ جان سکا۔ بلکہ وہ یہی سمجھا کہ اس کی جُدائی میں اُس کا یہ حال ہوا ہے۔
...بھی وہ اپنے جذبوں کے اظہار میں موتی لُٹا رہی ہے۔
...ں جانتا ہوں گذشتہ دو برسوں میں تم نے میرے لیے بہت موتی لٹائے ہوں گے لیکن اب
...آنکھوں پر مزید ستم مت ڈھاؤ، اب تو میں آگیا ہوں ناں، گذشتہ تمام دُکھوں کی تلافی کرنے۔"
...ہ کہنے کے لیے اُس کے ہونٹ نیم وا ہوئے تھے کہ وہ اس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ گیا۔
...ں وقت کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں، یہ ساری باتیں بعد کے لیے اُٹھا رکھو، میں سب نہ صرف
...ا بلکہ تلافی بھی کروں گا۔ اس وقت تو مجھے صرف یہ یقین کر لینے دو کہ تم میرے پاس ہو۔ میرے
...قریب۔"
...راہ اُس کی سرشاری کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اندر مچلتے نفرت کے جذبات کو تھپک تھپک
...نے لگی کہ تقدیر نے اگر اسے اس کا مجازی خُدا بنا ہی دیا تھا تو وہ اگر اس سے محبت نہیں کر
...ی تو نفرت کر کے گناہگار بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔
...ا بہت جلدی آنکھ کُھل گئی۔ کمرے کے اندر پھیلا ملگجا سا اندھیرا اس بات کا غماز تھا کہ ابھی
...نے پُوری طرح اپنے پَر نہیں پھیلائے۔ اُس نے ذرا سی گردن موڑ کر ثاقب حسن کی طرف دیکھا،
...بے سُدھ سو رہا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اپنے مسائل کو شکست دے کر اور پھر
...ملن کی کامیابی پر، وہ کتنی گہری اور پُرسکون نیند سو رہا تھا۔
...ا تک اُسے گئے دنوں کا وہ ثاقب حسن یاد آیا جو کاندھوں پر مسائل کا بارِ گراں لیے وسائل کی تلاش
...مارا مارا پھرتا تھا۔ چھریرا بدن اور چہرے پر حالات کی شکستگی لیے آنے والے دنوں سے انتہائی
...ں۔ اور اب جیسے ایک دُنیا کو تسخیر کر لیا تھا کہ نیند میں بھی ہونٹوں پر مُسکراہٹ مچل رہی تھی۔

اُسے اس پر ترس آنے لگا۔
"ثاقب حسن۔ جب تمہارے پاس کچھ نہیں تھا، تب تمہارا دامن محبتوں سے لبریز تھا اور اب تمہارے پاس سب کچھ ہے تو اس معاملے میں تم بالکل تہی داماں ہو۔" اُس نے سوچا اور بہت آہستہ بیڈ سے اتر آئی۔ پہلے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، باہر کا منظر مایوس کن تھا یعنی ایک تنگ سی گلی تھی اور اس سے پہلے کہ اسے کوئی اور منظر یاد آتا۔ اُس نے پردہ چھوڑ دیا۔ پھر الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو ثاقب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے ایک نظر کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے کہ اُس کی بڑی نند اندر آ گئی۔ پہلے اُس کا لیا، پھر کہنے لگی۔
"یہ کون سے کپڑے پہن لیے ہیں تم نے؟"
اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگی۔
"یہ صحیح ہے کہ تمہاری دوسری شادی ہے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اب ہم کو تو یہ بات معلوم نہیں ہے ناں۔ نہ ہی ہم نے کسی کو بتایا ہے۔ چلو کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہنو بلکہ میں خود نکال دیتی ہوں۔"
یہ صورتحال اور ایسی باتیں تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ گویا یہاں بھی وہ مجرم ہے۔ دکھ گہرے احساس میں گھر کر وہ دزدیدہ نظروں سے اسے الماری کھولتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے گہرے جامنی رنگ کا شلوار سوٹ جس پر تلے کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تھمایا اور جلدی پہن لینے کی تاکید کرتی ہوئی، کمرے سے نکل گئی۔ اُس نے ایک نظر سوٹ پر ڈالی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے پہن لیا۔
ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو یہ رنگ اس پر بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا، چہرے کی رنگت پھیکی پھیکی اور آنکھوں کے گرد حلقے، سوٹ کے رنگ سے مل رہے تھے۔ اسے اپنا آپ بڑا عجیب لگا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ بہت دنوں کے بعد اس طرح اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔
"یہ میں ہوں؟" اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے وہ انگلیوں سے اپنا چہرہ چھونے لگی۔ کبھی اُس کی انگلیاں آنکھوں کے گرد حلقوں پر گردش کرتیں، کبھی ہونٹوں پر اور کبھی رخساروں پر ٹھہر جاتیں۔
"رُوپ نہیں آیا؟" اچانک رات کی بات یاد آئی۔ پتا نہیں کس نے کہا تھا۔
"رُوپ کیسے آئے گا؟ کوئی پہلی بار تھوڑی دُلہن بنی ہے۔"
"گویا سارے روپ پہلے لٹا کر آئی ہے؟"
"سارے روپ میں ضرور لٹاتی، اگر جو میرے راستے میں دیواریں نہ کھڑی ہوتیں۔" اُس نے سوچا اور چہرے کی پھیکی رنگت کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ میک اپ سے فارغ ہو کر ابھی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ انیلا کے ساتھ اس کی اپنی بڑی آپا آ گئیں۔ شاید رواج کے مطابق ناشتا لے کر آئی تھیں۔ اجنبی دیس میں کوئی اپنا نظر آیا تو آپ ہی آپ ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔
"کیسی ہو؟" بڑی آپا نے اُسے گلے لگا کر پیار کیا تو وہ صرف سر ہلا سکی۔
"میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔" انیلا کچھ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ آپا تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگیں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"خوش ہو۔۔۔؟"
"پتا نہیں خوش کسے کہتے ہیں؟" اُس نے سوچا۔
"تمہیں خوش رہنا چاہیے۔" بڑی آپا اُس کے سر جھکانے پر کہنے لگیں۔ "تمہاری قسمت اچھی ہے جو ایک دفعہ میں دوبارہ گھر بس گیا۔ ورنہ آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ ابھی آتے ہوئے میری ثاقب حسن سے

سے ملاقات ہوئی ہے۔ خاصا خوش شکل اور خوش مزاج ہے۔ میرا خیال ہے تم جلدی ایڈجسٹ کر لو گی۔ پھر" انہیں اپنی بات روکنی پڑی کیونکہ اس کی بڑی نند ناشتے کی ٹرے لیے آ رہی تھی، ساتھ ثاقب حسن تھا۔
"آئیے جی۔ ناشتا کر لیں۔" ثاقب حسن نے اُس کے ساتھ ساتھ بڑی آپا کو بھی ناشتے کے لیے بلایا تو آپا معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"بس، میں اب چلوں گی۔ کیونکہ بچے کو چھوڑ کر آئی ہوں، وہ کلثوم اور ہما کو پریشان کر رہا ہوگا۔"
"ایک کپ چائے ہی پی لیں۔" ثاقب حسن نے اصرار کیا۔
"پھر سہی۔ اچھا ربیعہ میں چلوں۔" انہوں نے ربیعہ کو اٹھا کر ٹیبل کے پاس بٹھایا پھر خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئیں۔ اُن کے پیچھے اس کی نند بھی کمرے سے نکل گئی۔ تب ثاقب حسن اُس کے پاس آ بیٹھا۔
"چلو بھئی۔ جلدی سے شروع ہو جاؤ۔ مجھے شام کی تقریب کے سلسلے میں بہت سے کام کرنے ہیں۔" پلیٹس اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔
"کیسی تقریب؟" وہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔
"کیسی تقریب۔" وہ دہراتے ہوئے بے حد حیران نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا اور وہ کیونکہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں مچلتی حیرت نہ دیکھ سکی۔
"غالباً آج ہمارا ولیمہ ہے۔" وہ اس کی لاتعلقی پر قدرے طنز سے بولا۔ اور لہجے میں چھپا طنز اُس کے احساسات کو لمحہ بھر کے لیے منجمد کر گیا۔
"تمہیں یاد نہیں رہا یا اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔؟" بظاہر عام سے انداز میں بات کر رہا تھا۔
"تم مجھے کیا یاد دلانا چاہتے ہو؟" وہ اندر کی آزردگی کو لہجے میں اُترنے سے نہ روک سکی۔
"میں کیا یاد دلاؤں گا تمہیں۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ۔ ہر گزری بات، ہر گزرا پل، جو تمہارے بغیر گزرا۔"
"پتا نہیں مشکل وقت میں سب اس کا ساتھ کیوں چھوڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کی آواز بھی اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ورنہ وہ جھوٹ ہی سہی، یہ کہہ کر اسے مطمئن تو کر دیتی کہ میرا کوئی پل تمہاری یاد کے بغیر نہیں گزرا۔ لیکن وہ اپنی آواز کو صدائیں دیتی رہ گئی۔ اور وہ ناشتا کر کے اٹھ بھی گیا۔
پھر سارا دن اُس کے کمرے میں لڑکیوں اور خواتین کا آنا جانا لگا رہا۔ لڑکیوں سے اُس کی نندیں تعارف کراتیں اور خواتین سے اُس کی ساس۔ ساتھ ہی مختلف جملے بھی سننے کو ملتے رہے۔ دوپہر کا کھانا اُسے سب کے ساتھ ہی کھانا پڑا۔ اس کے بعد اُس کا دل چاہا، سو جائے لیکن کسی نے موقع ہی نہیں دیا۔ نہ ہی کسی کو خیال آیا، سب اس کے پاس ڈیرا جمائے بیٹھی رہیں۔
شام کی تقریب میں وہ تھکی تھکی سی تھی۔ اس کے باوجود تحمل سے بیٹھی رہی۔ تقریب کے بعد اماں کا اُسے ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا شاید اس کی دوسری شادی کی وجہ سے وہ رسموں کو اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن صوفیہ بضد تھی اور اماں سے کہہ کر اسے ساتھ لے آئی۔ سارا دن بیٹھے بیٹھے وہ اتنی تھک گئی تھی کہ اماں کے گھر آتے ہی کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ خیال تھا فوراً سو بھی جائے گی۔ لیکن صوفیہ چائے بنا کر لے آئی۔
"چھوٹی آپا۔ آپ؟" وہ اُٹھ کر بیٹھتی ہوئی بس اسی قدر کہہ سکی۔
"پتا ہے آج میں تمہاری وجہ سے یہاں رُکی ہوں۔" صوفیہ ایک مگ اُسے تھما کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
"میری وجہ سے۔؟"
"ہاں تمہاری وجہ سے ورنہ تم جانتی ہو، میں رات یہاں نہیں رُکتی۔ خیر تم چائے پیو۔" اماں اور چھوٹی

دونوں کو آتے دیکھ کر صوفیہ موضوع بدل گئی۔

"بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو ؟" اماں اس کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھتی ہوئی بولیں۔

"ہاں اماں، اصل میں سارا دن لیٹنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کمر اکڑ گئی ہے۔"

"مہمان بھی تو اُن کے گھر میں بھرے ہوئے ہیں۔"

"اسی لیے تو میں اِسے ساتھ لے آئی ہوں۔ یہاں ذرا آرام سے سوئے گی۔" صوفیہ نے فوراً توجیہ پیش کی۔

"چلو تو اب سونے دو اُسے۔" اماں نے فوراً کہا۔

"میں کہاں چلوں، میں یہیں سوؤں گی اس کے پاس۔" پھر کلثوم سے کہنے لگی "کلثوم پلیز اس دُوسری چارپائی پر کھیس بچھا کر تکیہ رکھ دو۔"

کلثوم نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اس کا بستر لگا دیا۔ تو وہ اپنا اور ربیعہ کا خالی مگ اُسے تھماتے ہوئے بولی۔

"چلو، اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔ ہمیں بھی نیند آ رہی ہے۔"

"کوئی نہیں چھوٹی آپا۔ ہمیں ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔" کلثوم نے ربیعہ کی محبت میں کہا۔

"نیند نہیں آ رہی تو بیٹھ کر پڑھو۔" صوفیہ نے اُسے ہٹانا چاہا۔

"پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔"

"پھر۔ ؟"

"پھر یہ کہ ہم آپی کے ساتھ باتیں کریں گے۔"

"تمہاری آپی کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ صبح باتیں کر لینا۔ ابھی دیکھ نہیں رہی ہو کتنی تھکی ہوئی ہے۔" صوفیہ نے ڈانٹا تو وہ بول پڑی۔

"بیٹھنے دیں۔ چھوٹی آپا کیوں ڈانٹ رہی ہیں ؟"

"اُنہیں ڈانٹنے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے ؟" کلثوم منہ پھلائے ہوئے چلی گئی۔ تو وہ صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیٹ جاؤ۔ آرام سے میں لائٹ آف کر رہی ہوں۔"

"نہیں پہلے کلثوم کو بلائیں، وہ خفا ہو کر گئی ہے۔"

"وہ اب لاکھ خوشامد پر بھی نہیں آئے گی۔ مجھے اس کی عادت کا پتا ہے" اور اس کی عادت سے تو وہ بھی واقف تھی، اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا اور پھر وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ صوفیہ اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اماں کو 'شب بخیر' کہہ کر لیٹ گئی۔

پھر جیسے ہی اماں، ہما کو لے کر کمرے سے نکلیں، صوفیہ نے اُٹھ کر لائٹ آف کر دی اور اپنی جگہ پہ آ لیٹی۔

"چھوٹی آپا۔" وہ صوفیہ کے لیٹتے ہی اُس کی طرف منہ کر کے کہنے لگی "میں جان گئی ہوں کہ آپ کو مجھ سے کوئی بات کہنی ہے۔ لیکن خُدا کے لیے گزری کوئی بات مت دہرائیے گا۔"

"میرا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے لیکن باتوں کے دوران اگر کہیں کسی گزری کل کا ذکر آ جائے تو خیال مت کرنا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھنے لگیں۔

"سنو۔ تم خوش ہو ؟"

"پتا نہیں چھوٹی آپا۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہی کہ مجھے خوش ہونا چاہیے یا۔"

"میں تمہاری کیفیت سمجھتی ہوں اور کاش کہ میں بہت پہلے جان جاتی لیکن تم نے مجھے بھی لاعلم رکھا" صوفیہ کہنی کھڑی کر کے ہتھیلی پہ سر رکھتی ہوئی نیم اندھیرے میں اس پر نظریں جما کر بولی۔

"اگر تم اس وقت بھی مجھے ساری حقیقت بتا دیتیں جب ثاقب حسن کے پرپوزل پہ میں نے تم سے ہامی

بھروائی تھی۔ تب بھی میں اور کچھ نہیں تو تمہیں ثاقب حسن جیسے شخص سے تو بچا ہی سکتی تھی۔ لیکن تم نے ایک تو مجھے، دوست اور ہمدرد نہیں جانا، مجھ پہ اعتبار نہیں کیا، دوسرے اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے۔"

"میں کسی پر کیا اعتبار کرتی جب تقدیر ہی مہربان نہیں تھی۔"

"تقدیر کو الزام مت دو۔ تقدیر شروع ہی سے تم پر مہربان تھی، اسی روز سے جس روز تمہارا شہروز احمد سے نکاح ہوا تھا لیکن تم نے اس مہربانی سے خود منہ موڑا۔"

"میں کبھی منہ نہ موڑتی اگر جو وہ شخص صحیح معنوں میں مجھے اپنی بیوی تسلیم کر لیتا۔ لیکن اس نے ہمیشہ مجھے پرائی امانت سمجھا۔ اور ۔ اب بس کریں چھوٹی آپا۔ میں نے کہا ہے ناں، گزری باتوں کو مت دہرائیں۔ اب جب کہ میں ثاقب حسن کے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کر چکی ہوں تو مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں کسی دوسرے کے بارے میں بات کروں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی "صبح ثاقب بھی کہہ رہا تھا کہ مجھے گزری ہر بات بھلا دینی چاہیے۔"

"ظاہر ہے وہ اور کیا کہے گا۔" صوفیہ طنز کرنے سے باز نہ رہ سکی۔ پھر اس کی دل آزاری کا خیال کر کے فوراً معذرت کرتی ہوئی اصل بات کی طرف آ گئی۔

"آئی ایم سوری۔ میں بھی تمہیں یہی بات سمجھانا چاہتی ہوں۔ دیکھو ربیعہ، میری نظر میں تم دُنیا کی بزدل اور بیوقوف ترین لڑکی ہو۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ حالات بھی تمہیں سمجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایک ہی ٹھوکر پر سنبھل جاتی۔ لیکن تم اگر ساری زندگی دھوکے پر دھوکا کھاتی رہوگی، تب بھی ایسی ہی رہوگی۔"

"میں کیا کروں ؟" وہ بے چارگی سے بولی۔

"وہی کرو جو حالات کا تقاضا ہے۔" پھر باقاعدہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگی "جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے اسے بھلانا آسان نہیں ہے لیکن تم اسے بھلا دینے کا فریب تو دے سکتی ہو ناں۔ آخر تمہارے ساتھ بھی فریب ہوا۔ اور جس شخص نے تمہاری زندگی کے ساتھ یہ مذاق کیا تھا تم اُسی کے ساتھ مذاق کر ڈالو۔"

"کیا مطلب ؟" وہ بالکل نہیں سمجھی۔

"کیا اب تم کبھی ثاقب حسن سے محبت کر سکتی ہو ؟" صوفیہ اُلٹا اس سے سوال کرنے لگی۔

"پتا نہیں۔"

"صاف کہو 'کبھی نہیں' اور اس کے باوجود تمہیں بقیہ تمام عمر اُسی کے ساتھ رہنا ہے، اسی کے بچوں کی ماں بننا ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اور خود تم بھی نہیں چاہو گی کہ تمہارے ماتھے پر دوبارہ کوئی داغ لگے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم اس گھر کی بنیادیں مضبوط کر لو گی اور بنیادوں میں جب تک محبت اور اعتبار کی اینٹیں نہ رکھی جائیں۔ گھر مضبوط نہیں ہوتا۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ اُلجھنے لگی۔

"اپنے آپ پر سے یہ سرد مہری کا لبادہ اُتار دو، ورنہ اگر ثاقب حسن کو ذرا بھی یہ شُبہ ہو گیا کہ تم مجبوراً اُس کے ساتھ نباہ کر رہی ہو تو وہ کوئی انتہائی قدم اُٹھانے سے ذرا بھی دریغ نہیں کرے گا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی "جس طرح وہ اپنی جیت کے نشے میں سرشار ہے، تم بھی اُس کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اُسے یقین دلاؤ کہ شہروز احمد کے گھر دو سال تم نے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔ اور یہ کہ ہر پل تم نے اس کے انتظار میں کاٹا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔ محبتوں کا یہ فریب تمہیں دینا ہے ورنہ زندگی کے راستے تنگ ہو جائیں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"میں مر جاؤں گی۔" وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"کوئی نہیں مرتا، جب تک مرنا لکھا نہ گیا ہو۔ یہ دُنیا ہے، یہاں اب فریب کے سوا کچھ نہیں رہا۔ خود ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ کم نہیں۔ اگر تم ایک فریب کر لو گی تو قیامت نہیں آ جائے گی اور پھر یہ ضروری

بھی نہیں ہے کہ تم تمام عمر فریب ہی دیتی رہو۔ ہوسکتا ہے کسی مقام پر ثاقب حسن تمہارے دل میں ا
بنانے میں کامیاب ہو جائے۔"
"آپ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ہوسکتا ہے، میرے نصیب میں حقیقی خوشیاں ثاقب حسن کے حوالے سے
لکھی ہوں۔" اُس نے یاد دلایا۔
"ہاں، میں نے کہا تھا اور اب میں دُعا کرتی ہوں کہ خدا کرے تم واقعی اُس کے ساتھ حقیقی خوشیوں کو پا
لو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر مت چھوڑو۔ خود اپنے اندر ہو
پیدا کرو۔ تم نے سُنا نہیں کہ تدبیر سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔"
"ہاں۔ لیکن آپ نہیں جانتیں، مجھے کن حالات کا سامنا ہے۔ مجھے لگتا ہے ثاقب کے گھر والے اس
شادی پر رضامند نہیں تھے۔ ایسی باتیں اور طنزیہ جملے سُننے کو ملے ہیں کہ کیا بتاؤں۔"
"تم بیوقوف ہو، ایسی باتوں کی پروا کرنے کے بجائے اس بات پر اکڑو کہ ان کی مخالفت کے باوجود ان
بیٹا تمہیں بیاہ کر لے گیا ہے۔ اور یقیناً تم میں کوئی خاص بات ہے جبھی تو۔۔۔ خبردار کسی سے د
کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کی عزت ضرور کرو لیکن ناجائز بات نہ سنو اور نہ مانو۔"
"میں کسی کے سامنے نہیں بول سکوں گی۔" وہ سدا کی بزدل تھی۔
"ٹھیک ہے، تو پھر ایسا کرو۔ روایتی بیوی بن جاؤ۔ ہر بات نہ صرف ثاقب حسن کو بتا دیا کرنا بلکہ ا
پر جتانا بھی کہ اس کی وجہ سے تمہیں پچھلی زندگی کے طعنے سُننے کو مل رہے ہیں۔ نہ وہ تمہارے ساتھ ایسا
اور نہ تمہیں طعنے سُننے پڑتے۔"
وہ خاموش رہ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی تھی کہ صوفیہ اس کا کندھا ہلا کر کہنے لگی
"میری اتنی بکواس کا تم پر کوئی اثر ہوا ہے کہ نہیں؟"
"ہاں، میں کوشش کروں گی۔" وہ مری مری آواز میں بولی۔
"کس بات کی؟"
"آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی۔"
"کوشش نہیں، تمہیں کل ہی ثاقب حسن پر یہ ثابت کر دینا ہے کہ تم اُس کے بغیر اُداس تھیں۔" پھر اُس کی
آزردگی کم کرنے کی غرض سے شرارت سے بولی۔" ویسے ہے خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ، رات رونمائی میں کیا
تھا اُس نے؟"
"پتا نہیں، میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔"
"دیکھا، یہ کی ناں تم نے حماقت، اب آئندہ ایسی حماقتیں مت کرنا، کم از کم اُس کے سامنے۔"
"نہیں کروں گی، اب آپ مجھے سونے دیں۔"
"ضرور سوؤ۔ اس یقین کے ساتھ کہ آنے والا ہر کل تمہارا ہے۔"
"اچھا۔" وہ پتا نہیں کیوں ہنسی، پھر 'شب بخیر' کہہ کر کروٹ بدل گئی۔
اگلے دن دوپہر سے پہلے ہی ثاقب اسے لینے آ گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا جب کہ اماں نے اس کے
گھر والوں کو رات کے کھانے پر بُلایا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی سلسلے میں صوفیہ اور ربیعہ سے مشورہ کر رہی
تھیں کہ رات کے کھانے پر کیا کیا پکنا چاہیے؟ لیکن اب جو اسے یوں اکیلا اور وقت سے پہلے آتے دیکھا تو
قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں۔
"خیر تو ہے بیٹا، یہ تم اتنی جلدی کیسے ربیعہ کو لینے آ گئے۔؟ اور تمہارے گھر والے۔؟"
"اصل۔ میں آج شام انیلا کے سسرال والے آ رہے ہیں اس لیے اماں وغیرہ نہیں آسکیں گی۔ انہوں
نے مجھے بھیجا ہے کہ ربیعہ کو لے آؤں۔" اُس نے اپنے اکیلے اور جلدی آنے کی وجہ بتائی، پھر اُس کی طرف
دیکھتا ہوا بولا۔" چلیں۔"
"لے جانا اسے اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ دیر بیٹھو تو۔" صوفیہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے کرتی ہوئی

بیٹھتے ہوئے بھی اُسے چلنے کا اشارا کرنے لگا اور اماں اُسے اتنی عجلت میں دیکھ کر چائے وغیرہ کا انتظام کرنے
باہر چلی گئیں۔ تب صوفیہ کو جیسے موقع مل گیا۔ لہجے میں شرارت سمو کر بولی۔
"بھئی مان گئی، تم دونوں کے جذبے کتنے زور آور ہیں۔"
"کیا مطلب؟" وہ انجان بننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔
"ان محترمہ کو صبح سے اُداسی کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ
میں نے کہا تھا کہ تم شام کو آؤ گے لیکن۔" صوفیہ بات چھوڑ کر زور سے ہنسی تو وہ جھینپ کر سر جُھکا گیا۔
"میرا خیال ہے میں بھی اُداس شکل بنا کر دروازے پر نظریں جما دوں، ہوسکتا ہے آفس میں بیٹھے
ان کے دل پر کچھ اثر ہو اور وہ سب کام چھوڑ کر مجھے لینے چلے آئیں۔"
"صرف اُداس شکل بنانے سے کچھ نہیں ہو گا، دل کو دل سے راہ ہونی چاہیے۔" وہ کنکھیوں سے اُس
کی طرف دیکھ کر بولا۔ جو سر جُھکائے شاید یہ سوچ رہی تھی کہ صوفیہ کی باتوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے
اُسے کیا کرنا چاہیے۔
"ٹھیک کہتے ہو تم، واقعی دل کو دل سے راہ ہونی چاہیے۔" صوفیہ نے تائید کی، پھر اس سے کہنے لگی۔
"جاؤ ربیعہ، تم جب تک اپنا حلیہ ٹھیک کر آؤ۔"
وہ چُپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی پھر بالوں میں برش کرتے ہوئے اور اس کے بعد میک اَپ کرتے ہوئے
مسلسل یہی سوچتی رہی۔ کہ کیا وہ ثاقب حسن سے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے میں محبتوں کی چاشنی
گھول سکے گی؟
"ربیعہ۔" صوفیہ اُسے پُکارتی ہوئی آئی اور وہ یوں گم صم کھڑی تھی کہ بس خالی خالی نظروں سے اس کی
طرف دیکھنے لگی۔
"کیا ہوا ہے تمہیں؟" صوفیہ نے اس کا کندھا جھنجھوڑ ڈالا۔
"کچھ نہیں۔" وہ چونکی۔
"چلو۔ ثاقب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" صوفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچنے لگی۔
"چھوٹی آپا۔" اُس نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر صوفیہ کو متوجہ کیا۔
"کیا ہے؟"
"مجھے پتا نہیں کیوں ڈر لگ رہا ہے۔"
"کس سے؟ یا کس بات سے؟" صوفیہ اس کی سہمی سہمی شکل بغور دیکھنے لگی۔
"جو باتیں آپ نے ثاقب سے کہی ہیں، اگر اس نے مجھ سے ان کی تصدیق چاہی تب۔"
"پاگل لڑکی، رات میں نے تم سے اتنی مغز ماری کی ہے، اس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" صوفیہ جھنجھلا گئی۔
"تم سے مجھے کوئی اُمید نہیں تھی، اس لیے ابھی میں نے خود اِبتدا کر دی ہے۔ اب آگے تم سنبھالنا۔ کوئی ایسی مشکل
بات نہیں ہے۔ اور اب ذرا اپنی شکل ٹھیک کرو۔ اُداس تم اس کے آنے سے پہلے تھیں۔ اب تمہارا چہرہ
کھلا کھلا شاداب نظر آنا چاہیے۔"
وہ زبردستی کی مُسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر صوفیہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ اماں ثاقب سے انیلا
کی شادی کے بارے میں معلوم کر رہی تھیں۔ اُسے دیکھا تو کہنے لگیں۔
"آؤ، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"
اُس نے کھڑے کھڑے چائے کا کپ اُٹھا لیا اور جلدی جلدی پی کر ثاقب حسن کی طرف دیکھنے لگی۔ اور
وہ جیسے انتظار میں بیٹھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ اماں سے اجازت لی، پھر صوفیہ سے کہنے لگا۔
"کبھی فرصت سے آئیے ناں ہمارے گھر۔"
"ضرور آؤں گی۔" صوفیہ نے مُسکرا کر ہامی بھری، پھر ان دونوں کو چھوڑنے دروازے تک آئی تو سرگوشی
میں اس سے کہنے لگی۔

"ابھی یہ شخص اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار تمہاری دسترس میں ہے۔ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر
وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

"یہ چھوٹی آپا بھی عجیب ہیں۔" ثاقب حسن کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا "چاہتی ہیں پلک
میں سب کچھ ہو جائے۔"

"تمہاری اماں کا ابھی تک تم سے جی نہیں بھرا یا تم اس گھر سے کچھ زیادہ مانوس ہو؟" وہ گاڑی میں
پر لایا تو کچھ طنز سے پوچھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی، اس کے لہجے میں چھپے طنز کو محسوس نہ کر سکی۔

"بھئی اتنا عرصہ ان کے پاس رہی ہو، رات پھر تمہیں لے آئیں"

"رسم دنیا تو نبھانی پڑتی ہے۔"

"تم منع کر دیتیں۔"

"تم اگر کہتے تو میں ضرور منع کر دیتی۔ لیکن تم نے کچھ کہا ہی نہیں تھا۔" وہ خوبصورتی سے اس پر بات ر

"اور یہ تمہاری چھوٹی آپا کب سے یہاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں؟"

"کل ہی آئی ہیں وہ۔" وہ اس کے بات کرنے کے انداز پر جزبز سی ہوئی، پھر ٹوک گئی۔ "یہ تم اس
کیوں بات کر رہے ہو؟ تمہاری اماں، تمہاری چھوٹی آپا۔ کیا تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں؟"

"خفا کیوں ہوتی ہو۔ چلو میں اس طرح کہہ دیتا ہوں کہ میری چھوٹی آپا کب سے اماں کے ہاں آئی ہوا
وہ اس کی طرف سے رخ موڑ لینا چاہتی تھی لیکن فوراً سنبھل گئی، لہجے کو ملائم بنا کر بولی۔

"میں تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔ کبھی بھی۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟" وہ اعتبار لیتے ہوئے بولا۔

"کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں۔؟" مان سے بولی لیکن اس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔

"تم پر اعتبار نہ ہوتا تو اتنا عرصہ تمہیں ایک ایسے شخص کے پاس کیوں چھوڑ دیتا، جس پر مجھے رتی
اعتبار نہیں تھا۔"

اس کا اشارا شہروز احمد کی طرف تھا۔ اور پتا نہیں اب وہ ایسی بات کیوں کر رہا تھا جب کہ اس
تو اسے اس پوری دنیا میں وہی قابلِ اعتبار نظر آئے تھے۔ وہ اس کی بات پر خاموش ہی رہی۔ کیو
تھی کہ اس سلسلے میں اس کے ہونٹوں سے نکلا چھوٹا سا لفظ بھی اس کے لیے الزام بن جائے گا۔ ا
سزاوار ٹھہرے گی۔

"یاد ہے یہ جگہ؟" گاڑی ایک جگہ روک کر اس نے پوچھا تو وہ فوراً سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ نظروں
عین سامنے وہی فائیو اسٹار ہوٹل تھا جہاں وہ آخری بار اس سے رخصت ہوئی تھی۔

"یاد ہے؟" وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ پرسوچ انداز میں سر کو اثبات میں ہلانے لگی۔

"اچھی بات ہے، اب میں اندر جا رہا ہوں، تم دس منٹ کے بعد آنا۔" وہ اپنی طرف کا گلاس
ہوا بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم مجھے اپنے ساتھ۔"

"اونہوں۔" وہ ٹوک گیا "میرے ساتھ تو تمہیں زندگی بھر چلنا ہے۔ بس اس وقت میری
ہے کہ تم کچھ دیر بعد میرے پاس آؤ۔" اس کے ساتھ ہی وہ اتر کر اندر چلا گیا۔ اور وہ اس کی اس
غریب خواہش پر الجھتی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے، تب
کر گھڑی دیکھنے لگی۔ مقررہ وقت گزرنے کے بعد اس کے پیچھے چل پڑی۔ گلاس ڈور سے داخل ہو
ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور جہاں وہ بیٹھا نظر آیا، اسی طرف آ گئی۔ میز کے پاس رکی ہی تھی کہ وہ ا
سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہیلو مسز ربیعہ ثاقب حسن۔" اس کی آواز میں شوخی تھی، اور لہجے میں کھنک، جب کہ وہ زلزلوں کی زد
میں آ گئی۔
کبھی کل ہی کی بات صدیوں پرانی لگتی ہے اور کبھی صدیوں پہلے کی بات پر لگتا ہے جیسے ابھی ابھی تو
ہوا ہے اور یہاں تو درمیان میں صرف دو سال تھے۔ فقط دو سال پہلے یہیں اسی جگہ، اسی طرح کھڑے ہو
اس نے کہا تھا۔

"ہیلو مسز شہروز احمد۔"

اور اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اور نمی تو اب بھی آنکھوں میں اترنے کو بے تاب
تھی لیکن وہ کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے کوئی بات
ہی نہ ہو۔ پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔ اس کی آزمائش یا اپنی دبی خواہش کی تکمیل بہرحال وضاحت کرتے
ہوئے کہنے لگا۔

"یاد ہے ربیعہ، جب تم یہاں آخری بار مجھ سے ملنے آئی تھیں تو میں نے تمہیں مسز شہروز احمد کہہ کر
مخاطب کیا تھا۔ اس وقت تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو کر مجھے بے حد مضطرب کر گئی تھیں۔ میں
اندر ہی اندر ایک کرب سے گزرتا رہا اور اسی روز میں نے تہیہ کیا تھا کہ ایک روز اسی جگہ میں تمہیں اپنے
والے سے مخاطب کروں گا تاکہ آنسوؤں بھری یہ آنکھیں میرے نام سے جگمگا اٹھیں۔"

"ارے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چونکا "تم تو اب بھی اداس ہو رہی ہو۔ کیا تمہیں خوشی نہیں
ہوئی؟"

"اسے یقین دلاؤ کہ شہروز احمد کے گھر دو سال تم نے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔" ابھی رات ہی تو
صوفیہ نے اسے سمجھایا تھا اور اس کی بات یاد کر کے وہ فوراً سنبھلتی ہوئی بولی۔

"میں خوش ہوں ثاقب، بہت خوش۔"

"پھر تمہاری آنکھوں میں دکھ اور اداسی کی پرچھائیاں کیوں لہرا رہی ہیں؟" وہ فکر مند کم مشکوک زیادہ
لگ رہا تھا۔

"تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ ان خوشیوں بھرے لمحات میں وہ اذیت ناک لمحے یاد دلا رہے ہو جنہیں
میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ تم کیا جانو تمہارے بنا میں نے۔" اس کی آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ ضبط
کے بندھن بھی موتیوں کی صورت پلکوں سے ٹوٹنے لگے۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ اس کے رونے سے پریشان اور پشیمان ہو کر بولا۔ "پلیز اس طرح مت روؤ،
مجھے دکھ ہوتا ہے اور پھر اب تو ہم آزمائشوں کے دور سے نکل آئے ہیں۔ اب ہمیں خوش رہنا چاہیے۔"

"ہاں لیکن مجھے لگتا ہے ابھی بھی آزمائشیں میرے تعاقب میں ہیں۔" وہ صورتحال اپنے حق میں دیکھ
کر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں ربیعہ۔ اب کوئی آزمائش نہیں ہوگی۔"

"یہ آزمائش ہی تو ہے کہ میں جو تمہارے سنگ خوبصورت زندگی کی ابتدا کر کے عہدِ رفتہ کو مکمل طور
پر فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔ اور تم پہلے ہی قدم پر مجھے یاد دلا رہے ہو، تم ہی بتاؤ کیا مجھے دکھ نہیں
ہوگا۔؟"

"آئی ایم سوری۔ میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنی خواہش کی تکمیل چاہتا تھا۔"

"ایسی اور کون کون سی خواہشات ہیں تمہاری جن کی تکمیل تم اس طرح مجھے عہدِ رفتہ کی یاد دلا کر کرو گے؟"
وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

"طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں۔"

"چلو چھوڑو یہ سب باتیں، یہ بتاؤ کھانے میں کیا منگواؤں؟" وہ خود ہی مینو اٹھا کر دیکھنے لگا اور وہ

اس کے چہرے پر نظریں جما کر اس کے اندر اُترنے کی کوشش کرنے لگی کہ آیا یہ شخص اندر سے بھی اتنا ہی اُجلا ہے جیسا کہ بظاہر نظر آرہا تھا۔

ابھی ثاقب حسن کی شادی کا ہنگامہ سرد نہیں پڑا تھا کہ انیلا کی شادی کا ہنگامہ اُٹھ اُٹھا۔ گھر میں پھر سے مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور کیونکہ بڑی دونوں بہنیں بیاہی ہوئی تھیں، اس لیے گھر کی ساری ذمہ داری اس پر آن پڑی۔ ویسے بھی یہاں کوئی ملازم وغیرہ نہیں تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا اور اب مہمانوں کی خاطر مدارات میں وہ بالکل گھن چکر بن گئی۔ اس کی ساس بھی جیسے اسی انتظار میں تھیں۔ سارے کام اسے سونپ کر بالکل بے فکر ہو گئیں۔ ان کا کام بس پلنگ پر بیٹھے بیٹھے حکم چلانا تھا اور حکم کی تکمیل میں ذراسی دیر ہوئی نہیں کہ وہ آئے گئے کا لحاظ کیے بغیر ایسی ایسی باتیں سُناتیں کہ وہ اپنے آپ میں کٹ کر رہ جاتی۔ اس لیے کوشش کر کے پہلی ہی آواز پر ان کے پاس بھاگی چلی جاتی۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں کوتاہی ہو ہی جاتی تھی، اِس وقت بھی وہ ڈرائنگ روم کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ جب عاقب اُس کے پاس آکر کہنے لگا۔

"بھابی۔ امّاں بہت دیر سے آپ کو بُلا رہی ہیں۔"

"ہیں۔" ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رُک گئے۔ اور وہ کچھ خوفزدہ سی ہو کر عاقب کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ تو یوں ڈر رہی ہیں جیسے میں نے ملک الموت کے آنے کی خبر دی ہو۔" عاقب نے ہنس کر چھیڑا۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ اُس کی ساس کے پاس پتا نہیں کون خاتون بیٹھی تھیں۔ جن سے وہ کہہ رہی تھیں۔

"دیکھا تم نے، کتنی آوازیں دے چکی ہوں، نواب زادی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

"ثاقب بھی کچھ نہیں کہتا اسے۔؟" خاتون تعجب سے پوچھنے لگیں۔

"وہ کیا کہے گا۔ اس پر تو پتا نہیں کیا جادو کر دیا ہے اس نے۔ اور اب سے نہیں بہت پہلے سے میرے بچے کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور ایسی پٹی باندھی ہے اس کی آنکھوں پر کہ اچھی بھلی خاندان کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اسی طلاقن سے شادی پر بضد تھا۔" پھر سینے پر دوہتڑ مار کر بولیں۔ "ایسا بھولا ہے میرا بچہ، یہ بھی نہیں سوچا کہ جو ایک کا گھر نہیں بسا سکی، وہ اس کا کیا بسائے گی؟!"

"میرے خدا۔" اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔

آنکھوں کے سامنے پہلے دائرے بنے پھر اندھیرا چھانے لگا، بمشکل تمام بڑھ کر دیوار کا سہارا لیا اور چاہا کہ اسی طرح چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جائے لیکن دوسرے ہی قدم پر ریت کی دیوار کی مانند زمیں بوس ہو گئی۔

جس وقت اسے ہوش آیا، وہ اپنے کمرے میں تھی اور کیونکہ ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس لیے اپنے بے وقت لیٹنے پر حیران ہوئی اور فوراً اُٹھنا چاہتی تھی کہ ثاقب حسن نے سامنے آکر اسے لیٹے رہنے کے لیے کہا پھر پوچھنے لگا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

"مجھے۔؟" اپنی طرف اشارہ کیا پھر ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

"بتاؤ ناں۔" وہ اصرار سے بولا۔

"پتا نہیں۔ میں امّاں کے بُلانے پر اُن کے پاس جا رہی تھی کہ اچانک مجھے چکر آیا اور میں گر گئی۔"

کتنا سمجھایا تھا صوفیہ نے کہ روایتی بیوی بن کر ہر بات ثاقب کو بتاتے ہوئے اپنی پوزیشن صاف رکھنا لیکن اُس کا دل ایسے چھچھورے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوا۔

"ڈاکٹر نے کمزوری بتائی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خوش رہنے کی کوشش کرو۔" دوسرا جملہ کہتے ہوئے وہ ایک شاکی نظر اُس پر ڈال کر سگریٹ سلگانے لگ گیا۔ اور وہ نادان نہیں تھی، جانتی تھی کہ ایسی کسی بھی بات پر خاموشی، اس کی زندگی میں مزید زہر گھول دے گی۔ اس لیے پہلے ہنسی پھر اُس کا ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"مجھے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں میں بہت خوش ہوں۔ میرا دل تمہارے دم سے شاد ہے اور تمہاری محبتوں سے آباد۔ اور کیا چاہیے مجھے؟۔"

خلافِ توقع وہ اس کی بات سُن کر خاموش رہا تو وہ پتا نہیں اپنے آپ کو بہلانے لگی یا اُسے۔

"پتا ہے ثاقی، کسی کسی وقت مجھے اس حقیقت پر خواب کا گمان ہونے لگتا ہے اور میں ڈرنے لگتی ہوں، کہیں آنکھ کھلے اور۔"

"اور تم شہروز احمد کے گھر میں ہو۔" اُس نے فوراً بات اُچک لی تو وہ ایک دم سنّاٹے میں آگئی۔

"حقیقت اپنی جگہ اٹل ہوتی ہے ربیعہ۔ البتہ تم جان بوجھ کر نظریں چُرانا چاہو تو الگ بات ہے۔" وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ "حیرت ہے کہ مجھے اپنے سامنے، اپنے قریب دیکھ کر بھی تم مجھے محسوس نہیں کرتی ہو۔ ابھی بھی تمہارے ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہے۔ میرا ہاتھ۔ یا تم اس میں کسی اور کا لمس کھوج رہی ہو۔؟"

"نہیں۔" وہ خیالی میں اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے مضبوط ہاتھ میں اُس کا ہاتھ یوں جکڑ گیا کہ اس کی اُنگلیاں چٹخنے لگیں۔

"شہروز احمد کے حصار سے نکل آؤ ربیعہ ورنہ۔" وہ بات اُدھوری چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ تو وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے رو پڑی۔

"شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آنے والے وقت میں آپ کو کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اُس شخص نے کہا تھا جس کا کہ ابھی ابھی ثاقب حسن اُسے طعنہ دے گیا تھا۔

"مجھے اندازہ تھا۔" وہ دل ہی دل میں انہیں مخاطب کر کے بولی۔ "لیکن افسوس کہ کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا، یہاں تک کہ تقدیر بھی مجھ سے رُوٹھی رہی۔"

"خدا کے لیے ربیعہ۔" صوفیہ جیسے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ "اس طرح رو کر اس کے شک کو تقویت مت دو۔ ذرا سا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو۔ بتا دو اُسے کہ تمہاری یہ حالت اُس کی ماں کی باتیں سُن کر ہوئی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ تمہیں الزام دے، تم اسے زیر کرو ورنہ۔"

"نہیں۔" وہ فوراً اُٹھ بیٹھی۔ "میں راستے میں پڑا کوئی پتھر نہیں ہوں جسے جب جو چاہے ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے ہٹا دے۔ اب یہی میرا گھر ہے اور یہیں مجھے اپنی زندگی تمام کرنی ہے۔" وہ ایک عزم سے اُٹھی، منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلی تو ثاقب حسن برآمدے میں ہی عاقب کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ وہ جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ ایک طرح سے خفگی کا اظہار تھا، وہ اُس کی بیوی تھی، اُس سے لڑنے اور خفا ہونے کا حق ——— رکھتی تھی اور کب تک وہ اپنا حق استعمال نہ کرتی۔

سارا دن منہ پھلائے وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ کتنی بار کمرے سے برآمدے اور برآمدے سے آنگن میں آتے جاتے ثاقب سے سامنا ہوا، ایک دو بار اُس نے جان بوجھ کر راستہ بھی روکا لیکن وہ منہ موڑ کر چل پڑی۔

رات میں سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے بجائے انیلا کے پاس جا بیٹھی اور یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ کافی وقت گزر گیا، پھر جب اُسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ سو چکا ہو گا، تب اپنے کمرے میں آئی لیکن وہ اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"تمہارے کام ابھی تک ختم نہیں ہوئے؟" اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آکر بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟" وہ اُس کی خاموشی توڑنے کی غرض سے بولا۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش

بلکہ اس کی طرف سے رُخ بھی موڑ گئی۔ تب وہ اُٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔
"رُوٹھے رُوٹھے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔ کیا بات ہے؟"
"مجھ سے بات مت کرو۔" وہ منہ پُھلائے ہوئے رُوٹھے لہجے میں بولی۔
"پھر کس سے بات کروں؟"
"مجھے نہیں پتا۔" وہ رُکتے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھی اور لیٹنا چاہتی تھی کہ وہ اس کا تکیہ پرے دھکیل کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ شاید اپنی صبح کی باتوں پر نادم تھا، جبھی کچھ کہنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی جب بولا تو اپنی غلطی کم تسلیم کی اُسے زیادہ الزام دیا۔
"میں مانتا ہوں، میں کچھ غلط بات کہہ گیا تھا لیکن غلطی تمہاری ہے جو تم مجھے ایسی باتیں کہنے کے مواقع فراہم کرتی ہو۔ تمہاری خاموشی، تمہارا گم صم رہنا اور اپنے آپ سے لاتعلق، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔ گو کہ زبان سے اقرار کرتی ہو لیکن تمہارا ہر عمل تمہاری بات کی نفی کرتا ہے۔"
"میری خاموشی اور اپنے آپ سے لاتعلقی کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے شہروز احمد کا طعنہ دو۔" بالآخر وہ اپنے آپ کو مضبوط کر گئی۔ تلخی سے کہنے لگی۔ "شہروز احمد کے پاس میں خود نہیں گئی تھی، تم نے مجھے بھیجا تھا۔ اور اب خود ہی طعنہ بھی دیتے ہو۔ افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔" لمحہ بھر رُک کر کہنے لگی۔
"لاتعلق میں نہیں بلکہ تم مجھ سے ہو۔ اسی گھر میں رہتے ہوئے یہ نہیں جان سکے کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر قفل لگا رکھے ہیں؟ سننا چاہتے ہو تو سنو۔ اول شب مجھے اس گھر میں طلاق ہونے کا طعنہ ملا۔ اس کے بعد تمہاری ماں ہر آئے گئے کے سامنے میری ذات کو نشانہ بناتی ہیں اور ایسی ایسی باتیں کہ تم سنو تو حیران رہ جاؤ۔ ایسے میں، میں خاموش نہ رہوں تو کیا کروں؟ زبان کھولوں گی تو تب بھی تمہاری نظروں میں بُری بنوں گی کہ تمہاری ماں کی عزت نہیں کرتی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں لیکن۔۔۔"
وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

"ربیعہ۔ ربیعہ۔" ثاقب حسن اُس کے یوں پُھوٹ پُھوٹ کر رونے سے سچ مچ پریشان ہو گیا۔ اُسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ پھر اس کے پاس بیٹھتا ہوا کہنے لگا۔
"پلیز ربیعہ۔ اس طرح مت رُوؤ۔ مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے۔"
"تم جانتے ہو دکھ کیسے ہوتے ہیں؟" وہ ہاتھوں سے چہرہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی تلخی سے بولی۔
"تم کیا جانو گے، تم تو پا لینے کے نشے میں سرشار ہر طرف سے بیگانہ ہو گئے ہو۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی۔ مجھ سے بھی ثاقب حسن جس کا حصول تمہاری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔"
"میں تم سے بیگانہ نہیں ہوں۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔
"یہ بیگانگی نہیں تو اور کیا ہے کہ مجھے گھر میں ڈال کر بے خبر اور لاپرواہ ہو گئے ہو۔ نہیں معلوم ہی نہیں کہ یہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ کیسی کیسی باتیں سننی پڑتی ہیں مجھے۔ تمہاری اماں ہر آئے گئے کو یہ بتانا فرض سمجھتی ہیں کہ میں پہلے سے شادی شدہ اور پھر طلاق یافتہ ہوں۔ اس کے بعد یہ کہنا بھی ضروری کہ میں پہلے گھر میں نہیں بسی تو یہاں کیا بسوں گی؟"
"تم نے تو کہا تھا یہ سب وقتی باتیں ہوں گی پھر بہت جلد لوگ اُنہیں بھلا کر ہماری زندگی پر رشک کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ تمہاری اماں ہر روز ایک نیا قصہ میرے ساتھ منسوب کرتی ہیں کہ میں خود اپنے آپ پر شرمندہ ہو جاتی ہوں۔ ایک مجرمانہ سا احساس جیسے میں قصوروار ہوں۔ تم ہی بتاؤ کب تک میرے ساتھ ایسا ہوتا رہے گا؟"

"بس کچھ دن اور۔"
"کچھ دن اور۔ کیوں؟"
"سمجھنے کی کوشش کرو۔ گھر میں مہمانوں کا آنا جانا ہے۔ میں ابھی اماں سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ اُسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "انیلا کی شادی ہو جائے۔ پھر میں اماں سے بات کروں گا۔ انہیں واقعی ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اور تم نے پہلے مجھے نہیں بتایا۔"
"اگر میں شروع دن سے تمہیں یہ ساری باتیں بتلانے لگتی تو تم یہی سمجھتے کہ میں تمہیں ماں بہنوں کے خلاف کر رہی ہوں۔ جب کہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ اسی طرح منہ پُھلائے ہوئے بولی۔
"میں اتنا جانتا ہوں تم بہت اچھی ہو۔ اب پلیز اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو، پھر کہیں باہر چلیں گے۔" شاید اسے بہلانا چاہ رہا تھا۔
"میں اس وقت کہیں نہیں جا سکتی۔"
"کیوں؟"
"دیکھتے نہیں، گھر میں مہمان آرہے ہیں اور سارا کام مجھے ہی کرنا ہوتا ہے۔"
"ہوتے ہی رہیں گے یہ سب کام تم چلو۔" وہ زبردستی اُسے اُٹھا کر باتھ روم کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔
"کپڑے تو لینے دو۔" وہ ہاتھ چھڑا کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔
پھر جب وہ قدرے ڈھنگ سے تیار ہو کر اس کے ساتھ کمرے سے نکلی تو کہنے لگی۔
"اماں سے تم خود ہی کہہ آؤ، مجھے ڈر لگتا ہے۔"
"بیوقوف۔" وہ اُسے ساتھ لیے ہوئے اماں کے کمرے میں گیا۔ اور انہیں اپنے جانے کے بارے بتایا تو وہ ایک دم پینترا بدلتی ہوئی کہنے لگیں۔
"دُلہن کو کہاں لے جا رہے ہو؟ اس کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرنے دو اسے۔"
"آرام بھی کر لے گی۔ ابھی اسے کھلی ہوا میں جانے کی ضرورت ہے۔" وہ اُن کی مزید کوئی بات سُنے بغیر اسے لے کر باہر نکل آیا۔
پہلے یونہی مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اُس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ پھر جب شام ہونے لگی تو پوچھنے لگا۔
"اپنی اماں کے گھر چلو گی۔" اُس نے جیسے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ فوراً اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ویسے بھی کافی دن ہو گئے تھے اُسے اماں کے گھر گئے ہوئے اور اِدھر انیلا کی شادی کی وجہ سے تو وہ نکل گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ بس یہی سوچتی شادی سے فارغ ہونے کے بعد دو ایک دن کے لیے اماں کے گھر چلی جائے گی۔ اب جو اُس نے پوچھا تو فوراً ہامی بھر گئی۔
لیکن اماں کے گھر جا کر اسے احساس ہوا کہ اُس نے اس وقت یہاں آ کر بڑی سخت غلطی کی ہے۔ کیونکہ چھوٹی آپا کے ساتھ مہروز بھی موجود تھا۔ اور اس تمام عرصے میں کیونکہ آج پہلی بار اس کا مہروز سے سامنا ہوا تھا، اس لیے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھٹھک گئے تھے۔ گو کہ مہروز اور اُس کا رشتہ اپنی جگہ اٹل تھا جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا لیکن فطری طور پر دونوں کے چہروں پر اس ٹوٹنے والے رشتے کا ملال سمٹ آیا تھا۔
"کیسے ہو تم؟" وہ بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پا کر بس اسی قدر کہہ سکی۔
"آپ کیسی ہیں؟" جواباً اس نے بھی سوال دہرایا تو وہ آہستگی سے سر ہلاتی ہوئی ثاقب حسن کو وہیں اس کے پاس چھوڑ کر اندر چلی آئی جہاں اماں چھوٹی آپا حیرت اور خوشی کا ملا جلا اظہار کرتی ہوئی پوچھنے لگیں۔
"ارے تم کب آئیں؟"
"ابھی۔" پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے سلام کیا اور اماں کے پاس بیٹھ گئی۔
"فرصت مل گئی تمہیں؟" اماں اُس کے اتنے دنوں بعد آنے پر شکایت بھرے لہجے میں بولیں۔

"نہیں امّاں ۔ انیلا کی شادی کی وجہ سے اتنی مصروفیت ہے ۔ نکلنا ہی نہیں ہوتا۔"
"کس کے ساتھ آئی ہو ؟۔" صوفیہ پوچھنے لگی۔
"ثاقب کے ساتھ ۔ وہ باہر مہروز کے پاس بیٹھے ہیں۔"
"اچھا۔" امّاں اُٹھ کھڑی ہوئیں "تم دونوں بیٹھو، میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔"
"ہمارے لیے تردّد مت کیجیے گا امّاں ۔" وہ فوراً بول پڑی "ہم زیادہ دیر نہیں رُکیں گے۔"
"کیوں ؟۔ اِتنے دنوں پر تو آئی ہو ؟۔"
"ابھی بھی خاص طور سے یہاں نہیں آئی ۔ اصل میں ۔"
"اچھا اچھا آرام سے بیٹھو ۔" امّاں اُس کی پوری بات سُنے بغیر کمرے سے نکل گئیں۔ پھر برآمدے میں سے اُن کی آواز آنے لگی ۔ وہ ثاقب سے اُس کا اور اُس کے گھر والوں کا حال احوال پوچھ رہی تھیں۔
"آپ سُنائیں چھوٹی آپا، کیسی ہیں ؟۔" وہ اُدھر سے توجہ ہٹا کر صوفیہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"ٹھیک ٹھاک ۔ تم اپنی سُناؤ۔" پھر بغور اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "روتی رہی ہو کیا ؟۔"
"ہاں ۔" اُس نے اعتراف کیا۔
"کیوں ؟۔"
"بس چھوٹی آپا ۔" پھر اُس نے ساری باتیں کہہ سُنائیں ۔ آخر میں کہنے لگی "آج میں نے آپ کی باتوں پر عمل کر ہی ڈالا یعنی ثاقب حسن کو اُس کی امّاں کی کہی ساری باتیں بتا ڈالیں۔"
"بہت اچھا کیا ۔ اسی طرح اسے باخبر رکھو اور اس سے پہلے کہ اُس کی ماں اُس کے کان بھرے، تم اُس پر اپنی گرفت مضبوط کر لو ۔ اور خبردار کسی مقام پر کمزور مت پڑنا۔ جب اس سارے قصّے میں تمہارا کوئی قصور ہی نہیں تو پھر سزا تم کیوں بھگتو ؟" کچھ دیر خاموش رہ کر کُریدنے کے انداز میں پوچھنے لگی۔
"ویسے ثاقب تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے ناں ؟۔"
"ہاں ۔ لیکن کِسی کِسی وقت اس کا رویہ بڑا عجیب سا ہو جاتا ہے۔"
"کیا کہتا ہے ؟۔"
"کچھ نہ بھی کہے، تب بھی بہت کچھ کہتا ہوا لگتا ہے جیسے۔" برآمدے میں ابا میاں کی آواز اُبھری تو وہ اُدھر متوجہ ہوگئی، پھر کہنے لگی۔
"میرا خیال ہے ابا میاں آگئے ہیں ۔ چلیے اُن سے مِل لیں ۔ بہت دن ہوگئے ہیں اُنہیں دیکھے ہوئے"
"ہاں چلو ۔ میں بھی اُن سے مِلنے کی خاطر رُکی ہوئی ہوں۔"
صوفیہ اُس کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی ۔ پھر دونوں باہر آئیں تو ابا میاں نے دونوں کو ایک ساتھ بٹھا
"ابا میاں ۔ آپ تو آتے ہی نہیں ہیں۔" صوفیہ شکوہ کرنے لگی۔
"کِس وقت آؤں بیٹا ؟۔ ایک چھٹّی کا دن ہوتا ہے ۔ اس میں کہیں نکلنے کی ہمّت ہی نہیں ہوتی۔" اُس نے دیکھا ابا میاں بہت تھکے ہوئے نظر آرہے تھے اور اس وقت اسے امّاں کا شکوہ بجا لگا کہ اگر جو ابا میاں کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اس عمر میں کیوں اتنی محنت کر رہے ہوتے، وہ بے اختیار اُن کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا گئی تو جلتی آنکھوں میں دھیرے دھیرے ٹھنڈک اُترنے لگی۔
"کیا بات ہے بیٹا ۔ تم ٹھیک تو ہو ؟" ابا میاں کا شفقتوں سے چُور لہجہ اور وہ اپنے آپ کو خوش اور مطمئن پوز کرتے کرتے بھی آنکھیں نم کر گئی ۔ اور جہاں آنکھوں میں نمی اُتر آئے، وہاں قوتِ گویائی پتا نہیں کیوں ساتھ چھوڑ جاتی ہے ۔ وہ جانتی تھی ابا میاں کی محبت میں اس کا دل بھر آیا ہے ۔ لیکن ثاقب حسن نہیں جانتا تھا، پتا نہیں کیا سمجھا اور اس وقت یہاں کا جو ماحول اور جو صورتحال تھی اُس سے وہ اپنے طور پر بہت کچھ سمجھ سکتا تھا، یہ اُس کے ظرف پر منحصر تھا اور جو وہ اِتنا عالی ظرف ہوتا تو اُس کی زندگی میں یہ مقام آتا ہی کیوں ؟۔
"چلو ربیعہ ۔ بہت دیر ہوگئی ہے ۔" وہ فوراً کھڑا ہوگیا اور وہ بھی اُٹھنا چاہتی تھی کہ صوفیہ نے

...ن کا ہاتھ پکڑ لیا اور ثاقب حسن کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔
"ابھی تو آئے ہو ۔ کچھ دیر بیٹھو ناں ۔ دیکھو، کلثوم چائے لا رہی ہے ۔ چائے پی کر چلے جانا۔"
"نہیں، ہمیں ایک جگہ اور بھی جانا ہے ۔" کوئی ادب، کوئی لحاظ نہیں کہ صوفیہ بڑی ہے ۔ انتہائی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتا ہوا رعونت بھرے لہجے میں بولا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں کوئی بدمزگی نہ پھیلے، فوراً کھڑی ہوگئی۔
"پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گی چھوٹی آپا ۔ ابھی واقعی ہمیں ایک اور جگہ جانا ہے ۔ اچھا ابا میاں میں چلوں ۔" وہ ابا میاں کے سامنے جُھکی تو وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
"جیتی رہو بیٹا ۔ خوش رہو۔"
"میں امّاں سے مل آؤں ۔" اُس نے کہا اور فوراً کچن کی طرف چلی گئی ۔ کلثوم اور ہما چائے کے ساتھ دیگر لوازمات ٹرے میں سجانے میں مصروف تھیں، اُسے دیکھا تو کہنے لگیں۔
"آپی ۔ ہم ابھی آرہے ہیں۔"
"لیکن میں جا رہی ہوں ۔"
امّاں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ وہ کہنے لگی "بس امّاں پھر کسی وقت آجاؤں گی۔"
"چائے تو پی لو۔"
"پھر سہی ۔ اچھا خدا حافظ ۔" وہ کلثوم اور ہما کو حیران چھوڑ کر پلٹ آئی ۔ ثاقب حسن تیار کھڑا تھا۔ اُس کے دوبارہ وہاں تک آنے سے پہلے خود اُس کی طرف بڑھا اور وہیں سے اُسے لے کر باہر نکل گیا۔
"کم از کم چائے کے لیے تو رُک جاتے۔" راستے میں وہ اُس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے، یونہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔
"تم اگر رُکنا چاہتی تھیں تو وہیں کہہ دیتیں، میں تمہیں چھوڑ دیتا۔"
وہ اُس کے جواب پہ حیران ہوئی ۔ اُس کا انداز بھی نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔
"میرا وہاں رُکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"
"خواہش تو ہوگی ۔"
"اوّل تو اِس وقت ایسی کوئی خواہش نہیں تھی ۔ اگر ہوتی بھی تو یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ۔ میرے ماں باپ کا گھر ہے ۔ اور بقول تمہارے لڑکیاں میکے جاتی ہی رہتی ہیں۔" وہ خوبصورتی سے آتے گئے دنوں کی یاد دِلا گئی۔
"تم مجھ پہ کیا جتانا چاہتی ہو ؟۔" وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔
"میں تم پر کچھ نہیں جتانا چاہ رہی ۔ لیکن اِتنا ضرور کہوں گی کہ اپنے روّیے میں لچک پیدا کرو۔ کم از کم میرے لیے سوچتے ہوئے تمہیں اپنا دل اور ذہن کشادہ رکھنا چاہیے۔"
"خاص طور سے تمہارے لیے کیوں ؟۔"
"اس لیے کہ میں بڑے کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزر کر دوبارہ تم تک آئی ہوں ۔ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ ۔"
"اچھا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور پھر اُس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا "کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا یہ ہاتھ کبھی شہروز احمد کے ہاتھوں میں نہیں گیا ؟۔"
"ثاقی ۔" اسے اپنے سینے میں سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ گہرے دُکھ کے احساس میں گِھر کر تاسف سے بولی "کیسی باتیں کر رہے ہو ؟۔"
"میری بات کا جواب دو۔" کمینگی کے ساتھ سنگدلی کی انتہا کر دی تھی اُس نے ۔ اُس کا دل چاہا، اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس چلتی گاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دے ۔ زندگی کا بدترین مقام، جب انسان کو خود اپنے آپ پر رحم آنے لگے ۔ اُسے بھی اپنے آپ پر رحم آرہا تھا کہ کِس قدر بے بس ہے وہ، کوئی

راہِ فرار نہیں۔

"یاد رکھیں ربیعہ۔ جو جتنا فرار چاہے گا، وہ اتنا ہی پھنستا چلا جائے گا۔" اسی شخص نے کہا تھا جس کے حوالے سے اس وقت ثاقب حسن بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز کی بازگشت جانے فضاؤں میں گونج رہی تھی یا اُس کے اپنے اندر تھی۔ بہرحال وہ اپنے آپ پر قابو پا کر سہولت سے کہنے لگی۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ شہروز احمد نے بارہا میرا ہاتھ تھاما تھا لیکن ایسا اُنہوں نے ارادتاً کبھی نہیں کیا۔ اور پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ نہ صرف میرا ہاتھ تھامنے کا حق رکھتے تھے بلکہ اور بھی بہت سارے حقوق انہیں حاصل تھے۔ اگر وہ چاہتے تو۔۔"

"شٹ اَپ۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ گھر سے تو اچھے خاصے نکلے تھے۔"

"تم اندر چھوٹی آپا کے ساتھ کیا باتیں کر رہی تھیں؟" وہ اُس کی بات نظر انداز کر کے پُوچھنے لگا۔

"کوئی خاص باتیں نہیں تھیں۔ بس ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم اس سے شہروز احمد کا حال احوال پُوچھ رہی تھیں۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ رُخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن جس طرح تم مہروز کو دیکھ کر چونکیں اور ٹھٹھکیں تو اس سے۔"

"پلیز۔" مزید سُننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ تقریباً چیخ پڑی "مت ایسی باتیں کرو جو مجھے اپنی ہی نظروں سے گرا دیں۔ مہروز میرا بہنوئی ہے۔"

"جو بھی ہو لیکن تم سن لو کہ میں تمہارا اس سے بات کرنا تو کیا سامنا بھی برداشت نہیں کر سکتا اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ یا تو تم میکے جانا چھوڑ دو یا اپنی امّاں سے کہو صوفیہ اور مہروز کا وہاں داخلہ بند کر دیں۔" اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی اور اس سے پہلے ہی اُتر کر اندر چلا گیا۔ کس قدر بے مایا کر گیا تھا۔ وہ اُس کی ہستی کو کہ کتنی دیر تک وہ اس کے پیچھے جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ گاڑی سے اُتری تو واپسی کے راستے پر دُور تک نظریں دوڑانے لگی۔ سارے راستے ہی بے نشان اور گھور اندھیاروں میں ڈوبے ہوئے۔ اُس کی نظریں ناکام ہو کر واپس پلٹیں تو ساتھ سرگوشیاں لیتی آئیں۔

"اگر ڈرتی رہیں تو ہمیشہ اسی طرح پریشان رہیں گی۔"

"تمہیں میری پریشانی سے کیا؟" وہ مُٹھیاں بھینچ کر تلخی سے سوچتی ہوئی سر جھٹک گئی لیکن جیسے کوئی قریب ہی کھڑا کہہ رہا تھا۔

"آج ثاقب حسن ہے تو کل کوئی اور ہوگا جس کا نام آپ کو خوفزدہ کر دیا کرے گا۔"

"میرے خدا۔" اُس نے بمشکل تمام آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو پلکیں جھپک کر اندر دھکیلا۔

"کوئی بھی۔ ہو سکتا ہے، میں۔ میرا مطلب ہے میرا نام بھی الزام بن سکتا ہے۔"

"تمہارا نام الزام بن گیا ہے شہروز احمد۔ اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"اپنے آپ کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی سے تیار کر لیں۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے لیکن میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس سے کہیں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگر اسی طرح بزدلی کا مظاہرہ کرتی رہیں تو کیسے ان دشواریوں سے نکلیں گی۔۔؟" اِسے اُن کی کہی باتیں اَزبر تھیں۔

"ربیعہ۔" ثاقب حسن دوبارہ دروازے پر نمودار ہوا اور وہیں کھڑے رہ کر کہنے لگا "وہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"تم نے جو مجھے یہیں چھوڑا ہے۔" وہ دُکھ سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"میں اس دروازے سے تمہارے ساتھ نکلی تھی اور تمہارے ساتھ ہی اندر جاؤں گی۔"

"اور اگر میں اپنے ساتھ نہ لے جاؤں تب؟" پتا نہیں اُسے کیسی کیسی آزمائشیں مطلوب تھیں۔

ب میں یہیں کھڑے کھڑے زندگی تمام کر دوں گی۔" اُس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ بے اختیار بے نکل کر اُس کے پاس چلا آیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔

لتے کی ٹیبل پر سب کے درمیان صوفیہ پتا نہیں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر ربیعہ کا ذکر چھیڑ گئی تو ایک وشی چھا گئی۔ گو کہ وہ اب بھی ہر ایک کے دل میں اسی طرح موجود تھی لیکن اس طرح سب نے ساتھ راس کا ذکر کبھی نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ سبھی جانتے تھے کہ یہ ایک تکلیف دہ موضوع ہے اور اپنے طور پر سب ایک دوسرے کو اس تکلیف سے بچانا چاہتے تھے۔ گو کہ اس وقت صوفیہ نے مام سی بات کی تھی۔ بس اِتنا کہا تھا کہ 'ربیعہ آج کل اپنی نند کی شادی کے سلسلے میں بہت مصروف' اور ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اُس نے دیکھا، شہروز احمد چائے کا کپ جوں کا توں چھوڑ کر اُٹھ بارہے تھے اور امّی بھی اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔

اتی آپ کے لیے چائے بناؤں؟" وہ فوراً پُوچھنے لگی۔

نہیں بس۔" اس کے ساتھ ہی امّی بھی کمرے سے چلی گئیں تو مہروز بے حد خاموش نظروں سے ی طرف دیکھنے لگا۔

کیا بات ہے، اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟" وہ پتا نہیں واقعی انجان تھی یا انجان بننے کی کوشش ہی تھی۔

تمہیں یوں سب کے سامنے ربیعہ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔" وہ سرزنش کرتا ہوا بولا۔

کیوں؟ کیا میں اپنے گھر والوں کا ذکر نہیں کر سکتی؟"

ضرور کر سکتی ہو لیکن ربیعہ کی بات اور ہے۔ اور میرا خیال ہے تمہیں اس سلسلے میں کچھ سمجھانے کی رت نہیں ہے۔ تم خود سمجھدار ہو۔" اِس کے ساتھ ہی وہ کُرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن میں نے ایسی کوئی غلط بات تو نہیں کہی جو سب ناشتا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

صوفیہ۔" اُس نے تنبیہی لہجہ اختیار کیا "سب کو الزام دینے کے بجائے بہتر ہے کہ اپنی غلطی تسلیم ۔"

آئی ایم سوری۔" وہ رُوٹھے لہجے میں اس انداز سے بولی۔ جیسے محض اس کی بات رکھنے کی خاطر معذرت ہی ہو اور وہ اس کی خفگی محسوس کر کے دوبارہ بیٹھ گیا۔

میں جانتا ہوں، تم سے انجانے میں غلطی ہوئی ہے لیکن پلیز آئندہ خیال رکھنا۔" پھر نرمی سے سمجھاتا کہنے لگا "اصل میں ربیعہ کے سلسلے میں امّی زیادہ قصوروار شہروز بھائی کو سمجھتی ہیں اور جس طرح ربیعہ طلاق دینے کے بعد شہروز بھائی شکستہ سے نظر آنے لگے ہیں۔ اس سے ہمارا خیال ہے کہ وہ اپنی غلطی د بھی پشیمان ہیں اور ایک شکستہ اور پشیمان شخص جو اپنی غلطی کا ازالہ کرنے پر بھی قادر نہیں اُسے ۔ پشیمانیوں میں دھکیلنا نہیں چاہیے۔ اس کے برعکس ہم چاہتے ہیں کہ جو ہو گیا، سو ہو گیا، وہ اُسے بھول ں اور نئے سرے سے نئی زندگی کی ابتدا کریں، آخر ربیعہ بھی تو ایسا کر چکی ہے۔"

"آپ ربیعہ کا طعنہ دے رہے ہیں۔"

نہیں۔ اس تمام عرصے میں تم اچھی طرح جان چکی ہوگی کہ ہم ایسی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ کسی کا م کسی پر رکھنا ہمارا شیوہ نہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا "بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ربیعہ ازندگی کی ابتدا کر چکی ہے۔ اور اب یہی دُعا ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش رہے۔"

وہ اُس کے پُرخلوص لہجے سے متاثر ہوئی اور موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔

آپ کے لیے چائے بناؤں؟"

نہیں مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ اب چلوں گا۔" وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

پھر جب اسے گیٹ تک سی آف کر کے واپس اندر آئی تو شہروز احمد کے کمرے سے آتی ٹیپ

ریکارڈر کی آواز سن کر متعجب ہوئی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا، وہ آفس جا چکے ہوں گے۔ کچھ دیر تک وہ
کھڑی رہ کر سوچتی رہی، پھر اُن کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اند
داخل ہوئی تو وہ صوفے پر نیم دراز نظر آئے۔ انگلیوں میں دبا جلتا ہوا سگریٹ اپنی ناقدری پر راکھ ہو
اور بند آنکھوں میں یقیناً کوئی تکلیف دہ منظر آ ٹھہرا تھا جس کے آثار چہرے پر واضح نظر آرہے تھے۔
پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں ٹیپ ریکارڈر پر جا ٹھہریں۔

ے کیسے کہوں تیرے بنا زندگی کیا ہوگی
جیسے کوئی سزا، کوئی بد دُعا ہوگی

اُس نے بڑھ کر ٹیپ بند کر دیا تو اُنہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور اُسے دیکھ کر سیدھے
ہو بیٹھے۔

"بے کار ہے۔" وہ ماحول پر چھائی افسردگی دُور کرنے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

"زندگی۔" وہ بے اختیار کہہ گئے۔

"نہیں بھئی، زندگی کیوں بے کار ہونے لگی۔"

"پھر۔ ؟"

"پھر یہ کہ پہلے بندہ غلطی کرے پھر اس پر پشیمان ہو اور آخر میں یہ حالت بنا لے۔" وہ اُن کے سر
سے پاؤں تک اشارہ کرتی بُرا سا منہ بنا کر بولی تو وہ ذرا سا مسکرائے۔

"کیوں میری حالت کو کیا ہوا؟"

"مجھ سے پوچھنے کے بجائے آئینے میں جا کر دیکھیں۔ مجنوں کو بھی مات کر دیا ہے آپ نے تو۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے مجنوں کو بہت قریب سے دیکھ رکھا ہو۔"

"دیکھ تو رہی ہوں۔" اُس کی برجستگی پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے، پھر پوچھنے لگے۔

"مہروز آفس جا چکا ہے۔"

"ہاں، اور آپ کیوں نہیں گئے؟"

"بس یونہی۔ ویسے بھی آج کل کام کچھ زیادہ نہیں ہے۔"

"اگر کام کا پریشر کم ہے تو کوئی زبردست قسم کا پروگرام بنائیں۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

"مثلاً۔ ؟" وہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"مثلاً۔ مثلاً یہ کہ آپی کے پاس لاہور چلتے ہیں یا پھر سوات۔ یا پھر آپ کی شادی کا پروگرام بنا
لیں۔"

اُن کے ہونٹوں پر ٹھہری مسکراہٹ ایک دم معدوم ہو گئی اور وہ پیکٹ اُٹھا کر اس میں سے سگر
نکالنے لگے۔

"میرا خیال ہے آخری والا پروگرام صحیح ہے۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ آپ۔"

"صوفیہ۔" وہ ٹوک گئے۔ "میں آج آرام کی غرض سے گھر پر رُکا ہوں۔ آپ پلیز مجھے ڈسٹرب نہ

"شہروز بھائی۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ "میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ خود سوچیں جس کے لیے آپ
اس طرح جوگ لیے بیٹھے ہیں، وہ تو اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔"

"کیا واقعی؟" وہ بلا ارادہ اور بے اختیار پوچھ گئے۔ اور اُس کے نظریں چرانے پر کہنے لگے۔ "
روز مجھے یہ یقین مل گیا کہ وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے، اُس روز سب سے پہلے
خود اپنے آپ کو معاف کروں گا۔ اُس کے بعد باقی ماندہ زندگی کا سفر یقیناً آسان ہو جائے گا۔"

"یہ یقین کیسے ملے گا آپ کو؟"

"میرا دل۔ میرا دل گواہی دے گا صوفیہ بی بی۔"

"اب آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

بے پناہ دشواریوں کا سامنا ہے جن کا اندازہ مجھے شروع ہی سے تھا اور پتا نہیں وہ بزدل
شواریوں سے نکل بھی سکے گی یا نہیں۔ ؟" وہ اُس کی دشواریاں سوچ کر افسردہ ہو گئے تھے۔
آپ کو پہلے سے اندازہ تھا تو پھر آپ نے ایسا قدم کیوں اُٹھایا؟ اُسے جلتے بوجھتے ہوئے
یوں میں کیوں دھکیل دیا؟" وہ انہیں الزام دینے سے باز نہ رہ سکی۔

کیا کرتا؟"

۔ سب کچھ آپ کے اختیار میں تھا۔ تمام قانونی اور شرعی حقوق حاصل تھے آپ کو۔ اگر ربیعہ
ے میں یہ یقین نہیں تھا کہ آیا وہ آپ کے ساتھ رہنا بھی چاہتی ہے یا نہیں، تو خود آپ تو ایسا
ھے۔ اپنی خواہش ہی کے پیشِ نظر اُس کے پاؤں میں اولاد کی زنجیر ڈال دیتے کہ پھر اگر وہ جانا بھی
نہیں جا سکتی تھی حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

نے کبھی اس بات کا اظہار کیوں نہیں کیا؟"

اظہار کرتی۔ وہ، جس کے نام کے ساتھ آپ بزدل کا لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں۔"

، بزدل تو وہ تھی۔"

ن وہ نہیں، آپ بھی یا پھر آپ نے اُسے اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔" وہ خاموش ہو کر اسے
ہے۔

ن کیجیے شہروز بھائی، مجھے آپ پر بالکل رحم نہیں آتا۔ میں جب اُسے دیکھتی ہوں، مجھے آپ
کا خیال آتا ہے اور آپ مجھے ثاقب حسن سے بھی بڑے مجرم نظر آتے ہیں۔"

ب حسن کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ پتا نہیں وہ شروع ہی سے پست
، کا مالک تھا یا اب وہ اس انداز سے سوچنے لگا تھا بہر حال اُس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا
ں سے شہروز احمد کے حوالے سے ایسی باتیں کرے گا۔ حالانکہ شروع دن سے وہ خود اُسے
ا تا رہا تھا کہ وہ یعنی شہروز احمد بہت اچھے انسان ہیں۔ اور یہ کہ دُنیا میں اُس کے لیے سب
دہ قابلِ اعتبار۔ پھر اب پتا نہیں کیوں وہ ایسی باتیں کرنے لگا تھا۔ مزید المیہ یہ بھی تھا کہ وہ
احمد کو نہیں سوچنا چاہتی تھی، ثاقب حسن کی باتیں اسے بہت کچھ یاد دلا کر انہیں سوچنے پر مجبور
، حالانکہ اس میں اس کی شعوری کوشش کو ہرگز دخل نہیں تھا بلکہ شعوری طور پر تو وہ کبھی اُن کا
بھی تو، سر جھٹک دیا کرتی تھی۔

ن جب ایک شخص کا بار بار ذکر کیا جائے، چاہے کسی بھی انداز سے تو پھر اس کے خیال سے
ۓ دامن بچایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی دامن بچاتے بچاتے تھک گئی، اس کے باوجود ہتھیار نہیں
دہ ہر صورت اپنے آپ سے کیا عہد نبھانا چاہتی تھی کہ اب جب کہ وہ صحیح معنوں میں ثاقب حسن
اہے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچے لیکن ثاقب حسن پتا نہیں کیا
ھا کہ اب اکثر بات بے بات شہروز احمد کا ذکر کرنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اُن کی قد آور شخصیت
وب ہو اور ان کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اس خوف میں مبتلا ہو کہ کہیں کسی مقام
ن کا موازنہ اُن سے نہ کرنے لگے، اس لیے وہ ربیعہ کو ان سے متنفر کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
اس کا مقصد کچھ بھی ہو، ربیعہ کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ سوچتی۔
انہیں کاتبِ تقدیر نے میرے لیے ایسی آزمائشیں کیوں لکھی ہیں۔ شہروز احمد کے گھر تھی تو۔
سن کا خوف اور یہاں ہوں تو شہروز احمد کا خیال زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ میری زندگی میں کمزور
ا والے گھر ہی کیوں لکھے گئے ہیں؟ سر پر سائبان ملے بھی تو ایسے کھوکھلے جو نہ تپتی دھوپ سے
ہیں اور نہ چھاجوں برستی بارش سے۔"

بہرحال ۔۔ ، آخر میں اُس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ "یہی میرا گھر ہے اور اس کی بنیادو
میں خود مضبوط کروں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔"

اُس نے گھر کی بُنیادوں کو مضبوط کرنے کا سوچا تھا لیکن انیلا کی شادی میں اسے ان میں مزید
پڑتی نظر آئیں۔ جب اُس نے ثاقب حسن کو اپنی خالہ زاد شبانہ کے ساتھ بہت زیادہ فری ہوتے
پہلے اُس نے سوچا، شادی کا گھر ہے، آپس میں ہنسی مذاق تو ہوتا ہی ہے لیکن بات صرف گھ
نہیں رہی۔ ثاقب حسن کسی کام سے باہر جانے لگتا، تب بھی اپنے ساتھ شبانہ کو لے جاتا، وہ کھلی
سے یہ سب دیکھتی اور کُڑھتی رہتی۔ فوری طور پر ٹوکا اس لیے نہیں کہ شادی کے گھر میں کہیں با
پھیل جائے۔

مہندی والے روز تو وہ یوں ثاقب حسن کے ساتھ ساتھ تھی جیسے وہی اُس کی بیوی ہے۔ اور ا
انجان لوگ یہی سمجھتے رہے، جس وقت یہاں سے لڑکیاں مہندی لے کر دولہا والوں کے ہاں جانے والی
وہ بھی اپنے طور پر اہتمام سے تیار ہو کر کمرے سے نکلی تھی لیکن برآمدے ہی میں ثاقب حسن کے
میں شبانہ کو کھڑے دیکھ کر اُس کے قدم وہیں رُک گئے۔ پھر اُس نے سُنا کوئی خاتون ثاقب کی وا
سے کہہ رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ۔۔ کیا خوب جوڑی ہے۔ بہو تو اچھی ڈھونڈی تم نے۔"

"کہاں بہن۔" ثاقب کی والدہ آہ بھر کر بولیں۔ "میں تو خود اسے بہو بنانا چاہتی تھی لیکن اپنی قسم

"کیا مطلب؟ کیا یہ تمہاری بہو نہیں ہے؟"

"نہیں، یہ میری بھانجی ہے۔"

"پھر کیا مشکل ہے۔ بہو بنا ڈالو۔ دیکھو تو دونوں ساتھ کھڑے کتنے اچھے لگ رہے ہے۔" خاتون
بالکل ہی انجان تھیں لیکن اور سب تو انجان نہیں تھے۔ ان کی باتوں پر ثاقب حسن نے شوخ نظروں
شبانہ کی طرف دیکھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اور وہ جو خاصے اہتمام سے تیار ہو کر نکلی تھ
بہت خاموشی سے دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر کتنی دیر تک وہ انتظار کرتی رہی، شاید کوئی
بلانے آئے لیکن کوئی نہیں آیا۔ اور اگر اس مقام پر اسے ندا کی شادی یاد آ گئی تھی تو اس میں نہ ا
شعوری کوششوں کو دخل تھا اور نہ ہی وہ قصوروار تھی۔

شہروز احمد کی امی، بھائی، بہن اور تمام کزنز نے اسے کس قدر اہمیت دی تھی۔ چھوٹی سے چھ
بات میں اُس کی رضا شامل، جیسے کوئی بھی بات اُس کی مرضی کے خلاف ہو گئی تو قیامت آ جا
کتنی معتبر ہو گئی تھی وہ۔ خود اپنی نظروں میں بھی۔ پھر تمام کزنز کا اُسے گھیر کر گانے کی فرمائش کر

ع پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی

اُس کے ہونٹ بے آواز حرکت کرنے لگے تھے اور وہ بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر
کوئی اُس کے اندر دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔

آج سے اپنا وعدہ رہا، ہم ملیں گے ہر اک موڑ پر
دل کی دُنیا بسائیں گے ہم غم کی دُنیا کا در چھوڑ کر
ٹوٹ جائے گی ہر ہتھکڑی، پیار کرلیں گھڑی دو گھڑی
پیار کرلیں گھڑی ۔۔ ۔۔

"ربیعہ ۔۔"

"آں ۔۔" اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ دروازے میں کھڑی انیلا پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔
چُپ چاپ اُسے دیکھے گئی۔

"تم سب کے ساتھ نہیں گئیں؟" اندر آتے ہوئے انیلا نے پوچھا۔

نہیں۔" وہ سیدھی بیٹھتی ہوئی بولی۔

کیوں؟"

بس اچانک پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ دل گھبرانے لگا۔ سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔" اُس نے جھوٹ
ہارا لیا۔ انیلا بیڈ پہ اس کے سامنے بیٹھی تو۔۔ کچھ دیر تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہی
ہنے لگی۔

سنو ابھی تو میں اسی گھر میں ہوں اور یہاں کی ہر بات سے باخبر بھی البتہ جب چلی جاؤں گی تو شاید
ہری کی بنا پر تمہاری باتوں کا یقین کر لیا کروں گی۔"

کیا مطلب؟" وہ بہت حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔

تم بہت اچھی طرح جانتی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ بہرحال مجھے یہ بتاؤ ثاقب بھائی تمہارے
ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

کیا کر رہے ہیں؟" وہ اُلٹا اُس سے پوچھنے لگی۔

پلیز ربیعہ، مت بات کو الجھاؤ۔ کیا میں نہیں جانتی کہ ثاقب بھائی تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔
ان کی مخالفت کے باوجود انہوں نے تمہارے ساتھ شادی کی، یہ جاننے کے باوجود کہ تمہاری پہلی
ناکام ہو چکی ہے، پھر بھی انہوں نے تمہیں اپنایا، پھر اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیوں تمہیں
ز کر رہے ہیں؟"

بات تم اپنے بھائی سے پوچھو۔" وہ اس سلسلے میں کیا کہتی بس اپنا دامن بچانے لگی۔

ہیں بھی تو اندازہ ہو گا۔"

میں تو یہی کہوں گی کہ تمہارا بھائی جذباتی انسان ہے۔ میرے حالات کے پیشِ نظر یقیناً مجھ سے
ی کی بنا پر شادی کر بیٹھا اور اب۔ اپنی غلطی پر پچھتا رہا ہے۔" وہ اپنے ناخن سے نیل پالش
ا ہوئی بولی۔

شادی کوئی گڈے، گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تمام عمر کا بندھن ہے۔ اِس میں ہمدردی اور پھر
کیا سوال؟" اُس کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔ "شبانہ میری خالہ زاد بہن ہے لیکن اس کا
ب نہیں کہ میں اسے تم پر ترجیح دوں گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ امّاں ثاقب بھائی کی شادی
سے کرنا چاہتی تھیں لیکن اس وقت ثاقب بھائی نے سختی سے منع کر دیا تھا۔"

پتھا۔" وہ اندر کا درد چھپانے کو ہنسی۔ "میرا خیال ہے اب وہ منع نہیں کرے گا۔"

یسی باتیں کرتی ہو؟ تم ثاقب بھائی کو روکو۔ منع کرو انہیں کہ وہ شبانہ کو اتنی لفٹ نہ دیں۔"

یا وہ باز آ جائے گا؟"

ریقے سے منع کرو گی تو ضرور باز آ جائیں گے۔ ویسے تم ان کی بیوی ہو، ہر طریقہ استعمال کر سکتی ہو۔
ے پیار سے۔ اگر اس طرح نہ مانیں تو غصہ، خفگی، آخر میں میکے جانے کی دھمکی۔" اُس نے صرف
نے پر اکتفا کیا۔

اگلے دن انیلا رُخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو اتنے دنوں سے جو گھر میں شادی کے ہنگامے
ہے تھے، ایک دم ماند پڑ گئے۔

دونوں تک سب کی زبان پر اس شادی کا تذکرہ رہا، پھر خود بخود ہر بات معمول پر آ گئی۔ روز و شب
روٹین۔ البتہ اب وہ گھر کے سارے کام کرنے کو تنہا ہو گئی۔ جب تک انیلا تھی، وہ اُس کا
کرتی تھی، اب امّاں تو بس حکم ہی چلایا کرتی تھیں۔

ے گھر کے کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ تو ویسے بھی مصروفیت کے بہانے ڈھونڈتی
ی بہانے وہ سارا دن مصروف رہتی لیکن جب طاقت سے بڑھ کر بوجھ اُٹھایا جائے تو زیادہ
ھڑا نہیں رہا جا سکتا، وہ بھی بالآخر ڈھے گئی۔ پہلے دو ایک روز ہلکا ہلکا بخار رہا، تیسرے دن صبح

جب ثاقب حسن نے اُسے اُٹھایا تو وہ بخار میں جل رہی تھی۔

"رات تو تم اچھی بھلی تھیں، پھر اچانک اِتنا تیز بخار کیسے آگیا؟" وہ اچنبھے سے پوچھنے لگا

وہ کیا کہتی، خاموش ہی رہی۔

"تم لیٹی رہو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔" شاید اس میں کچھ انسانیت باقی تھی کبھی کبھی غالب آکر اُسے مغلوب کر دیا کرتی تھی۔ اُسے لیٹے رہنے کا کہہ کر وہ باہر نکل گیا، پھر اس سے اپنی امّاں سے چائے بنانے کے لیے کہا تھا جو انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"جورو کے غلام ہو تم۔ اب اس نوابزادی کو کمرے میں چائے پہنچواؤ گے، وہ بھی مجھ سے؟ میں اس کے باپ کی نوکر نہیں لگی ہوئی۔"

"امّاں۔ امّاں۔" وہ انہیں اس کی بیماری کا بتانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی کہے گئیں۔

"کہہ دو اس سے۔ اگر اِتنا ہی پلنگ توڑنے کا شوق ہے تو باپ سے کہے کوئی خدمت گار دے۔ مجھ سے اس کلموہی کے نخرے نہیں اُٹھائے جاتے۔ مجھے تو پکی جادوگرنی لگتی ہے، پتا ایسا کون سا جادو کیا ہے تم پر کہ تمہیں اس کے پچھلے لچھن ہی نظر نہ آئے۔"

"میرے خدا۔" اُس نے تکیہ کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا لیکن امّاں کی آواز تھی یا اسرافیل کا جو ہر رکاوٹ توڑ کر سماعتوں پر ہتھوڑے برسائے جا رہی تھی۔

"ربیعہ۔" کافی دیر بعد ثاقب حسن کی آواز سنائی دی لیکن وہ شاید اسے نادم نہیں دیکھنا تھی، اس لیے سوتی بن گئی اور وہ بھی دو تین آوازیں دینے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔

پھر سارا دن وہ اسی طرح پڑی رہی۔ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کھانا، پانی تو دُور کی بات کمرے میں جھانکا تک نہیں اور پتا نہیں ثاقب حسن ایسے کون سے ضروری کاموں میں اُلجھا ہوا اُسے بھی گھر میں بیمار بیوی کا خیال نہیں آیا۔ بس اِتنا کرم کیا کہ گزشتہ کئی روز سے جو رات گئے تھا، سرِ شام چلا آیا۔ لیکن جتانے سے بھی باز نہیں رہ سکا۔

"میں تمہاری وجہ سے اپنا اِتنا ضروری کام چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔"

اُس کا دل چاہا کہہ دے، 'اب بھی نہ آتے' لیکن وہ خاموش رہی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟۔ بخار اُترا یا نہیں؟۔"

اور سارا دن بھوکی پیاسی رہنے کے باعث نقاہت اتنی تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ تب بڑھ کر اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگا۔ بخار کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

"کوئی دوا تو نہیں لی ہوگی تم نے؟۔ مجھ سے غلطی ہوئی عاقب سے کہہ جاتا تو وہ تمہیں ڈاکٹر پاس لے جاتا۔" پھر خود ہی کہنے لگا۔ "عاقب کو بھی کہاں فرصت ہے، ابھی بھی ایک پارٹی سے ملنے تھا۔" وہ چپ چاپ سنتی اور دیکھتی رہی۔

"چلو اُٹھنے کی کوشش کرو۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانے لگا۔ تمام وہ بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکرا کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

اُسی وقت کال بیل بجنے کی آواز آئی تو وہ اُسے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو پیچھے آتی صوفیہ کو بس ایک پل کو دیکھ سکی کہ آنکھوں کے سامنے دھند کی چادر سی تن گئی۔

"تم نے تو شاید گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھالی ہے، میں نے سوچا، میں ہی تم سے مل آؤں۔" کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام گئی۔

"ارے کیا ہوا تمہیں؟" صوفیہ کو لگا جیسے کلائی جلتے انگاروں سے چھو گئی ہو۔ ایک دم پریشان ہو وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ابھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا۔" اس کے

حسن نے جواب دیا۔

"کب سے بیمار ہے؟۔ کم از کم ہمیں اطلاع تو کرتے۔"

"صبح تک تو ٹھیک تھی۔ بس اچانک۔ آپ ٹھیک سے بیٹھیں، میں چائے وغیرہ۔"

"نہیں میرا خیال ہے پہلے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ چلو ربیعہ، ہمت کرو، میں بھی تو چلتی ہوں۔" صوفیہ نے سہارا دے کر اُسے اُٹھایا۔ پھر اسی طرح اپنے ساتھ لگائے ہوئے لے کر ثاقب حسن کے پیچھے باہر آئی تو وہ جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر خود اُسے بٹھانے لگا۔

صوفیہ نے اپنی گاڑی وہیں لاک کر دی اور خود ربیعہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"مہروز نہیں آئے آپ کے ساتھ؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا پوچھنے لگا۔

"مصروف اتنے رہتے ہیں کہ مشکل ہی سے کہیں جانے کے لیے وقت نکال پاتے ہیں۔ آج کل ویسے بھی ایک نئے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔" پھر اخلاقاً کہنا پڑا۔ "کبھی تم لوگ آؤ ناں۔"

"یہ رسمی باتیں۔" اُس نے سوچا۔ حالانکہ یہ طے ہے اور دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ کبھی وہ اس طرف آسکے گا اور نہ کبھی ہم ہی جا سکیں گے پھر بھی ایک دوسرے کو دعوت دے رہے ہیں۔ یہ ثاقب حسن کس قدر دوغلا ہے۔ اس روز تو مہروز کے خلاف اتنا زہر اُگل رہا تھا اور اب یوں کہہ رہا ہے جیسے اس سے بڑے اچھے مراسم ہوں۔"

"کس طرف چلنا ہے؟" وہ گردن موڑ کر پوچھنے لگا۔ "میرا مطلب ہے کون سے ڈاکٹر کے پاس۔"

"ڈاکٹر حسنین کے کلینک چلیں۔ وہ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔" صوفیہ نے مشورہ دیا۔

"یہ کہاں پر ہیں؟۔"

"تم چلو، میں بتاتی ہوں۔" صوفیہ اُسے راستہ بتانے لگی اور وہ شیشے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر گئی۔

"ربیعہ، تم ٹھیک تو ہو؟۔" صوفیہ اُس کی طرف متوجہ ہوئی اور اُسے اتنا نڈھال دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگی۔ اُس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا اور ہلکے سے سر ہلا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"میرا خیال ہے ربیعہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ پلیز گاڑی تیز چلاؤ۔"

"یہ اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتی۔" وہ اسپیڈ بڑھاتا ہوا بولا۔ "ہر وقت کام، کام اور بس کام۔"

"میرا خیال ہے تم ملازم افورڈ کر سکتے ہو، پھر کیوں نہیں رکھتے؟۔"

"یہی کلینک ہے؟" وہ اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگا۔

"ہاں، بس یہیں روک دو۔"

اُس نے گاڑی روکی اور جلدی سے اُتر کر ربیعہ کو اُترنے میں مدد دینے لگا۔

دوا نہ سہی، اگر غذا بھی لے سے ملی ہوتی تو وہ اِتنی نڈھال نہ ہوتی، صبح سے ایک قطرہ پانی تک اُس کے منہ میں نہیں گیا تھا، جبھی یہ حالت تھی کہ صوفیہ اور ثاقب حسن کے سہارے چلنے کے باوجود کوریڈور تک آتے آتے اُس کی سانس پھول گئی۔ اور بدن کانپنے لگا۔ ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ مزید چلنے سے انکار کرتے ہوئے وہ وہیں بینچ پر بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"میں ڈاکٹر صاحب کو یہیں لے آتی ہوں۔" صوفیہ اسے چھوڑ کر بہت عجلت میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی طرف چلی گئی تو وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ لاکھ ستمگر اور بے مہر سہی، اس وقت اس کی حالت دیکھ کر وہ سچ مچ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ اپنی غلطی اور امّاں کی زیادتی کا احساس جاگا تو کہنے لگا۔

"مجھے صبح ہی تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے، امّاں نے تو سارا دن تمہیں پوچھا بھی نہیں ہوگا۔ کم از کم تمہیں کوئی ہلکی پھلکی غذا ہی کھلا دیتیں۔" پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر کہنے لگا۔ "پلیز میری کوتاہی معاف کر دو۔"

"عجیب شخص ہے کبھی شعلہ، کبھی شبنم۔" اُس نے سوچا اور اپنا دُوسرا ہاتھ اُس کے ہاتھوں پر رکھ کر گویا یقین دلانے لگی کہ وہ اس سے خفا نہیں ہے۔
"میں تمہیں بہت دُکھ دینے لگا ہوں لیکن میں کیا کروں کہ۔"
صوفیہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو آتے دیکھ کر اُس نے اپنی بات وہیں چھوڑ دی۔
"ارے بیگم شہروز احمد۔ کیا ہوا ابھی آپ کو؟" ڈاکٹر صاحب انجانے میں بھونچال لے آئے تھے اور خود اطمینان سے اُس کا معائنہ کرنے لگے۔ جب کہ صوفیہ کی ساری خود اعتمادی دھری کی دھری رہ گئی۔ اپنے آپ میں چور سی بن کر کنکھیوں سے ثاقب حسن کی طرف دیکھا۔ اُس کے بھینچے ہونٹ اور شکن آلود پیشانی نے شدت سے احساس دلایا کہ وہ کتنی بڑی حماقت کر گئی ہے لیکن وہ کیا کرتی، فوری طور پر جہاں ڈاکٹر حسنین کا نام زبان پر آیا تھا وہاں وہ یہ بھی بھول گئی کہ ڈاکٹر حسنین، شہروز احمد کے فیملی ڈاکٹر ہیں اور گزشتہ دو برسوں میں کبھی کبھی ربیعہ سے ضرور مل چکے ہوں گے۔
اور ربیعہ جو پہلے ہی بیماری کے باعث نڈھال ہو رہی تھی، ڈاکٹر صاحب کے اس طرح مخاطب کرنے پر اُس کی رُوح تک کانپ گئی۔ یوں لگا جیسے اس کا وجود ہوا میں کہیں معلق ہو گیا ہو۔ بالکل غیر ارادی طور پر اُس نے سہارے کے لیے ثاقب حسن کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنی چاہی لیکن وہ بڑی بے دردی سے اُس کے ہاتھ جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
"غالباً شہروز احمد آپ کا خیال نہیں رکھ رہے۔ مجھے بیگم صاحبہ سے اُن کی شکایت کرنی پڑے گی۔" ڈاکٹر صاحب چیک اَپ کر کے سیدھے کھڑے ہوتے تو پُر مزاح لہجے میں کہنے لگے۔ وہ مدد کے لیے صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی تو وہ فوراً بول پڑی۔
"ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"
"نہیں میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں لیکن میڈیسن سے زیادہ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے کمزور بھی بہت ہو رہی ہیں۔ اگر کہیں تو ڈرپ لگا دوں؟"
اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔
"چلیے پھر میں کل کمپاؤنڈر کو گھر بھیج دوں گا، وہ آپ کو ڈرپ لگا آئے گا۔"
اُس نے ان سنی کرتے ہوئے اور اس صورتحال سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی خاطر ذرا سی گردن موڑ کر واپسی کے رستے پر نظریں دوڑائیں تو لگا جیسے اچانک اُس کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا ہو۔ ساتھ ہی کائنات کی ہر شے ساکن۔
اور اس سارے منظر میں اگر کوئی چیز متحرک تھی تو وہ شہروز احمد کے قدم، جو لمحہ بہ لمحہ درمیانی فاصلہ مٹاتے چلے آ رہے تھے۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

وہ شہروز احمد کے قدم روکنے پر قادر نہیں تھی، اندر ہی اندر بے حد خوفزدہ ہو کر رُخ موڑ گئی۔
"شاید ساری قیامتیں آج ہی ٹوٹنی ہیں!" اُس نے سوچا اور غیر محسوس طریقے سے آنچل پیشانی سے آگے تک کھینچ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شہروز احمد اُسے دیکھیں اور ابھی تک تو واقعی اُنہوں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ وہیں اپنے قدم روک لیتے اور شاید واپس بھی پلٹ جاتے۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ وہ جانے کن خیالوں میں مگن ہو کر چلے آ رہے تھے کہ وہاں موجود کسی شخص پر بھی اُن کی نظر نہیں پڑی اور شاید وہ اسی طرح سب کے قریب سے گزر بھی جاتے لیکن ڈاکٹر حسنین نے اُنہیں دیکھ لیا اور وہ چونک کر رُکے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔
"غالباً آپ اپنی مسز کے لیے آئے ہیں۔"
یہ ایک اور چونکانے والی بات تھی۔ وہ حیران ہوئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ صوفیہ بول پڑی

"ڈاکٹر صاحب۔ اگر آپ میڈیسن لکھ دیتے تو۔"
"صوفیہ آپ۔؟"
اُنہوں نے اسی قدر کہا تھا کہ صوفیہ نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چل دی۔ اور وہ صوفیہ کے اشارے پر خاموش تو ہو گئے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ اُلجھے اُلجھے سے اُس کے پیچھے جانا چاہتے تھے کہ ثاقب حسن سامنے آ کھڑا ہوا اور طنز آمیز لہجے میں دانت پیس کر بولا۔
"آپ لوگوں کی پلاننگ کی داد دینی پڑے گی شہروز احمد۔"
"پلاننگ؟" اُن کی سمجھ میں نہیں آیا، آخر انہیں کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہے۔
"انجان بننے کی کوشش بے کار ہے شہروز احمد۔ مجھے تو صرف اتنا بتا دیں کہ اس پلاننگ میں میری بیوی کس حد تک شریک تھی؟"
بات کرتے ہوئے ثاقب حسن نے بینچ پر بیٹھی ربیعہ کی طرف اشارہ کیا تو اُن کی نظریں بھی اُس طرف اُٹھ گئیں اور پھر یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جسے ہر پل نظریں تلاش کرتی تھیں۔ ایک طویل مدت بعد اس پر نظر پڑے اور ٹھہر نہ جائے۔ بہت چاہا اُس کی رُسوائی کا سامان نہ ہو۔ اُس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ لیکن اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اُس پر سے نظریں نہ ہٹا سکے۔ اور یہی بات ثاقب حسن کے شک کو تقویت دے گئی۔ اُن پر بس نہیں چلا تو ربیعہ کی کلائی تھام کر ایک جھٹکے سے اُٹھایا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا اور وہ وہیں کھڑے ایک بار پھر اُسے دُور جاتا ہوا دیکھتے رہے۔
"ربیعہ کہاں ہے؟" عقب سے صوفیہ کی آواز آئی تو وہ فوراً اُس کی طرف پلٹے اور فقط اُس کا نام لے سکے۔
"ربیعہ۔"
"ہاں ابھی ربیعہ اور ثاقب یہاں تھے، کہاں گئے؟"
"پتا نہیں۔ شاید باہر موجود ہوں۔" اُنہوں نے کہا تو صوفیہ تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک گئی۔ اور وہاں ثاقب حسن کی گاڑی نہ دیکھ کر مایوسی سے پلٹ آئی۔ پھر قدرے تیز لہجے میں پوچھنے لگی۔
"آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"
"میں امی کی رپورٹس لینے آیا تھا۔"
"آپ کو بھی اسی وقت آنا تھا۔" اُس کے لہجے میں دُکھ، تاسف، پریشانی اور جانے کیا کچھ تھا کہ شہروز احمد زیادہ تو نہیں سمجھے لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ، کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔
"یہ سب محض اتفاق ہے لیکن وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔" صوفیہ پُرسوچ انداز میں جیسے اپنے آپ سے بولی تھی وہ سن کر کہنے لگے۔
"کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟"
"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ جا کر امی کی رپورٹس لے آئیں۔ پھر گھر چلتے ہیں۔"
"رپورٹس میں کل لے لوں گا۔ آپ آئیے۔"
وہ اُس کی حالت کے پیشِ نظر اپنا کام کل پر چھوڑ کر اُسے لے کر باہر نکل آئے، پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگے۔
"آپ آئی کیسے تھیں؟ میرا مطلب ہے آپ کی گاڑی؟"
"میں ربیعہ اور ثاقب کے ساتھ آئی تھی۔"
وہ اتنا کہہ کر اُن کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور جب انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو اُن کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگی۔
"میں ربیعہ سے ملنے اُس کے گھر گئی تھی۔ وہ بیمار تھی اور ثاقب حسن اُسے ڈاکٹر کے پاس لے

جانے والا تھا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں بھی اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اور مزید غلطی یہ کہ جب ثاقب نے ڈاکٹر کی بابت پوچھا تو میں نے بنا سوچے سمجھے ڈاکٹر حسنین کا نام لے دیا اور یہاں آکر جا ہیں کیا ہوا؟"

وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگے۔

"ڈاکٹر حسنین، ربیعہ سے اسی پرانے تعلق کے حوالے سے بات کرنے لگے۔ یعنی انہوں نے اسے بیگم شہروز احمد کہہ کر مخاطب کیا۔"

"مائی گاڈ۔" اسٹیئرنگ پر اُن کی گرفت سخت ہوگئی۔

"ستم تو یہ ہے کہ ثاقب حسن بھی وہیں موجود تھا۔ اور آپ سوچ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے طرزِ تخاطب پر اس کا کیا ردِعمل ہوا ہوگا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ پہلے ڈاکٹر حسنین کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا۔ اس کے بعد ربیعہ کے ٹکڑے کر دیتا۔" قدرے توقف کے کہنے لگی۔

"میں اگر غیر جانبداری سے بات کروں تو یہی کہوں گی کہ جہاں ربیعہ بے قصور ہے، وہاں ثاقب حسن کا ردِعمل بھی بالکل فطری تھا۔ وہ تو کیا، کوئی بھی شخص یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اُ کی بیوی کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ منسوب کر کے مخاطب کیا جائے۔ اور مزید ستم یہ کہ آ چلے آئے۔"

"مجھے اگر معلوم ہوتا تو۔" وہ تاسف سے بولے۔

"میں آپ کو الزام نہیں دے رہی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "مجھے تو لگتا ہے جیسے حالات ربیعہ کے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ وہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں کیوں نہ مارے، حالات کو شکست نہیں سکتی۔" بہن کو درپیش حالات کی سنگینی محسوس کر کے وہ رو پڑی اور اسی طرح روتے ہو

"پتا نہیں، اس کے مقدر میں یہ سب کیوں لکھا گیا؟۔ اتنی ڈھیر ساری آزمائشیں، اتنے کڑے امتحان اور ایسے کٹھن مراحل یا میں انہیں سزا سے تعبیر کروں۔ لیکن سزا بھی کیوں؟ کیا کیا ہے نے؟۔ اس کی ساری زندگی میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہے۔ کہیں کوئی گناہ، کوئی خطا نہیں ہے جو گرفت میں آجائے پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔"

"پلیز صوفیہ۔" وہ اُسے رونے سے منع کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اور شدت سے روتی بولی۔

"آپ جانتے ہیں اُسے۔ کس قدر سادہ ہے وہ۔ شروع ہی سے ایسی ہے۔ صابر، شاکر او زیادتی چپ چاپ سہہ جانے والی۔ اگر کوئی اُسے تپتی ریت پر کھڑا کر کے یہ کہہ دے کہ تمہیں عمر یہیں کھڑے رہنا ہے تو میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنا قصور پوچھے بنا وہیں اپنی زند تمام کر دے گی۔" انہوں نے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو کہنے لگے۔

"میں آپ کا دُکھ اور پریشانی محسوس کر سکتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں کچ کر سکتا۔ کیونکہ میں بالکل بے اختیار ہوں۔"

"جب بااختیار تھے، تب کیا، کیا؟" وہ ہر موقع پر یہ جتانے سے باز نہیں رہ سکتی تھی کہ ابتد ہی سے ہوئی، اب بھی طنز سے بولی۔ تو وہ افسردگی سے مسکرا دیے۔

"مجھے تو رہ رہ کر ربیعہ کا خیال آرہا ہے۔ ایک تو وہ بیمار ہے۔ اوپر سے ثاقب حسن پتا نہ اُس کے ساتھ۔"

"پلیز۔" انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے روک دیا، پھر کہنے لگے۔ "آپ خوامخواہ پر ہو رہی ہیں۔ ثاقب حسن اُس کا شوہر ہے۔ محبت میں ہر حد پھلانگ جانے والا شخص۔ وہ اگر

دتی کرے گا تو تلافی بھی کر دے گا۔ میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اِدھر لڑے، اُدھر ہوگئی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو آپ نے"

اُس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر ایک دم خاموش ہوگئے۔ ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہنے لگے۔

"چلیے۔ آپ گھر جائیں۔ امّی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اور آپ؟۔"

"میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ امّی پوچھیں تو بتا دیجیے گا۔ اور یہ بھی کہ ہو سکتا ہے مجھے نے میں دیر ہو جائے۔"

اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے لائٹر جلا کر سگریٹ سُلگایا اور پھر ڈھیر سارے دھوئیں میں اپنے کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

"جو باتیں آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے شہروز بھائی، اُن سے اپنے آپ کو بھی بہلا گا۔" وہ دُھند کے اُس پار اُن کے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔ پھر فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اُتر گئی۔ اور وہ جو سوچ رہے تھے، اُس کے اُترتے ہی گاڑی بھگا لے جائیں گے، چپ چاپ اُس کی ن دیکھے گئے۔

"میری گاڑی ربیعہ کے گھر ہے، ہو سکے تو ڈرائیور بھیج کر منگوا لیجیے گا۔" اُس نے کہا اور اُن کا جواب بغیر اندر چلی گئی۔

ثاقب حسن کی پیشانی شکن آلود تھی اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ اُس کی طرف دیکھنے کی ہمت کر پائی تھی۔ لیکن گاڑی کی مسلسل بڑھتی ہوئی اسپیڈ سے وہ اس کے اندر اُٹھتے طوفان کا اندازہ کر سکتی تھی۔ اس طوفان کا اندازہ کر کے ہی اندر ہی اندر وہ بے حد خوفزدہ ہوگئی۔ اور اپنے آپ کو اس طوفان کا سامنا نے کے لیے تیار کرنے لگی۔ اُس کا خیال تھا وہ ڈاکٹر حسنین کے طرزِ تخاطب پر خفا ہوگا یا پھر اچانک روز احمد کے آجانے پر اور زیادہ سے زیادہ ان دونوں حضرات کو گالیوں سے نوازے گا لیکن وہ تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔ ایسی باتیں جو اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ گھر اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ پھر اسے دھکا دے کر بیڈ پر گراتا ہوا کہنے لگا۔

"تم آوارہ اور بدچلن ہو۔ میرے گھر میں رہ کر شہروز احمد کے ساتھ عشق و محبت کا کھیل، کھیل رہی ہو۔ اس کھیل میں تمہاری وہ لنگڑی بہن بھی شریک ہے۔"

"نہیں۔" وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ تو نفی میں سر ہلاتی ہوئی اُس کے سامنے جوڑ گئی۔

"یہ الزام مت لگاؤ مجھ پر اور میری بہن پر۔"

"یہ الزام نہیں، حقیقت ہے۔" وہ اُس کے بندھے ہاتھوں پر پیر سے ٹھوکر مارتا ہوا کہنے لگا۔ "مجھے پر شبہ تو اُسی روز ہوگیا تھا جس روز فون پر تم نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تمہارے کی بیزاری اور اُکتاہٹ میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔ پھر اپنی بہن کو محض اس لیے تم نے گھر میں بیاہا تاکہ آئندہ بھی وہاں سے تعلق رکھ سکو۔ اور تم اس میں کامیاب ہوئیں۔"

"نہیں ثاقب حسن۔ نہیں۔" اُس کے آنسو روانی سے بہہ نکلے تھے۔

"بیماری کا ڈھونگ رچا کر شہروز احمد سے ملنے گئی تھیں۔ اگر میں وقت سے پہلے نہ آجاتا تو تم اپنی کے ساتھ آزادی سے طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے اُس عاشق سے مل آتیں۔"

"خدا کے لیے ثاقب حسن۔ چاہو تو مجھے جان سے مار دو لیکن ایسے گھٹیا الزام مت لگاؤ کہ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگے۔"

"گھن تو تمہیں اُس وقت آئے گی، جب میں تمہیں بے نقاب کروں گا اور سارا زمانہ تم پر تھوکے گا۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ شہروز احمد پر بھی جو بڑا عزت دار بنا پھرتا ہے۔"

اُس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تو اُس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اُونچا کرتا ہوا کہنے لگا۔

"تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں دوبارہ شہروز احمد تک جانے کے لیے آزاد کر دوں گا۔ تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ گو کہ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا، اس کے باوجود تمہیں یہیں رہنا ہے، اسی گھر میں اور اگر کبھی گھر سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ سمجھیں تم۔" اُس کے بالوں کو زور سے جھٹکا دے کر چھوڑا تو تکلیف کی شدت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

"چلاؤ مت۔" وہ دھاڑا۔ "اپنی آواز کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر دفن کر دو۔ اور اب میں ذرا تمہارے عاشقِ نامدار سے دو دو ہاتھ کر آؤں۔"

وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

یہ صحیح ہے کہ وہ شہروز احمد سے ناتا توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن جب ناتا ٹوٹ گیا تو اُس نے نہ صرف ہر تعلق ختم کر لیا تھا بلکہ اپنی سوچوں پر بھی پہرے بٹھا لیے تھے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ثاقب حسن سے بہت پہلے متنفر ہو گئی تھی اور نہیں چاہتی تھی۔ کہ وہ دوبارہ اُس کی زندگی میں آئے لیکن جب ہر بات ہی اُس کی خواہش کے برعکس ہوئی، تب اُس نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گو کہ وہ اپنے دل میں ثاقب حسن کے لیے محبت نہیں پیدا کر سکی تھی۔ لیکن اُسے مجازی خدا سمجھتے ہوئے وہ اس سے ہٹ کر سوچتی بھی نہیں تھی۔ اور وہ تھا کہ ابھی اس پر اتنا بڑا الزام رکھ گیا تھا۔ آوارہ اور بدچلن کہہ کر اُس کی رُوح تک میں شگاف ڈال گیا تھا۔

وہ سسک سسک کر روتی رہی۔ اس سارے واقعے کو سوچتی تو کہیں بھی حالات اُس کے حق میں نہیں تھے۔ گو کہ سب کچھ محض اتفاق تھا۔ چھوٹی آپا کا آنا۔ ڈاکٹر حسنین کی لاعلمی۔ پھر شہروز احمد کی آمد۔ لیکن ثاقب حسن نے اپنی سوچ کے مطابق کڑی سے کڑی ملا کر اسے ان سب کی پلاننگ قرار دے دیا تھا اور وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی گئی۔

ایک تو پہلے ہی طبیعت خراب تھی۔ رونے سے بخار اور تیز ہو گیا۔ سر بھی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی کچھ کھانے کو تو دل نہیں چاہا لیکن چائے کی شدید خواہش تھی۔ کوئی ایک کپ چائے ہی پلا دے اور کون تھا، کوئی بھی نہیں۔ ساس نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی طبیعت خراب ہے، کمرے میں جھانکا تک نہیں تھا۔ اور خود سے اُٹھنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر تک خود ہی اپنا سر اور پیشانی دباتی رہی۔ پھر دوپٹے سے اپنا سر باندھ رہی تھی کہ پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر اُس کے سسر اندر جھانک کر شاید ثاقب کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے لیکن اس کے سر پر دوپٹہ بندھے دیکھا تو اندر آتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی۔"

وہ اسی قدر کہہ سکی اور وہ قریب آئے تو اُس کی سُرخ آنکھیں اور بھیگا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"تم رو رہی ہو؟" اُس نے نفی میں سر ہلایا لیکن زبان پھسل گئی۔

"جی۔"

"ثاقب نے کچھ کہا ہے یا اُس کی ماں نے؟"

"جی۔ کسی نے نہیں۔"

"اچھا۔" وہ اطمینان سے اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور بغور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "اچھی بات ہے کہ تم کسی کی شکایت نہیں کرتیں۔ لیکن بیٹا اس طرح اکیلے رونے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا نا۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ابا۔ بس سر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔"

"نہیں ابا۔" وہ نادم ہوئی اور جلدی سے سر پر بندھا دوپٹہ کھولنے لگی۔ "میں اسپرین لے لیتی ہوں۔"

"اسپرین ہے؟"

"میں دیکھتی ہوں۔"

"رہنے دو۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کر چلے گئے تو اُس نے پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے فوری طور ہر خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ کیونکہ ذرا سی سوچ درد کی ٹیسوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ البتہ آنکھیں بند کرتے ہی سارے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔ کافی دیر بعد جب ابا آئے، وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ اُنہوں نے پکارا، تب سر اُونچا کیا۔ اور اُن کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھ کر حیران ہوئی اور اپنے آپ میں بے حد شرمندگی محسوس کرتی ہوئی اُٹھنے لگی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بے بسی سے سر تھام کر رہ گئی۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی ابا؟"

"کوئی تکلیف نہیں کی۔ لو یہ بسکٹ کھاؤ۔" ابا نے پلیٹ اُس کے آگے رکھی۔ پھر ایک بسکٹ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھایا۔

"میرا کچھ کھانے کو دِل نہیں چاہ رہا۔ بس چائے پیوں گی۔"

"تمہیں اسپرین بھی لینی ہے اور خالی پیٹ اسپرین نقصان دہ ہوتی ہے۔ چلو پہلے بسکٹ کھاؤ۔" ابا نے پیار بھرا رعب جمایا تو اُس نے بسکٹ لے لیا۔

"یہ صحیح ہے کہ میں الگ تھلگ ایک کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔" ابا چائے کا کپ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں گھر کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اس گھر میں کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا اور اس سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ حیرت اپنے بیٹے ثاقب پر ہے کہ وہ تو تمہیں ہماری مخالفتیں اور ناراضگی مول لے کر بیاہ کر لایا تھا۔"

اُس نے یوں دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو 'آپ بھی' ۔ اور وہ اُس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر کہنے لگے۔

"ہاں، میں بھی۔" وہ پوری ایمانداری سے اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں خود اس شادی کا مخالف تھا۔ اور میری مخالفت کی وجہ خاص طور پر تمہاری ذات نہیں تھی، تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تب بھی میں ایسا ہی کرتا کیونکہ میں ثاقب حسن کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح اُس کی والدہ اپنی بھانجی کو اس گھر میں لانے کی خواہشمند تھیں۔ بہرحال میری مخالفت اور ناراضگی اُسی روز ختم ہو گئی جس روز تم بیاہ کر اس گھر میں آئیں لیکن شاید تمہاری ساس ابھی تک دل میں بُغض رکھے ہوئے ہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"میرا خیال تھا جس چاہ سے ثاقب حسن تمہیں بیاہ کر لایا ہے، اس سے بہت جلد وہ تمہیں اس گھر میں تمہارا صحیح مقام دلا دے گا لیکن وہ تو انتہائی نامعقول نکلا۔ اُس کی مثال اس بچے کی سی ہے جو کسی کھلونے کے لیے مچل مچل کر روتا اور ضد کرتا ہے۔ اُس کے حصول کے لیے ہر جائز اور ناجائز

حربہ استعمال کرنے کو حق سمجھتا ہے اور جب حاصل کر لیتا ہے تو بڑی بے دلی سے ایک کونے پر ڈال کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی اُس نے یہی کچھ کیا۔ اس میں تھوڑا قصور تمہارا بھی ہے تمہاری بے زبانی کا۔ اور صاف گوئی کے لیے معاف کرنا بیٹی کہ تمہارا پہلے سے ثاقب سے کوئی ربط ہو گا جبھی تو اُس نے تم سے شادی پہ اتنا اصرار کیا۔ اور ایسی صورت میں تو لڑکیاں بڑے دھڑلے سے نہ صرف شوہر بلکہ اُس کے پورے گھر پر حکمرانی کرتی ہیں کیونکہ انہیں یہ مان حاصل ہوتا ہے کہ جو شخص سب کی ناراضگی مول لے کر اُسے بیاہ لایا ہے، وہ ہر قدم پہ اُس کا ساتھ دے گا۔“

وہی باتیں جو چھوٹی آپا نے اُسے سمجھائی تھیں اور جن پر عمل کر کے اُس نے یہ مان حاصل کرنا چاہا تھا لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ وہ جب اُسے اپنا احساس دلانے میں کامیاب ہونے لگتی، کوئی ایسی بات ہو جاتی، جس سے وہ اور زیادہ متنفر ہو جاتا۔ شام میں بھی تو وہ اپنی غلطی کا احساس کر کے لوٹا تھا اور اس سے اعتراف بھی کر رہا تھا کہ چھوٹی آپا آ گئیں۔ گو کہ اُن کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا ہو گی اور بے چاری محبت یا ہمدردی میں اُس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھی چل پڑیں۔ کیا خبر تھی کہ ہر قدم پہ بدنصیبی جال پھیلائے کھڑی ہے۔

”آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“ ابا پوچھ رہے تھے اور وہ تو خود نہیں جانتی تھی، انہیں کیا بتاتی، بہت آزردہ سی ہو کر ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی۔

”ابھی کس بات پہ اِتنے غصے سے دندناتا ہوا باہر گیا ہے؟“ ابا نے پوچھا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ آنکھیں الگ جل تھل ہو گئیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلتی ہوئی پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

”مجھے بتاؤ بیٹا، کیا بات ہے؟ شاید میں اسے سمجھا سکوں۔“ اس تمام عرصے میں پہلی بار کوئی اُس کا دُکھ محسوس کر کے نرمی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ساری کوششیں ترک کر کے رو پڑی تو ابا اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ محبت سے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

”رؤو مت بچی۔ مجھے بتاؤ۔“

”وہ شاید میری گذشتہ زندگی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہا۔“ وہ بمشکل تمام اسی قدر کہہ سکی تھی کہ ابا فوراً بول پڑے۔

”کیوں؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ جب اُسے معلوم تھا سب کچھ جانتے بوجھتے اُس نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے پھر اب ان باتوں کو دُہرانے اور تمہیں طعنہ دینے کا کیا مقصد ہے؟ یہ ساری باتیں تو اسے پہلے سوچنی چاہیے تھیں۔ بہر حال تم فکر نہ کرو، میں اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ اتنی کم ظرفی کا مظاہرہ نہ کرے۔“ پھر اُس کا سر تھپکتے ہوئے لگے۔

”چلو، ابھی تم نے اسپرین کھائی ہے، اب آرام کرو۔ رؤو مت اور ذہن پر بوجھ ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ پھر خود ہی اُس کے لیے تکیہ سیدھا کر کے اُسے لٹایا اور سونے کی تاکید کرتے ہوئے ٹرے اُٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

اُس نے بہت خاموشی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھا، پھر آنکھوں پہ بازو رکھ لیا۔ نیند تو نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی ثاقب حسن کی واپسی تک سونا چاہتی تھی۔

اس وقت سے تو وہ ہر سوچ کو پرے دھکیلتی رہی تھی اور اب پیٹ میں تھوڑی غذا جانے اور چائے پینے سے اعصاب قدرے پُرسکون ہوئے تو وہ ازخود نئے سرے سے سارا واقعہ سوچنے لگی۔ وہ قصوروار نہیں تھی اور ہو سکتا ہے ثاقب حسن کو بھی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن اِس وقت جس بات نے اُسے پریشان کیا، وہ ثاقب حسن کا غصے میں جانا تھا اور

بھی کہہ گیا تھا کہ وہ شہروزا احمد کے پاس جا رہا ہے، وہ تصور کرنے لگی ثاقب حسن، شہروزا احمد کا ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہونا اور اس کے بعد بہت ساری باتیں جو اُس کی زندگی پر تو اثر انداز ہوتیں ہی، چھوٹی آپا کی پُرسکون زندگی میں بھی زہر گھول سکتی تھیں۔ اور یہ ساری باتیں سوچ کر وہ اندر ہی اندر ہولنے لگی۔ ساتھ ہی دُعا بھی کر رہی تھی کہ ثاقب حسن اور شہروزا احمد کا سامنا نہ ہو۔

کتنا وقت گزر گیا۔ پریشان سوچوں میں گھرے، گھڑی نے ایک کا گھنٹہ بجایا تھا، جب ثاقب حسن آیا تھا۔ گو کہ وہ فوراً جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے اور کیا کر کے آ رہا ہے؟ لیکن وہ اُس کی طرف دیکھنے کی ہمت تک نہ کر سکی۔ بازو کی آڑ سے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا اور اُس کا سُرخ چہرہ دیکھ کر آنکھ بند کر لی۔

”میرے خدا۔“ دل دھڑک دھڑک کر کسی خطرے کی آگاہی دینے لگا اور کسی خوفناک واقعے کو سوچ کر اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔

اور وہ جو اُسے سوتا سمجھ رہا تھا، اُس کے کندھوں میں حرکت دیکھ کر فوراً آگے بڑھ آیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے بازو ہٹاتا ہوا پوچھنے لگا۔

”کون آیا تھا یہاں؟“

”آیا۔“ اُس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔ تمہارے گھر سے کون آیا تھا؟“ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جیسے ابھی اُسے جلا کر راکھ کر دے گا۔

”کک۔ کوئی نہیں۔“

”پھر تمہاری بہن کی گاڑی کون لے گیا ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”گاڑی کیا خود چل کر گئی ہے۔ کوئی تو آیا ہو گا۔“

”میں نہیں جانتی۔ تم اماں یا ابا سے پوچھ لو، انہیں معلوم ہو گا۔“

”پوچھ لوں گا اُن سے۔ اور اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ گاڑی کے بہانے کوئی تمہارے پاس بھی آیا تھا، تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”کون آئے گا میرے پاس، کیا میرے گھر والے؟“

”ہاں میں تمہارے گھر والوں کا یہاں آنا بھی پسند نہیں کرتا۔“ وہ اُس کی بات کاٹ کر دبی دبی آواز میں چیخا۔ ”اگر کوئی آیا تو میں دھکے دے کر نکال دوں گا۔ اور آج تو وہ تمہارا عاشق نامدار بچ گیا، لیکن آخر کب تک؟“

اس کے ساتھ ہی وہ پیر پٹختا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ ڈریس چینج کر کے نکلا تو قہر آلود نظر اُس پہ ڈال کر اپنی جگہ پہ جا لیٹا۔ وہ کچھ دیر تک سانس روکے اُس کی طرف سے مزید کسی بات کی منتظر رہی لیکن جب وہ کچھ کہے بغیر دوسری طرف کروٹ بدل گیا، تب اُس نے بہت آہستگی سے سینے میں رُکی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی اور دوبارہ بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اُسے یہ سوچ کر ہی خوف آنے لگا تھا کہ ثاقب حسن اُس کے گھر سے آئے کسی فرد کو دھکے دے کر نکال دے اور اُس سے کوئی بعید بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر گزرتا۔ ویسے تو اُس کے گھر سے کوئی آتا بھی نہیں تھا۔ جب سے اُس کی شادی ہوئی تھی، بس اماں ایک بار آئی تھیں یا آج شام چھوٹی آپا، اور ظاہر ہے، جب وہ نہیں جائے گی تو کوئی نہ کوئی تو اُس کی خیر خبر لینے ضرور آئے گا۔ چھوٹی آپا بھی تو اسی لیے آئی تھیں۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ آخری بار اماں کے گھر کب گئی تھی۔ تب اسے یاد آیا کہ انیلا کی شادی سے

پہلے شام کے وقت ذرا دیر کو گئی تھی اور اُس روز بھی اچانک مہروز سے سامنا ہونے پر ثاقب حسن کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسی خوف سے نہیں گئی تھی۔ اور اس بات کو تقریباً ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا، پھر آگے کا بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ثاقب حسن کب تک اسے جانے دے۔ اور اس دوران امّاں اس سے بالکل تو غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ کسی دن اِدھر آ سکتی تھیں اور اُن کی آمد پر ثاقب حسن کا ردِعمل سوچ کر اُسے جھرجھری آ گئی۔ پھر اُس نے سوچا، وہ کسی طرح امّاں کو منع کروا بھیجے گی کہ فی الحال اُس کے گھر کوئی نہ آئے۔ لیکن اس طرح تو امّاں پریشان ہو جائیں گی اور وہ اپنی طرف سے کسی کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔

صوفیہ سے تو اُنہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ۔ آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ثاقب حسن اُس کا شوہر ہے۔ اگر زیادتی کرے گا تو تلافی بھی ضرور کرے گا۔

لیکن وہ اپنے آپ کو یہ بات نہیں سمجھا سکے تھے۔ صوفیہ کو گھر پر اُتار کر پھر وہ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے رہے۔ مسلسل اُسی کا خیال پریشان کر رہا تھا اور اُنہیں لگتا جیسے اس سارے واقع کے وہی ذمّہ دار ہوں۔ رہ رہ کر اس کا بیمار اور افسردہ چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور پھر ثاقب حسن کا اُسے گھسیٹتے ہوئے لے جانا۔ اُنہوں نے سوچا، جب وہ سرِعام اُس کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے تو گھر جا کر تو پتا نہیں کیا کچھ نہ کہا ہو گا۔ اور پتا نہیں کوئی اسے روکنے والا بھی ہو گا کہ نہیں۔

"وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی۔ جس کا خیال ہی زندہ رہنے پر اُکساتا ہے۔ وہ اس سلوک کی مستحق تو ہرگز نہیں تھی۔" اُنہوں نے سوچا اور اُس کے بہت سارے روپ ایک ساتھ نگاہوں میں آسمائے۔

وہ اُس کا دھیرے دھیرے چلنا اور دھیمے دھیمے مُسکانا۔

ذرا سے سخت لہجے پر اُس کا سہم جانا۔

کبھی ایک دم اپنی اپنی سی اور کبھی ایک دم پرائی۔

"یقیناً تمہیں سوچنا مجھے زیب نہیں دیتا۔" وہ تصوّر میں اُسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔ "لیکن میرا خود اپنے آپ پر اختیار ہو تب ناں، میں اپنے آپ کو باز بھی رکھوں۔ تم نے تو کوئی لمحہ میرے لیے چھوڑا ہی نہیں۔ اسی لیے ربیعہ اکرام علی، میں تمہیں سوچتے ہوئے اپنے آپ کو سرزنش یا ملامت نہیں کروں گا۔"

اُنہوں نے کلب کے سامنے گاڑی روکی تو آس پاس اُس کی آواز کی بازگشت سُنائی دینے لگی۔

"میں آئندہ آپ کا کلب جانا پسند نہیں کروں گی۔"

"آپ۔" اُنہیں یاد نہیں آیا اُنہوں نے کیا کہا تھا لیکن اُس کی بات اچھی طرح یاد تھی۔

"جی۔ جب تک کچھ حق رکھتی ہوں، اُسے استعمال بھی کروں گی۔"

وہ راہِ فرار ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آئے تھے لیکن پہلے ہی مرحلے پہ وہ جیسے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ گاڑی موڑنا چاہتے تھے کہ قریب ہی سونیا کی گاڑی آن رُکی۔ اُنہیں دیکھتے ہی وہ شیشے سے سر نکال کر کہنے لگی۔

"ارے شہروز احمد۔ کہاں غائب ہیں آپ؟"

"غائب کہاں، تمہارے سامنے تو ہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"کیا واپس جا رہے ہو؟" وہ اُنہیں گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"نہیں۔" اتنے عرصے بعد ایک اچھی دوست ملی تھی۔ اُنہوں نے واپسی کا ارادہ ترک کیا اور گاڑی سے اُتر آئے۔ پھر اُس کے ساتھ اندر آئے تو وہ پوچھنے لگی۔

"آج اپنی مسز کو نہیں لائے؟ کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔ ربیعہ۔"

اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک طرح سے یوں ظاہر کیا جیسے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

لان میں آ گئے۔ اور وہ بھی عجیب لڑکی تھی۔ لان چیئر پر اُن کے سامنے بیٹھی تو کہنے لگی۔

کیا حال ہے ربیعہ کا؟ یقیناً بچے میں مصروف ہو گئی ہو گی۔ جبھی تم یہاں نظر آ رہے ہو۔"

تم اپنی سناؤ اس تمام عرصے میں کیا کرتی رہی ہو؟" وہ بات کا رُخ اُس کی طرف موڑ گئے۔

کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "وہی پُرانی روٹین چل رہی ہے۔ ڈیڈی ساتھ اُن کے آفس میں بیٹھنا، سہ پہر میں گھر اور اس وقت یہاں۔"

شادی کا نہیں سوچا؟" وہ یونہی بات بڑھانے کی غرض سے بولے۔

سوچا۔ لیکن عمل نہیں کیا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

کیوں؟"

اس لیے کہ مجھے کوئی پسند نہیں آیا۔ اور کسی کو میں پسند نہیں آئی۔"

ارے۔" وہ اب پوری طرح اُس کی طرف متوجّہ ہوئے۔ "کیا کوئی تمہیں بھی ریجیکٹ کر سکتا ہے؟"

کیوں؟ مجھ میں کیا سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں؟"

یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، ہر لحاظ سے۔"

اچھا۔" وہ ہلکے سے ہنسی۔ پھر کچھ دیر تک براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد کہنے اگر تمہیں میرے ہر لحاظ سے اچھا ہونے کا یقین تھا تو پھر تم نے مجھے پروپوز کیوں نہیں کیا؟"

تم جانتی ہو، میں شادی شدہ آدمی ہوں۔" وہ اپنا دفاع کرنے کی غرض سے بولے۔

میں اس سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔"

اس سے پہلے۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "پہلے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور جب خیال آیا تو لڑکی زندگی میں آ چکی تھی۔"

ربیعہ کی بات کر رہے ہو؟" وہ فوراً پوچھنے لگی۔

ہاں۔" وہ مزید اس کے ذکر سے بچنے کی خاطر سگریٹ سُلگانے لگے، پھر طویل کش لے کر بولے۔ سنو۔ یہ ریجیکٹ کرنے اور ریجیکٹ ہونے کا سلسلہ چھوڑو، آرام سے گھر بساؤ۔ لڑکیاں اپنے ں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔"

اچھا۔" وہ زور سے ہنسی۔ "گویا اب تم نصیحت کرنے والے بن گئے ہو۔"

نصیحت سمجھو یا ایک دوست کا مخلصانہ مشورہ۔"

سوچوں گی۔" وہ کندھے اُچکا کر لاپرواہی سے بولی۔

اب سوچنے کا نہیں، عمل کرنے کا وقت ہے ورنہ عمر گزر گئی تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

سنو، کہیں تم بیٹی کے باپ تو نہیں بن گئے؟" وہ میز پر قدرے آگے جُھک کر شرارت سے

بیٹی، نہ بیٹا۔ میں تمہیں گزرتے وقت کا احساس دِلا رہا ہوں۔"

س کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑے ہو گئے۔

کہاں جا رہے ہو؟"

اندر۔ اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔ باقی لوگوں سے مل لوں۔"

ہاں سب لوگ تمہیں بہت مِس کرتے ہیں۔"

اوکے۔ سی یو۔"

وہ اُسے وہیں چھوڑ کر اندر چلے آئے۔ کچھ نئے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب وہی تھے۔ جن کے ساتھ اچھی خاصی دوستی تھی۔ سب کے ساتھ 'ہیلو، ہائے' کرتے ہوئے آخر میں وہ سلمان کی ٹیبل اور پھر اُن کے ساتھ کارڈز کھیلتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

آہستہ آہستہ سب لوگ رُخصت ہو گئے۔ آخر میں وہی چاروں رہ گئے تھے اور جب سلما
نے بھی پتے پھینک کر گھر جانے کا اعلان کیا، تب باقیوں کو بھی اُٹھنا پڑا۔
وہ جب گھر میں داخل ہوئے، رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ٹی وی لاؤنج کا بلب غا
اُن کے انتظار میں جل رہا تھا۔ وہ اسے آف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
دیر سے سونے کی وجہ سے صبح بہت دیر سے اُن کی آنکھ کھلی۔ سائیڈ ٹیبل سے گھڑی اُٹھا کر
دیکھی، نو بج رہے تھے۔ اپنے آپ میں خاصی شرمندگی ہوئی۔ اس طرح اُن کے معمولات تو کبھی نہ
بگڑے تھے۔ انہیں امی کا خیال آیا۔ پتا نہیں، وہ کیا سوچیں گی اور پھر صوفیہ۔ وہ یقیناً باز پرس کرے
وہ اس وقت صوفیہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے کمرے سے نکلے تو سیدھے امی کے پاس
چلے گئے۔ اور امی کی زبانی انہیں معلوم ہوا کہ صوفیہ کچھ دِنوں کے لیے اپنی امی کے گھر گئی ہے۔ گو کہ یہ عام
بات تھی لیکن وہ پتا نہیں کیوں اُلجھنے لگے تھے۔

وہ ٹیبل پر ناشتا لگا رہی تھی جب اچانک برآمدے سے شور کی آواز آنے لگی۔ وہ بہت آہستگی سے
میں پکڑی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر سننے کی کوشش کرنے لگی۔ ابا پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے، جواب میں اماں کی ہا
ہائے، گونجنے لگی۔
"الٰہی خیر۔" اُس نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ اماں جلدی جلدی کا شور
رہی تھیں۔
"ثاقب کہاں ہے؟۔ عاقب کو بلاؤ، جلدی کرو۔"
"حوصلے سے کام لو۔ اس طرح پریشان ہوگی تو بہن کو کیا سہارا دو گی؟" ابا نے کہا اور ثاقب کے سا
عاقب کو بھی پکارنے لگے۔
"کیا ہوا ابا؟" وہ آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔
"بیٹا۔ وہ شبانہ کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"
اِتنا ہی کہا تھا کہ اماں چیخ کر بولیں۔
"اِس منحوس کو تو پرے کرو۔ میں اس کی شکل دیکھ کر نہیں جاؤں گی۔"
وہ ابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔ ثاقب حسن شوز پہننے میں مصروف تھا۔ پھر
ہوا تو اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔
"ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ تم فون کر کے انیلا کو اپنے پاس بُلا لینا۔"
"میں بھی چلوں؟" وہ بڑی آس سے بولی۔
"کہاں؟"
"تم سب کے ساتھ۔"
"کوئی ضرورت نہیں ہے اور سنو دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔" وہ پتا نہیں کیا جتا کر کمرے سے نکا
وہ فوراً اس کے پیچھے نہیں گئی۔ جب گاڑی جانے کی آواز سنی اور اس کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی
کمرے سے نکلی۔ پہلے جا کر گیٹ اچھی طرح بند کیا۔ پھر ڈائننگ روم میں آ کر ناشتے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔
لوگ اسی طرح چلے گئے تھے، بغیر ناشتا کیے۔
ماس نے سب کچھ دوبارہ لے جا کر کچن میں رکھا، پھر اپنے لیے چائے بنا کر برآمدے میں چلی آ
پیتے ہوئے وہ سب کے رویے پر غور کرنے لگی۔ خاص طور پر ثاقب حسن جو اس روز کے واقعے
بالکل ہی بدل گیا تھا۔
لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی ثاقب حسن ہے جو کبھی اُس کے بغیر زندگی کو اُدھورا خیال کرتا تھا۔ ہر

ں طنز، طعنے اور آج کل تو اُس کے پاس ایک ہی موضوع تھا 'تمہاری اماں'۔ اور پھر اماں کو لالچی عورت
تے ہوئے ایسی ایسی باتیں کرتا کہ وہ اندر ہی اندر کٹ کر رہ جاتی۔
'لالچی عورت بیٹیوں کے لیے محلوں کے خواب دیکھتی ہے۔ ارے اس سے کہو پہلے اپنی حیثیت تو
یکھے۔' رات بھی وہ اس قسم کی باتیں کرتا رہا تھا۔
'اب کبھی آئے گی تو میں خود اس پر اس کی حیثیت اچھی طرح واضح کر دوں گا۔ جس طرح اُس نے پہلی
میری ماں کو مایوس لوٹایا تھا۔ میں اس سے زیادہ اسے ذلیل کر کے یہاں سے نکالوں گا۔'
"اماں یہاں نہیں آئیں گی۔ انہیں کبھی یہاں نہیں آنا چاہیے۔" اُس نے سوچا اور چائے کا آخری گھونٹ
ے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی وہ کئی روز سے سوچ رہی تھی، کسی طرح اماں کو منع کروا بھیجے کہ فی الحال
ں کے گھر کوئی نہ آئے۔ اور یہ اچھا موقع تھا کہ وہ بڑی آپا یا چھوٹی آپا کو فون کر سکتی تھی۔ ورنہ تو اسے فون
رنے اور فون سننے کی اجازت بھی نہیں تھی۔
پہلے اُس نے سوچا کہ وہ بڑی آپا کو فون کرے لیکن بڑی آپا اُس کے حالات نہیں جانتی تھیں اور پھر جس
رح وہ بڑی تھیں، اسی طرح اپنی بڑائی جتا کر چھوٹوں کو سمجھانا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اُن کی طرف سے یہی
دشہ تھا کہ وہ اس کی بات تو سن لیتیں لیکن شام میں کسی بہانے آ کر اُس کے ساتھ ساتھ ثاقب حسن کو بھی
مجھانے بیٹھ جاتیں اور ثاقب حسن فوراً جان جاتا کہ اُسی نے انہیں بُلایا ہے اور اُس کے بعد ہو سکتا ہے
بڑی آپا کا لحاظ بھی نہ کرتا۔
یہی سب سوچ کر اُس نے چھوٹی آپا کے نمبر ڈائل کیے۔ دُوسری طرف بیل جا رہی تھی اور گو کہ وہ اُس
ت بالکل اکیلی تھی۔ پھر بھی اچانک کسی کے آ جانے کا خوف اتنا حاوی تھا کہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو
ئے۔ پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ اور دل کا عالم یہ تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ گرے گا۔
"ہیلو، شہروز احمد اسپیکنگ۔" ریسیور اُٹھتے ہی مانوس آواز اُبھری اور اُس کا رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹ
یا۔ فوراً کریڈل پہ ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ یہ تو
ال ہی نہیں رہا تھا کہ چھوٹی آپا کے علاوہ کوئی اور بھی فون اُٹھا سکتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دوبارہ اور پھر
ہبارہ کوشش کی۔ اور ہر بار وہی آواز سنائی دی تو مایوس ہو کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر دل نے سمجھایا کہ یہ موقع
رنہیں ملے گا۔
'ہاں ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔' اُس نے سوچا اور اپنے آپ پر قابو پا کر پھر نمبر ڈائل کرنے لگی۔
"شہروز احمد۔" اب کہ صرف اتنا کہا گیا اور وہ لہجے کو پُر اعتماد بناتی ہوئی بولی۔
"صوفیہ ہیں؟"
"کون؟۔ ربیعہ؟" کوئی ناتا، کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی بے اختیار یوں پوچھ گئے جیسے سارے تعلق اُسی
ہوں اور اُن کے لہجے کی بے اختیاری محسوس کر کے وہ ڈوبنے لگی۔ کیا کوئی اب بھی اسے اِتنی چاہ سے
رسکتا ہے؟۔
"ربیعہ۔ آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟" وہ پوچھ رہے تھے۔
"پلیز صوفیہ کو بُلا دیں۔" وہ اپنی آواز کی لرزش پر کسی طرح قابو نہ پا سکی۔
"صوفیہ تو غالباً ہاسپٹل گئی ہیں۔"
"خیریت؟"
"ہاں کافی دِنوں سے کچھ سُست سی تھیں۔ چیک اَپ کے لیے گئی ہیں۔"
"کیا ہوا ہے اُنہیں؟" وہ اپنی بات بھول گئی۔
"صوفیہ کے لیے کوئی میسج دینا چاہیں تو۔؟"
"نہیں، البتہ آپ سن لیں کہ جن دشواریوں کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ پھر کبھی وقت آنے پر اُن

کے بارے میں بتائیں گے، تو وہ میں جان چکی ہوں۔" وہ پتا نہیں کیسے یہ بات کہہ گئی اور اُن کے پکارنے کے باوجود سلسلہ منقطع کر دیا۔

اپنے کمرے تک آتے آتے لگا جیسے میلوں کی مسافتیں طے کر آئی ہو۔ سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب — اور ٹانگوں میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی، وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر گری اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ دیواروں کے کان تو سنا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا جیسے دیواروں پر بے شمار آنکھیں لگی ہوں۔ اور ابھی ثاقب حسن کے آنے پر سب گواہی دیں گی کہ ہم نے ربیعہ کو شہروز احمد سے بات کرتے نہ صرف سنا بلکہ دیکھا بھی ہے۔"

"میرے خدا —" وہ بے حد خوفزدہ ہو کر جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

"میں چھوٹی آپا سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دُوسری طرف شہروز احمد فون ریسیو کریں گے۔"

"تم سلسلہ منقطع کر دیتیں۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"میں نے ایسا ہی کیا تھا لیکن ہر بار ہی —" اسی طرح خود ہی سوال کرتی، خود ہی جواب دیتی وہ بُھول گئی کہ ثاقب حسن نے اسے انیلا کو بُلانے کے لیے کہا تھا۔

کتنی دیر گزر گئی۔ جب سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شور مچاتی دھڑکنیں معمول پر آ گئیں تب وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔ اور اب کام کرنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ فراغت بے چین کرنے لگی۔

"پتا نہیں، گھر والوں کی واپسی کب ہو؟" اُس نے سوچا اور بلا مقصد برآمدے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگی۔

ابھی دوسرا چکر ہی لگا رہی تھی کہ باہر گاڑی رُکنے کی آواز سن کر چونک گئی اور رُک کر انتظار کرنے لگی، پھر جیسے ہی بیل بجی، فوراً جا کر گیٹ کھولا۔ سامنے ثاقب حسن اکیلا کھڑا تھا۔ اسے تقریباً دھکیلتا ہوا اندر آیا اور متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا پوچھنے لگا۔

"انیلا نہیں آئی —؟" اُس کے پوچھتے ہی یاد آیا کہ وہ جاتے جاتے کیا کہہ گیا تھا، وہ اندر ہی اندر سہم گئی اور پھنسی پھنسی آواز حلق سے نکلی۔

"نہیں —"

"کیوں؟ کیا کہہ رہی تھی؟"

"اصل میں مجھے اُس کا نمبر نہیں ملا۔" اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"نمبر نہیں ملا — یا تم نے ملایا نہیں —؟" وہ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن اُس کا فون انگیج تھا۔" وہ اُس کی ٹٹولتی نظروں سے گھبرا کر دُوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اُس کا دھیان بٹانے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"خالو جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"خطرے سے باہر ہیں۔" وہ گرنے کے انداز میں ایزی چیئر پر بیٹھا تو کہنے لگا۔ "کچھ پکایا تو نہ ہو گا تم نے — چلو ایک کپ چائے ہی لے آؤ۔"

"ناشتا اسی طرح رکھا ہے، اگر کھانا چاہو تو —"

"نہیں بس چائے —" اُس نے کہا تو وہ کچن میں آ گئی

ابھی چولہے پر پانی رکھ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ ثاقب حسن وہیں موجود تھا۔ اِس لیے اُ کے جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔

پھر جب وہ چائے لے کر آئی تب [illegible] پھر بیل بج رہی تھی۔ اس نے دیکھا ثاقب حسن

ر کان سے لگا کر دو تین بار "ہیلو" کہا۔ اور پھر کچھ جھنجلا کر ریسیور پٹخ دیا۔

"پتا نہیں کون اُلّو کا پٹھا ہے جسے میری آواز سنتے ہی سانپ سونگھ جاتا ہے۔" وہ اُونچی آواز میں بڑبڑایا۔

اُس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پتا نہیں کیا خیال آیا کہ کہنے لگا۔

"نہیں بیٹھ جاؤ۔" وہ بیٹھ گئی تو کہنے لگا۔

"ہو سکتا ہے دُوسری طرف کوئی تمہاری آواز سننے کا متمنی ہو۔"

"کون ہو سکتا ہے؟" اُس نے سوچا اور ذہن اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ اور ابھی کسی خاص فرد تک رسائی ل نہیں کر سکا تھا کہ بیل دوبارہ بجنے لگی۔ وہ اتنی محو تھی کہ بیل کی آواز پر اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔

"ریسیور اُٹھاؤ۔" اُس کا لہجہ سفاک اور نظروں میں جانے کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ اور اُس کی بات پر عمل نہیں کر سکی۔

"اُٹھاؤ" اُس نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔

"اے کاش کوئی نہ ہو —" اُس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی اور ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن بولی نہیں۔

"اپنی آواز سناؤ اُسے —" وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا اور کیسے اتنے یقین سے کہہ رہا تھا، وہ اُس کا غلط ثابت کرنے کی خاطر آہستہ آواز میں بولی۔

"ہیلو —"

"تھینکس گاڈ! ربیعہ، تمہاری آواز تو سنائی دی۔" دُوسری طرف صوفیہ جس طرح اطمینان کا سانس لیتی بولی، اس سے وہ سمجھ گئی کہ کافی دیر سے وہی رِنگ کر رہی ہے۔

"کون ہے؟" ثاقب حسن نے اُس سے جھپٹ کر ریسیور اپنے کان سے لگایا تو صوفیہ کہہ رہی

"اصل میں جس وقت تمہارا فون آیا، میں ہاسپٹل گئی ہوئی تھی۔ شہروز بھائی بتا رہے تھے، تم کچھ پریشان رہی تھیں۔ سب خیریت تو ہے ناں؟"

"اب تک تو واقعی خیریت تھی صوفیہ بی بی لیکن اب شاید نہ رہے۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولا اور ریسیور پٹخ کر اس پر جما دیں۔ وہ نہیں جانتی تھی صوفیہ نے کیا کہا ہے البتہ ثاقب حسن کے خطرناک تیور اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

اسی پل اس کے اندر کوئی دھیرے دھیرے بولنے لگا۔

"اسی طرح ڈرتی رہیں تو حالات کا مقابلہ کیسے کریں گی؟"

"میں کیوں ڈر رہی ہوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟" وہ اپنا قصور کھوجنے لگی۔ "کہیں کوئی خطا نہیں کوئی ہیں، پھر یہ شخص ناکردہ جرم کی سزا دینے پر کیوں تُلا ہے؟"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ وہ پوری قوت سے چیخا۔

"ربیعہ —" وہ چند قدم چلنے کے بعد رُک گئی۔

"واپس آؤ —" وہ اسی طرح چیخ کر بولا۔

"آر یا پار — میں اب کسی ناکردہ گناہ کی سزا نہیں جھیلوں گی۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور ر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے شہروز احمد کو فون کیا تھا؟"

"نہیں — میں نے چھوٹی آپا کو فون کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ریسیو شہروز احمد نے کیا۔" اس کی وہی ھی کہ پیر کے نیچے دب کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے اور پھر جب آر یا پار سوچ ہی لیا تھا تو ڈرنے یا ، کا کیا سوال؟ جرم کر کھڑی رہی اور اعتماد سے جواب دیا تو وہ اور زیادہ طیش میں آ گیا۔

گویا تم اعتراف کر رہی ہو۔"

"ہاں جو حقیقت ہے میں اس کا اعتراف کر رہی ہوں۔"

"اگر اتنی دیدہ دلیر ہو گئی ہو تو جاؤ، اپنے اس نامراد عاشق سے مل آؤ جو یقیناً۔"

"ثاقب حسن۔" وہ بھی چیخ پڑی۔ "اپنی زبان کو لگام دو۔ مجھ پر کوئی الزام رکھنے سے پہلے خود ا گریبان میں جھانکو کہ تم خود کیا ہو؟"

"اپنے گریبان میں تو بعد میں دیکھوں گا ربیعہ بیگم پہلے اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال آؤں جو میر عزت سے کھیل رہا ہے۔ اتنی جرأت دے دی ہے اُس نے تمہیں کہ آج تم میرے مقابل کھڑی گئی ہو۔" اس کے ساتھ ہی وہ کرسی کو پیر کی زوردار ٹھوکر سے دُور گراتا ہوا انتہائی غصّے کے عالم میں باہر طرف چلا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنا نقصان نہ کر بیٹھے، اُس کے پیچھے لپکی۔

"ثاقب رُک جاؤ۔"

وہ اَن سُنی کرتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔ کِسے مدد کے لیے پکارے؟ اس وقت تو ویسے بھی کوئی نہ تھا۔ جب کہ چھٹی حس الارم بجانے لگی تھی۔

"الٰہی خیر کرنا۔" وہ بار بار دُعا مانگنے لگتی۔ ثاقب حسن جس طرح غصّے کے عالم میں گیا تھا اُس سے کچھ بھی کر سکتا تھا اور بہت ساری باتیں سوچ کر آخر میں وہ اپنے آپ سے اُلجھنے لگی۔

"کیا ضرورت تھی مجھے ثاقب حسن کے سامنے جم کر کھڑے ہونے کی۔ کیوں میں نے اُسے مز طیش دلایا۔ اگر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں ہمیشہ اس سے ڈر کر دب کر رہوں تو پہلے کی طرح اب بھی سر جھکا دینا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بک جُھک کر خاموش ہو جاتا۔ اب پتا نہیں کہاں گیا ہے؟"

وہ اسی طرح سوچتی ہوئی گیٹ تک آئی اور ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا، دُور دُور تک کوئی نظر نہیں تب بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے واپس آ رہی تھی کہ فون کی بیل سے اُس کے اعصاب تن گئے۔ کی پہلی سیڑھی پر قدم روک کر خوفزدہ نظروں سے فون کو گھورنے لگی۔ دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہیں دھڑکے گا۔

اُس نے سوچا، دُوسری طرف جو بھی ہو گا، خود ہی مایوس ہو کر فون بند کر دے گا۔ لیکن کوئی مستقل مز ہی تھا جو مسلسل گھنٹی بجتی رہی، جب تک کہ اُس نے ریسیور نہ اُٹھا لیا۔

"کون ربیعہ؟۔ کہاں ہو بھئی؟۔" دُوسری طرف انیلا تھی۔ اُس کی آواز سُنتے ہی کہنے لگی۔

"میں باتھ روم میں تھی۔" اُس نے جھوٹ بولا۔

"اور کوئی نہیں ہے کیا؟" انیلا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟۔" اُس کا پوچھنا تھا کہ وہ رو پڑی۔

"انیلا۔ تم آ جاؤ پلیز، اسی وقت۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے ڈرنے کی کیا بات ہے؟۔ اور یہ امّاں اور ابا کہاں ہیں؟۔"

"بس یہیں آ جاؤ۔ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"اچھا، تم رونا بند کرو۔ میں آ رہی ہوں۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا اور وہیں بیٹھ کر باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ پتا نہیں کیوں اندر ہی اند بیٹھا جا رہا تھا۔ اب تک کی زندگی میں اُسے مختلف حالات کا سامنا رہا تھا۔ لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی تو آنسو پھر بہہ نکلتے۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہچکیوں کو روکا۔ تب بھی سُنائی دیتی رہیں۔ یہ اُس کے ساتھ اور کون رو رہا تھا؟

وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی نہیں تھا، پھر یہ آوازیں۔ جیسے کوئی بین کر رہا ہو۔ اُس نے ھبرا کر کان اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ انیلا کے آنے کا پتا بھی ہیں چلا۔ نہ اُس کی پکار سُنائی دی۔

"کیا ہوا ربیعہ؟۔" انیلا نے اُس کا کندھا ہلایا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا ہے؟۔" انیلا سچ مچ پریشان ہو گئی۔ قریب بیٹھ کر اُس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنایا، اس کا وجود لے ہولے لرز رہا تھا۔ اُس کے بازوؤں کے حلقے میں قدرے پُرسکون ہوا۔ تب آنکھیں کھولیں، انیلا دیکھا تو بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

"سب خیریت تو ہے ناں؟۔" انیلا اُس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی نرمی سے پُوچھنے لگی۔

"اب تک تو سب خیریت تھی صوفیہ بی بی۔ لیکن اب شاید نہ رہے۔" انیلا کے پوچھنے پر ثاقب حسن بات یاد آئی تو آنسو پھر بہہ نکلے۔

"ربیعہ۔ اِسی طرح روتی رہو گی تو میں کیا سمجھوں گی؟۔ آخر کچھ تو بتاؤ۔" انیلا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ے کیسے چُپ کروائے۔ پہلے رومال سے اُس کی آنکھیں صاف کیں، پھر اُٹھ کر پانی لے آئی۔ اور گلاس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ جانے کب سے پیاسی تھی۔ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی۔ ہچکولے تا دل قدرے ٹھہر سا گیا۔ تب اُس نے دیکھا، انیلا مجسّم سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

"تمہارے خالو جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" اُس نے اِتنا ہی کہا تھا کہ انیلا بول پڑی۔

"کب؟۔"

"غالباً رات کے آخری پہر۔ اور امّاں ابا صبح وہیں گئے ہیں۔"

"اُس کے بعد کوئی اطلاع ہے؟۔"

"ہاں ثاقب بتا رہے تھے، اب خطرے سے باہر ہیں۔"

"چلو شکر ہے۔" انیلا اطمینان کا سانس لیتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر شدّتِ گریہ سے اُس کی رخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر بولی۔

"لیکن تمہارے رونے کی وجہ یہ تو نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب ہے۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے پہلے نظریں چرائیں پھر سر جُھکا لیا۔

"ثاقب بھائی نے کچھ کہا ہے؟۔" وہ خود ہی سمجھ کر پوچھنے لگی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا، تب وہ کہنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا، ثاقب بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہاں تو تمہارے لیے مرے جاتے تھے اور ب یہ عالم ہے کہ ہر وقت تمہیں رُلاتے رہتے ہیں۔ اور تم کتنی بیوقوف ہو۔ چُپ چاپ اُن کی باتیں سن ی ہو اور پھر رونے بیٹھ جاتی ہو۔ کسی دن کھری کھری سُنا دو۔ دماغ ٹھکانے آ جائے گا اُن کا۔ صاف ، وہ دن بھول گئے جب میرے حصول کے لیے بے قرار رہتے تھے۔" اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو مُسکرا پہلے لندھے اُچکائے پھر رازداری سے پُوچھنے لگی۔

"ویسے اب کِس بات پر خفا ہوئے ہیں؟"

"باتیں تو وہی پُرانی ہیں۔" وہ سوچ کر بولی۔ "لیکن ابھی وہ اتنے غصّے میں گئے ہیں کہ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کہاں گئے ہیں؟۔"

"پتا نہیں۔"

"اچھا خیر چھوڑو۔ تم زیادہ دل پر بوجھ مت ڈالو۔ بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ کہیں باہر نکل گئے ہیں۔ واپس آنے تک غصّہ بھی ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔" پھر اُس کا دھیان بٹانے کی خاطر بولی۔

"تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟"
"نہیں۔ کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ صبح میں ابھی ناشتا لگا ہی رہی تھی کہ خالہ جان کے ہاں سے فون آگیا اور اسی وقت سب چلے گئے۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔
"اچھا۔ تم اپنے ذہن کو آرام دو۔ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" انیلا اٹھنے لگی کہ اس نے روک لیا۔
"نہیں انیلا، تم بیٹھو۔ یہ فرض تو میرا ہے۔ اور دیکھو اپنی پریشانی میں، میں تم سے کھانے کا پوچھنا تو بھول ہی گئی۔" وہ شرمندگی محسوس کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"افوہ۔ یہ تکلفات رہنے دو ربیعہ۔ ویسے بھی میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔"
"پھر بھی تم بیٹھو۔"
وہ انیلا کو بٹھا کر خود کچن میں آگئی۔ خاص طور پر اپنے لیے کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے صبح والے سلائس دوبارہ گرم کیے۔ آملیٹ بنایا اور ابھی چائے کا پانی رکھ ہی رہی تھی کہ انیلا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔
"ربیعہ۔" وہ اسے پکار رہی تھی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

وہ کیتلی پھینک کر بھاگی چلی آئی۔ انیلا کو دیکھا، وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔
"کیا بات ہے؟" اس نے قریب آکر پوچھا تو انیلا ایک نظر اس پر ڈال کر فون پر بات کرنے لگی۔
"ہاں منصور، یہ میں ہوں انیلا۔ پلیز آپ جلدی آجائیں۔ میں یہاں اماں کے گھر ہوں۔ بس فوراً آئیں۔"
انیلا ریسیور رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ اس کے کندھے جھنجوڑ کر چیخنے لگی۔
"مجھے بتاؤ انیلا، کیا ہوا ہے؟ خالو جان تو ٹھیک ہیں اور ثاقب حسن۔ ثاقب کہاں ہے؟"
"پتا نہیں ربیعہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" انیلا وہیں ڈھے گئی پھر اس کے سراپے پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔
"جاؤ تم ڈریس چینج کر آؤ۔ ابھی منصور آجائیں، پھر ہم چلتے ہیں۔"
"کہاں؟"
"ہاسپٹل۔"
"ہاسپٹل۔" اس نے دہرایا "کیا خالو جان؟"
"بس تم جاؤ جلدی کرو۔" انیلا اس کے سوالوں سے جھنجھلا کر چیخ پڑی۔
"لیکن میں ثاقب کی اجازت کے بغیر کیسے جاسکتی ہوں؟ وہ تو مجھے۔"
"ثاقب نے ہی تمہیں بلایا ہے۔ اب جاؤ۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔
وہ الجھتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ ڈریس چینج کر کے بالوں میں اوپر ہی اوپر سے برش پھیرا اور کمرے سے نکل کر آئی تو منصور آچکا تھا۔ انیلا سرگوشیوں میں پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔
"چلیں۔" منصور ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو انیلا نے جلدی جلدی کمروں کے دروازے بند کیے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر منصور کے پیچھے چلی آئی۔
تمام راستہ ایک پراسرار سی خاموشی رہی۔ پھر ہاسپٹل کے پارکنگ میں گاڑی روک کر منصور سیدھا انکوائری کی طرف چلا گیا۔ پھر وہیں سے ان دونوں کو اشارہ کیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیکنڈ فلور پر آیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک خالو جان کا خیال تھا، اس لیے وہ اماں ابا اور خالو جان کے گھر والوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

یونہی بھٹکتی ہوئی نظریں آپریشن تھیٹر پر جا ٹھہریں۔ اسی وقت دروازہ کھلا، بس ایک پل کو اور ایک پل نے اسے عذاب لمحوں کی آگاہی دے دی۔ اس کے اندر چیخوں کا طوفان بھرنے لگا۔ ہونٹ کھلنے کی دیر تھی کہ فرش تا عرش اس کی چیخیں گونجنے لگتیں۔ لیکن پتا نہیں کیسے جب ہونٹ تو ساری آوازیں کہیں دب کر رہ گئیں۔ انیلا کے کندھے پر پیشانی ٹکاتی ہوئی وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔
"ثاقب حسن۔"

"اماں۔ مجھے ربیعہ کے حالات ٹھیک نہیں لگتے۔" صوفیہ اس وقت سے اماں کے سامنے بس یہی جملہ کہہ کر خاموش ہو جاتی تھی۔ اصل میں اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اماں کو کس طرح اس کے ات بتائے کیونکہ اس روز جب اس نے اماں کو یہ بتایا تھا کہ وہ ربیعہ کو ڈاکٹر حسنین کے پاس گئی تھی اور اس کے بعد بھی جو واقعات پیش آئے۔ وہ سب بھی بتائے تو اماں نے سارا الزام کے سر رکھ دیا تھا اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسے ربیعہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی رابطہ رکھنے کی ورت نہیں ہے۔ اسی لیے اب وہ ربیعہ کو فون کرنے کا بتاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔
"تم سے کس نے کہا کہ اس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں؟" اماں بار بار ایک ہی جملے کی تکرار سے آکر ناگواری سے پوچھنے لگیں۔
"بس اماں، اب میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود اس کے گھر کا چکر لگا آئیں۔"
"اچھی بات ہے، کسی دن ہو۔ آؤں گی۔" اماں نے آئندہ پر ٹالا۔
"کسی دن نہیں اماں، آج ہی بلکہ ابھی چلی جائیں۔" صوفیہ نے اصرار کیا۔
"کیوں؟" اماں کو اس کے منت بھرے انداز پر شبہ ہوا تو کہنے لگیں۔ "سچ سچ بتاؤ، آخر بات کیا ہے؟ ہیں تم پھر تو نہیں اس کے گھر گئی تھیں؟"
"کیسی باتیں کرتی ہیں اماں؟ اول تو میں اس کے گھر گئی نہیں اور اگر چلی بھی جاؤں تو وہ میری بہن ہے یں اس سے تعلق توڑ تو نہیں سکتی۔" وہ بھی صوفیہ تھی، کسی بھی بات کو ایک حد تک ہی برداشت تی تھی اور اماں اس کی اس عادت کو نہ صرف اچھی طرح جانتی تھیں بلکہ خائف بھی تھیں، اس لیے نرم کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔
"بیٹا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تمہاری بہن ہے، تم اس سے تعلق نہیں توڑ سکتیں لیکن اس کی بہتری اسی میں ہے کہ فی الحال تم اس سے کوئی تعلق نہ رکھو۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔
"ثاقب حسن کو تم جانتی ہو، کتنا شکی مزاج ہے۔ اور اگر شکی مزاج نہ بھی ہو تو تب بھی کوئی شخص ایسی یں برداشت نہیں کر سکتا۔ جو تم نے بتائی ہیں۔ ارے بیٹا، مرد تو بیوی کا اس کے میکے سے زیادہ ق پسند نہیں کرتا، کہاں اس گھر سے۔"
"میں یہ ساری باتیں سمجھتی ہوں اماں۔"
"پھر۔؟"
"آپ سہولت سے میری بات سنیں تو۔"
"ہاں کہو۔" اماں پوری طرح متوجہ ہو گئیں تو وہ کہنے لگی۔
"اصل میں صبح ربیعہ کا فون آیا تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔" پھر اس نے شہروز کے بجائے امی کا نام لے کر بتایا۔ "اس کا فون امی نے ریسیو کیا تھا اور انہوں نے ہی بتایا کہ وہ بہت یشان لگ رہی تھی۔ پھر آپ ہی بتائیے، میں چین کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ میں نے فوراً اسے فون کیا لیکن قب حسن کی آواز سن کر بند کر دیا۔ تین چار بار تو ایسا ہوا، پھر جب ربیعہ نے ریسیو کیا تو میں نے فوراً س سے پوچھا کہ سب خیریت تو ہے اور میرا خیال ہے ثاقب حسن اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ جو میری بات جواب اسی نے دیا۔"

"کیا کہا اُس نے ؟" اماں بے تابی سے پوچھنے لگیں۔
"کہہ رہا تھا، اب تک تو سب خیریت تھی لیکن اب نہیں رہے گی۔"
اُس نے کہا تو اماں کتنی دیر تک اُسے دیکھے گئیں۔ پھر مایوسی سے بولیں۔
"پھر اب میں کیا کر سکتی ہوں ؟"
"آپ کسی بہانے اُس کے گھر چلی جائیے۔" اماں شاید منع کرنا چاہتی تھیں کہ وہ فوراً بول پڑی۔
"اُسے یوں بے آسرا مت چھوڑیے اماں۔ اگر یہاں سے کوئی اس کی خبر گیری نہیں کرے گا تو ثاقب حسن اور شیر ہو جائے گا۔ جو دل چاہے کرتا پھرے گا۔" اماں کو سوچتے دیکھ کر کہنے لگی۔
"لڑکیوں کے پاس ایک میکے کا مان ہی تو ہوتا ہے۔ ربیعہ سے یہ مان مت چھینیے۔ آپ کے جانے سے اُسے بڑا سہارا ہو گا۔ ورنہ وہ بھی یہی سمجھے گی کہ آپ نے ایک بوجھ کی طرح اُسے اُتار پھینکا۔"
"تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا لیکن۔"
"لیکن کو چھوڑیں اماں۔ بس آپ جائیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اُس کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا ہے۔" صوفیہ پھر اتنی منت سے بولی کہ اماں انکار نہ کر سکیں اور ابھی جانے کی تیاری کر ہی رہی تھیں کہ بڑی آپا آگئیں۔
"کہاں جا رہی تھیں ؟" بڑی آپا انہیں تیاری کرتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔
"ذرا ربیعہ کی طرف جا رہی تھی۔"
"تو آپ کو معلوم ہو گیا ؟"
"کیا ؟" اماں سے پہلے صوفیہ بول پڑی۔
"ثاقب حسن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"
"کیا۔ کب۔ ؟" اماں ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھیں۔ "وہ خیریت سے تو ہے ناں۔"
"آپ کو کیسے معلوم ہوا بڑی آپا ؟" صوفیہ ایک دم سناٹوں میں گھر کر پوچھنے لگی۔
"ابھی میرے پاس انیلا کے میاں منصور کا فون آیا تھا۔ اُسی نے بتایا ہے، میں نے سوچا، اماں کو بھی ساتھ لے چلوں۔" پھر اماں کو دیکھتی ہوئی بولیں۔
"لیکن اماں کی حالت تو ایسی نہیں لگ رہی۔ تم چلو۔"
"ہاں میں تو چلوں گی لیکن اماں کا جانا بھی ضروری ہے اور میرا خیال ہے راستے میں کہیں سے ابا میاں کو بھی فون کر دیں گے۔" پھر کلثوم کو آواز دے کر کہنے لگی۔
"کلثوم جلدی سے گلوکوز بنا کر اماں کو پلاؤ۔"
"اماں۔ آپ حوصلہ رکھیں، اللہ بہتر کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بڑی آپا اماں کی ہتھیلی سہلاتی ہوئی بولیں۔
پھر کلثوم گلوکوز لے کر آئی تو اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر خود اماں کو پلایا۔
"کیا ہوا ہے بڑی آپا ؟" کلثوم پریشانی سے پوچھنے لگی۔
"کچھ نہیں اور سنو۔ ہم ذرا اماں کو لے کر جا رہے ہیں، تم دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔"
"کہاں لے جا رہی ہیں ؟" کلثوم پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
"ربیعہ کے گھر۔" صوفیہ اُس کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر بولی۔
"میں اور ہما بھی چلیں۔" وہ اشتیاق سے بولی۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تینوں جا تو رہے ہیں، تم دونوں پھر کسی وقت چلی جانا۔" بڑی آپا نے قدرے رعب سے کہا۔ پھر اماں کو اُٹھا کر باہر لے آئیں۔
وہ تینوں جب ہاسپٹل پہنچیں۔ ثاقب کے اماں ابا اور بڑی بہنیں بھی آچکی تھیں۔ ثاقب حسن ابھی

آپریشن تھیٹر میں تھا اور ڈاکٹر اُس کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہے تھے۔
"بس دُعا کریں۔" آتے جاتے ڈاکٹر یا سسٹر سے کوئی بھی ثاقب کے بارے میں پوچھتا تو وہ یہی لفظ کہہ کر چل دیتے۔
گھنٹہ دو گھنٹہ یا شاید اس سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ جب نرس نے باہر آکر ربیعہ کو پکارا۔ چونکی اور صرف اپنی طرف اشارا کر سکی۔
"تم اندر چلی جاؤ۔" نرس نے اُس سے کہا۔ اور دُوسری طرف چلی گئی۔ تو وہ کچھ سہم کر بڑی آپا کی دیکھنے لگی۔
جاؤ۔" بڑی آپا نے اُس کا کندھا تھپک کر حوصلہ دیا تو وہ بمشکل تمام اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی آپریشن ٹر میں داخل ہو گئی۔ سامنے ثاقب حسن جس حال میں نظر آیا، اس سے اُس کے سارے حوصلے پست گئے۔
"میرے خدا۔ ایسا تو کبھی نہیں سوچا تھا میں نے۔" انتہائی دُکھ سے سوچتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور کا خون آلود چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔
"ثاقی۔ دیکھو میں ہوں ربیعہ۔"
"ربیعہ۔" اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھنے لگا۔ تواتر سے بہتے آنسو اور چہرے پر بچھڑ جانے کا خوف۔ وہ حیران ہوا۔
"کیا تم اَب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو ؟"
اور اگر ایک ذرا سی ہاں اُس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا سکتی تھی تو وہ ضرور اعتراف کر لے گی۔
"ہاں۔"
"میری زیادتیوں کے باوجود۔ ؟"
"تم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں نے کبھی تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مانا۔" وہ اُس کی آنکھوں کے اروں سے بہتے آنسو اُنگلیوں پر سمیٹ کر بولی تو اُس کے چہرے پر کرب سمٹ آیا۔
"میں خدا کی لکھی ہوئی تقدیر کو مٹا کر شاید خود خدا بن بیٹھا تھا اور یہی بات اُوپر والے کو پسند نہیں ا۔"
"ایسی باتیں مت کرو۔" اُس کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔
"کہنے دو مجھے کہ میں نے تمہارے ساتھ۔"
وہ اعتراف کرنے جا رہا تھا لیکن زندگی دغا دے گئی۔ سانسوں نے ناتا توڑ لیا۔ وہ منتظر اُس کے ہونٹوں کو دیکھے جا رہی تھی کہ ڈاکٹر نے بہت آہستگی سے اُس کے ہاتھ ہٹا کر اس کا چہرہ انپ دیا، وہی چہرہ جسے پہلی بار دیکھ کر وہ گرد و پیش سے بے گانہ ہو گئی تھی۔
ایک پل میں اُس کے سارے روپ نگاہوں میں آسمائے۔ اس کے بعد سارے منظر دُھندلا ئے۔
وہی سسکیاں، وہی بین کی آواز جو صبح اُسے دھیرے دھیرے سُنائی دی تھیں اور اُس نے اپنے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب وہی آوازیں اُس کے چاروں طرف گونج رہی تھیں اور وہ نہ کان بند لتی تھی، نہ آنکھیں اور آنکھیں اُس وقت بھی بند نہیں کیں، جب محبت میں ہر حد پھلانگ جانے اچھے بُرے کی تمیز مٹا دینے والا ثاقب حسن چار کندھوں پر سوار ہو کر گیا۔
اُس وقت بھی آنکھیں کُھلی رہیں، جب ساس نے چوڑیاں اُس کی کلائیوں میں یوں توڑیں کہ یاں لہولہان ہو گئیں۔ پھر کان بھی کُھلے رہے۔ نہ صرف بین کی آوازیں بلکہ کوسنے بھی۔
"منحوس۔ ابھاگن۔ جب سے آئی ہے، میرے گھر پر نحوست کا سایا پڑا ہے۔ آخر میرے

شیر جوان کا سر لے کر چھوڑا۔ ہائے خود کیوں نہ مرگئی ہے۔"

کوئی نہیں تھا جو اُس زبان کے آگے بند باندھتا۔ سب کی ہمدردیاں اس عورت کے ساتھ تھیں، جو سینہ کوبی کر رہی تھی۔ وہ بے آواز آنسو لٹاتی رہی۔ لے دے کے ایک انیلا ہی تھی جو کسی کسی وقت آکر اُس کے گلے لگ جاتی۔ اور جب ثاقب کے ابا نے آکر اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اُس کی اماں سے کسی طرح برداشت نہ ہوا۔ اُسی وقت اُسے یہاں سے نکل جانے کا حکم سنا دیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر، مچل مچل کر روئی، ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

"جانا تو ہے ہی لیکن ابھی نہیں۔"

"ابھی اِسی وقت۔ میں مزید ایک لمحہ تمہیں برداشت نہیں کرسکتی۔"

پھر انیلا اور ابا اُس کی حمایت میں بولے بھی لیکن اُنہوں نے ایک نہیں سُنی۔ اماں، بڑی آپا اور صوفیہ وہیں موجود تھیں۔ پہلے تو وہ اُسے ساس کی منت سماجت کرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں، پھر اُن سے برداشت نہیں ہوا۔ بڑی آپا نے اماں کو اشارہ کیا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چلو بیٹا۔ جس کے دم سے تم اس گھر میں تھیں، وہی نہیں رہا تو اَب تمہارا یہاں رہنا فضول ہے۔"

"اماں۔"

وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن اماں کے اشارے پر بڑی آپا اور صوفیہ اسے اُٹھا کر لے آئیں۔

زندگی کا یہ امتحان بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ورنہ اب سے پہلے تو ہر امتحان کے لیے بہت پہلے سے جیسے پرچۂ سوالات اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا تھا اور وہ اگر اُس امتحان میں پوری نہیں بھی اُتر سکتی تھی، تو بھی اپنے طور پر پہلے سے اپنے آپ کو آنے والے امتحان کے لیے تیار ضرور کرلیتی تھی۔ لیکن یہ امتحان جس کے بارے میں اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، اُسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دِنوں وہ سنبھل نہیں پائی، اس پر ساس کے سلوک نے ذہنی حالت بھی مفلوج کردی تھی۔

ثاقب حسن خواہ کیسا بھی سہی بہرحال اُس کا شوہر تھا۔ اور پھر مرنے والے کی زیادتیاں تو ویسے بھی بھلا دی جاتی ہیں۔ انسان دانستہ نظریں چُرا لیتا ہے۔ وہ بھی بھول گئی۔ کھلے دل سے اُسے معاف کردیا۔ اور پھر یہ شہروز احمد والا معاملہ بھی نہیں تھا جو وہ اپنے اندر دفن کردیتی۔ اس کے برعکس وہ اسے علی الاعلان یاد کرتی۔ اماں کے پاس بیٹھتی تو اُس کی ڈھیروں باتیں کرتی۔ بولنے پہ آتی تو بولتی چلی جاتی۔

"اماں۔ وہ شروع سے ایسا نہیں تھا۔ پتا نہیں کس بات نے اُسے اِتنا تلخ بنا دیا تھا۔"

پھر اپنی خالی گود کا احساس۔

"اللہ میاں اگر مجھے اولاد دے دیتا تو شاید حالات ایسے نہ ہوتے۔"

پھر مایوسی سے کہتی۔

"پتا نہیں اللہ میاں نے میرے مقدر میں اتنی آزمائشیں کیوں لکھی ہیں۔ اور کون جانے یہ آزمائشیں ہیں یا میرے کسی گناہ کی سزا۔"

اماں کسی کسی وقت اُسے حوصلہ دینے کی خاطر ایک آدھ جملہ کہہ دیتیں ورنہ زیادہ تر خاموش رہتیں شاید اس لیے کہ وہ بول کر، کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرلے۔ پھر وقت کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اگر دوسروں کی خوشیاں اپنے دامن میں سجاتا ہے تو غم بھی سمیٹ لیتا ہے۔ اُس کے دُکھوں کو بھی اگر مکمل طور پہ سمیٹا نہیں تو کچھ نہ کچھ تو لے ہی اُڑا تھا۔ جبھی تو اس میں ٹھہراؤ آگیا۔ نہ آنسوؤں میں وہ روانی رہی، نہ تڑپ میں وہ شدت۔ پھر ذہن کسی قابل ہوا تو شاید زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ اب اُس کی زندگی پر خود اس کا اپنا اختیار ہے اور وہ اپنے لیے خود کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی، جس پر چل کر بقیہ زندگی کچھ سہل ہوجائے۔ حالات نے اگر اسے توڑ

...کھ دیا تھا تو زندہ رہنے کے کچھ ڈھنگ اور انداز بھی سکھا ہی دیے تھے۔

...اپنے دُکھوں کی چادر سمیٹ کر اُس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو ہر ایک کو اپنے لیے پریشان اور ...ردہ دیکھا۔ ابا میاں پہلے سے بہت کمزور اور جھکی ہوئی کمر۔ اماں آہیں بھرتی نظر آتیں۔ کلثوم ...ر ہما کسی نہ کسی کونے میں دبکی ہوتیں، کبھی کسی کام میں مصروف، کبھی کتابوں میں سر دیے ہوئے یہاں ...ے کہ گھر کے در و دیوار میں اُداسیاں گھلی ہوئی تھیں۔ اُس نے ان سارے چہروں پر چھائی اُداسیوں کا ...ذمہ دار خود کو سمجھا، پھر پہلے اپنے آپ کو سہارا دیا پھر اس گھر کی زندگی کو دوبارہ پہلے والے معمول پر لانے ...سوچا اور اگلے دن سے عمل بھی کر ڈالا۔

"ارے۔" اماں صبح ہی صبح اسے کچن میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔ "تم اتنی جلدی کیوں اُٹھ گئیں؟"

"مجھے اسی وقت اُٹھنا چاہیے اماں اور ہمیشہ میں اسی وقت اُٹھتی رہی ہوں۔ آپ خوامخواہ میری عادت ...اب کررہی ہیں۔" وہ اپنے پُرانے انداز میں بولی اور چولہے پہ چائے کا پانی رکھ کر تسلے میں آٹا نکالنے ...لی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہاں کیوں چلی آئیں، باورچی خانے میں۔؟"

"ناشتا بنانے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"چھوڑ دو۔ میں بنالوں گی یا پھر ہما اور کلثوم۔"

"اماں۔" وہ ہاتھ روک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ "مجھے مت روکیں اب جب کہ مجھے یہیں رہنا ہے ...میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک مت کریں کہ میرے اندر ہر دم اجنبیت کا احساس جاگتا رہے۔"

"تم اجنبی کیوں ہونے لگی بیٹا؟۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔" اماں کو کہنا پڑا۔

"ہاں یہی میرا گھر ہے۔" روکتے روکتے بھی آنکھوں میں نمی اُتر آئی جسے اماں سے چھپانے ...خاطر وہ سر جھکا کر آٹا گوندھنے میں مصروف ہوگئی۔ اماں کچھ دیر تک کھڑی اُسے دیکھتی رہیں، پھر ...ر چلی گئیں۔

عہدِ گزشتہ کی طرح اُس نے سب سے پہلے ناشتا بنا کر ابا میاں کو دیا اور اماں کو بھی زبردستی ...ن کے ساتھ بٹھا دیا۔ پھر کچن میں آکر اونچی آواز میں کلثوم اور ہما کو ناشتے کے لیے پکارنے لگی اُس ...آواز میں کوئی جادو، کوئی سحر نہیں تھا، پھر بھی در و دیوار پر چھائے اُداسیوں کے بادل سمٹنے لگے۔ ...میاں نے پہلے حیران ہوکر اماں کی طرف دیکھا پھر اطمینان بھرا سانس لے کر ناشتا کرنے لگے تھے۔ ...کہ کلثوم اور ہما تقریباً بھاگتی ہوئی کچن کی طرف گئی تھیں۔ اُن کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی گمشدہ چیز ...انک ہاتھ آگئی ہو۔

"آپ کی سسٹر کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔" شہروز احمد نے کہا تو ...صوفیہ چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ ہمیشہ سے برعکس ربیعہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ...ن کا چہرہ سپاٹ اور انداز بے حد سرسری تھا جیسے فرض نبھا رہے ہوں۔

"بہت بڑا سانحہ ہوا ہے اُن کے ساتھ۔ یقیناً بہت ڈسٹرب ہوں گی۔"

صوفیہ خاموش رہی تو یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگے۔

"ابھی وہیں ثاقب کے گھر ہیں یا۔؟"

"نہیں۔ اماں کے گھر آچکی ہے۔"

اسی وقت امی اُدھر آگئیں۔ اُنہوں نے صوفیہ کی بات سُن لی تھی، جبھی بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"کون آچکی ہے؟"

صوفیہ نے جواب دینے سے پہلے شہروز احمد کی طرف دیکھا اور اُن کے نظریں چرانے پر کہنے لگی۔

"میں ربیعہ کی بات کررہی ہوں۔ وہ اماں کے گھر آچکی ہے۔"

"اچھا۔" امّی کچھ دیر سوچنے اور حساب لگانے کے بعد کہنے لگیں۔ "میرا خیال ہے ابھی اس کی عدت کے دن تو پورے نہیں ہوئے۔"

"نہیں۔" اور امّی کے مزید ایسے کئی سوالوں سے پہلے خود ہی بتانے لگی۔ "اصل میں ہم اُسے سوئم کے بعد ہی گھر لے آئے تھے کیونکہ وہاں اُس کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اور ثاقب حَسن کے گھر والوں کو تو خود اپنا ہوش نہیں ہے، اُسے کون دیکھتا؟" اُس نے قصداً اُس کی ساس کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا۔

"تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ربیعہ میکے آچکی ہے۔ کم ازکم میں اس کے پاس تعزیت کے لیے تو چلی جاتی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ "مجھے اُس کے پاس جانا تو ہے لیکن اب تک میں نے اس لیے نہیں کہا کیونکہ میرا خیال تھا وہ اپنے سسرال میں ہوگی۔ اور وہاں جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ آخر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"آئی ایم سوری۔ مجھے خیال نہیں رہا۔" صوفیہ ندامت سے بولی۔

امّی کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"مہروز کہاں ہے؟ بلاؤ اسے، ابھی چلتے ہیں۔"

"جی۔" صوفیہ فوراً اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو امّی یونہی شہروز احمد کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ پتا نہیں کیا سمجھے، اُٹھتے ہوئے بولے۔

"میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہوئیے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے، امّی مہروز اور صوفیہ کا انتظار کرنے لگیں۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں کمرے سے نکل کر آئے، امّی چلنے کے لیے تیار ہوگئیں۔

شام ابھی پوری طرح نہیں اُتری تھی۔ صوفیہ اور مہروز کے ساتھ امّی کو دیکھ کر امّاں کو حیرت ضرور ہوئی لیکن ظاہر نہیں ہونے دی۔ خلوص و تپاک سے ملیں اور بڑے کمرے میں لے آئیں۔

"میں کافی دنوں سے آنا چاہ رہی تھی۔" امّی بیٹھتے ہی کہنے لگیں۔ "آپ کے داماد کا سنا، بہت افسوس ہوا۔"

"بس جی۔ اللہ کی مرضی۔" امّاں آہ بھر کر بولیں۔

"صوفیہ بتا رہی تھی ربیعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب کیا حال ہے اُس کا؟"

"اب تو اللہ کا شکر ہے، کافی بہتر ہے۔"

"ہے کہاں؟" امّاں نے صوفیہ کو اشارہ کیا تو وہ ربیعہ کو بلانے کچن میں آگئی۔

"ارے چھوٹی آپا۔ آپ کب آئیں؟" وہ اچانک صوفیہ کو سامنے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"ابھی آئی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ چلیں آپ اندر چل کر بیٹھیں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"چائے بعد میں بنا لینا، پہلے میرے ساتھ اندر آؤ۔"

"خیریت، کیا ہوا؟"

"امّی ہمارے ساتھ آئی ہیں اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"امّی؟" فوری طور پر وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ پھر یاد آیا تو کہنے لگی۔ "اچھا، آپ کی ساس؟"

"ہاں۔"

"مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟" وہ بہت حد تک نارمل نظر آ رہی تھی۔

"بڑی آپا کی ساس کیوں آئی تھیں؟۔ اور سب لوگ کیوں آ رہے ہیں؟" صوفیہ نے کہا تو وہ ایک خاموش ہوگئی۔ پھر چولہا دھیما کر کے 'چلیں' کہتی ہوئی اُس کے ساتھ اندر آگئی۔

امّی سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں 'آداب' کہہ کر امّاں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور فوری طور پر امّی کچھ ہی نہ سکیں، بس اُسے دیکھے گئیں۔

یہ وہ ربیعہ تو نہیں تھی جو دو سال اُن کے گھر میں رہی تھی گو کہ اس میں شوخی اور بے باکی تو پہلے بھی نہیں تھی لیکن اس کا دھیما دھیما انداز زندگی کا پتا ضرور دیتا تھا۔ اور اب اس کا پورا وجود سناٹوں کی زد میں تھا۔

"کیسی ہو بیٹا؟" کتنی دیر بعد امّی اسی قدر کہہ سکیں۔ اور وہ اثبات میں سر ہلا سکی۔

"ثاقب حَسن کی موت کا بے حد افسوس ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی اُتر آیا اور روکنے کی کوشش کے باوجود چھلکتا چلا گیا۔

"صبر اور حوصلے سے کام لو بیٹا۔ خُدا کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

اُس کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

"روؤ مت۔ مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ کسی طرح آنسو نہ روک سکی اور اسی طرح اُٹھ کر چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔ تو صوفیہ بھی اُس کے پیچھے چلی آئی۔

"بس کرو ربیعہ، مت روؤ۔"

"کیوں نہ روؤں؟" وہ بگڑنے لگی۔ "ثاقب حَسن مرگیا اور میں روؤں بھی نہ۔ کیا دیا ہے میں نے اسے؟۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ زندگی سے ناتا توڑ گیا۔ اور میں کچھ نہ کر سکی۔"

"جب وہ اِتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا تو تم کیا کر سکتی تھیں؟" پھر اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

"تمہیں اِس طرح اُٹھ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی تو امّی تم سے بات کر رہی تھیں۔"

"بس میں نے سُن لیں اُن کی باتیں، میں مزید اُن کے سامنے نہیں بیٹھ سکتی۔"

وہ کمرے سے اسٹور اور اسٹور سے نکل کر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ کلثوم چائے بنا رہی تھی اُس نے کوئی توجہ نہیں دی، پہلے جو کام کر رہی تھی، دوبارہ اسی میں مصروف ہوگئی۔ پھر جب جانے سے پہلے صوفیہ اُس کے پاس آئی تو وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی، اس سے کہنے لگی۔

"بُرا مت مانیے گا چھوٹی آپا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔"

"میں جانتی ہوں۔" صوفیہ نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"آپ جا رہی ہیں کیا؟"

"ہاں۔"

"اتنی جلدی؟"

"پھر کسی وقت آؤں گی۔ ابھی تو امّی ساتھ ہیں ناں، اس لیے رُک نہیں سکتی۔"

"پھر صبح سے آئیے گا۔ بلکہ مہروز سے کہیں کچھ دنوں کے لیے آپ کو یہیں چھوڑ دے۔"

"رُکنے کا وعدہ نہیں کرتی البتہ صبح سے ضرور آؤں گی اور سارا دن رہوں گی۔ اچھا میں چلوں۔ امّی نکل چکی ہیں۔"

صوفیہ جلدی سے خُدا حافظ کہہ کر چلی گئی تو وہ ہُما کو دیکھنے لگی جو چائے کے برتن لے کر آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"آپی۔ آپ ہٹ جائیں، روٹی میں پکاؤں گی۔"

"کیوں ؟"

"امّاں ناراض ہورہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں ہم نے سارا کام آپ پر ڈال دیا ہے۔"

"کوئی نہیں۔" اُس نے چولہا جلا کر توا رکھا، پھر کہنے لگی۔" میں خود مصروف رہنا چاہتی ہوں اور مجھے مصروف رہنے دو، ورنہ فارغ بیٹھتی ہوں تو کتابِ زندگی کا ہر باب کُھلتا چلا جاتا ہے، جن میں سوائے آہوں اور آنسوؤں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ سب میری اپنی غلطیوں کے سبب ہے۔ ورنہ ایسا تو کہیں نہیں ہوتا۔ ہر رات کی سحر ضرور ہوتی ہے۔ پھر میں مسلسل اندھیروں میں کیوں بھٹکتی رہی؟ شاید اس لیے کہ میں بزدل تھی، خوشیوں نے دستک دی بھی تو میں نے خود دروازے بند کر لیے، روشنی کی کرن بلکہ مینارے نظر آئے اور میں آنکھیں بند کرتی رہی لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں کمزور اور بُزدل نہیں ہوں۔"

ہُما خوشگوار حیرت سے اُس کی طرف دیکھے گئی جو کہہ رہی تھی۔

"مجھے اگر زندہ رہنا ہے تو زندہ رہنے کے ڈھنگ بھی سیکھنے ہوں گے۔ گذشتہ پر کُڑھنا اور آئندہ کے لیے خوفزدہ ہونا عقلمندی نہیں ہے۔ اور پھر یہ ضروری نہیں کہ انسان صرف اپنے لیے سوچے، اپنے لیے زندہ رہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو دُوسروں کے کام آئے۔ میں بھی اپنے لیے ایسی ہی زندگی منتخب کروں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"میں زندہ رہوں گی امّاں کے لیے، جو ہمارے لیے خوشحال زندگی کی آرزو میں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی آئی ہیں۔ ابا میاں کے لیے جو ہماری فکروں میں اپنی صحت تباہ کر بیٹھے ہیں۔ کاش اُن کا کوئی بیٹا ہوتا جو آج اُن کا سہارا بنتا۔" وہ ایک عزم سے بولے گئی۔

"آپی۔" ہُما نے اُس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔" آپ جانتی ہیں، ابا میاں راضی بہ رضا رہنے والے ہیں۔ وہ حالات سے مایوس نہیں ہوتے۔ وہ صرف آپ کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ آپ خوش رہیں گی تو دیکھیے گا، وہ پھر سے جی اُٹھیں گے۔"

"ہاں میں اب انہیں اپنی طرف سے فکرمند نہیں ہونے دوں گی۔" اُس نے عزم سے کہا اور مُسکرا کر پہلے ہما کا گال تھپتھپایا، پھر اپنی کمر کے گرد حمائل اُس کے بازو ہٹاتی ہوئی بولی۔" چلو ہٹو، اب مجھے روٹی پکانے دو۔"

"پہلے امّاں کو سمجھائیے، پھر آ کر پکائیے گا، وہ خوامخواہ مجھ پر خفا ہو رہی ہیں۔" ہُما نے منہ بنا کر کہا۔

"وہ یہاں آئیں گی تو میں کہہ دوں گی اُن سے۔ تم جاؤ۔" وہ زبردستی ہُما کو باہر دھکیل کر روٹیاں پکانے میں لگ گئی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ سوچتی رہی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ کبھی خیال آتا بچّوں کو گھر میں ٹیوشن پڑھانا شروع کر دے، کبھی لڑکیوں کو سلائی سکھانے کا سوچتی لیکن پھر خیال آتا کہ اس طرح وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی گھر میں محدود ہو جائے گی جب کہ وہ دُنیا کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ یوں وہ سنجیدگی سے جاب کرنے کے بارے میں سوچنے لگی اور جب فیصلہ کر لیا تو امّاں سے کہا۔

"امّاں! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا۔ ؟" امّاں حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"اس طرح مت دیکھیں امّاں۔ میں نے کوئی انہونی بات نہیں کی، آخر اور لڑکیاں۔"

"بس کرو۔" امّاں نے ٹوک دیا۔" مجھے اور لڑکیوں کی مثالیں مت دو۔ میں جانتی ہوں، لڑکیاں بہت کچھ کرتی ہیں لیکن تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے ہے ضرورت۔" وہ زور دے کر بولی۔" آپ مجھے دو بار اس گھر سے رُخصت کر چکی ہیں۔

تقدیر کی ستم ظریفی کہ پھر مجھے یہیں لا پٹخا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اَب میں آپ کی ذمّہ داری نہیں ہوں۔ اپنا بوجھ خود اُٹھانے دیں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔" امّاں تاسف سے بولیں۔" بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں اور اگر تم دوبارہ یہاں ہو تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ یہ تمہارا گھر ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں، تمہارے لیے سوچیں گے۔ تمہیں اپنے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں امّاں۔ آپ کے آگے دو اور لڑکیاں بھی ہیں، اُن کے بارے میں سوچیں، میرے لیے جو آپ نے کرنا تھا، کر لیا۔"

"پھر بھی تمہاری دو وقت کی روٹی ہم پر بھاری نہیں ہے۔"

"بات صرف دو وقت کی روٹی کی نہیں ہے۔" وہ اُلجھ کر بولی۔

"اور بھی جو کچھ چاہو گی، پُورا کرنے کی کوشش کریں گے۔" امّاں نرمی سے بولیں۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں، میرا مطلب یہ تھوڑی ہے۔" وہ جھنجھلائی۔

"پھر ؟"

"بس آپ مجھے اجازت دے دیں، میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔" کچھ دیر رُک کر کہنے لگی۔" میں اب نو عمر نہیں ہوں، حالات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ہماری سادگی اور شاید غریبی نے ہی لوگوں کو اتنا حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ جس نے جو چاہا، ہمارے ساتھ سلوک کیا۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟" امّاں چونک کر پوچھنے لگیں۔

"ثاقب حسن کے گھر والوں کی۔ اُس کی امّاں کو شاید یہ خوف تھا کہ کہیں میں اُن کے گھر پر قابض ہو جاؤں، جبھی تیسرے دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا اور میں بھی کتنی پاگل تھی کہ چلی آئی جب کہ گھر کی ہر شے میرے شوہر کی تھی اور مجھے یاد آ رہا ہے امّاں، ایک دن ثاقب حسن نے کہا تھا، وہ گھر میرے نام سے خریدتا ہے۔ اس طرح تو امّاں میں۔"

"بیٹا۔" امّاں نے ٹوک دیا۔" بھول جاؤ سب، جب سر کا سائیں ہی نہیں رہا تو پھر یہ چیزیں لے کر کیا کرو گی؟"

"مجھے واقعی ان چیزوں کی نہ ضرورت ہے اور نہ خواہش، لیکن جو سلوک اُنہوں نے میرے ساتھ کیا ہے، اس کی سزا تو اُنہیں ملنی چاہیے۔"

"تم اس طرح مت سوچو جو جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پھر بھی میں ان پر یہ ضرور واضح کرنا چاہوں گی کہ جتنا کمزور اُنہوں نے سمجھا تھا، اتنی میں ہُوں نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"کیا کرو گی تم ؟"

"یہ بعد کی بات ہے، پہلے آپ مجھے جاب کی اجازت دیں۔"

"آپ مان جائیں، ابا میاں کو منانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اُس نے امّاں کے گلے میں بازو ڈال کر اپنا گال اُن کے گال سے مِلا دیا۔" منع مت کریں امّاں، یہ میری خواہش ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن پہلے اپنے ابا میاں سے پوچھ لو۔" امّاں اس کی خوشی کی خاطر مان گئیں۔ ابا میاں نے بھی اب اس کی بات رَد کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کسی بھی طرح سہی، وہ خوش رہے۔ اور وہ بھی یہی چاہتے تھے، جبھی اُنہوں نے بھی اجازت دے دی۔

وہ اِتنا جانتی تھی کہ جاب آسانی سے نہیں ملے گی لیکن اِتنی دشواریوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک تو اس کی تعلیم صرف انٹر تھی، دُوسرے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا، جہاں جاتی تجربے کے بارے میں پوچھا جاتا یا پھر ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ، کمپیوٹر وغیرہ کے بارے میں ——— اور اُسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

پھر ایک جگہ اُسے ٹیلی فون آپریٹر کی جاب مل گئی۔ اور اس طرف سے اطمینان ہوتے ہی اُس نے ایک انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے کر شام کی کلاسز میں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنا شروع کر دیا۔

آفس سے پانچ بجے چھٹی ہوتی تو وہاں سے سیدھی انسٹیٹیوٹ چلی جاتی اور پھر گھر آتے آتے سات بج جاتے تھے۔ یوں وہ بہت مصروف ہوگئی۔ اور اس کے لیے مصروفیت بہت ضروری تھی جبھی تو وہ اب گذشتہ پر کُڑھنے کے بجائے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگی تھی، اور آئندہ کے لیے سوچتے ہوئے اُس کے پیشِ نظر اپنی ذات نہیں بلکہ وہ کلثوم اور ہما کے بارے میں سوچتی تھی۔

اُس روز وہ جب حسبِ معمول سات بجے گھر لوٹی تو صوفیہ اور مہروز آئے ہوئے تھے۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی، اس لیے دُور ہی سے دونوں کو سلام کر کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے چلی گئی، پھر اطمینان سے اُن کے پاس بیٹھی تو فوراً شکوہ کرنے لگی۔

"واہ چھوٹی آپا۔ آپ نے صبح سے آنے کو کہا تھا اور میں انتظار ہی کرتی رہی۔"

"میں اگر صبح سے آ بھی جاؤں تو تم کون سا گھر میں ملو گی۔" چھوٹی آپا نے جوابی شکوہ کیا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہفتے میں ایک دن چھٹی کا بھی ہوتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ خیر یہ بتاؤ، جاب کیسی چل رہی ہے؟"

"بس ٹھیک ہے۔ اپنا شارٹ ہینڈ کا کورس مکمل کر لوں، پھر کسی اچھی جگہ اپلائی کروں گی۔" پھر مہروز کی طرف متوجہ ہوئی "آپ کیسے ہیں مہروز بھائی؟"

"میں تو ٹھیک ہوں البتہ صوفیہ ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ قدرے شرارت سے بولا "ہر ہفتے ڈاکٹر کے پاس دوڑنا پڑتا ہے۔"

"کیا ہوا چھوٹی آپا؟" وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں، مہروز تو بس یونہی۔" صوفیہ، مہروز کو گھورنے لگی۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر جو مُسکراہٹ دبی تھی، اُس نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس وقت تو کچھ نہیں بولی، جب مہروز ابا میاں کے پاس چلا گیا، تب کہنے لگی۔

"مبارک ہو چھوٹی آپا۔ لیکن بیٹا ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"بس مجھے بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

"پاگل ہو تم بیٹا ہو یا بیٹی۔ اللہ کی دین ہے۔"

"ہاں، ہے تو اللہ کی دین، پھر بھی بیٹی نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔" پھر خود ہی کہنے لگی "اگر اللہ میاں بیٹی دے تو اُس کا نصیب آپ جیسا ہو یا بڑی آپا جیسا۔"

"اچھا۔ اب یہ دادیوں جیسی باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کبھی ثاقب حسن کے گھر سے بھی کوئی آیا یا نہیں" صوفیہ نے پوچھا تو وہ جو خاصے خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی، ایک دم خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی۔

"نہیں چھوٹی آپا۔ وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ حالانکہ کسی نہ کسی کو ضرور آنا چاہیے تھا۔ اور کوئی نہیں تو انیلا یا آپا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی "میں سوچ رہی ہوں، کسی دن میں خود وہاں جاؤں لیکن امّاں جانے سے منع کر رہی ہیں۔"

"تم کیوں جانا چاہتی ہو؟" صوفیہ بغور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"وہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ وہ نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا حق ختم ہوگیا۔ اور جو میرا جائز حق ہے، وہ میں نہیں چھوڑوں گی۔" وہ اتنے مضبوط لہجے میں بولی کہ صوفیہ کتنی

اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس کا کندھا تھپک کر بولی۔

جیتی رہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھ رہی ہو۔"

حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔" وہ افسردگی سے مُسکرائی۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے "چلیے تو آپ نے پی لی ہوگی اور میرا خیال ہے کھانا بھی تیار ہوگا۔ آپ بیٹھیں میں دیکھوں کیا کر رہی ہیں؟"

کلثوم اور ہما کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔" صوفیہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹتی ہوئی بولی۔

میں دیکھتی ہوں۔" وہ اُٹھنے لگی کہ صوفیہ نے روک لیا۔

تم کہاں جا رہی ہو۔؟ جب کھانا پک جائے گا بلکہ دسترخوان پر لگ جائے گا، امّاں بُلا لیں گی۔"

وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ امّاں کچن میں ہوں اور میں یہاں بیٹھی رہوں۔"

امّاں ویسے بھی تمہیں کچن میں نہیں گھسنے دیں گی۔"

کیوں؟"

ظاہر ہے پہلے ہی اتنی تھکی ہوئی آئی ہو، اَب کچن میں جاؤ گی تو وہ خفا ہوں گی کیونکہ ابھی تمہارے ...میں وہ یہی بات کر رہی تھیں کہ تم بہت تھک جاتی ہو۔"

...وئی نہیں۔" اور پھر رازداری سے پوچھنے لگی "اور کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا مطلب ہے، میرے ...رنے کے بارے میں؟"

...پہ نہیں بلکہ مطمئن ہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں اچھا ہے، تم مصروف ہوگئی ہو اور مجھے بھی تم پہلے ...بہت بہتر نظر آ رہی ہو۔"

...ں چھوٹی آپا، زندگی تو گزارنی ہی ہے۔ اور اگر میں پہلے ہی اپنے بارے میں سوچ کر حوصلے ...ام لیتی تو شاید یہ دُوسرا سانحہ میری زندگی میں نہ آتا۔" وہ افسردہ ہو کر بولی۔

...دُوسرے کی بات کر رہی ہو، جب کہ میں اس سے بھی پہلے کا سوچتی ہوں، کاش تم۔"

...ھوٹی آپا۔" وہ اُن کی پوری بات سُنے بغیر بول پڑی "آپ کلثوم کے لیے کوشش کریں ...وئی اچھا لڑکا دیکھیں کہیں۔"

...ل۔ امّاں بتا رہی تھیں۔ بوا ایک دو جگہ سے پیغام لائی تو ہیں۔"

...چھا۔" وہ حیران ہوئی۔ "مجھے امّاں نے نہیں بتایا۔"

...ج ہی تو آئی تھیں بوا۔ تمہارے پاس امّاں بیٹھیں گی تو ضرور بتائیں گی۔" وہ پُرسوچ انداز میں ...نے لگی۔ اُسی وقت ہما انہیں پکارتی ہوئی آگئی۔

...لیں بھئی آپی اور چھوٹی آپا، کھانا لگ چکا ہے۔"

...وئی خاص چیز بھی بنائی ہے یا وہی روزمرہ کا کھانا ہے۔" وہ اُٹھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

...ہمان نہیں ہیں ہم۔" صوفیہ نے فوراً ٹوکا۔ پھر اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہی کمرے سے نکلی۔ ...اور مہروز دسترخوان پر آ چکے تھے۔ وہ دونوں بھی بیٹھ گئیں۔

...ر کھانے کے بعد جب کلثوم نے چائے کا پوچھا تو مہروز کہنے لگا۔

...ئے نہیں۔ چلو تم لوگوں کو آئس کریم کھلا لاؤں۔"

...ی۔؟" ہما نے خوشی کا اظہار کیا۔

...کل سچ۔" وہ ہنسا پھر اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا "چلیں ربیعہ، آپ بھی ہمارے ساتھ ...ہیں۔"

...یں بھئی، میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔" وہ واقعی نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن صوفیہ نے رُوٹھ

جانے کی دھمکی دی تو اُسے آمادہ ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ لاکھ اپنے آپ کو بدل ڈالے لیکن یہ طے تھا کہ وہ نہ رُوٹھتی تھی اور نہ رُوٹھنے دیتی تھی۔ پتا نہیں کیسے اس کے اندر یہ خوف جڑ پکڑ گیا تھا کہ کبھی وہ رُوٹھی یا کوئی اس سے رُوٹھا تو ہر دو صورتوں میں رُوٹھنے والا یا منانے والا جان سے گزر جائے گا، اس لیے اس کا کہنا تھا کہ نہ رُوٹھو اور نہ مجھے رُوٹھنے دو۔"

پھر اماں اور ابا میاں سے اجازت لے کر وہ سب باہر نکل آئے۔ کچھ شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے، اس لیے شاید نو بجے ہی سب گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ گلیاں اور گھر کے قریب والی سڑک سنسان تھی۔ لیکن جب گاڑی مین روڈ پر آئی تو تب کچھ گہما گہمی کا احساس ہوا۔

"کہاں چلیں؟" مہروز گردن موڑ کر ان تینوں سے پوچھنے لگا۔

"میرا خیال ہے کسی قریبی کولڈ کارنر سے کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں۔" ربیعہ نے فوراً اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں مہروز بھائی۔ آپی تو بس ایسے ہی بور کریں گی۔" ہما اس کے گھورنے کے باوجود اپنی کہہ گئی۔ "ہم طارق روڈ جائیں گے۔ اور اگر طارق روڈ جانے سے پہلے آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے بڑی آپا کے گھر لے چلیں تو ہم ساری زندگی آپ کو دعائیں دیتے رہیں گے۔"

"کیا بدتمیزی ہے ہما؟" اس نے ڈانٹا۔ "اتنے لمبے چوڑے پروگرام کی کیا ضرورت ہے؟ آخر انہیں گھر بھی جانا ہے۔"

"ہماری فکر مت کرو۔" صوفیہ نے اُسے ٹوکا، پھر مہروز سے کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے مہروز، پہلے بڑی آپا کے گھر چلیں۔ ہمیں بھی کافی دن ہو گئے ہیں وہاں گئے ہوئے۔" مہروز نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی بڑی آپا کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔ ساتھ ہی کیسٹ پلیئر بھی آن کر دیا۔

اس نے ایک نظر ساتھ بیٹھی ہما اور کلثوم پر ڈالی، پھر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک تو دن بھر کی تھکی ہوئی تھی، دوسرے گاڑی کے اندر مدھم سُروں میں بجتی موسیقی اور کھڑکی سے آتی مست ہوا کے جھونکے، اُسے نیند آنے لگی۔ ایک میٹھی اور پُرسکون نیند جیسے کوئی ہلکے ہلکے تھپک کر سُلا رہا ہو۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی، تب اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سب سے پہلے نیچے اُتر آئی۔ سب کے آنے تک وہ کال بیل پر انگلی رکھ چکی تھی۔ گیٹ عاصم بھائی نے کھولا۔ ان سب کو دیکھ کر حیرت اور خوشی کا ملا جُلا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

"تم لوگ کیسے راستہ بھول گئے؟"

"ہم تو راستہ بھول بھی جاتے ہیں۔ آپ تو بھولتے بھی نہیں۔" مہروز ان سے مصافحہ کرتا شکوہ کرنے لگا۔

"کیا کروں یار؟ وقت ہی نہیں ملتا۔ خیر اندر تو آؤ۔" وہ سب کو لیے ہوئے اندر آ۔ تو چاروں بہنیں بڑی آپا کو نظر انداز کرتی ہوئی، اُن کے دونوں بچوں پر جھپٹ پڑیں۔

"ارے رے۔" بڑی آپا چیخیں۔ "ابھی ابھی دونوں سوئے ہیں۔"

اُنہوں نے جیسے سُنا ہی نہیں، گود میں لے کر گُدگُدانے لگیں، جس سے چھوٹی گڑیا نے رونا شروع کر دیا۔

"دیکھا، نیند میں سے اُٹھا دیا ناں، اب یہ روتی رہے گی۔" آپا ہلکی سی خفگی سے بولیں۔

"کوئی نہیں۔ ہم ابھی چُپ کرائے دیتے ہیں۔" کلثوم اُسے بازوؤں میں جھُلانے لگی۔

"اچھا تم لوگ بیٹھو۔"

"جی نہیں۔ ہم آپ سے ملنے نہیں آئے۔ ہم کاشی اور گڑیا سے ملنے آئے ہیں۔"

"اور کیا۔ اور بڑی آپا آپ نہیں آتی، نہ آئیں لیکن بچوں کو ضرور بھیج دیا کریں۔"

"اچھا۔" بڑی آپا ہنسیں۔ پھر ربیعہ کو فارغ دیکھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور ...نتی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

"اچھا۔" وہ جھینپ کر ہنسی۔

"میرے پاس آ کر رہو ناں، کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔"

"کیسے آؤں آپا۔ سارا دن تو آفس میں گزر جاتا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ رات میں کچھ دیر مل کر بیٹھا کریں گے۔"

"لیکن یہاں سے آفس جانے کی پرابلم ہوگی۔ وہاں سے تو ڈائریکٹ بس مل جاتی ہے۔" وہ سادگی سے بولی اور بڑی آپا پیار بھری خفگی سے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"خوامخواہ بہانے مت بناؤ۔ یہاں سے آفس جانے کی کیا پرابلم ہے؟ صبح عاصم کے ساتھ ...جایا کرنا اور واپسی میں وہ لیتے بھی آئیں گے۔"

"آؤں گی۔" اُسے ہامی بھرنی پڑی۔ "لیکن ابھی نہیں، میرا شارٹ ہینڈ کا کورس مکمل ہو جائے ...ب۔"

"کیا بات ہے بھئی، چائے وغیرہ کا پروگرام نہیں ہے؟" عاصم بڑی آپا کو مخاطب کر کے بولے ...وہ فوراً اُٹھنے لگی تھیں کہ سب نے روک دیا۔

"نہیں عاصم بھائی اب ہم چلیں گے۔"

"کیوں بھئی؟"

"اصل میں اس وقت ہم آئسکریم کھانے نکلے ہیں۔ اگر چائے پی لی تو آئسکریم سے محروم رہ جائیں ...گے۔" ہما کو آئسکریم بہت پسند تھی، اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔

"چلو تو میں آئسکریم یہیں منگوا لیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ آپ کی طرف آئسکریم اُدھار رہی۔ ابھی تو ہم مہروز بھائی کی جیب خالی کرائیں گے۔"

"بھئی، میرا تو چائے پینے کا موڈ ہے۔" مہروز شرارت سے بولا۔ اور اطمینان سے سامنے ...ل پر ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ ہما نے فوراً ٹیبل اپنی طرف گھسیٹ لی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے پیر پسار کر بیٹھنے کی، چلیں اُٹھیں۔"

"ہاں مہروز بھائی، یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔ چلیں جلدی اُٹھیں۔" کلثوم نے بھی ہما کی تائید کی تو ...ربیعہ کی طرف دیکھنے لگا، جو آج بھی اسے اسی پُرانے حوالے سے عزیز تھی۔ دل چاہا گذشتہ کی طرح ...ل شوخ جُملہ کہہ کر اُسے چونکا دے۔ اور اگر یہ یقین ہوتا کہ وہ چونک کر اسی طرح پیار بھری خفگی ...دیکھنے لگے گی تو ضرور کوئی ایسی بات کہہ جاتا۔

"چلیں ناں۔" کلثوم اور ہما اصرار کرنے لگیں۔ اور وہ اسے چونکانے کی خاطر بس اسی قدر کہہ سکا۔ ...ربیعہ کہیں گی تو چلوں گا۔"

"...میں۔" وہ سچ مچ چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے چہرے پر اُسی پُرانے تعلق کی ...ائیاں دیکھ کر لمحہ بھر کو کانپ گئی۔ پھر فوراً سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں۔ میں نے کب منع کیا ہے۔"

"گویا آپ بھی میری جیب کی دُشمن ہیں۔"

"بالکل۔"

"پھر تو اُٹھنا پڑے گا۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ پھر سب سے پہلے بڑی آپا کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا تو اُن سب نے بھی اُس کی تقلید کی۔

طارق روڈ سے آئسکریم کھاتے ہوئے جب گھر واپس آئے تو بارہ بج رہے تھے۔ امّاں اُن سب کے انتظار میں برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ دیر سے آنے پر سرزنش کرتیں ہما نے اُن کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"پیاری امّاں، کچھ کہیے گا مت۔ کیونکہ ہم پہلے بڑی آپا کے گھر چلے گئے تھے۔"

"یہ کوئی وقت ہے اُس کے گھر جانے کا۔" امّاں بگڑنے لگیں۔

"ابھی تھوڑی، جب یہاں سے نکلے تھے تو سیدھا وہیں گئے تھے۔ اس وقت نو ہی تو بجے تھے۔"

"کیا حال ہے اُس کا اور اُس کے بچّوں کا؟" امّاں نرم پڑتے ہوئے بڑی آپا کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اور چھوٹی گڑیا تو ماشاءاللہ بہت پیاری ہوگئی ہے۔" اُس نے ... دیر ... کر ہما کی بات سنی اور پھر چپ چاپ اندر چلی گئی۔

وقت کا اپنا انداز ہے۔ اس کا پہیّہ صدیوں سے اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا ہے البتہ انسان کے احساسات و محسوسات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک دم فراغت، کرنے کو کچھ نہ ہو یا کسی بات کو اپنے اوپر طاری کر لو تو الزام وقت کے سر کہ وقت رینگ رہا ہے۔ ایک ہی موسم میں ٹھہر گیا ہے۔ خاص کر اداسیوں کے موسم میں ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔ اور جب یہ موسم بیت جائے، ساتھ ہی بے پناہ مصروفیات گھیر لیں تو پھر یہی وقت بھاگتا ہوا لگتا ہے۔

وہ بھی رینگتے وقت سے نکل آئی تھی۔ بے پناہ مصروفیات میں گھر کر پتا ہی نہ چلا کہ کتنا وقت بیت گیا ہے۔ وہ ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ مکمل کر کے کمپیوٹر کا کورس بھی کر چکی تھی اور اب ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر رہی تھی پُرکشش تنخواہ کے ساتھ۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے آفس کا ماحول بھی بہت اچھا مِلا تھا۔ یوں اچھے لوگوں کے ساتھ کام کرنے اور اُن کے درمیان اُٹھنے بیٹھنے سے جہاں اُس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوا تھا، وہاں وہ بہت پُراعتماد بھی ہوگئی تھی گو کہ اُس کے مزاج میں سادگی ویسے ہی تھی اور یہ سادگی اُس کے سراپے میں بھی جھلکتی تھی لیکن اس سادگی نے اسے جو وقار بخشا تھا، اُس کی بدولت وہ اکثر سب میں نمایاں نظر آتی تھی۔ پھر اُس کے اندر محنت کا جذبہ بھی تھا۔ اپنا کام پوری ایمانداری اور لگن سے کرتی تھی۔ اس لیے کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی بلکہ مختصر عرصہ میں اُس نے اپنا ایک الگ مقام بنالیا تھا۔

امّاں کے گھر میں ساری زندگی ایک ابّا میاں کمانے والے رہے اور کوئی بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے امّاں نے بلکہ گھر کے کسی فرد نے یہ تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ اس گھر کی آمدنی میں کبھی اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ امّاں ساری زندگی قناعت کرتی رہیں اور یہی سبق اولاد کو بھی دیا تھا۔ اب جب آمدنی میں دوگنا بلکہ تین گنا اضافہ ہوا، تب بھی امّاں اپنی پرانی ڈگر سے ہٹنے کو تیار نہ ہوئیں۔ اوّل تو وہ بیٹی کی تنخواہ کے روپے لینے کو آمادہ ہی نہیں تھیں۔ لیکن جب اُس نے اپنی قسم دینے کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ کچھ کھا کر سو رہے گی، تب مجبوراً انہیں لینے پڑے۔ پھر بھی خرچ کرنے کو تیار نہ ہوئیں۔ اُن کا کہنا تھا۔

"ہماری دال روٹی تو چل ہی رہی ہے۔ اور خرچ کا کیا ہے جتنا بڑھائیں گے اُتنا ہی بڑھ جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس اضافی آمدنی کو کل کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔"

ہما اور کلثوم لاکھ کسی چیز کی فرمائش کرتیں، کوئی نیا کپڑا بنانے کے لیے اصرار کرتی رہ جاتیں۔ ... اُن کا وہی پُرانا جواب ہوتا۔

"کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس نہیں ہے۔"

"سب کچھ ہے آپ کے پاس۔ ناشکری کیوں کرتی ہیں؟" ایک دن ہما نے ٹوک ہی دیا اور ... کے بعد جو اُس کی شامت آئی۔ توبہ بےچاری اگلے کئی دن تک منہ چھپائے پھری۔

چھٹی کا دن تھا اور اس دن وہ اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ کپڑے دھوتی اور سوکھنے کے بعد ... پریس کر کے رکھتی تھی۔ شروع میں ایک بار امّاں نے کہا تھا کہ یہ کام چھوٹی بہنیں کر دیا کریں ... لیکن اُس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنا کام خود کرے گی۔

اس وقت بھی وہ کپڑے دھونے کے بعد انہیں تار پر پھیلا رہی تھی کہ کلثوم اور ہما کی کوئی ... کہ دوست آگئی۔ وہ دونوں اس کے باتوں میں اتنی مگن ہوئیں کہ دوپہر کے کھانے کی فکر ہی ... اتی رہی۔ ... تک کہ اپنی دوست کو چائے پانی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔

وہ اُن دونوں کی لاپرواہی پر انہیں دل ہی دل میں سخت سُست کہتی ہوئی کپڑوں سے فارغ ... کچن میں چلی آئی۔ پتا نہیں دونوں میں سے کون چاول چن رہی تھی کہ یونہی تھال نیچے رکھ کر ... گئی تھی۔ دال بھی ویسے ہی رکھی تھی۔ اُس نے دونوں برتن اُٹھا کر شیلف پر رکھے، پھر ... چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر ٹرے میں کپ رکھنے لگی۔ اس وقت امّاں کسی کام سے اِدھر آئیں تو ... چائے بناتے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"تم کیوں چائے بنا رہی ہو؟ جب ان دونوں کو ہی خیال نہیں ہے تو۔"

"کوئی بات نہیں امّاں۔ غالباً بہت دنوں کے بعد ملی ہیں، جبھی سب بھلائے بیٹھی ہیں۔"

"اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہے۔" امّاں نے اپنے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہو جائیں گی۔" اُس نے دونوں کی طرفداری کی تو امّاں خاموش ہو رہیں۔

پھر اُس نے جلدی سے ٹی پاٹ میں چائے دَم کی اور ٹرے اُٹھا کر ڈرائنگ روم کی طرف آ... دروازے سے داخل ہو رہی تھی کہ ایک نام سماعتوں سے ٹکرایا۔ وہ شاید توجہ نہ دیتی لیکن اندر ... دیکھتے ہی کلثوم پر نظر پڑی جس کے ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی اور آنکھیں کسی ... سے چمکتی ہوئیں بہت سی اَن کہی داستانوں کا پتا دے رہی تھیں۔ اور وہ اب ناداں نہیں ... ایک پل میں اُس کے تصوّر تک رسائی حاصل کر گئی۔

"... آپی آپ۔" اُسے دیکھ کر ہما چونکی اور فوراً اُٹھ کر اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر ٹیبل ... تی ہوئی اپنی دوست کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"... ثمینہ۔ یہ ہماری آپی ہیں۔"

"السلام علیکم۔" ثمینہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو بھئی، کھڑی کیوں ہوگئیں؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"... دونوں آپ کا بہت ذکر کرتی ہیں اور تعریف بھی۔" ثمینہ بیٹھتی ہوئی بولی۔

"... اچھا۔" وہ ہنسی۔ "لیکن میں ان کی تعریف نہیں کروں گی۔"

"... کیوں آپی؟" ہما فوراً پوچھنے لگی۔

"... اس لیے کہ تم دونوں بہت لاپروا ہو۔ اتنی دیر سے تمہاری دوست آئی ہوئی ہے۔ اور تم نے ... چائے تک نہیں پلائی۔"

"... اصل میں ہم باتوں میں۔"

"مجھے پتا ہے اور اب اس سے پہلے کہ چائے ٹھنڈی ہو، اُسے پیش کرو۔" وہ بات کاٹ کر بولا۔
"آپ بھی آئیں ناں۔"
"نہیں بس، مجھے کام ہے۔" وہ وہیں سے واپس چلی آئی۔ امّاں کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھیں، وہ فوراً اُن کے سر پر پہنچ گئی۔
"آپ ہٹ جائیں امّاں ۔ میں پکا لوں گی۔"
"ابھی تو کپڑے دھو کر ہٹی ہو۔"
"تو کیا ہوا، بس آپ ہٹیں ۔" وہ زبردستی انہیں اندر بھیج کر خود اُن کی جگہ کھڑی ہو گئی۔ پھر مختلف کام کرتے ہوئے اچانک اُس کا دھیان کلثوم اور ہما کی طرف چلا گیا۔ ساتھ ہی وہ نام یاد آیا جو اُن کی دوست کے ہونٹوں سے نکلا تھا اور کلثوم کے چہرے کو قوس و قزح کی سوغات دے گیا تھا۔
"جنید ربانی ۔" اس نے دہرایا ہی تھا کہ وقت کا پہیہ اُلٹا چلنے لگا۔ کلثوم کی جگہ وہ خود تھی اور ثمینہ کی جگہ انیلا آن کھڑی ہوئی تھی۔
"ثاقب حسن ۔" ہونٹوں نے اس نام کو کیا چھوا کہ آنکھوں میں نمی اُتر آئی ۔
"اونہوں ۔ جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں ، اُن میں پانی نہیں اُترنا چاہیے۔" اُس کی آواز کی بازگشت چاروں طرف سنائی دینے لگی۔ تو وہ گھبرا کر اندر چلی آئی ۔
"کیا ہوا ؟" امّاں اُس کی اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔
"کچھ نہیں امّاں ۔ میرا سر چکرانے لگا ہے ۔ آپ کلثوم سے کہیں، وہ کھانا بنا دے گی۔"
"میں نے تو پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا۔ جاؤ کچھ دیر آرام کر لو۔"
"ہاں میں سونے جا رہی ہوں ، اگر خود سے اُٹھ گئی تو ٹھیک ورنہ خاص طور سے کھانے کے لیے مت اُٹھائیے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ چھوٹے کمرے میں چلی آئی اور اپنی چارپائی پر لیٹتے ہی سر تک چادر اوڑھ لی۔ پھر عہدِ رفتہ سے دامن چھڑانے کی اُس نے کوئی کوشش نہیں کی۔
"تم تو بس ۔ اتنا کرو میری جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سجاؤ۔" ہر مقام پر اُسے آزردگیوں سے نکالنے کی خاطر وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔
"ثاقب حسن ۔ محبتیں تو سکھائی تھیں پھر اُن پر سے اعتبار کیوں اُٹھا دیا میرا کہ اب سب دھوکا اور فریب لگتا ہے۔" آنکھوں کے اندر ٹھہرا پانی مچلنے لگا تو اُس نے سارے حفاظتی بند ہٹا دیے۔ اور پھر یادوں اور اشکوں کے سیلِ رواں میں بہتے ہوئے جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔
پھر جب دوپہر ڈھل رہی تھی تب وہ اُٹھی۔ کچھ دیر تک تو یونہی خالی الذہن سی چھت پر نظریں جمائے رہی، پھر اچانک ہر طرف خاموشی کا احساس ہوا تو اُٹھ بیٹھی۔ کمرے سے نکل کر آئی تو دیکھا، امّاں، کلثوم اور ہما سو رہی تھیں۔ بے خیالی میں اُس کی نظریں کلثوم کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔ اُسے لگا جیسے وہ اُس کی بند پلکوں کے اندر تک رسائی حاصل کر چکی ہے ۔
"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ؟" اُس نے سر جھٹکا اور برآمدے میں نکل آئی ـــــ گرمیوں کی دھوپ نے پورے وجود میں حبس سا بھر دیا تھا۔ اُس نے سوچا امّاں کے اُٹھنے سے پہلے ہی نہا لے ورنہ وہ اس وقت نہانے کو منع کریں گی۔ پھر وہ جلدی سے اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو طبیعت کا بوجھل پن قدرے دُور ہو چکا تھا۔ البتہ نامعلوم سی اُداسیاں اب بھی اُس کی گھیراؤ کیے ہوئے تھیں۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھ کر گیلے بالوں میں برش کرنے لگی۔
"تم اِس وقت نہائی ہو۔" امّاں پتا نہیں کب اُٹھ کر آ گئیں۔ وہ خاموش رہی۔
"کھانا بھی کھایا یا نہیں ؟" اُس کے خاموش رہنے پر امّاں پوچھنے لگیں۔

"بھوک نہیں ہے۔"
"چائے بنا دوں ؟"
"آپ رہنے دیں، میں بنا لوں گی۔"
اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی ۔ پھر وہاں سے رات کا کھانا بنانے کے بعد ہی ...لی تھی۔
"سنو۔" رات میں جب وہ تینوں فراغت سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو وہ اچانک سرگوشی میں ...ہنے لگی "ایک بات پوچھوں، تم دونوں اُس کا پوری ایمانداری سے جواب دینا۔"
"پوچھیں ۔" کلثوم اور ہما اس کے رازدارانہ انداز پر قدرے اُس کی طرف جھک گئیں۔
"یہ جنید کون ہے ۔ ؟" اُس نے پوچھا تو وہ دونوں اس پر سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے ...طرف دیکھنے لگیں۔
"مجھ سے چھپانے کی کوشش فضول ہو گی کیونکہ میں سب سن چکی ہوں ۔" اُس نے مبالغہ آرائی ...سے کام لیا جب کہ اُس نے صرف نام سنا تھا۔
"بتا دوں ؟" ہما کلثوم سے پوچھنے لگی اور اُس کے سر جھکانے پر بولی ۔" وہ ثمینہ کا بھائی ہے۔ ...ر کلثوم کو بلکہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"
"کب سے ؟" وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی ۔
"جب سے ہم نے کالج جانا شروع کیا تھا۔"
"کیا کرتا ہے وہ ؟" اُس نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا۔
"پہلے تو بے کار تھا لیکن آج ثمینہ بتا رہی تھی، اُسے کہیں جاب مل گئی ہے۔"
"اُس کے ارادے کیا ہیں ؟"
"وہ کلثوم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور آج ثمینہ یہی کہنے آئی تھی کہ وہ اپنی امّی کو لانا چاہتی ہے۔ لیکن آپی امّاں نہیں مانیں گی۔" ہما نے فوراً خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔
"کیوں ؟"
"اس لیے آپی کہ وہ کوئی بہت بڑے لوگ نہیں ہیں۔ اور آپ تو جانتی ہیں کہ امّاں۔"
"ہاں، میں جانتی ہوں ۔" وہ فوراً بول پڑی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔" بہرحال تم ثمینہ ...سے کہنا وہ اپنی امّی کو لے آئے، ہم جنید کو دیکھنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"
"لیکن آپی ۔"
"اوں ہوں ۔" اُس نے ٹوک دیا۔" قبل از وقت اندیشوں میں مت گھرو ۔ اگر جنید اچھا لڑکا ...ہے تو امّاں کو ماننا پڑے گا۔ اور کلثوم نے اپنی آنکھوں میں جو خواب سجا لیے ہیں، میں اُنہیں ...ٹوٹنے نہیں دوں گی۔" اُس نے بہت پُریقین لہجے میں کہا تھا اور اُس کے لہجے کا عزم کلثوم کو ...ابوں کی تعبیر دے گیا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

کبھی چھوٹی آپا نے اُسے حوصلہ دیا تھا۔ اور اپنے طور پر تو اُنہوں نے کوشش بھی کی تھی کہ اُس کی ...ں پر سجے خواب ٹوٹنے نہ پائیں ۔ لیکن قسمت نے اُس کا ساتھ نہیں دیا تھا ۔ اور اب وہ کلثوم کو ...صلہ دیتے ہوئے اس کی پلکوں پر سجے خوابوں کو تعبیر دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔
پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ثمینہ اپنی امّی کو لے آئی۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھی۔ اگر ہوتی ...اسی وقت انہیں کوئی حوصلہ افزا جواب دیتی۔ لیکن امّاں نے آئندہ پر ٹال دیا تھا۔ اور شاید دل میں ...یں انکار کرنے کا ٹھان چکی تھیں، جب ہی اس سے ذکر بھی نہیں کیا۔ اُسے ہما کی زبانی ثمینہ کی امّی کی

آمد کا علم ہوا اور اگلے دو تین روز تک وہ انتظار کرتی رہی کہ اماں اُس سے تذکرہ کریں گی لیکن جب اُن کا ایسا کوئی اِرادہ نظر نہیں آیا، تب اُسے خود ہی بات چھیڑنی پڑی۔

"اماں ۔ ثمینہ کی والدہ آئی تھیں؟۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟۔" اماں چونک کر پوچھنے لگیں۔

"بس معلوم ہو گیا۔ یہ بتائیے آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟۔"

"کیسا جواب؟۔"

"انجان مت بنیں اماں ۔ میں سب جانتی ہوں، مجھے صاف صاف بتائیں۔"

"صاف سننا چاہتی ہو تو سنو۔ میں کلثوم کی شادی وہاں نہیں کروں گی۔" اماں نے صاف الفاظ میں انکار کیا۔

"کیوں؟۔" وہ اپنی جگہ جم گئی۔

"کیوں کا کیا سوال، بس مجھے نہیں پسند۔" اماں بات ختم کرنا چاہتی تھیں۔

"نہیں اماں، لڑکے کو دیکھے اور جانے بغیر آپ کیسے کہہ رہی ہیں کہ آپ کو پسند نہیں۔"

"دیکھنے کی کیا بات ہے، اُن کے حالات ہی ایسے ہیں۔" اصل وجہ اماں کے ہونٹوں پر آ ہی گئی۔

"کیسے ہیں حالات؟۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"باپ سر پر ہے نہیں اور یہ لڑکا اکیلا کمانے والا۔ جب کہ ۔"

"بس کریں اماں ۔" وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے چیخ پڑی۔ "مجھے دیکھیں، میرے لیے بھی آپ نے اسی انداز سے سوچا تھا، پھر کیا مِلا مجھے؟۔ ایک بار رُسوائی اور دُوسری بار بیوگی کی سفید چادر، اس کے علاوہ کیا مِلا مجھے؟۔ نہ خوشی، نہ سکون اور دونوں بار تین کپڑوں میں نکلی۔ اَب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ میری قسمت ہی ایسی تھی۔ نہیں اماں، یہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہوا کیونکہ آپ کو قسمت پر یقین ہی نہیں۔" وہ اچانک پھٹ پڑی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟۔" اماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔ اگر آپ میرے حالات کی ذمّہ دار خود کو نہیں سمجھتیں، تب بھی آپ کو اپنی سوچ ضرور بدل لینی چاہیے تھی لیکن آپ اب بھی اپنی سوچ پر قائم ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟۔" اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"صرف اِتنا کہ جو کچھ میرے ساتھ کیا، وہ کلثوم کے ساتھ مت کیجیے۔ ایک ہی کہانی کو دوبارہ مت دہرایئے اماں، اگر قسمت پر یقین رکھتی ہیں تو صرف جنید کے بارے میں جان کر فیصلہ کر لیجیے۔ یقین کیجیے، اگر کلثوم کے نصیب میں خوشحالی اور آسودگی لکھی ہو گی تو جنید کے توسط سے ہی مِل جائے گی ورنہ میری طرح سب حاصل ہو کر بھی خالی ہاتھ۔"

اُس کی آواز ساتھ چھوڑ گئی تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چُھپا کر اپنے کمرے میں چلی گئی جب کہ اماں کتنی دیر تک بے حس و حرکت وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

اُس نے کہنے کو تو اماں سے سب کہہ دیا تھا۔ جذبات میں آ کر اپنی تباہی کا ذمّہ دار بھی اُنہیں ٹھہرا گئی تھی لیکن اب اُن کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔ صبح بہت خاموشی سے ناشتا کر کے نکل جاتی اور واپسی میں اماں اندر ہوتیں تو وہ باہر اور اماں باہر ہوتیں تو وہ اندر۔ کلثوم اور ہُما الگ اپنی جگہ چور سی بنی ہوئی تھیں۔ اُن کا سر جوڑ کر بیٹھنا، سرگوشیوں میں باتیں کرنا اور دبی دبی مُسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز نظروں سے ایک دُوسرے کو دیکھنا سب ختم ہو گیا تھا۔ دونوں الگ الگ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔

اس کھینچا تانی نے گھر کی فضا کو عجیب سا رنگ دے دیا تھا۔ کوئی ضروری بات بھی ہوتی تو ایک دُوسرے سے نظریں چُرا کر کی جاتیں، زندگی میں کوئی گہما گہمی تو پہلے بھی نہ تھی اور اب تو بالکل ہی پھیکی اور بے کیف سی لگنے لگی تھی۔

اُس شام وہ آفس سے لوٹی تو اماں گھر میں نہیں تھیں اور اتنے دنوں بعد ہُما بے اختیار اُس کے گلے ے بازو ڈالتی ہوئی بولی۔

"ایک اچھی خبر ہے آپی۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"چھوٹی آپا کے جڑواں بیٹے ہوئے ہیں۔"

"کیا ۔؟۔" اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"ہاں، ہم ایک بیٹے کی دُعا کر رہے تھے اور اللہ میاں نے دو بیٹے ایک ساتھ دے دیئے۔"

"چھوٹی آپا کیسی ہیں؟۔"

"ٹھیک ہیں، اماں اُن ہی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔"

"اچھا ۔" وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔ چھوٹی آپا اور اُن کے پہلو میں دو بچوں کا تصوّر اُس کے ہونٹوں سکراہٹ لے آیا۔

"لیجیے، مٹھائی کھائیں۔" کلثوم نے مٹھائی کی پلیٹ اُس کے سامنے کر دی۔

"یہ کون لایا ہے؟۔" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"مہروز بھائی۔"

"خوش ہوں گے مہروز؟۔"

"ہاں، بہت چہک رہے تھے۔" اُس نے پلیٹ میں سے ایک گلاب جامن اُٹھایا، پھر پوچھنے ی۔

"اماں وہیں رہیں گی کیا؟۔"

"پتا نہیں۔" دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ دیوار سے کمر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے، میں ابھی چھوٹی آپا کو دیکھ آؤں۔ ہیں کہاں وہ؟۔"

"ڈاکٹر شبنم کے کلینک میں۔"

"پھر تو میں جا سکتی ہوں۔" وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "کل آفس کے بعد اُن کے پاس سے ہوتی وئی آؤں گی۔"

"آپی، ہمیں بھی لے چلیے گا ناں۔" ہُما منّت سے بولی۔

"تمہارا کیا ہے، تم تو کسی بھی وقت اُن کے گھر بھی جا سکتی ہو جب کہ ۔" وہ خاموش ہو گئی اور پھر اسی رح اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

اگلے دن اُس کا آفس میں بالکل دل نہیں لگا۔ مسلسل دھیان صوفیہ کی طرف رہا۔ بار بار گھڑی دیکھتی اور لگ رہا تھا، وقت جیسے رُک گیا ہے۔ شام تک انتظار نہیں کر سکی اور لنچ ٹائم میں ہی چھٹی لے کر آفس سے نکل آئی۔ ڈاکٹر شبنم کا کلینک یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا، اس لیے وہ بس کا انتظار کرنے کے بجائے رکشے میں چلی گئی۔

کوریڈور میں ایک نرس کو روک کر صوفیہ کے بارے میں پوچھا اور جس طرف اُس نے اشارہ کیا، اُسی طرف چل پڑی۔ مطلوبہ کمرے کے سامنے رُک کر پہلے یہ یقین کیا کہ اندر صوفیہ کی ساس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو گا۔ تب قدرے اعتماد کا مظاہرہ کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اُس کا اندازہ صحیح تھا۔ سامنے ہی صوفیہ کی ساس بیٹھی تھیں۔

"السّلام علیکم ۔" وہ اُنہیں سلام کر کے فوراً صوفیہ کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی اور اس پر جُھکتی ہوئی بولی۔

"بہت مُبارک ہو چھوٹی آپا۔"

"تمہیں بھی۔" چھوٹی آپا مُسکرا کر بولیں۔

"آپ تو ٹھیک ہیں ناں۔"

"ہاں۔" پھر سرگوشی میں بولی۔ "امّی بہت خوش ہیں، اُنہیں بھی مُبارکباد دو۔"

"اچھا۔" وہ سیدھی کھڑی ہوئی، پھر پلٹ کر کہنے لگی۔ "پوتے مُبارک ہوں آنٹی۔"

"خوش رہو۔ تمہیں بھی بھانجے مُبارک ہوں۔" امّی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میں بچّوں کو دیکھ لوں؟" وہ کاٹ کی طرف بڑھتی ہوئی پتا نہیں کیوں جھجک گئی۔

"دیکھ لو۔" صوفیہ کو ہنسی آگئی۔ "دیکھنے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔"

"آپ تو بس۔" وہ جلدی سے آگے بڑھ کر کاٹ پر جُھک گئی۔

صحت منداور گول مٹول بچّے سکون سے سو رہے تھے۔ اسے بے اختیار ان پر پیار آیا تو اُنگلی سے اُن کے گال چُھو کر دیکھنے لگی۔ نرمی سے چُھونے کے باوجود بچّہ کسمسایا اور رونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُس نے گود میں اُٹھا لیا اور پھر بے اختیار ہو کر اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیے۔ پھر سینے میں بھینچا تو اُس کے اندر ممتا انگڑائیاں لینے لگی۔

"چھوٹی آپا۔" وہ اپنے آپ میں نہیں رہی۔ کھویا کھویا لہجہ اور کھوئے کھوئے انداز میں کہنے لگی۔ "اِسے مجھے دے دیں۔"

"دونوں تمہارے ہیں۔" صوفیہ سے پہلے امّی بول پڑیں۔ اُنہوں نے شاید اس کا دِل رکھنے کی خاطر کہا تھا۔

"اچھا۔" وہ بچّے کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرنے لگی۔ "اگر آپ اجازت دیں تو اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"ربیعہ۔" صوفیہ حیران ہوئی۔

"پلیز چھوٹی آپا، اسے مجھے دے دیں۔ یقین کریں میں اس کی پرورش میں کبھی کوتاہی نہیں کروں گی۔" وہ عجیب منّت بھرے انداز میں بولی۔

"لیکن ابھی یہ بہت چھوٹا ہے، ذرا بڑا ہو جائے پھر۔"

"اچھا۔" وہ مایوس نظر آنے لگی۔ ساتھ ہی ناتمام آرزوؤں کا عکس چہرے پر اُتر آیا تھا۔ بہت آہستگی سے بچّے کو دوبارہ کاٹ میں لٹا دیا۔

"اچھا، میں چلوں۔" اپنی بات کہہ کر فوراً پلٹی تو دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے مہروز کے ساتھ شہروز احمد کھڑے تھے۔

اور وہ جو خاصی پُراعتماد ہو گئی تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اب ہر قسم کے حالات کا سامنا کر سکتی ہے، شہروز احمد کو اچانک سامنے دیکھ کر ساری خود اعتمادی دھری کی دھری رہ گئی۔ یا پھر شاید اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی اُن سے یوں بھی سامنا ہو جائے گا۔ بہت کوشش کی کہ مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی اُن کے قریب سے نکل جائے لیکن ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی، بمشکل اپنا رُخ موڑ سکی۔

عجیب سی صورتحال ہو گئی تھی کہ سب اپنی اپنی جگہ خاموش۔ اور شہروز احمد محض امّی کی موجودگی کی وجہ سے اپنی پوزیشن آکورڈ محسوس کر رہے تھے۔ اگر امّی اس وقت یہاں موجود نہ ہوتیں تو وہ اگر اس کی طرف پیش قدمی نہ کرتے تو واپس ضرور پلٹ جاتے۔ کتنے لمحے چُپ چاپ سرک گئے۔ پھر اس خاموش فضا میں ارتعاش بچّے کے رونے کی آواز سے پیدا ہوا، اس کے بعد ہر شے جیسے حرکت میں آگئی۔

صوفیہ کے ساتھ اُس نے بھی گردن گُھما کر کاٹ کی طرف دیکھا۔ امّی اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگئیں۔ مہروز بے اختیار آگے بڑھا اور شہروز احمد بے آواز قدموں سے باہر نکل گئے۔

"اسے بُھوک لگی ہے۔" امّی نے کہا تو صوفیہ اس سے کہنے لگی۔

"ربیعہ پلیز، ذرا اس کا دُودھ بنا دو۔"

وہ چُپ چاپ میز کی طرف بڑھ گئی۔ اور کپ میں دُودھ بنا کر دوبارہ کاٹ کے پاس آئی اور خود

چ سے بچّے کے منہ میں دُودھ ڈالنے لگی۔ اس وقت اس کے اندر کی ممتا چہرے اور آنکھوں میں سمٹ ئی۔ مہروز کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر پلٹ کر دُوسرے بیڈ پر جا بیٹھا۔ وہ بچّے کو دُودھ پلا کر تو کہنے لگی۔

اچھا چھوٹی آپا، میں اَب چلتی ہوں۔"

کہاں جائیں گی؟ میرا مطلب ہے آفس یا گھر؟" مہروز پُوچھنے لگا۔

گھر جاؤں گی۔"

کچھ دیر رُک جائیں، میرے ساتھ چلیے گا، میں آپ کو گھر چھوڑ دوں گا۔"

وہ منع کرنا چاہتی تھی کہ صوفیہ بول پڑی۔

مہروز ٹھیک کہہ رہے ہیں، اِن کے ساتھ چلی جانا۔"

آؤ یہاں آ کر بیٹھو۔" اسے شش و پنج میں دیکھ کر امّی بولیں جیسے جانتی ہوں کہ وہ اُن کی بات سے نہیں کرے گی۔

اور امّی کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتیں، تب بھی وہ بڑائی کا خیال کرتے ہوئے انکار نہ کرتی، اس لیے شی سے بیڈ کے قریب رکھی کُرسی پر بیٹھ گئی اور دُزدیدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی، جہاں احمد کھڑے تھے۔ اب وہ وہاں نہیں تھے۔ اُس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور یونہی بات نے کی غرض سے صوفیہ سے پُوچھنے لگی۔

آپ کب تک یہاں رہیں گی؟"

غالباً پانچ چھ دن۔"

اُسی وقت ڈاکٹر صاحبہ راؤنڈ پر آگئیں تو مہروز اُٹھ کر باہر آگیا۔ کاریڈور کے آخری سرے پر ریلنگ سہارے شہروز احمد کھڑے نظر آئے تو وہ ان ہی کے پاس چلا آیا۔

آپ یہاں کیوں آگئے؟" قریب پہنچ کر اُس نے پوچھا لیکن پھر اپنا سوال احمقانہ لگا۔ کچھ خجل سا ہو لجھانے لگا تو شہروز احمد ہلکے سے ہنس دیے۔

تم یہاں کیوں آگئے؟"

ڈاکٹر صاحبہ راؤنڈ پر آئی ہیں، میں اس لیے یہاں آگیا۔"

دونوں بچّے تو ٹھیک ہیں ناں؟"

"جی۔"

سُنو۔" شہروز احمد اُسے متوجّہ کر کے خاموش ہو گئے اور نظریں بھی ہاسپٹل کے احاطے سے باہر روڈ پر رواں دواں ٹریفک میں بھٹکتی چھوڑ دیں۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے؟" مہروز پُوری طرح اُن کی طرف متوجّہ تھا اور اُن کی طرف سے کسی بھی بات منتظر۔

سوچ رہا ہوں، تم سے کہوں یا نہیں، پتا نہیں تم کیا خیال کرو۔" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔

الیسی کیا بات ہے جس کے لیے آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟" مہروز کو اچنبھا ہوا۔ وہ خاموش رہے ہنے لگا۔

"آپ حکم کریں، میں کچھ خیال نہیں کروں گا۔"

وہ ایک نظر اُس پہ ڈال کر دوبارہ سامنے متوجّہ ہو گئے تو مہروز نے بے اختیار اُن کا بازو تھام کر لا۔

آپ خاموش کیوں ہیں؟ بتائیے ناں، مجھے بہت تجسس ہو رہا ہے۔"

امّی کیا کر رہی ہیں؟" اُنہوں نے کہا تو مہروز جھنجھلا گیا۔

"پتا نہیں آپ وہ بات کریں جو کرنا چاہ رہے ہیں۔"
"بُرا تو نہیں مانو گے؟۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
شہروز احمد کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتے رہے پھر قدرے سر جُھکا کر بولے۔
"ایک بچّہ مجھے دے دو۔"
"شہروز بھائی۔" وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔ "دونوں آپ کے ہیں۔"
"ہاں۔" اُنہوں نے جُھکے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا، پھر کہنے لگے۔ "لیکن ایک بچّہ جس کے میں تمام اختیارات چاہتا ہوں، اُس کے بارے میں ہر فیصلہ میں خود کروں۔"
"کیسی باتیں کرتے ہیں شہروز بھائی، آپ بڑے ہیں، ہمارے بارے میں بھی فیصلے کے اختیارات آپ کو ہیں۔ کیا میں نے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا؟۔" مہروز سعادت مندی کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔
"تم نہیں سمجھو گے۔ میرا خیال ہے، مجھے صاف لفظوں میں بتانا چاہیے۔" اُنہوں نے طویل سانس لے کر کہا تو مہروز پُوری توجہ سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔
"میں وہ بچّہ ربیعہ کی گود میں ڈالنا چاہتا ہوں۔" اپنی بات کہہ کر اُنہوں نے ذرا سا رُخ موڑا پھر کہنے لگے۔ "ابھی وہ غالباً ایسی کسی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔ اُس کی خواہش رَد مت کرو مہروز، اُس نے کبھی ہم سے کچھ نہیں مانگا۔ اور پھر وہ کوئی غیر نہیں، صوفیہ کی بہن ہے۔ بچّہ صوفیہ کے پاس رہے یا اُس کے پاس، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ آہستگی سے بولے۔
مہروز چُپ چاپ اُن کی طرف دیکھے گیا اور وہ پتا نہیں کیا سمجھے، ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ کتنی دیر تک دونوں کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہروز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور وہ سمجھے مہروز کو اُن کی بات بُری لگی ہے۔ جب ہی کہنے لگے۔
"آئی ایم سوری یار۔ میں کچھ۔"
"نہیں شہروز بھائی۔" مہروز فوراً بول پڑا۔ "مجھے آپ کی بات سے نہ اختلاف ہے، نہ انکار البتّہ امّی۔"
وہ بات اَدھوری چھوڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔
"امّی اور صوفیہ سے تم خود بات کرو۔" اُنہوں نے اپنا دامن بچایا۔
"ابھی۔؟۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"ہاں، اسے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔" وہ کسی نادیدہ نقطے پر نظریں جما کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولے تو مہروز 'او کے' کہہ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو وہ اُسے دیکھتے ہی بولی۔
"چلیں؟۔"
"ابھی چلتے ہیں۔" پھر جیسے اچانک یاد آیا تو کہنے لگا۔ "ربیعہ، پلیز آپ یہاں سے اپنی بڑی آپا کو فون کر دیں۔ میں گیا تو تھا فون کرنے لیکن مجھے اُن کا نمبر یاد نہیں رہا۔"
"کیا کہنا ہے اُن سے؟۔" وہ اُٹھتی ہوئی پُوچھنے لگی۔
"اپنے دو عدد بھانجوں کی خوشخبری سُنا دیں۔" وہ شریر مُسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اُس کا اشارہ پا کر باہر نکل آئی۔ سامنے سے آتی سسٹر سے ٹیلی فون کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے نیچے پی سی او میں جانے کے لیے کہا۔ وہ اُس کا شکریہ ادا کر کے سیڑھیاں اُتر آئی۔
"کون؟۔ ربیعہ؟۔" بڑی آپا اُس کی آواز سُن کر کہنے لگیں۔ "کہاں سے بات کر رہی ہو؟۔"
"ہاسپٹل سے۔"
"خیریت؟۔"
"ہاں، وہ چھوٹی آپا کو دیکھنے آئی تھی۔"

"کیا ہوا ہے؟۔" بڑی آپا اشتیاق سے پُوچھنے لگیں۔
"بیٹا۔ بلکہ ماشاءاللہ دو بیٹے۔"
"اچھا مُبارک ہو، یہ بتاؤ صوفیہ کیسی ہے؟۔"
"ٹھیک ہیں۔ آپ آئیں گی؟۔"
"ہاں، شام میں عاصم آئیں گے تو اُن کے ساتھ آؤں گی اور تم کیا صوفیہ کے پاس رہ رہی ہو؟۔"
"نہیں بڑی آپا۔ میں تو ابھی آفس سے چُھٹی لے کر آئی تھی، بس اَب گھر جا رہی ہوں۔"
"گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں؟۔"
"جی۔ آپ آئیں ناں کسی دن۔"
"آؤں گی۔"
"اچھا، خُدا حافظ۔"
وہ فون بند کرنے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ دل چاہ رہا تھا یہیں سے گھر چلی جائے۔ بلہ ان سب کے درمیان بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُس نے سوچا، اُسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ب صوفیہ گھر آتی، تب وہ بچّوں کو دیکھ لیتی۔ لیکن جب آ ہی گئی تھی تو یُوں چُپ چاپ واپس جانا بھی سب نہیں تھا، اِس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ اُوپر آ گئی۔
"بات ہو گئی بڑی آپا سے۔" صوفیہ اُسے دیکھتے ہی پُوچھنے لگی۔
"جی۔" وہ مختصر جواب دے کر یونہی کھڑی رہی تاکہ مہروز بھی جانے کے لیے اُٹھ جائے اور وہ ے دیکھ کر کہنے لگا۔
"کیا بات ہے، آپ کو جانے کی بہت جلدی ہے؟۔"
"ہاں، مجھے اَب چلنا چاہیے۔"
"او کے۔" وہ اُٹھا تو امّی بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گئیں۔
"آپ بیٹھیں آنٹی۔" پھر صوفیہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اچھا، چھوٹی آپا، میں چلوں۔"
"رُکو بیٹا۔" امّی نے کہا تو وہ بڑھتا قدم روک کر اُنہیں دیکھنے لگی جو بچّے کو کمبل میں لپیٹ رہی تھیں، ہاتھوں پر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔
"لو بیٹا، یہ تمہارے پاس رہے گا۔"
"جی۔" وہ حیرتوں کے ساتھ سنّاٹوں میں گھر گئی۔
"لو ربیعہ، ابھی تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں۔" صوفیہ نے کہا تو وہ فوراً بول پڑی۔
"ہاں لیکن۔ میرا مطلب ہے آپ۔ مہروز بھائی۔" اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔
"ہم سب خوشی سے اسے تمہاری گود میں دے رہے ہیں، اور پھر یہ تمہارے پاس رہے یا میرے ا، ایک ہی بات ہے۔" صوفیہ نے نرمی سے کہا۔
"چھوٹی آپا۔" وہ اسی قدر کہہ سکی اور امّی کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر بچّہ اپنے بازوؤں بھر لیا۔ اگلے پل اُسے سینے میں بھینچ کر اپنی پیشانی اُس پر ٹکائی تو آنکھوں میں پانی اُتر آیا جسے بمشکل ا نے پلکوں تک آنے سے روکا اور چہرہ اُونچا کیا تو کہنے لگی۔
"میری زندگی کے صحرا میں جو پھول آپ نے کِھلایا ہے اس کے لیے میں۔"
"کوئی شکریہ نہیں۔" مہروز فوراً بول پڑا۔
"شکریہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے مہروز بھائی اور میرے پاس الفاظ نہیں۔" وہ اسے تشکّر سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"اچھی بات ہے، اَب چلیں۔"
"میں جاؤں؟۔" وہ امّی کی طرف دیکھ کر بہت سادگی سے پُوچھنے لگی۔ اُنہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ

صوفیہ کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ بھری آغوش کے احساس نے اچانک اسے بے پناہ خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا اور اندرونی خوشیوں کا عکس اُس کے چہرے کو اس قدر منور کر رہا تھا کہ دُور کھڑے شہروز احمد اُسے دیکھ کر لمحہ بھر کو تو حیران رہ گئے۔ پھر دُور تک اُن کی نظریں اس کا تعاقب کرتی گئی تھیں۔

مہروز اُسے باہر ہی سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور جب وہ بچّے کو لیے ہوئے اندر آئی تو اماں، کلثوم اور ہما پہلے حیران ہوئیں، پھر سوال پر سوال۔

"کس کا بچّہ ہے؟"

"تمہارے پاس کیسے آیا؟"

"کہاں سے آ رہی ہو تم؟" وغیرہ وغیرہ۔

وہ اطمینان سے مسکراتی رہی پھر بیٹھی تو اسی اطمینان سے بولی۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔"

"ربیعہ۔" اماں نے تنبیہی انداز اختیار کیا۔ "کہاں سے لائی ہو اسے؟"

"میں چھوٹی آپا کو دیکھنے گئی تھی۔" اُسے بتانا پڑا۔ "اُن سے کہا، ایک بچّہ مجھے دے دیں، اُنہوں نے دے دیا۔"

"کیا؟" اماں کو یقین نہیں آیا۔ فوراً بڑھ کر بچّے کے مُنہ پر سے کمبل ہٹایا، پھر کہنے لگیں۔

"ہے تو صوفیہ کا بچّہ۔ لیکن اُس نے تمہیں کیوں دے دیا؟"

"میں نے کہا تھا ناں اُن سے۔"

"اور تمہارے کہنے سے اُس نے دے دیا اور مہروز اور اُس کی ساس۔؟" اماں حیرانی سے بولیں۔

"سب وہیں موجود تھے۔" وہ اماں کی بات پُوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ "اور اُن کی ساس نے خود میری گود میں بچّہ ڈالا ہے۔ یہ کہہ کر کہ یہ اب میرا ہے۔" وہ قدرے بُلند آواز میں بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا۔" اُس کی تیز آواز پر اماں نرم پڑتی ہوئی کہنے لگیں۔ "لیکن تمہیں بچّے کو اس کی ماں سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔"

"اماں۔ کیا میں اس کی ماں نہیں بن سکتی؟"

اماں خاموش رہیں تو کہنے لگی۔

"میں بنوں گی اس کی ماں۔ میں نے اسے جنم نہیں دیا تو کیا ہوا؟ میں اس کی پرورش کروں گی۔ اور اماں، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اب اس گھر کی خاموش فضاؤں میں اس کی معصوم ہنسی کی جلترنگ بجا کرے گی۔"

"اور کیا۔" ہما نے فوراً اس کی تائید کی، پھر اُس کے برابر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "لائیے آپی، اسے میری گود میں دیں۔"

"ہاں، تم اسے پکڑو، میں اس کا دُودھ وغیرہ لے آؤں۔" اُس نے بچّہ ہما کی گود میں دیا، پھر اُٹھی تو اماں کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

"اماں، چھوٹی آپا نے خوشی سے دیا ہے۔ یقین کریں میں نے اُنہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ بے شک وہ آئیں تو پُوچھ لیجیے گا۔"

اماں نے اُس کے ہاتھ تھپک کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے بیگ اُٹھا کر باہر نکل گئی۔

کوئی گھنٹے بھر بعد واپس آئی تو دُودھ اور فیڈر کے علاوہ بچّے کی اور کتنی چیزیں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ جنہیں پلنگ پر رکھتے ہوئے وہ ہما سے پُوچھنے لگی۔

"یہ اُٹھا تو نہیں تھا۔"

"نہیں۔"

"اماں کہاں ہیں؟"

وہ بچّے کے کپڑے وغیرہ سینے میں لگی ہیں۔"

اچھا۔" اُس نے خوشی کا اظہار کیا پھر تھرماس اُٹھا کر کلثوم کو دیتی ہوئی بولی۔ "پانی اُبال کر اس میں

دو۔ کوئی پتا نہیں خان بہادر کب اُٹھ جائیں۔"

آپی۔ ابھی اس کا نام تو نہیں رکھا ناں؟" ہما پُوچھنے لگی۔

نہیں۔"

کیا نام رکھیں؟"

تم دونوں ناموں کی لِسٹ بنا لو پھر اس میں سے جو اچھا لگے گا، رکھ لیں گے۔" اُس نے فراخدلی

کلثوم اور ہما کو بچّے کا نام رکھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب اُنہوں نے طویل لِسٹ اس کے

رکھی تو اُسے کوئی بھی نام پسند نہ آیا۔ مُنہ بنا کر بولی۔

نام ایسا ہو جس کے معنی بھی اچھے ہوں اور میں اس کے اسمِ بامسمّٰی ہونے کی دُعا کیا کروں۔" پھر

کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

یہ میری بے آب و بے رنگ زندگی میں خوشیوں کا پیامبر بن کر آیا ہے۔ ہمارے ہونٹوں کی کِھلکِھلاتی

اس ننھے سے وجود کی مرہونِ منّت ہے اور ابھی تو یہ ہمارے لیے اور بہت سی خوشیاں لائے

ابتہاج ہے۔ اِبتہاج کا مطلب سمجھتی ہو؟" اُس نے اُن کی طرف مُنہ کر کے پُوچھا۔

کلثوم اور ہما نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگی۔

ابتہاج کا مطلب ہے، خوشی، مسرّت، شادمانی اور خُدا اسے ہمیشہ شادمان رکھے۔" اُس نے بچّے

بتاتے ہوئے ساتھ اُسے دُعا بھی دی۔ پھر اُس کے نرم نرم گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گُزر گئے۔ ننھے ابتہاج کی بدولت واقعی اس گھر میں ایک ہلچل سی مچ

۔ ابا میاں آفس جانے تک اُس کی زبان میں پتا نہیں کیا کیا بولتے رہتے تھے۔ پھر اماں سارا دن اُس

ساتھ مصروف رہتیں۔ کلثوم اور ہما اُس کے کام بھاگ بھاگ کر کرتیں اور وہ جب آفس سے لوٹتی تو

کے باوجود اُس کے ساتھ لگی رہتی بلکہ اُس کا کہنا تھا کہ ابتہاج کو گود میں لیتے ہی اُس کی ساری تھکن

جاتی ہے اور رات میں بھی اس کا فیڈر وغیرہ بنانے کے لیے وہ خود اُٹھتی تھی۔ کئی بار اماں نے کہا کہ

آفس جانا ہوتا ہے۔ رات میں سُکون کی نیند لے لیا کرے، بچّے کو وہ دیکھ لیں گی۔ لیکن وہ نہیں مانی،

اپنے پاس ہی سُلاتی تھی۔

روز وہ آفس سے لوٹی تو اماں اس کے پاس آ بیٹھیں۔ کچھ دیر یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔

لگیں۔

آج پھر ثمینہ اپنی والدہ کو لے کر آئی تھی۔"

ثمینہ؟" فوری طور پر اُسے یاد نہیں آیا تو پُوچھنے لگی۔

کلثوم کی سہیلی جو اپنے بھائی کا پیغام لائی تھی۔"

۔" وہ سرسری انداز میں کہہ کر لاتعلق نظر آنے لگی تو اماں متعجب ہوئیں پھر خود ہی کہنے لگیں۔

نے اُن سے کہہ دیا ہے، پہلے ہم لڑکے کو دیکھ لیں، پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔" اُس نے کوئی

کیا۔

کل بُلا گئی ہیں۔ تم آفس سے جلدی آ جاؤ تو ہمارے ساتھ چلنا۔"

؟" وہ اپنی طرف اشارہ کر کے اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

تم بڑی بہن ہو۔"

تو ٹھیک ہے اماں لیکن اگر آپ بڑی آپا کو لے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔" پھر وضاحت کرتی

"میرے بارے میں لوگ سوالات کرتے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ ہما یا کلثوم کی شادی سے پہلے میرے حالات اُن کے سسرال والوں تک پہنچیں۔ ہر کوئی اپنی سمجھ کے مطابق سوچتا ہے اماں، ہو سکتا ہے کہیں بات بنتے بنتے محض میری وجہ سے نہ بگڑ جائے۔"

"کیسی بات کر رہی ہو؟ تمہاری وجہ سے کیوں؟" اماں نے اُسے ٹوکا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی اماں، ایک بار میرے ماتھے پر طلاق کا لیبل لگا اور دُوسری بار بیوگی کی چادر اوڑھی۔ آپ ماں ہیں اِس لیے کہتی ہیں کہ اس میں میرا کیا قصور؟ لیکن ہر کوئی تو ایسا نہیں کہہ سکتا، ا کچھ نہیں تو منحوس ہی سمجھ لیں گے لوگ۔" وہ تلخ ہوتے ہوئے بولی۔

"ایسی باتیں مت کرو بیٹا۔"

"میرے نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ حقیقت یہی ہے جو میں کہہ رہی ہوں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ بڑی آپا کو لے جائیں۔ ویسے بھی میں ان معاملات میں خاصی اناڑی ہوں۔"

اماں خاموش رہ کر اُسے دیکھے گئیں تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"اُس روز میں آپ کے ساتھ بدتمیزی کر گئی تھی۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"نہیں بیٹا، تم نے تو مجھے میری غلطی کا احساس دِلایا تھا۔ کم عقلی ہے میری جو میں یہ سمجھتی رہی کہ سُکھ بڑے گھروں میں ہی ملتے ہیں۔ ہر ایک کو خوشحالی راس نہیں آتی۔ ہر ایک کو دُکھ سُکھ سب مُقدر سے ملتے ہیں اور میں مقدر ہی کی نفی کرتی رہی۔" قدرے توقف کے بعد گہری سانس لے کر بولیں۔

"اگر میں مقدر پر یقین رکھتی اور پہلی بار ہی تمہارے لیے ثاقب کے گھر والوں کو 'ہاں' کر دیتی تو شاید حالات۔"

"بس کریں اماں۔" اُس نے ٹوک دیا۔ "میرے ساتھ جو ہونا تھا ہوا، اب اُسے دُہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کلثوم اور ہما کا سوچیں۔"

"اُن کا تو سوچ ہی رہی ہوں لیکن اُن سے زیادہ مجھے تمہاری فکر۔"

"میری فکر۔؟" وہ پھر ٹوک گئی۔

"میری فکر کیوں کرتی ہیں اماں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

کلثوم کی جُنید کے ساتھ منگنی ہوتے ہی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ اماں کا خیال تھا، جس طرح پہلے بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں۔ اسی طرح کلثوم کی بھی کریں گی لیکن وہ فوراً بول پڑی۔

"نہیں اماں، پہلے صرف ابا کمانے والے تھے، اب میں بھی ہوں اور میں یہ صرف اپنے لیے نہیں کرتی، ا گھر کے لیے کرتی ہوں۔ میرا جتنا پیسہ آپ نے آئندہ کے لیے جمع کر رکھا ہے، وہ سب کلثوم کی شادی پر لگا دیں۔"

اماں منع کرتی رہیں، آخر میں اُس نے دھمکی دی۔

"ٹھیک ہے، جب میں اس گھر کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ تو مجھے یہاں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں میں اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لیتی ہوں۔ جہاں ابتہاج اور میں رہیں گے۔"

"جو دل چاہے کرو۔" اماں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اُس کی جمع شدہ رقم اس کے حوالے کر دی جس سے وہ جب آفس سے جلدی نکلنے کا موقع ملتا، کلثوم کے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی۔

اُس روز بھی آفس میں کچھ زیادہ کام نہیں تھا۔ اِتفاق سے ایم ڈی بھی نہیں آئے تھے۔ اس لیے بجے کے قریب جب جی، ایم صاحب سے گھر جانے کی اجازت مانگی تو اُنہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اپنی ٹیبل پر آ کر اُس نے جلدی جلدی تمام کاغذات سمیٹ کر دراز میں بند کیے اور بیگ کھول پیسوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ فرناز اُس کے پاس آ کر کہنے لگی۔

"خیریت؟۔ یہ اِتنی عُجلت کا مظاہرہ کس سِلسلے میں ہو رہا ہے؟"

"میں چھٹی لے کر جا رہی ہوں۔" وہ مسلسل بیگ میں مصروف رہ کر بولی۔

"گھر جاؤ گی؟"

"ہاں، لیکن پہلے ذرا مارکیٹ جاؤں گی۔" وہ بیگ بند کر کے اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی۔

"مارکیٹ۔" فرناز سوچتی ہوئی بولی۔ "مارکیٹ تو مجھے بھی جانا ہے۔ گھر کے لیے کچھ چیزیں خریدنی ں۔"

"چلو پھر۔" وہ فوراً بولی۔

"پتا نہیں مجھے چھٹی ملتی ہے یا نہیں۔"

"کام تو کچھ ہے نہیں۔ اور رحمانی صاحب بھی اچھے موڈ میں بیٹھے ہیں، تم جا کر بات کر دیکھو۔ ہو سکتا چھٹی مل جائے۔"

"اچھا۔" فرناز اسے رُکنے کا کہہ کر رحمانی صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہیں سے انگوٹھا دِکھا کر چھٹی مل جانے کا اشارہ دیا اور اُس کے پاس کے بجائے اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ اُس نے اُٹھتے اُٹھتے بھی اپنی ٹیبل کا جائزہ لیا۔ پھر فرناز ار دیکھ کر اُس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"تمہیں کیا لینا ہے؟" فرناز پوچھنے لگی۔

"میں کلثوم کے لیے ایک دو بنارسی ساریاں لوں گی۔ اس کے علاوہ کوئی مخصوص شے ذہن میں ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز نظر آ گئی۔ جسے میں نے اس کے لیے ضروری خیال کیا تو لے لوں گی۔" وہ سے بولی۔

"پھر یہیں قریبی مارکیٹ چلتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے تو مل جاتی ہے یہاں۔" فرناز نے کہا تو اُس سے کرتے ہوئے دونوں پیدل ہی چل پڑیں۔

پھر مختلف دُکانیں دیکھتے ہوئے پہلے اُس نے ساریاں خریدیں پھر کیونکہ کوئی خاص آئٹم ذہن میں تھا۔ اس لیے فرناز کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ جس دُکان پر رُکتی۔ وہ بھی رُک جاتی، وہ چلتی تو وہ بھی پڑتی۔ ایک جگہ رُک کر فرناز اپنی مطلوبہ چیزیں دیکھ رہی تھی تو یونہی بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں سامنے یں میں سجے بچوں کے خوبصورت ڈیزائن والے کپڑوں پر جا ٹھہریں۔ اُسے فوراً ابتہاج کا خیال آیا۔

"سُنو، میں ذرا سامنے والی دُکان میں جا رہی ہوں۔" اُس نے فرناز کو دُکاندار کے ساتھ بحث میں ف دیکھ کر اُس کے کان میں کہا اور اُس کے دیکھنے پر سامنے اشارہ کر کے اسی طرف چلی گئی۔ ابتہاج لیے سوٹ دیکھنے اور پسند کرنے میں کافی وقت لگا۔ اِس دوران وہ بار بار فرناز پر بھی نظر ڈالتی ھی۔ پھر فرناز اپنی چیزیں لے کر اُس کے پاس آ گئی تو اُس نے بھی تین، چار سوٹ الگ کر کے ار کو پیک کرنے کے لیے دے دیے۔

"کس کے لیے لے رہی ہو؟ میرا مطلب ہے بھانجا یا بھتیجا؟" فرناز پوچھنے لگی۔

"نہ بھانجا، نہ بھتیجا۔ میرا اپنا بیٹا۔" وہ مُسکرا کر بولی۔

"کیا۔؟" فرناز نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "تو کیا تم؟" باقی بات اَدھوری چھوڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" اُس کی حیرت سے محظوظ ہو کر اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دکاندار کے ہاتھ سے شاپنگ لے کر پے منٹ کر دی۔

پھر فرناز کو چلنے کا اشارا کرتی ہوئی جیسے ہی پلٹی، انیلا کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹھک گئی۔ اُس کے ساتھ منصور صور کی گود میں بچّی تھی۔ اُس کا خیال تھا ہمیشہ کی طرح انیلا لپک کر آئے گی لیکن پتا نہیں کیوں وہ نظریں لگی تھی۔ اُسے افسوس ہوا کیونکہ ایک وہی تو تھی، جس نے ثاقب حسن کے گھر میں اُس کی دلجوئی کی ور اَب وہ بھی نظریں چرا رہی تھی۔ اُس نے سوچا، بدلے میں وہ بھی انجان بن کر قریب سے نکل جائے

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اور فرناز کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"کیسی ہو انیلا؟" پھر منصور کی طرف دیکھ کر بولی "آپ کیسے ہیں منصور بھائی اور یہ بچی؟"
"ہماری ہے۔" منصور خوشدلی سے ہنسا۔
"مُبارک ہو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں؟" اُس نے شکوہ کیا۔
"آپ دوبارہ آئی ہی نہیں۔" جواباً منصور کا شکوہ، تو وہ فوراً بولی۔
"میں آتی، میں۔ کیا میری واپسی کے لیے گنجائش چھوڑی گئی تھی؟"
"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ اصولاً تو۔"
"چلیں منصور۔" منصور پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا کہ انیلا ٹوک کر واپسی کی بات کرنے لگی۔ اُس نے تاسف سے اُسے دیکھا۔ اور دُکھ سے بولی۔
"رِشتوں سے قطع نظر انیلا، تم تو میری دوست بھی تھیں۔ مجھے اور کسی کا نہیں لیکن تمہارا انتظار ضرور رہا اور میں اَب تک تمہاری راہ دیکھا کرتی ہوں۔"
"آؤں گی کسی دِن۔" انیلا کا انداز صاف جان چُھڑانے والا تھا جسے اُس کے ساتھ ساتھ فرناز نے بھی محسوس کیا اور وہ تو شاید نظر انداز کر کے کھڑی رہتی لیکن فرناز کو سخت توہین کا احساس ہوا، اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی دکان سے باہر لے آئی۔
"کون تھی یہ بدتمیز؟" فرناز نے خاصا جل کر پوچھا۔
"پہلے دوست پھر نند۔" مختصر لفظوں میں تعارف کروا کر وہ پھر انیلا کے پیچھے نظریں دوڑانے لگی تو فرناز اسے وہاں سے بھی کھینچ کر باہر لے آئی۔
"عجیب لڑکی ہو تم۔ وہ تو تمہیں لفٹ نہیں کرا رہی اور تم اُس کے پیچھے مری جا رہی ہو۔" فرناز نے باقاعدہ اُسے ڈانٹ پلائی تو وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں، میں حیران ہو رہی ہوں کہ وہ تو ایسی نہیں تھی۔"
"آج ہی جا کے اُس کے بھائی سے شکایت کرنا۔" فرناز نے فوراً مشورہ دیا تو وہ غائب دماغی سے بولی۔
"کون سے بھائی سے؟"
"ہائیں۔" فرناز نے پُوری آنکھیں پھیلائیں۔ "کہاں ہو تم؟۔ بھئی اُسی بھائی سے جس کی تم منظورِ نظر منکوحہ ہو۔" وہ خاصے طنزیہ انداز میں بولی۔
"اچھا۔" اُس کی ہلکی سی ہنسی میں دُکھ بھی شامل تھا جو پل بھر میں آنکھیں نم کر گیا۔
"کیا بات ہے؟۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟" اُس کی آنکھوں میں نمی اُترتے دیکھ کر فرناز ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
"نہیں، آؤ واپس چلیں۔" اُس کے ساتھ ہی وہ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ جب کہ فرناز نے وہیں کھڑے کچھ دیر اسے دیکھا پھر اُس کے پاس آئی تو کہنے لگی۔
"سُنو، مجھے پیاس لگی ہے اور کچھ بُھوک بھی۔" پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر بولی "چلو وہاں بیٹھ کر کوک پی لیں۔"
"اب گھر تو جا ہی رہی ہو، وہیں جا کر پی لینا۔" وہ اَب کہیں بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔
"ارے واہ۔ راستے میں چاہے پیاس سے دم نکل جائے تب۔" وہ خاصے غصیلے لہجے میں بولی۔
"ایسا نہیں ہو گا۔" وہ مُسکرائی۔
"تمہیں کیا پتا۔ چلو آؤ۔" فرناز زبردستی اُسے لے گئی اور کونے والی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اُس نے کوک کے ساتھ برگر کا آرڈر دے دیا پھر اطمینان سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"ہاں، اب بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟"

"کیسا معاملہ؟" وہ واقعی نہیں سمجھی۔
"تمہاری نند تم سے اُکھڑی اُکھڑی کیوں تھی؟۔ اور شوہر کے ذکر پر تمہاری آنکھیں کیوں بھیگیں؟۔ کیا وہ
ہی تم سے اسی طرح اُکھڑا اُکھڑا رہتا ہے۔"
"نہیں، وہ اس دُنیا میں نہیں رہا۔" وہ مختصراً بولی۔
"ارے۔" فرناز کو اس دُوسرے انکشاف پر شاک سا لگا۔ کتنی ہی دیر تک گُنگ سی اسے دیکھتی
ی۔ پھر کہنے لگی۔
"کمال ہے تم نے کبھی اپنے بارے میں بتایا ہی نہیں۔ میں تو یہ سمجھتی رہی کہ تم میری طرح ہی کی لڑکی ہو
نعلیم کے بعد اچھے رشتے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے جاب کرنے لگی ہو تاکہ
رکی گاڑی مزید سہولت سے چل سکے۔" اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔
"لیکن تم تو مختلف مراحل سے گُزر کر آئی ہو۔ کٹھن مراحل سے۔ کیا ہوا تھا تمہارے شوہر کو؟" آخر
، ہمدردی سے پُوچھنے لگی۔
"ایکسیڈنٹ۔" اُس نے مختصر جواب دیا۔
"ویری سیڈ۔ کتنا عرصہ ہوا؟" وہ افسوس کرتے ہوئے بولی۔
"ڈیڑھ سال۔"
"واقعی بہت افسوس ہوا۔ کیا تمہارے سُسرال والے تم سے نہیں ملتے؟"
"نہیں۔" پھر اُس نے ثاقب حسن کے گھر والوں کا شروع سے جو رویہ رہا تھا، وہ سب بتایا اور آخر
کہنے لگی۔
سوئم والے روز ہی میری ساس نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی میرے پاس نہیں آیا۔
بھی نہیں جو میری بہت اچھی دوست رہی تھی۔ اور سب گھر والوں کے ناروا سلوک کے باوجود
رے ساتھ بہت اچھی تھی۔ لیکن آج تم نے خود دیکھ لیا۔" اُس کی آواز میں دُکھ کا تاثر تھا۔
ہُوں۔" فرناز 'ہوں' کہہ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔ پھر برگر کھانے کے دوران بھی وہ مسلسل سوچتی
اُس کے بعد کوک کا بڑا سا گھونٹ حلق سے اُتار کر میز پر کہنیاں ٹِکاتی ہوئی پُوچھنے لگی۔
سُنو، تمہارا شوہر گھر میں واحد کمانے والا تھا؟"
ہاں۔ لیکن بعد میں اُس نے اپنے بھائی کو بھی بزنس میں شامل کر لیا تھا۔"
سی لیے۔" فرناز جیسے ساری بات سمجھ کر بولی۔
لیا اسی لیے؟۔" وہ کچھ حیران ہو کر پُوچھنے لگی۔
ی لیے تمہاری ساس نے تمہیں گھر سے نکال دیا تاکہ وہ تمہارے شوہر کے بزنس پر قابض ہو
ا۔ اور بیوقوف ہو تم جو پھر کبھی پلٹ کر نہ گئیں۔" پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔
سنو اپنا جائز حق کیوں چھوڑتی ہو؟۔ مروت تو وہاں برتی جاتی ہے، جہاں دوسرے میں بھی لحاظ
ب انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تو تم کیوں لحاظ کر رہی ہو۔ دھڑتے سے
را اپنے شوہر کی ہر چیز پر قابض ہو جاؤ۔ اگر وہ تمہارا حق تسلیم نہ کریں تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ
لیے انصاف مانگو اور اگر اپنے لیے نہیں تو بچے کے لیے۔" مگر وہ اُس کی بات کاٹ کر فوراً بولی۔
ہ میرا نہیں ہے۔" مزید انکشاف اور فرناز اُچھل پڑی۔
یا مطلب؟"
میری بہن کا بچہ ہے۔ میں نے اُسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔"
، اچھی بات ہے۔" فرناز لاپرواہی سے کہہ کر پھر اسی بات کی طرف آ گئی۔
رحال تم اپنے لیے بھی تو سوچ سکتی ہو خوامخواہ دوسرے کی نوکری کر رہی ہو جب کہ خود اچھی خاصی

فرم کی مالک ہو۔"
"تم سے کس نے کہا کہ میں مالک ہوں؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔
"ظاہر ہے شوہر کے بعد بیوی ہی مالک ہوگی۔ اور اگر مالک نہ بھی ہو، تب بھی تمہیں اس میں سے اتنا حصّہ تو مل ہی جائے گا کہ جس سے تم اپنے مستقبل کو محفوظ کر سکو۔" فرناز اُسے سمجھاتے ہوئے بو
"چھوڑو میرا دل نہیں مانتا۔ جب سائبان ہی نہیں رہا تو یہ سب لے کر کیا کروں گی؟" وہ اُکتا کر بولی۔
"اچار ڈالنا۔ ایمان سے اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو ایک ایک کو کٹہرے میں گھسیٹ لاتی۔ اور تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گی۔"
"سوچوں گی۔" وہ بات ختم کرنے کی غرض سے بولی۔ "اب ویٹر کو بلاؤ، پے منٹ کر کے چلتے ہیں شام ہونے لگی ہے۔"
"چلو لیکن میں پھر تم سے تفصیلی بات ضرور کروں گی۔" فرناز نے اس سے کہہ کر ویٹر کو اشارے سے بلایا۔ پھر پے منٹ کر کے دونوں اپنے اپنے شاپنگ بیگ اُٹھا کر باہر نکل آئیں۔ شام کے سائے تیزی سے پھیلنے لگے تھے۔ فرناز رکشے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی ہوئی بولی۔
"ایک تو ہمارے راستے الگ الگ ہیں ورنہ ایک ہی رکشے سے چلے جاتے۔"
اسی وقت ایک رکشہ قریب آ کر رُکا تو پوچھنے لگی۔
"پہلے تم جاؤ گی کہ میں؟"
"مجھ سے پوچھنے کے بجائے رکشے والے سے پوچھو کہ وہ کہاں جانا پسند کرے گا؟" وہ ہنستی ہوئی بولی تو فرناز رکشے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پھر اس سے بات کر کے پلٹ کر بولی۔
"سنو۔ یہ گلشن جائے گا۔"
"کوئی بات نہیں، تم چلی جاؤ۔ میں دوسرا رکشہ دیکھ لیتی ہوں۔" اس نے فراخدلی سے اُسے جانے کی اجازت دی۔
اس کے جانے کے بعد وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ ایک رکشہ دُور کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس طرف جانے لگی کہ ایک گاڑی بالکل قریب آ کر رُکی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور یونہی سرسری نظر ڈالی کہ شہروز احمد کو دیکھ کر بالکل غیر ارادی طور پر جہاں کھڑی تھی، پنجوں پر پیچھے کی طرف گھوم گئی۔
اور وہ کیونکہ دُور ہی سے اُسے دیکھ چکے تھے اور گاڑی بھی انہوں نے اسی کے لیے روکی تھی اس لیے قدرے آواز کے ساتھ اس کی طرف کا دروازہ کھولا کہ وہ متوجہ ہوگی۔ لیکن وہ اسی طرح رہی اور آواز دینا انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ خود اُتر کر اس کے سامنے آ گئے۔ نہ آداب، نہ حال احوال سامنے آتے ہی کہنے لگے۔
"آیئے، میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"
اور وہ کیونکہ اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی۔ اس لیے سے بولی۔
"شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔"
"شکریہ اُس وقت ادا کیجیے گا، جب میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں۔" اُن کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی اور لہجہ بہت عام سا۔ جیسے کبھی اس سے ملے بھی ہوں تو کسی اور کے توسط سے، براہِ راست کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ وہ بہت خاموشی سے اُن پر سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جہاں کچھ دیر پہلے رکشہ کھڑا نظر آیا تھا۔ اتنی دیر میں رکشہ پتا نہیں کس طرف نکل گیا تھا۔ اس کی تلاش میں نظروں کا زاویہ بدلا تو وہ کہنے لگے۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی۔ یقیناً بہت سواریاں مل جائیں لیکن اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو۔"
اُس نے فوراً اُن کی طرف دیکھا تو کہنے لگے۔
"اگر صوفیہ کو معلوم ہوا کہ میں نے اُن کی بہن کو دیکھنے کے باوجود وہیں کھڑا چھوڑ دیا تھا تو وہ بہت ہوں گی۔"
"صوفیہ کو یونہی نہیں معلوم ہو جائے گا۔ کوئی بتائے گا تب ہی۔" وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔
"بعض باتیں نہ بھی بتائی جائیں، تب بھی لوگ جان جاتے ہیں۔"
"بہرحال میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔" وہ حتمی انداز۔ میں کہہ کر دُوسری طرف متوجہ ہوگئی۔
اور وہ جو اُس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ اُس کے پورے وجود پر سے پھسلتی ہوئی نظریں اس کے پیروں پر جا ٹھہریں۔ پیشانی پر ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی، ہونٹ ذرا سے بھینچے، مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی میں جا بیٹھے اور ابھی اسٹارٹ کر ہی رہے تھے کہ وہ رکشے میں بیٹھتی نظر آئی۔ اُن کی پیشانی پر کئی اور لکیروں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے گاڑی آگے نکال لے گئے۔

عجیب بات تھی، وہ شہروز احمد کے ساتھ تھی تو ثاقب حسن سے متنفر۔ اور اپنے طور پر نہ صرف سوچ چکی تھی بلکہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ دوبارہ کبھی ثاقب حسن سے نہیں ملے گی لیکن تقدیر نے ثاقب حسن کو اُس کا مجازی خدا بنا دیا۔ تو وہ زیادہ دیر تک اس کے لیے اپنے دل میں کدورت نہیں رکھ سکی تھی۔ کہ زندگی بہرحال اُسی کے ساتھ گزارنی تھی۔
لیکن جب شہروز احمد کا نام اس کی زندگی میں زہر گھولنے لگا۔ تب وہ اس نام سے بھی متنفر ہوگئی۔ اِن سارے قصّے میں وہ سب سے زیادہ قصوروار شہروز احمد کو سمجھنے لگی اور اب بھی سمجھتی تھی اس کا کہنا تھا کہ شہروز احمد جیسے شخص کو اوّل تو شروع ہی میں ثاقب حسن کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا اور اگر کسی بھی وجہ سے وہ اس سے نکاح کر ہی بیٹھے تھے تو پھر چھوڑنے کا کیا سوال، جب کہ بعد میں وہ صوفیہ کے سامنے اس سے محبت کا اعتراف بھی کر گئے تھے۔
اگر یہی اعتراف وہ اُس کے سامنے کر لیتے تو وہ خود ثاقب حسن کو مایوس لوٹا دیتی لیکن اب وہ اس کے نزدیک بزدل ترین انسان تھے۔ لوگ محبت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور شہروز محبت کی وہ دیوار نہ گرا سکے۔ جو ثاقب حسن نے اوّل روز ہی اُن دونوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔
"اور آج وہ کس ناتے سے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے؟" رات میں وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔
"بڑا گھمنڈ ہے شاید انہیں اپنی ذات پر کہ وہ کہیں گے اور میں اُن کے ساتھ چل پڑوں گی۔ ہونہہ! فالتو اور گری پڑی نہیں ہوں میں۔ خود ہوں گے زمانے بھر کے فالتو۔ آئندہ اگر کبھی میرے راستے میں آئے تو وہ مزا چکھاؤں گی کہ یاد ہی کریں گے۔" اُس نے سر جھٹک کر کروٹ بدلی تو پھر اُن ہی کا خیال۔
"سمجھ رہے ہوں گے میں وہی پہلے والی بیوقوف سی ربیعہ ہوں گی، انتہائی بزدل سی۔ وہ ذرا رعب سے بات کریں گے اور میں ڈر جاؤں گی۔ میں کیوں ڈروں؟ ہاں میں کیوں ڈروں؟" وہ کسی بھی انداز سے نہیں، مسلسل انہیں ہی سوچ رہی تھی اور اپنے طور پر مطمئن کہ اس شخص کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔
اور اس روز تو اُسے یاد نہیں رہا تھا، اگلے روز اُس نے امّاں کو بتایا کہ اس کی انیلا سے ملاقات ہوئی اور جب یہ بتا رہی تھی کہ وہ خاصی اُکھڑی اُکھڑی سی تھی تو اُسے فرناز کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُس نے

سوچا، شاید انیلا بھی اس لیے بدل گئی ہے تاکہ میں اس گھر سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھوں
تب وہ اماں سے کہنے لگی۔

"اماں۔ کلثوم کی شادی سے فارغ ہو جائیں، پھر میں اپنی سسرال جاؤں گی۔"

"کاہے کو۔؟" اماں حیرت سے بولیں۔ "وہاں اب کون ہے تمہارا؟"

"کوئی نہ ہو پھر بھی میں ضرور جاؤں گی۔ اپنا حق لینے۔ آخر کس حساب سے انہوں نے مجھے تین کپڑوں میں نکال باہر کیا تھا؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تین کپڑوں میں تو تم شہروز کے گھر سے بھی آئی تھیں۔" اماں کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ ایک دم سناٹے میں آگئی۔ اور اماں اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہے گئیں۔

"آج تم ثاقب کے گھر والوں سے اپنا حق لینے کی بات کر رہی ہو۔ کل شہروز سے حق وصول کرنے کھڑی ہو جاؤ گی۔ اور اس سے صوفیہ کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا، یہ سوچا ہے تم نے؟"

"اماں۔" کتنی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی۔ "یہاں شہروز کا کیا ذکر۔ ان کے گھر سے میں تین کپڑوں میں ضرور آئی تھی لیکن انہوں نے مہر کی رقم کے ساتھ مجھے مکان کے کاغذات بھی بھجوائے تھے جو میں نے اسی وقت واپس بھجوا دیے تھے۔ جب کہ ثاقب حسن کے گھر سے کوئی مجھے پوچھنے تک نہیں آیا، اس لیے ناں کہ انہیں خدشہ ہے، کہیں میں اپنا حق نہ مانگنے لگوں اور اماں جس کی نیت خراب ہے، اس سے میں ضرور وصول کروں گی۔" اس نے اماں کو ساری بات کہہ دی۔

"بیٹا۔" اماں نرم پڑتی ہوئی بولیں۔ "مت سوچو ایسا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا، اب پھر کہہ رہی ہوں، جب گھر والا ہی نہیں تو گھر لے کر کیا کرو گی؟"

"میرے اندر آگ لگی ہے اماں جو کسی طرح بجھائے نہیں بجھتی۔ ان کا سلوک، رویہ اور جس طرح انہوں نے بھری برادری میں مجھے نکال باہر کیا تھا، وہ سب آپ کے سامنے ہوا اور کیا وہ بھولنے والی باتیں ہیں؟" قدرے توقف کے بعد بولی

"مجھے گھر نہیں چاہیے، کچھ بھی نہیں چاہیے لیکن میں انہیں سبق ضرور سکھانا چاہتی ہوں۔ بتانا چاہتی ہوں انہیں کہ جس لڑکی کو کمزور سمجھ کر انہوں نے گھر سے نکالا تھا، وہ اب کمزور نہیں رہی۔" اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

"کیا کرو گی تم؟" اماں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ بھی۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں اماں۔ وقت کی لگامیں اب میرے ہاتھوں میں ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ وقت بہت بڑا ناصح ہے۔ غریب اور مظلوم کا ساتھ دینے میں دیر نہیں کرتا۔" اس کی آنکھیں اچانک کسی خیال کے تحت چمکنے لگی تھیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اماں حیرت سے اس کی طرف دیکھے گئیں۔ ہمیشہ سے کس قدر مختلف لگ رہی تھی وہ۔ شاید حالات نے اسے یہ سب سکھایا تھا، انہوں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ مزید ٹوٹی نہیں، بکھری نہیں بلکہ اپنے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر گئی ہے۔

"اماں۔" وہ اماں کو یوں اپنی طرف دیکھتے پا کر ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ پریشان نہ ہوں، میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے آپ کو تکلیف ہو یا ابا میاں کی نیک نامی پر کوئی بات آئے۔"

"بس بیٹا، یہی خیال رکھنا۔" اماں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ اس نے ان کے ہاتھ ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا لیے۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں بلکہ فی الحال تو بھول ہی جائیں کہ میں نے ایسی کوئی بات کی ہے۔ ہنسی خوشی کلثوم کی شادی کریں، اس کے بعد اس قصے پر سوچیں گے۔"

"اپنے ابا میاں سے ضرور مشورہ کر لینا۔"

"نہ صرف مشورہ بلکہ ان کی اجازت سے ہی کروں گی۔" اس نے اماں کو خدشوں سے نکال کر پوری طرح مطمئن کیا تھا۔

کلثوم کی شادی میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے اور وہ چاہتی تھی آفس سے چھٹی لے کر اماں کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں آفس میں کام اتنا زیادہ تھا کہ اسے چھٹی نہ مل سکی۔ دو تین بار اس نے درخواست دی اور ہر بار خود ایم ڈی نے منع کر دیا۔ اصل میں ان کی فرم نے کوئی بہت بڑا پروجیکٹ حاصل کیا تھا، جس پر کام کرنا اکیلے ان کی فرم کے بس میں نہیں تھا، اس لیے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کوئی دوسری فرم ان کے ساتھ اس پروجیکٹ میں شیئر کرے۔

اس سلسلے میں ایک دوسری فرم سے بات ہو رہی تھی بلکہ ایک طرح سے آخری مراحل میں تھی۔ اس کے لیے کاغذی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ اور وہ کیونکہ اپنے کام کے ساتھ بہت فیئر تھی، پوری ایمانداری اور محنت سے کام کرتی تھی، اس لیے انتہائی ضروری معاملات میں ایم ڈی خود اس پر انحصار کرتے تھے۔

اور اب جب کہ کاغذی کارروائیاں ہو رہی تھیں تو ضروری کاغذات ٹائپ کرنا خاص طور سے اس کی ذمہ داری تھی، وہ اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن کیا کرتی، ذہن مسلسل کلثوم کی شادی کی طرف لگا ہوا تھا اور اماں بالکل اکیلی تھیں۔

ہما بازار کے چکر نہیں لگا سکتی تھی جب کہ بڑی آپا اور صوفیہ اپنے اپنے گھروں میں مصروف۔ کسی وقت آتیں بھی تو مزید مشورے دے کر چلی جاتیں۔ بڑی آپا تو خیر شروع ہی سے بہت کم کم آتی تھیں اور صوفیہ خواہ روز آئے لیکن رہنے کی بات کبھی نہیں کرتی تھی اور اب تو بچے کی وجہ سے کہیں نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ مجبوراً بے چاری اماں ہی سب کام نپٹاتی پھر رہی تھیں۔

اس وقت بھی جتنی تیزی سے اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر حرکت کر رہی تھیں، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اصل میں صبح جب وہ آ رہی تھی تو اماں نے اس سے کہا تھا کہ وہ جلدی آ جائے، پھر وہ اس کے ساتھ جیولر کے پاس جائیں گی۔ جہاں انہوں نے کلثوم کا زیور بننے دیا تھا اور اب پانچ بج چکے تھے۔ اس کا کام ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں کمپنیوں کے درمیان ہونے والے ایگریمنٹ کے کاغذات ٹائپ کر رہی تھی۔ کتنی ڈھیر ساری شرائط کچھ اس کی سمجھ میں آئیں، کچھ سر سے گزر گئیں۔

"یہ بڑے لوگ۔" آخری کاغذ ٹائپ کرتے ہی اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے سوچا۔ "زبانی ایک دوسرے پر اعتبار ہی نہیں کرتے۔ جب تک اتنے کاغذوں پر ایک دوسرے سے سائن نہ کروا لیں، کسی کام میں ہاتھ ہی نہیں ڈالیں گے۔"

"مس۔" چوکیدار کے پکارنے پر وہ سیدھی ہو بیٹھی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔"

"ہاں، آ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور جلدی جلدی تمام ٹائپ کیے ہوئے کاغذات سمیٹ کر پہلے انہیں ایک فائل میں لگایا، پھر وہ فائل لے کر ایم ڈی صاحب کے کمرے میں آ گئی۔

"ہو گیا سارا کام؟" وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

"یس سر۔" اس نے فائل ان کے سامنے رکھ دی جسے کھولنے سے پہلے انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر پوری طرح فائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس نے کچھ دیر انہیں کاغذ پلٹتے دیکھا، پھر یونہی نظروں کا زاویہ بدل کر شیشوں سے باہر دیکھنے لگی۔

"ویری گڈ۔" کافی دیر بعد ان کی آواز آئی تو وہ پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ فائل بند کر رہے تھے پھر اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بہت اچھا۔ یقیناً اتنا اچھا کام کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔"
"تھینک یو۔" اُسے زبردستی مسکرانا پڑا۔
"آپ نے غالباً چھٹی کی بات کی تھی۔" وہ یاد کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔
"جی۔" وہ اسی قدر کہہ سکی۔
"آئی ایم سوری۔ یہ کام اتنا ضروری تھا کہ میں۔"
"کوئی بات نہیں سر۔" وہ فوراً کہہ گئی تو انہوں نے پہلے انٹرکام پر چائے کے لیے کہا، پھر اُس سے پوچھنے لگے۔
"کیا اب بھی چھٹی کی ضرورت باقی ہے یا جس کام کے لیے آپ کو چھٹی چاہیے تھی، وہ ہو گیا؟"
"نہیں سر، وہ کام ہوا تو نہیں۔ اصل میں میری سسٹر کی شادی ہے۔"
"اچھا اچھا۔" وہ خوشدلی سے بولے۔ "اب آپ بالکل فارغ ہیں، جتنے دن چاہیں چھٹی کر سکتی ہیں لیکن۔"
"لیکن کیا سر؟" وہ فوراً بول پڑی۔
"کل آپ کو ضرور آنا ہے۔" پھر وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگے۔ "اصل میں اس ایگریمنٹ اور اس نئے پروجیکٹ کے افتتاح کے سلسلے میں، میں نے اپنے اسٹاف کے خاص لوگوں کو ڈنر پر بلایا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پارٹنرز اور ان کے اسٹاف کے کچھ لوگ بھی شرکت کریں گے۔ وہیں آپس میں تعارف کا مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے سر لیکن اگر میں۔"
"نہیں، آپ کو ضرور آنا ہے۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ "ایسا کریں، آپ صبح آفس نہ آئیں، میں شام میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ ڈنر میں شرکت کر لیجیے گا۔"
"اوکے۔" وہ اُٹھنے لگی کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ مجبوراً اُسے چائے پینے تک بیٹھنا پڑا۔
"میں جاؤں سر۔" چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی اس نے اجازت طلب کی تو وہ کہنے لگے۔
"اگر آپ کو جلدی جانا ہے تو میں ڈرائیور سے کہوں، آپ کو چھوڑ آئے گا۔"
"نو تھینک یو سر۔ میں چلی جاؤں گی۔"
"ایز یو لائیک۔" انہوں نے مسکرا کر جانے کی اجازت دی تو وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اپنی ٹیبل کے پاس رُک کر کھڑے کھڑے اس نے ضروری چیزیں دراز میں بند کیں پھر بیگ اُٹھا کر باہر آ گئی۔
بس اسٹاپ پر بہت رش تھا اور بسیں بھی بھری ہوئی آ رہی تھیں۔ مجبوراً اُسے رکشہ کرنا پڑا۔
گھر آئی تو اماں اس کا انتظار کرتے کرتے آخر مایوس ہو کر کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اُس نے ہما سے پوچھا، پھر کچن میں ان کے پاس چلی آئی۔
"اماں جیولر کے پاس صبح چلے جائیں گے۔" اس نے ایک تو تھکن، دوسرے گہری ہوتی شام کے پیش نظر کہا۔
"ہاں، اب تو جانے کا وقت بھی نہیں ہے۔" اماں کوئی شکوہ کیے بغیر بولیں تو وہ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی دوبارہ اندر آ گئی۔ بیگ پھینک کر خود بھی گرنے کے انداز میں پلنگ پر بیٹھی تو ابتہاج گھٹنوں کے بل چلتا ہوا، اس کے پاس آ گیا۔
"کتنا بے مروت ہے۔" ہما کہنے لگی۔ "ہم سارا دن اس کے پیچھے ہلکان ہوتے ہیں لیکن یہ جہاں آپ کو دیکھتا ہے، فوراً ہمیں نظر انداز کر کے آپ کی طرف لپکتا ہے۔"
"میرا بیٹا میری طرف نہیں لپکے گا تو کس کی طرف لپکے گا۔؟" اس نے ابتہاج کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"ایک بات کہوں آپی۔؟" ہما نے دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"اگر آپ کا اور شہروز بھائی کا کوئی بچہ ہوتا تو وہ بالکل ایسا ہی ہوتا ابتہاج جیسا۔"
"ہما۔" اس کے اندر باہر محشر برپا ہو گیا۔ آنکھیں پوری کھلیں، ہونٹ نیم وا، کتنی دیر متحیر سی بیٹھی رہی، پھر اسی طرح اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بہت زیادہ اہتمام سے تو وہ ویسے بھی تیار نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اپنا ایک الگ سیدھا سادا سا انداز تھا۔ اور ثاقب حسن کے بعد تو اس نے جیسے اپنے آپ کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید کچھ خوفزدہ بھی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے، بیوہ ہو کر سنگھار کرتی ہے۔ اس لیے بھی محتاط رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ہلکے رنگ کا پلین سوٹ پہنا تھا اور ابھی بالوں میں برش کر رہی تھی کہ ہما سر پہ پہنچ گئی، پہلے اس کے کپڑوں پر اعتراض کیا۔
"آپی۔ آپ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے جا رہی ہیں اور یہ کپڑے پہن کر جائیں گی؟"
"کیوں؟ کیا ہوا ان کپڑوں کو؟" وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"کپڑوں کو کچھ نہیں ہوا، بس آپ کے ایم ڈی صاحب آپ کو کسی سے متعارف کراتے ہوئے خاصی سبکی محسوس کریں گے۔"
"بکومت۔" وہ ڈانٹنے لگی۔ "خبردار جو مجھے کوئی مشورہ دیا۔"
"میں مفت مشورہ دیا بھی نہیں کرتی۔ خیر لائیے، آپ کے بال میں بنا دوں۔" اس کے ساتھ ہی ہما نے اس کے ہاتھ سے برش چھین لیا
"جلدی سے چوٹی باندھ دو۔ گاڑی آنے والی ہو گی۔" وہ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔
"ایسے ہی کھلے رہنے دیں، اچھے لگ رہے ہیں۔" پھر آئینے میں اُسے دیکھتی ہوئی بولی۔
"سارا دن بازار میں خوار ہوتی رہی ہیں، چہرا بہت تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔ ذرا سی سنو ہی لگا لیں تاکہ فریش نظر آئیں۔"
اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر کریم کی شیشی اُٹھائی اور جیسے ہی لگائی، ہما تعریف کرتے ہوئے بولی۔
"دیکھا، اب چہرہ فریش لگ رہا ہے۔ لیکن ہونٹ۔ بس ہلکی سی لپ اسٹک۔" پھر خود ہی لپ اسٹک اُٹھا کر اس کے ہونٹوں پر لگانے لگی۔ اسی وقت باہر گاڑی رُکنے اور پھر ہارن کی آواز سنائی دی تو وہ چونک گئی۔
"میرا خیال ہے، گاڑی آ گئی ہے۔ اور تم نے ابھی تک میرے بال بھی نہیں باندھے۔"
"بس بس۔ ایسے ہی رہنے دیں۔" ہما نے برش دور پھینک دیا اور اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھاتی ہوئی بولی۔ "جائیے گاڑی آ چکی ہے۔"
"بہت بدتمیز ہو تم۔ میں تم سے آ کر نبٹوں گی۔" وہ اس پر خفا ہوتی ہوئی باہر آئی۔ اماں برآمدے ہی میں کھڑی تھیں۔ انہیں جانے کا بتایا تو وہ پوچھنے لگیں۔
"واپس کیسے آؤ گی؟"
"جب گاڑی لینے آئی ہے تو چھوڑ بھی جائے گی اور ہاں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہوئیے گا۔ ایسی جگہوں پر دیر ہو ہی جاتی ہے۔"
اماں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔
کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آنے کا اس کا یہ کوئی پہلا اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اجنبی لوگوں میں جانے کا یقیناً پہلا موقع تھا۔ پھر بھی وہ زیادہ نروس نہیں تھی، بس کچھ الگ الگ سی۔ آفس کے وہ مخصوص لوگ جن سے روزانہ اس کی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی ان ہی لوگوں سے اس نے رسمی

جملے بولے، باقیوں کو نظرانداز کرتی ہوئی اپنے ایم ڈی اسفندیار کے پیچھے قدرے فاصلے سے جا کھڑی ہوئی۔

اس طرح اس کا خیال تھا، وہ سب سے پہلے تعارف کے مرحلے سے گزر کر پھر اطمینان سے کسی گوشے میں جا بیٹھے گی۔ اچانک اسے فرناز کا خیال آیا تو وہ اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ پتا نہیں وہ آئی بھی تھی کہ نہیں لیکن وہ اسے ڈھونڈنے میں اتنی مگن تھی کہ اچانک آس پاس جو ہلچل مچ گئی تھی، اس کا اُسے احساس ہی نہیں ہوا۔ چونکی اس وقت جب ایم ڈی اسفندیار کہہ رہے تھے۔

"یہ میرے اسٹاف کی بہت ذمّہ دار، بہت محنتی لڑکی ربیعہ۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس دعویدار آواز پر اسے سنبھلنے میں کچھ لمحے ضرور لگے۔ نظریں اس چہرے کی طرف اُٹھیں ضرور لیکن ٹھہریں نہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ نروس ہوگئی تھی اس لیے کہ شہروز احمد شناسائی کا جو دعوا کر رہے تھے، وہ اسے اچھا نہیں لگا۔

"آپ جانتے ہیں انہیں؟" اسفندیار خوشگوار حیرت میں گھر کر بولے۔

"یاد تو آ رہا ہے کہیں۔ پہلے بھی مُلاقات ہوئی ہے۔ بہرحال آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسز ربیعہ ثاقب حسن۔" اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اُن کی اس بے باک جسارت پر وہ حیران ہوئی اور محض اس خیال سے کہ کہیں تماشا نہ بن جائے۔ اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا، جس پر فوراً اُنہوں نے گرفت مضبوط کرلی اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں، ہم پہلے کب اور کہاں ملے ہیں؟" اس کا دل چاہا کہے جہنّم میں۔ اور پھر ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر زور سے اُنہیں دھکا دے اور بھاگتی ہوئی یہاں سے نکل جائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ضبط کا دامن تھامنے کی کوشش میں اُن کے ہاتھ کی پشت پر اُس کی اُنگلیاں سخت ہوگئیں تو وہ ذرا سا مُسکرائے۔

"شاید آپ کنفیوز ہو رہی ہیں۔ بہرحال میں شہروز احمد ہوں۔"

"رائل بلڈرز کے ایم ڈی جن کے ساتھ ہم نے نیا پروجیکٹ شیئر کیا ہے۔" اسفندیار نے تعارف مکمل کیا تو اُسے رسمی جُملہ بولنا پڑا۔

"ہمیں آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔"

"یقیناً۔" اُن کی مُسکراہٹ گہری ہوئی۔ "ہمیں بھی آپ کی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع ملے گا۔"

"آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی اور ذرا سی کوشش سے اُن کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر پیچھے ہٹ گئی تو وہ اس کے پُورے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ صورتِ حال بڑی غیر متوقع تھی گو کہ اُس نے کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا، پھر بھی جھنجھلا کر سوچ رہی تھی۔

اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ سامنا شہروز احمد سے ہوگا تو میں اپنے آپ کو اُن کا سامنا کرنے کے لیے تیار رکھتی، پھر دیکھتی، صاحب بہادر کیسے اِتنا جم کر کھڑے ہو سکتے تھے۔

"سُنو۔ یہ میں ہوں۔ میں۔ ربیعہ اکرام علی کہو یا ربیعہ ثاقب حسن۔" وہ دُور سے شہروز احمد پر نظریں جما کر دل ہی دل میں اُنہیں مخاطب کر کے بولی۔

"گردشِ دوراں نے مجھے چٹان بنا دیا ہے۔ اَب کوئی آندھی، کوئی طوفان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم بار بار میرے سامنے آؤ۔ میں ہر بار تمہاری نفی کروں گی۔"

"آپ یہاں کھڑی ہیں؟" کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر سب کے ساتھ جا بیٹھی۔

اسفندیار اور شہروز احمد نئے پروجیکٹ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اُن کی طرف متوجہ

ـے اور کچھ اپنی باتوں میں مصروف۔ اور وہ بظاہر لاتعلق سی لیکن ذہن پُوری طرح حاضر کہ کسی بھی وقت ـئی مخاطب کرے تو وہ فوراً متوجہ ہو سکے۔

کچھ دیر بعد سب کھانے کے لیے اُٹھ گئے تو وہ شہروز احمد کی سیکریٹری کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ ہولی۔ ـکھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی وہ اسی کے ساتھ رہی۔

چائے کے بعد جب سب جانے پر آمادہ نظر آئے تو وہ اسفندیار سے یہ پُوچھنے کی غرض سے کہ آیا اُن کا ـائیور اُسے چھوڑ آئے گا یا وہ خود سے جائے گی۔ اسفندیار کے پاس آئی تو شہروز احمد جیسے منتظر تھے، اُسے ـیکھتے ہی کہنے لگے۔

"اسفندیار۔ یہ میرے بھائی کی سسٹر اِن لاء ہیں۔"

"اچھا۔" اسفندیار یقیناً حیران ہوئے۔

"اصل میں ایک آدھ بار ہی ان سے ملاقات ہوئی ہے، جب ہی میں فوراً پہچان نہیں سکا۔"

"سر میں جاؤں۔" وہ اُنہیں نظرانداز کر کے اسفندیار سے پُوچھنے لگی۔

"کیسے جائیں گی؟ میرا مطلب ہے ڈرائیور سے کہیں۔"

"میرا خیال ہے، میں انہیں چھوڑ دوں گا، اسی بہانے ان کے گھر والوں سے بھی مُلاقات ہو جائے گی۔ ـہ تو مصروفیت میں آپ جانتے ہی ہیں۔" اُنہوں نے اسفندیار کی بات کاٹ کر کہا تو اسفندیار اس کی ـف دیکھنے لگے۔ وہ صاف منع کرنا چاہتی تھی لیکن پھر وہی خیال "کہیں تماشا نہ بن جائے" خاموش رہنے پر ـبور کر گیا اور خاموشی کو رضامندی سمجھ کر شہروز احمد اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے اسفندیار۔ اجازت دیجیے، آپ سے مُلاقات تو اَب رہے گی۔"

"جی ہاں۔" اسفندیار نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور اسی طرح چلتے ہوئے باہر آئے۔ وہ بہت ـوشی سے ان دونوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ گاڑی کے قریب رُک کر دونوں نے رسمی جملے بولے۔ پھر ـہروز احمد دروازہ کھول کر اُس سے کہنے لگے۔

"آئیے مِس ربیعہ۔"

"مسز ربیعہ۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ کر بیٹھ گئی تو اُنہوں نے پلٹ کر ایک بار پھر اسفندیار سے ہاتھ ـایا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مین روڈ تک وہ گاڑی خاصی تیز رفتاری سے لائے تھے، اُس کے بعد سگریٹ سُلگانے کے بہانے ـار دھیمی کی تو پھر اُسی طرح رہنے دی۔ وہ اندر ہی اندر خاصی جُزبُز ہوئی لیکن اُن سے کچھ کہنے کی کوشش ـیں کی، ہونٹ بھینچے شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔

"باہر کے مناظر واقعی بہت دِلکش ہیں یا میری صورت بہت زیادہ خوفناک۔؟" اُس کی حد سے زیادہ ـغلقی دیکھ کر بالآخر اُنہیں متوجہ کرنا پڑا۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

"آپ کا بیٹا کیسا ہے؟" کچھ دیر بعد پھر پُوچھا۔ جان بوجھ کر ایسی بات کی کہ وہ جواب دے گی، ـن ہنوز خاموشی۔

"مجھے یاد ہے۔" وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ کبھی خفا نہیں ہوتیں۔ کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ اگر آپ رُوٹھ ـیں تو کوئی منا نہ سکے گا۔ اور پھر یہ بھی کہا تھا، شہروز احمد! مجھے رُوٹھنے نہ دینا۔"

"میرے خُدا۔" ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنے آپ کو چٹان کہہ رہی تھی اور اَب دل پتے کی طرح یُوں ـرز رہا تھا جیسے تیز آندھیوں کی زد میں آگیا ہو۔

"اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں کسی کو رُوٹھا ہوا نہیں ـدیکھ سکتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے مجھے گو کہ ہمارے درمیان رُوٹھنے اور منانے والا نہ کوئی سلسلہ ہے، نہ تعلق،

پھر بھی میں چاہتا ہوں، دوستی نہیں تو عداوت بھی نہ ہو۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر اُس کے بولنے کا انتظار کیا لیکن وہ پتا نہیں قصداً خاموش تھی یا قوتِ گویائی کھو چکی تھی کہ ہونٹوں نے ذرا سی جنبش نہیں کی البتہ پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے ویو مرر میں اس کا جائزہ لیا، پھر کہنے لگے۔

"آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمّہ داری حالات یا تقدیر پر ڈال کر ہم بری الذّمہ نہیں ہو سکتے، کم از کم اپنے بارے میں، میں ضرور کہوں گا کہ خود اپنے ضمیر کی عدالت میں، میں اپنے آپ کو سُرخرو نہیں کر سکا۔ اس تمام عرصے میں بارہا میں نے اپنا محاسبہ کیا اور کہیں نہ کہیں میرا دامن ضرور ملوّث نظر آیا۔ اس لیے دِل پر ایک بوجھ رہا۔ جس نے مجھے کبھی چین نہیں لینے دیا۔

ہمہ وقت ایک مُجرمانہ احساس کے ساتھ یہ خیال بھی گھیرے رہا کہ کہیں نہ کہیں مجھ سے بھی زیادتی ضرور ہوئی ہے اور اس وقت تو یہ احساس اور زیادہ شدّت اختیار کر گیا، جب مجھے معلوم ہوا کہ ثاقب حَسن نے آپ کو وہ مقام نہیں دیا جو کہ آپ کا حق تھا۔"

وہ صرف سُن رہی تھی۔ اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے اس پانی کو اندر ہی اندر روکنے کی کوشش میں مصروف جو آنکھوں میں اُترنے اور پھر چھلکنے کو بے تاب تھا۔

"اگر آپ ثاقب حسن کے ساتھ مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتیں تو شاید میں بھی مطمئن ہو کر نئی زندگی کی ابتدا کر چکا ہوتا لیکن اس کے برعکس حالات نے مجھے اپنے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیا۔ کبھی خیال آیا بھی تو سوچا، پہلے آپ سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگ لوں ورنہ ضمیر ہمیشہ کچوکتا رہے گا۔" وہ خاموش ہو کر سوچنے لگے کہ اب جو بات کہنے جا رہے ہیں، وہ پتا نہیں کہنی مناسب بھی ہے کہ نہیں مگر کہے بغیر رہ بھی نہ سکے۔

"میں شاید تلافی نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کے لیے ایک عمر کا ساتھ درکار ہے۔ جب کہ یہ کچھ وقت کا ساتھ بھی آپ پر گراں گزر رہا ہے۔ بہرحال اگر آپ بھی مجھے قصوروار سمجھتی ہیں تو اس کے لیے جو سزا چاہیں، میرے لیے تجویز کریں، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ لیکن خدارا اس کے بعد مجھے معاف ضرور کر دیجیے گا تاکہ ضمیر کی خلش سے نجات ملے اور میں ہر بوجھ سے آزاد ہو کر مطمئن ہو سکوں۔"

اُس کے بعد خاموشی۔

اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور وہ بس اندر ہی اندر اُلجھتی رہی۔ لڑتی رہی۔ گاڑی گھر جانے والے راستے پر مڑی اور پھر رُک گئی تو لگا جیسے پُوری کائنات ٹھہر گئی ہے۔ اُس نے چاہا، وہ انہیں ایک عمر کی خلش اور ضمیر کے مسلسل کچوکے دے کر بنا کچھ کہے چُپ چاپ اُتر کر اندر چلی جائے تاکہ حیات کے باقی ماندہ سفر میں فقط ایک خیال طمانیت بخشتا رہے کہ اِس سفر میں وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کی طرح کوئی اور بھی تنہا تنہا چلتا ہے۔ لیکن وہ تھی ربیعہ اکرام علی، جس نے کبھی دانستہ اپنی ذات سے کسی کو دُکھ نہیں پہنچایا تھا۔ اگر کسی کو خوشیاں نہ دے سکی تو دُکھ بھی نہیں۔

اور اَب دامن پھیلانے والے شہروز احمد تھے جن کی سنگت میں گزرے ماہ و سال کو اُس نے اماں کے سامنے خوبصورتیوں سے تشبیہہ دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اب ویسی خُوبصورتیاں میرا مقدر نہیں ہو سکتیں بہرحال اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا، تب بھی وہ اپنی فِطرت سے مجبور۔ خوشیاں نہیں تو دُکھ بھی نہیں۔ آخر اُس نے ثاقب حَسن کو بھی تو معاف کر دیا تھا، جس نے سائبانی دینے کے باوجود تپتی دھوپ میں گھسیٹا تھا۔

وہ اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر رہی تھی اور اس کی یہ کوشش وہ مرر میں دیکھ بھی رہے تھے۔ پھر جب وہ بولی تو وہ ساری نمی جسے وہ آنکھوں میں اُترنے سے روکتی رہی تھی، اس کے لہجے میں آسمائی۔

"کوئی سزا نہیں شہروز احمد۔ بس معافی ہی معافی۔ اگر میرے معاف کر دینے سے آپ ہر بوجھ سے آزاد ہو سکتے ہیں تو میں نے معاف کیا۔

اگر دل کی خلش سے نجات کا یہی ایک راستہ ہے تو میں معاف کرتی ہوں۔

میری معافی اگر آپ کی خوش آئند زندگی کی ضامن ہے تو میں یہ ضمانت دے رہی ہوں کہ ربیعہ اکرام علی اپنی بے آب و رنگ زندگی کا نہ کبھی حساب مانگے گی، نہ کبھی الزام رکھے گی۔

آپ مطمئن ہونا چاہتے ہیں تو یہ اطمینان یہیں سے لے کر جائیں۔ میں نے سب معاف کیا۔ اور آج بلکہ ابھی اپنی کتابِ زندگی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے نکال پھینک رہی ہوں، جس میں دو مردوں نے میری زِندگی سے متعلق کوئی معاہدہ کیا تھا۔"

اِس کے ساتھ ہی وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اُتر گئی۔

اور شہروز احمد جو اپنا آپ بھلائے بیٹھے تھے ایک دم چونک گئے۔ اور اس کا تعاقب کرتی ہوئی اُن کی نظریں اُس دروازے تک گئیں، جہاں سے وہ بارہا اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور اب وہ اکیلی یوں اس کے پیچھے غائب ہو گئی تھی جیسے پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔

کمالِ ضبط کا مظاہرہ کر گئی تھی وہ کہ اندر سیلاب مچلتا رہا اور آنکھوں میں اُس نے ایک بوند تک نہ ترنے دی تھی۔ لیکن دروازے سے داخل ہوتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔

"بس کچھ دیر اور۔" اُس نے اپنے آپ کو سہارا دیا۔ اور اندر آئی تو ہُما اور کلثوم جیسے مُنتظر تھیں۔

"کیسا رہا۔؟ ہمارا مطلب ہے۔" ہُما نے کہا تو وہ بول پڑی۔

"تمہارا مطلب جو بھی ہو، اس وقت میں ڈنر کی تفصیل نہیں بتا سکتی کیونکہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"چائے بنا دوں؟۔" ہُما نے مُخلصانہ پیشکش کی۔

"نہیں، چائے پی کر آ رہی ہوں۔ بس اب سوؤں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہ چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔ کپڑے بدل کر پلنگ کی چادر ٹھیک کر رہی تھی کہ اماں آگئیں۔

"آگئیں تم۔ کِس کے ساتھ آئی ہو؟" اماں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ لمحہ بھر کو اُس کے ہاتھ پلنگ کی سطح پر ٹھہر گئے۔ پھر اُن کی بات کا جواب دینے کے بجائے پُوچھنے لگی۔

"اِبتہاج سو گیا کیا؟۔"

"ہاں، ابھی سویا ہے۔"

"آج آپ اُسے اپنے پاس سُلا لیں۔ میں شاید رات میں اُٹھ نہ سکوں۔"

"تھک گئی ہو گی۔" اماں نے بغور اُسے دیکھا، پھر کہنے لگیں "اب زیادہ دیر تک جاگنے کی ضرورت نہیں ہے، سو جاؤ آرام سے۔ اور ہاں اِبتہاج کی فِکر مت کرو، میں اسے اپنے پاس سُلا لوں گی۔"

"ہاں، اَب سو رہی ہوں۔" اُس نے کُھلے بالوں کو چوٹی کی شکل دی اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹی ہی تھی کہ اماں لائٹ آف کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

لمحہ بھر کو اُسے حیرت ہوئی۔ یوں لگا جیسے سب نے آپس میں طے کر کے اسے عہدِ رفتہ میں بھٹکنے کو تنہا چھوڑ دیا ہو۔ لیکن اب اسے عہدِ رفتہ میں نہیں بھٹکنا تھا کیونکہ ابھی تو وہ گذشتہ باب کو پھاڑ کر پھینک آئی تھی۔

"گذشتہ نہ سہی۔" اُس کے اندر جیسے کوئی پُکار کر کہنے لگا۔ "ابھی جو کچھ ہوا، اُسے تم کیا کہو گی۔ وہ شخص جس کی تم نفی کرنے جا رہی تھیں، کِس دھڑلے سے تمہیں سب کے سامنے جاننے کا دعوا کر رہا تھا۔ اور اپنے اس دعوے کو سچ بھی کر دِکھایا کہ تمہیں ساتھ لے آیا۔ حوصلہ تھا تو سب کے سامنے اسے جُھٹلا دیتیں۔ پھر اُس کی باتیں۔

"میں کسی کو رُوٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ گو کہ ہمارے درمیان رُوٹھنے اور منانے کا نہ کوئی سِلسلہ ہے، نہ تعلق۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں، دوستی نہیں تو عداوت بھی نہ ہو" اور پھر۔

"میں شاید تلافی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُس کے لیے ایک عمر کا ساتھ درکار ہے۔ جب کہ یہ کچھ وقت کا ساتھ بھی آپ پر گراں گزر رہا ہے۔" اور پھر اُسے یاد آیا، اُنہوں نے کہا تھا۔

"اگر آپ ثاقب حسن کے ساتھ مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتیں تو شاید میں بھی مطمئن ہو کر نئی زندگی کی ابتداء کر چکا ہوتا۔"

"یہ سب لن ترانیاں ہیں شہروز احمد۔" اُس نے سوچا۔ "مجھے فریب دینے کا کوئی نیا انداز۔ ورنہ کس نے روکا تھا تمہیں نئی زندگی کی اِبتداء کرنے سے؟۔ اور پھر اب تو میں نے تمہیں ہر خلش سے آزاد کر دیا ہے، تم یقیناً مطمئن ہو گئے ہو گے۔"

ایک تلخ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پہ پھیلی اور وہ کروٹ بدل گئی۔

پھر بس اگلے دن ہی وہ کچھ ڈسٹرب رہی۔ اس کے بعد کلثوم کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا تو وہ اُدھر مصروف ہو گئی۔ ماموں جان کی باقی سب لڑکیوں کی تو شادی ہو گئی تھی، بس ایک نیلو رہ گئی تھی۔ وہ مہندی والے روز سے ہی آ گئی۔ بڑی آپا اور صوفیہ روزانہ صبح سے آتیں بھی تو شام ہوتے ہی واپس چلی جاتیں۔ لیکن جس روز دُولہا والے مہندی لے کر آئے اور اس تقریب کے بعد جب صوفیہ واپسی کی تیاری کر رہی تھی تو اُس نے آ کر اُس کا بیگ چھین لیا۔

"بس چھوٹی آپا۔ آج آپ یہیں رہیں گی۔"

"میں صبح پھر آ جاؤں گی۔" صوفیہ اس سے بیگ لینے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"میں جانے دوں گی تب ناں۔" پھر وہ مہروز سے پُوچھنے لگی۔ "مہروز بھائی، آخر آپ انہیں یہاں کیوں نہیں رہنے دیتے؟"

"بخدا میں نے کبھی منع نہیں کیا۔" مہروز نے صاف اپنا دامن بچایا۔

"تو پھر کہیں اِن سے، یہ یہیں رہیں۔"

"نہ بابا۔" مہروز کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "یہ سمجھیں گی، میں جان چھڑا رہا ہوں۔ اِن کی مرضی رہیں یا نہ رہیں۔ مجھے اِس معاملے سے الگ ہی رکھیں۔"

"چلیے، آپ اجازت دے دیں، انہیں روکنا میرا کام۔"

"نہیں ربیعہ۔" صوفیہ منّت سے بولی۔ "بچّہ پریشان ہو گا، اصل میں اسے اپنی جگہ سونے کی عادت ہے۔ ابھی دیکھو، کیسا بسور رہا ہے۔"

"اِسے میں سنبھال لوں گی۔"

"تم اپنے والے کو سنبھالو گی یا میرے کو۔"

ربیعہ ابتہاج کی طرف دیکھنے لگی جو آرام سے پلنگ پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ اُس نے لپک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا، پھر کہنے لگی۔

"میرا بیٹا بہت اچھا ہے۔ بالکل تنگ نہیں کرتا۔"

"یقیناً آپ پہ گیا ہو گا۔" مہروز مُسکرا کر بولا پھر صوفیہ کی گود میں بچّے کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہنے لگا۔ "یہ اپنی ماں پر گیا ہے، تنگ کرنے میں ماسٹر۔"

"میں تنگ کرتی ہوں؟" صوفیہ نے غصّے سے کہا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"بالکل نہیں۔ اور ہاں، چلنا ہے تو بتا دیں ورنہ میں جاؤں۔"

"بڑی فراخدلی دکھا رہے ہیں۔ اگر میں رُک گئی تو آپ ہی کا مُنہ پھُولا رہے گا۔" پھر جلدی سے بیگ اُٹھا کر اُسے تھمایا اور ربیعہ کا گال تھپک کر بولی۔ "صبح آؤں گی، ہاں۔"

"صبح آنے کی کیا ضرورت ہے۔ شام میں آئیے گا مہمانوں کی طرح۔" وہ خفگی سے بولی تو صوفیہ ہنستی

ی اُسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اگلے دن کلثوم رُخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ تو جہاں خوش اسلوبی سے اہم فرض کی ادائیگی سے ی ہوئی، وہاں گھر ایک دم خالی خالی لگنے لگا۔ اُس رات وہ دیر تک کلثوم کے بارے میں نہ صرف سوچتی رہی بہتر زندگی کے لیے دُعا کرتی رہی تھی۔ اِتنے دنوں کی افراتفری کے بعد سب یوں اطمینان سے سوئے کہ کوئی بھی معمول کے مطابق نہ اُٹھ سکا۔

سب سے پہلے ابتہاج اُٹھا تھا اور سب کو سویا ہوا دیکھ کر اُس نے رونا شروع کر دیا۔ اُس کے رونے آواز پر ہی اُس کی آنکھ کُھلی تھی، فوراً اُسے گود میں لے لیا۔

"کیا ہوا میری جان؟" اور اُس نے ابھی بولنا نہیں سیکھا تھا، اس لیے اس کے سینے میں مُنہ چھپا لیا۔

ب آہستہ آہستہ اُسے تھپکتی ہوئی وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ہما، آماں یہاں تک کہ ابا میاں بھی سو رہے تھے۔

"بیٹی بیاہ کر سوئے ہیں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑائی، پھر خود ہی ہنس پڑی۔

"ماما۔" ابتہاج سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگا تو وہ اُس کی پیشانی چُوم کر بولی۔

"آپ کو بُھوک لگی ہو گی۔ چلو یہاں بیٹھو، میں آپ کا دُودھ بنا لاؤں۔" وہ اسے بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

پہلے فیڈر بنا کر اسے دیا پھر مُنہ ہاتھ دھو کر ناشتا بنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اماں بھی اُٹھ گئیں۔ اُنہوں نے خاص طور سے، الگ سے ناشتا بنانے سے منع کیا کیونکہ رات کا سالن اور روٹی رکھی ہوئی تھی، اُس نے ہی گرم کیا۔ اتنے میں اماں نے ابا میاں اور ہما کو بھی اُٹھا دیا، پھر سب نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔

ناشتے کے بعد وہ ہما کے ساتھ مِل کر گھر کی حالت ٹھیک کرنے لگی۔ کافی دنوں سے افراتفری مچی ہوئی ی اور سب سمیٹتے سمیٹتے کافی وقت لگ گیا، پھر شام میں ولیمے میں بھی جانا تھا۔ یوں سارا دن مصروف گزر گیا۔ اور رات میں بھی کافی دیر سے فراغت مِلی، اس طرح وہ اگلے دن بھی آفس جانے سے رہ گئی۔

گو کہ اسفندیار نے کہا تھا کہ وہ جتنے دن چاہے چھٹی کر لے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی پروا ہو جاتی۔ وہ اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اس لیے اگلے دن گو کہ کلثوم اور جُنید کو آنا تھا، اس ے باوجود وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اور آفس میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اسے یہ آیا کہ جس کمپنی میں وہ ملازم ہے، اس میں شہروز احمد ی حصّے دار ہیں، یہ خیال نہ خوش کُن تھا، نہ مایوس کُن، پھر بھی پتا نہیں کیوں اُس کا دِل اچاٹ ہو گیا۔

اُنہیں مطمئن ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اُنہوں نے خود کہا تھا کہ وہ اُنہیں معاف کر دے تاکہ وہ اس بوجھ سے آزاد ہو سکیں اور دل کی خلش سے نجات حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں۔ لیکن طمانیت تو دُور کی بات خلش ں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کا بھیگا بھیگا لہجہ دل کو نئی بے کلی بخش گیا تھا۔

اُنہیں لگتا اس کے وہ سارے آنسو جنہیں وہ تمام راستہ پلکوں کے اندر روکتی رہی تھی، اُن کے دل پر رے ہوں۔ شاید اُن کا خیال تھا، اُن کے اعتراف پر، وہ سارا الزام اُن کے سر رکھتے ہوئے لڑے گی، گڑے گی اور دِلوں پہ چھائی ہوئی ساری کدورتیں، آپ ہی آپ ڈھل جائیں گی۔ تب وہ شکوہ کرے گی۔

"یہ اعتراف اس وقت کیوں نہ کیا، جب میں آپ کے پاس تھی؟" اور اس ایک شکوے سے سارے ِلے پل میں سِمٹ جائیں گے۔ لیکن کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں، اس کے برعکس وہ اُن کی جھولی میں، افی ڈال کر خوش آئند زندگی کی ضمانت بھی دے گئی کہ "نہ حساب مانگے گی، نہ الزام رکھے گی۔"

ان دنوں وہ مسلسل اُسے سوچ رہے تھے اور اُن کے اندر عجیب سی بے چینی و بے قراری بھر گئی تھی۔ ریں ہر پل کھوجتی ہوئی۔ بات ہونٹوں پہ آ کر رہ جاتی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے کھو جاتے اور کبھی کھوئے کھوئے بک جاتے۔

صوفیہ ایسی باتیں بہت جلدی نوٹ کرلیا کرتی تھی لیکن ان دنوں وہ کلثوم کی شادی کے سلسلے میں اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی، اس لیے اُن کی طرف متوجہ نہ ہوسکی، لیکن امّی سے ان کی بے قراری چھپی نہ رہ سکی۔ پہلے کچھ دن تک تو وہ دیکھتی رہیں، پھر ایک دن بُلا کر کہنے لگیں۔

"ایسے کب تک رہوگے؟۔ میرا خیال ہے، اب تمہیں شادی کرلینی چاہیے۔"

وہ یوں دیکھنے لگے جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"اِس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟۔ میں نے کوئی انہونی بات نہیں کی۔ مرد تو ایک کی موجودگی میں دُوسری کر لیتے ہیں۔ اور تم۔"

"بس کریں امّی۔" وہ ٹوک گئے۔" میں نے ابھی اس بارے میں نہیں سوچا۔"

"تو کب سوچوگے؟۔"

"پتا نہیں۔" وہ دامن بچانے لگے۔

"یہ غلط بات ہے۔" امّی سمجھانے لگیں۔" مہروز کو دیکھو، تم سے چھوٹا ہے، ماشاءاللہ گھر بار والا ہوکر خوش وخرم اور مطمئن نظر آتا ہے۔ اور تم اکیلے پھرتے ہو۔ مجھے دیکھ رہے ہو، بوڑھی ہوکر کسی کام کی نہیں رہی اور صوفیہ کب تک تمہارا خیال رکھے گی۔ ایک دو بچّے اور ہوگئے تو وہ بے چاری خود اتنی مصروف ہو جائے گی۔"

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آنے والی میرا یا میری ضروریات کا خیال رکھے گی۔

"پہلے تو تم نے ایسی کوئی گارنٹی نہیں مانگی تھی۔" امّی کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔ کہ وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

"بہرحال۔" امّی نے حتمی لہجہ اختیار کیا۔" تم نہ سوچو، لیکن میں سوچ چکی ہوں۔"

"کیا۔ کیا سوچ چکی ہیں آپ؟۔" وہ گھبرا کر بولے۔

"تمہاری شادی کا۔ اور اس سلسلے میں اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو بتا دو ورنہ میں خود لڑکی تلاش کرتی ہوں۔"

"ابھی نہیں امّی۔" وہ کسی چھوٹے سے بچّے کی طرح منّت سے بولے۔

"پھر کب؟۔" امّی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"بس کچھ وقت دیں۔ میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن یاد رکھنا، تم نے کچھ وقت کہا ہے اور میں زیادہ وقت انتظار نہیں کروں گی۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُن کے پاس سے اُٹھ آئے تھے۔

اور اب تک تو واقعی انہوں نے اپنے بارے میں اور خاص طور سے اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔ اور اب امّی کے احساس دلانے بلکہ مجبور کرنے پر انہیں سوچنا پڑا۔ اس وقت بھی وہ ان ہی سوچوں میں گم تھے بیٹھے بیٹھے تھک گئے تو وہیں صوفے پر نیم دراز ہوکر ٹانگیں سامنے ٹیبل پر سیدھی کرلیں۔

سگریٹ کا گہرا کش لے کر دُھواں فضا میں چھوڑا تھا کہ ہلکی سی اِس دُھند کے اس پار لگا جیسے ڈریسنگ روم سے نکل کر وہ آرہی ہو۔ اپنے مخصوص انداز میں اُنہیں دیکھ کر جیسے پہلے قدم پر ٹھٹکتی تھی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی ہوئی، کبھی چُپ چاپ کمرے سے نکل جاتی اور کبھی بیڈ کی بے شکن چادر کو خوامخواہ ٹھیک کرتی ہوئی یہ بتانے کی کوشش کرتی کہ" میں سونا چاہتی ہوں، آپ جائیں یہاں سے۔"

دُھوئیں کے مرغولے اِدھر اُدھر راستہ بناتے ہوئے نکل گئے تو سامنے منظر صاف تھا۔ انہوں نے ایک اور گہرا کش لے کر فضا کو دُھندلا دیا تو وہ پھر آس پاس نظر آنے لگی۔ کبھی مہربان ہوتی تو کپڑے پریس کرتی ہوئی۔ اِدھر اُن کے ہونٹوں سے بات نکلی، اُدھر چائے کا کپ لے کر حاضر۔ اور کبھی خفا ہوکر اجنبی اجنبی سی جیسے پہچانتی ہی نہ ہو۔

کبھی ہر پل آنکھیں نم کہ ساون کا گمان ہوتا، اب برسا کہ تب۔

کبھی ہونٹوں پہ کھلکھلاتی ہنسی کہ اطراف کلیاں چٹکنے لگتیں۔ کتنے روپ سامنے آتے رہے اور مٹتے

ہے۔ وہ شاید اسی دُنیا میں مگن رہنا چاہتے تھے کہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سُلگاتے گئے۔ یہاں تک کمرے میں ہر طرف دُھواں ہی دُھواں تھا اور اس دُھندلی فضا میں وہ دھڑتے سے جلوہ افروز تھی۔

"شہروز بھائی۔" صوفیہ نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پکارا۔ اور پھر ہر طرف دھواں ہی دُھواں دیکھ کر پریشان ہوکر پورا دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی بولی۔

"میرے خدا۔ یہ اِتنا دُھواں کہاں سے آگیا؟۔" اُن پہ نظر پڑی تو ٹھٹک گئی۔ وہ 'دیکھ تو دل سے کہ اں سے اُٹھتا ہے' کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیے۔ پھر اُن کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کیا ہُوا ہے آپ کو؟۔ اور یہ اتنی سگریٹ۔!؟"

"ہاں۔" وہ چونکے پھر طویل سانس لے کر صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے صاف گوئی سے بولے۔

"ابھی مجھے اپنے آس پاس ربیعہ کی موجودگی کا احساس ہورہا تھا۔"

"کیا؟۔" صوفیہ مجسم حیرت کی تصویر بن گئی۔" آپ پھر سے اُسے سوچ رہے ہیں؟۔"

"پھر سے؟۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔" میں ہمیشہ اسے سوچتا رہا۔ اس تمام عرصے میں کبھی یادہ دن تک اُس کے خیال سے دُور نہیں رہ سکا۔"

"کیوں؟۔" صوفیہ سنبھل کر بیٹھی تو قدرے ناگواری سے بولی۔

"میں خود نہیں جانتا۔ یا شاید جانتا ہوں۔ ایک لڑکی اپنی ذات اور اپنے وجود کی تمام تر خوبصورتیوں میت دو سال تک اس گھر میں اس کمرے میں میرے آس پاس رہی، اُسے بُھلا دینا آسان ہے کیا؟۔ ر کوشش کرتا تب بھی نہیں اور میرا خیال ہے میں نے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔" وہ پوری ایمانداری سے اعتراف کررہے تھے۔

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے شہروز بھائی اور اب جب کہ امّی آپ کی شادی کا سوچ رہی ہیں تو۔"

"اسی لیے تو۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر کہنے لگے۔" وہ اور شدت سے یاد آنے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے یسے وہ مجھ سے پُوچھ رہی ہو، کیا کوئی اور میری جگہ لے سکتا ہے؟۔"

"آپ کا جواب کیا ہوتا ہے؟۔"

"نہیں، اُس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔" کچھ دیر رُک کر کہنے لگے۔

"اور اُس روز کی ملاقات کے بعد تو میں بالکل ہی ہار گیا ہوں۔

"کیا مطلب؟۔ کیا آپ کی ربیعہ سے ملاقات ہوئی ہے۔؟۔" صوفیہ چونک کر پوچھنے لگی۔ اور وہ اُس ں بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"اپنے آپ کو بے حد مضبوط پوز کرنے کی کوشش میں وہ کرچی کرچی ہورہی تھی۔ آنکھیں خشک صحرا ور ں نے ایک بوند سے بھی اُنہیں سیراب نہیں کیا۔ کم ازکم میرے سامنے۔ بہرحال جس ضبط کا مظاہرہ اُس نے کیا، اس سے مجھے خوشی ہوئی کہ وہ پہلے والی بُزدل سی لڑکی نہیں رہی۔ ابھی حالات سے لڑ رہی ہے، ندہ اپنے حق کے لیے لڑ سکتی ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔ میں اُسے ایسا ہی مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اور ب نے نہیں تو کسی نے تو بنا ہی دیا۔"

"حالات نے۔" صوفیہ فوراً بولی۔

"ہاں، غالباً اس میں حالات کا بڑا دخل ہے۔ بہرحال اس سے پہلے ہم کوئی اور بات کررہے تھے۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر کہنے لگے۔

"میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں میں ربیعہ کو سوچتا رہا ہوں اور میری سوچیں ان ہی ماہ و سال ں گردش کرتی رہی ہیں۔ جو ربیعہ نے اس گھر میں گزارے۔ اس سے ہٹ کر کبھی کوئی خیال نہیں آیا لیکن ب سے امّی نے شادی کے لیے اصرار کرنا شروع کیا ہے، تب سے میں اس کے لیے نئے انداز یا نئے

سرے سے سوچنے لگا ہوں۔ ایسا ممکن تو ہے ناں؟"

اُنہوں نے براہِ راست صوفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو فوری طور پر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ نہ اثبات میں سر ہلا سکی، نہ نفی میں۔ بس چپ چاپ اُن کی طرف دیکھے گئی۔

"آپ کیا سوچنے لگیں؟" کتنی ہی دیر بعد شہروز احمد نے صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکی نہیں، بس اُن پر سے نظریں ہٹا کر میز کی سطح پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔

"کیا بات ہے، آپ اِس طرح چپ کیوں ہو گئیں؟ میں نے کوئی غلط بات کہہ دی کیا یا یہ کوئی انہونی ہے؟" شہروز احمد کی سمجھ میں اُس کی خاموشی نہیں آ رہی تھی۔

"پتا نہیں، آپ کی بات غلط ہے یا انہونی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا" صوفیہ اُلجھ کر بولی۔

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔ اگر صاف لفظوں میں سُننا چاہتی ہیں تو میں کہوں گا، امّی ایک اور بہولانا چاہتی ہیں۔ تو کسی اور کے بجائے اُسے ہی لے آئیں جو پہلے بھی یہاں رہ چکی ہے" آخر میں وہ ذرا سا مُسکرائے لیکن صوفیہ اسی سنجیدگی سے بولی۔

"آپ اسے آسان سمجھ رہے ہیں؟"

"کیوں اس میں مشکل کیا ہے؟" پھر خود ہی سمجھ کر بولے "شاید آپ ربیعہ کی وجہ سے کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں۔ اور پتا نہیں امّی بھی اس بات کو پسند کریں گی یا نہیں؟"

"اس میں ناپسندیدگی کا کیا سوال؟ میں سمجھتا ہوں امّی نے کبھی بھی ربیعہ کو ناپسند نہیں کیا بلکہ اس کی وجہ سے مجھ سے خفا ہیں۔"

"یہ اس وقت کی بات ہے جب ربیعہ یہاں تھی اور اب حالات مختلف ہیں۔"

اُنہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

"اور میں آپ سے بھی یہی کہوں گی شہروز بھائی کہ پہلے موجودہ حالات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔"

"میں اس روز سے سوچ رہا ہوں، جس روز اُس سے سامنا ہوا تھا" اُنہوں نے پھر صوفے کی پُشت سے سر ٹکایا اور نظریں سامنے دیوار پر یوں جما دیں جیسے اُس روز کی فلم چلنے لگی ہو۔

"کب ہوا تھا اُس سے سامنا؟ ہاسپٹل میں؟" صوفیہ یاد کرتی ہوئی پُوچھنے لگی۔

"نہیں اس کے بعد۔" پھر اُنہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسفند یار کی طرف سے دیے گئے ڈنر میں اُس سے مُلاقات ہوئی تھی اور وہ اسے گھر بھی چھوڑنے گئے تھے۔ صوفیہ ساری تفصیل سُننے کے بعد حیرت سے بولی۔

"کمال ہے ربیعہ نے مُجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے اُس کے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم بات نہ ہو۔ بہرحال آپ اس سے پُوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟"

"میرا خیال ہے، پہلے آپ امّی سے بات کر لیں۔" صوفیہ نے مشورہ دیا۔

"نہیں، امّی سے بعد میں بات کروں گا کیونکہ مجھے یقین ہے امّی میری خواہش رَد نہیں کریں گی۔"

"اور ربیعہ۔" اس تمام عرصے میں پہلی بار صوفیہ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلی، کچھ شریر، کچھ معنی خیز سی۔

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا" وہ بھی کُھل کر مسکرائے "کچھ رُوٹھی رُوٹھی سی ہے اور کیونکہ خوابوں کی دُنیا سے نکل کر حقیقت میں زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھ گئی ہے، اس لیے اُسے منانے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔"

"ارے" صوفیہ نے شوخ حیرت کا مظاہرہ کیا "اتنی دیر کی مُلاقات میں آپ اُس کے بارے میں

کچھ کیسے جان گئے؟"

"بس جان لیا۔ آپ یہ بتائیں، آپ اُس سے کب بات کریں گی؟"

"جب جاؤں گی، بات کر لوں گی۔ اِس سے پہلے اگر آپ مزید سوچ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں۔"

"مجھے جو سوچنا تھا، سوچ لیا" وہ اُس کی بات کاٹ کر فیصلہ کُن انداز میں بولے تو وہ خاموش ہو کر اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ وہ پُوچھنے لگے۔

"کلثوم کی شادی ٹھیک ٹھاک ہو گئی؟"

"ہاں۔ اللہ کا شُکر ہے۔"

"خوش ہے۔؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی، پھر جاتے جاتے بولی۔

"اگر اَب آپ نے سگریٹ پی تو میں آپ کی بات ربیعہ سے نہیں کروں گی۔"

"دھمکی؟" وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

"بالکل۔"

"اچھی بات ہے۔ ویسے اب مجھے سگریٹ کی ضرورت رہی بھی نہیں۔ شفاف فضا میں بھی بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔"

پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے وہ۔ صوفیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اُچکائے اور اُنہیں "شب بخیر" کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

اُس نے جب سوچ لیا تھا بلکہ تہیہ کر لیا تھا کہ ثاقب حسن کے گھر ضرور جائے گی تو اماں کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنا ارادہ ترک نہیں کر سکی اور اُس کے گھر جانے کا تو موقع نہیں ملا۔ لیکن ایک روز اپنے آفس سے نکلی تو سیدھی ثاقب حسن کے آفس پہنچ گئی۔ اُس کی کُرسی پر اُس کا بھائی صاحب براجمان تھا۔ اُس کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اس بزنس کے مالکانہ حقوق حاصل کر کے اپنی پوزیشن اچھی خاصی مضبوط کر چکا ہے۔ اُس کے باوجود اچانک اسے سامنے دیکھ کر لمحہ بھر کو گھبرایا ضرور لیکن فوراً سنبھل گیا۔

"ارے بھابی۔ آپ؟ خیریت تو ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟" یقیناً اُس نے آفس کا خیال کر کے لہجے کو خوشگوار بنایا تھا۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اسی طرح گھر میں سامنا ہو جاتا تو وہ شاید بات بھی کرنا پسند نہ کرتا۔ بہرحال وہ بھی اب پہلے والی ربیعہ نہیں تھی۔ بے حد مطمئن انداز میں لاپروائی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بولی۔

"بہت دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہر بار مصروفیت آڑے آتی رہی۔ آج اتفاق سے یہاں سے گزر ہوا تو سوچا" وہ خاموش ہو گئی لیکن دل میں اپنی بات مکمل ضرور کی۔ "کچھ حساب کتاب ہی کر جاؤں۔"

"آپ بیٹھیے ناں۔ کیا منگواؤں آپ کے لیے۔؟"

"چائے۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو" وہ کُرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی قدرے بے تکلفی سے بولی تو وہ انٹرکام پر چائے کے لیے کہنے لگا، پھر اُس کی طرف متوجہ ہوا تو مُسکرا کر پوچھنے لگا۔

"اور سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"اللہ کا شُکر ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے" پھر آفس کا جائزہ لیتی ہوئی بولی "تم نے ثاقب حسن کے بزنس کو خاصی ترقی دے دی ہے۔" ایک طرح سے باور کرا دیا کہ یہ سب تمہاری جاگیر نہیں ہے۔

"ہاں بس۔" وہ اسی قدر کہہ سکا، پھر فوراً اُس کی طرف آتا ہوا بولا۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"جاب۔" پھر وضاحت ضروری سمجھی۔ "مصروف رہنے کی خاطر جاب کر رہی ہوں۔ ورنہ مجھے ضرورت تو نہیں تھی کیونکہ ثاقب حسن نے میرے لیے اتنا تو ضرور چھوڑا ہو گا جس سے میں اپنا مستقبل محفوظ کر سکوں۔"

وہ کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ مُلازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے آ گیا۔ اُس نے ٹرے اس کے سامنے رکھوا کر مُلازم کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس سے کہنے لگا۔

"آپ کسی دن گھر آئیں ناں۔"

"میں ضرور آتی لیکن پتا نہیں کیوں وہاں جانے کا سوچ کر مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ شاید ثاقب حسن کے بغیر اس گھر کا تصور مجھے خوفزدہ کرتا ہے یا پھر تمہاری اماں کا سلوک۔" وہ بڑی خوبصورتی سے اُن کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ "حالانکہ لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ تمہارے شوہر کا گھر ہے، تم اس کی بہت ساری چیزوں میں حصے دار ہو لیکن میرا دل نہیں مانا۔ گو کہ میں جانتی ہوں، اَب تمہاری اماں کا میرے ساتھ وہ رویہ نہیں ہو گا، ثاقب حسن کے غم نے انہیں بہت بدل دیا ہو گا۔ پھر بھی۔" وہ خاموش ہو کر سر جھکا گئی۔

"چائے لیجیے۔" عاقب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو کپ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا جسے اُس کے ہاتھ سے لے کر وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"یہ سموسے لیں ناں۔"

"نہیں بس۔"

"ارے۔ ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، کھانے کو بھی کچھ چاہیے۔"

"ہاں۔ لیکن اب خواہش نہیں رہی۔" اُس نے بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں ختم کی پھر دُوسرا کپ بنانے لگی۔ اسی وقت ملازم آ کر کہنے لگا۔

"سر، اسد صاحب آئے ہیں۔"

"کون اسد صاحب؟" عاقب پُرسوچ انداز میں پُوچھنے لگا۔

"سر، وہی انشورنس والے۔"

اور انشورنس پر اُسے یاد آیا کہ ایک بار ثاقب حسن نے بھی سرسری انداز میں اس سے ذکر کیا تو فوراً مُلازم کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"اِنہیں یہیں بھیج دو۔"

پھر کپ میں چمچ چلاتی ہوئی خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "اچھا اتفاق ہے۔ میں اسد صاحب سے ثاقب کی پالیسی کے بارے میں معلوم کر لوں گی۔"

"آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔" عاقب کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ اور وہ سادگی سے بولی۔

"کیوں؟"

"بس میں کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ ہنسی اور دروازے سے داخل ہوتے اسد صاحب کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ہی وہ بیٹھے کہنے لگی۔

"اچھا ہوا۔ آپ سے یہیں مُلاقات ہو گئی ورنہ مجھے آپ کے آفس آنا پڑتا۔"

"آپ کون ہیں خاتون؟" اسد صاحب پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"میں ربیعہ ہوں۔ مسز ربیعہ ثاقب حسن۔"

"آپ بیگم ثاقب حسن؟" انہوں نے غالباً تصدیق کے لیے عاقب کی طرف دیکھا اور وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا، تب وہ اُسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میں آپ ہی کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔ عاقب نے بتایا تھا کہ آپ ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں۔"

"ہاں۔ آں۔" وہ ہاں کو لمبا کھینچتی ہوئی عاقب کی طرف دیکھنے لگی۔

"کب آئیں آپ؟" اسد صاحب پوچھنے لگے۔

"کچھ دن ہوئے۔ غالباً ہفتہ، ڈیڑھ ہفتہ۔"

"اچھا۔" اسد صاحب متعجب ہوئے۔ "ابھی دو روز پہلے میں نے فون کیا تھا، عاقب صاحب نے آپ کی ی کا نہیں بتایا۔"

"میں نے منع کیا تھا۔" وہ فوراً بولی۔ یہ صورتحال جہاں اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی، وہاں وہ دل ہی ں محظوظ بھی ہو رہی تھی۔ پھر بھی بظاہر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

"اصل میں میں ابھی کسی سے مِلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے عاقب کو خاص طور سے ہدایت کی سی کو میری واپسی کا نہ بتائے۔ بہر حال آپ بتائیے، مُجھ سے کیا کام ہے؟"

"وہی انشورنس پالیسی۔" اسد صاحب بریف کیس کھولتے ہوئے بولے۔

"کیا آپ میرا انشورنس کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس کے لیے میں آپ کو بعد میں کنوینس کروں گا۔" پھر کچھ کاغذات اسے دِکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "وقت تو میں آپ کو آپ کے مرحوم شوہر کی پالیسی کے بارے میں بتانے آیا ہوں، جو اُنہوں نے۔"

"ایک منٹ۔" اُس نے روک دیا۔ پھر گھڑی دیکھتی ہوئی بولی۔ "معاف کیجیے گا، اس وقت تو میں جلدی وں۔ آپ کل کا ٹائم دے دیں، میں خود آپ کے آفس آ جاؤں گی۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ چائے وغیرہ۔"

"نہیں شکریہ۔" وہ عاقب سے مصافحہ کر کے چلے گئے، تب وہ بھی اُٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے، میں بھی چلوں۔ بلکہ اگر تم بھی اُٹھنے کا ارادہ کر رہے ہو تو چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہ۔"

وہ کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی چپ چاپ اُس کے پیچھے نکل آئی۔ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی پوچھنے لگی۔

"کیا تم بتا سکتے ہو، ثاقب نے کتنے کی پالیسی لی تھی؟"

"ہاں۔" وہ پھٹ پڑا۔ "لیکن تم سُن لو کہ اِس ساری رقم پر صرف تمہارا حق نہیں ہے۔"

"حق کی بات مت کرو عاقب حسن! ورنہ میں اور بہت سارے حقوق کا دعوا کرنے لگوں گی۔"

"کیا۔؟" وہ چیخا۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں ثاقب حسن نے میرے نام سے شیئرز خریدے تھے اُس کے علاوہ۔"

"بس۔" وہ ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے روک گیا۔ "اوّل تو تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، ِ محال تم کہیں سے ثبوت حاصل کر بھی لو تو اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں نے تمام شیئرز فروخت کر ہیں۔"

"میری اجازت کے بغیر؟" اُس نے حیرت کا مظاہرہ کیا گو کہ وہ بالکل حیران نہیں تھی کیونکہ جس طرح اُسے ے نکال کر دوبارہ کوئی پوچھنے بھی نہیں آیا تھا، اس سے وہ بہت پہلے ہی ان کی نیت جان گئی تھی۔

"تم کون ہوتی ہو اجازت دینے یا نہ دینے والی؟" وہ انتہائی بدتمیزی سے بات کرنے لگا۔

"میں ثاقب حسن کی بیوی ہوں۔ کیا ثبوت کے طور پہ مجھے نکاح نامہ پیش کرنا پڑے گا؟" آخر میں وہ ے بولی۔

"تم ثاقب حسن کی بیوی تھیں۔ اب نہیں ہو۔ اور سُن لو، ہمارے تم سے سارے ناتے، سارے تعلق

اُسی کے دم سے تھے، وہ نہیں رہا تو سب ختم ہوگیا۔ ہم تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔"

"اچھی بات ہے، پھر تم مجھے یہیں اُتار دو۔" وہ بہت پُرسکون رہ کر بات کر رہی تھی۔"میں تمہیں اپنا دیور سمجھ کر تمہارے ساتھ بیٹھی تھی لیکن اب جب تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو تو میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔"

اُس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی اور خشمگیں نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

"سُنو۔ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم ثاقب حسن کی بیمہ پالیسی کو بھول جاؤ ورنہ۔"

"ورنہ۔؟" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی چیلنج کر گئی۔"جو کر سکتے ہو کر لینا عاقب حسن! لیکن کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے اِتنا ضرور سوچ لینا کہ ربیعہ ثاقب حسن گھی نکالنے کے لیے اُنگلیاں ٹیڑھی کرنا سیکھ گئی ہے۔"

"دیکھ لوں گا تمہیں۔" اُس کا بس نہیں چل رہا تھا، یہیں اُس کی گردن دبا کر قصہ ہی ختم کر دے اور وہ اُس کی حالت پر ہنستی ہوئی دروازہ کھول کر اُتر گئی۔ پھر قریب سے گزرتے رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گئی۔

گھر آئی تو صوفیہ اور مہروز آئے ہوئے تھے۔ اور وہ جو ابھی تک عاقب کے جھنجھلانے اور اس کی بے بسی پر محظوظ ہو رہی تھی، بیٹھتے ہوئے بولی۔

"توبہ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دُنیا میں؟۔ خُدا کا خوف ہی نہیں ہے۔ بس پیسے کو ہی دین ایمان سمجھ لیا ہے۔"

"خیریت؟۔ تمہارا ایسے لوگوں سے کیسے واسطہ پڑ گیا؟۔" صوفیہ تجسس سے پوچھنے لگی۔

"واسطہ تو پہلے سے تھا لیکن اُن کی اصلیت اب سامنے آئی ہے۔"

"کون ہیں؟۔"

"ثاقب حسن کے گھر والے۔" پھر شوز اُتار کر آرام سے بیٹھتی ہوئی بتانے لگی۔"میں آج ثاقب حسن کے آفس چلی گئی تھی۔ جہاں عاقب سے مُلاقات ہوئی۔ پہلے تو اچھے طریقے سے ملا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ میں اپنا حق چھوڑوں گی نہیں تو میں بتا نہیں سکتی چھوٹی آپا کہ اُس نے کیسا رنگ بدلا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے گولی سے اُڑا دیتا۔"

"اور میں آپ کو بتاؤں۔ اُنہوں نے محض بیمے کی رقم حاصل کرنے کی خاطر انشورنس والوں کو یہ کہہ رکھا تھا کہ میں مُلک سے باہر گئی ہوں۔ وہ تو آج اتفاق سے اسد صاحب سے مُلاقات ہوگئی ورنہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کچھ عرصے بعد وہ لوگ میری موت کی خبر اُڑا کر وہ رقم بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ میرے شیئرز تو فروخت کر ہی چکے ہیں۔"

"کتنے کے تھے؟۔" صوفیہ نے پوچھا تو وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اور مجھے تو انشورنس کی رقم کا بھی پتا نہیں ہے کہ ثاقب حسن نے کتنے کی پالیسی لی تھی۔ یہ تو کل اسد صاحب کے آفس جاؤں گی، تب معلوم ہوگا۔"

"کیا ضرورت ہے تمہیں ان سب جھنجھٹوں میں پڑنے کی؟۔" اماں نے پھر ٹوکا۔"ایسا نہ ہو وہ لوگ تمہارے دُشمن بن جائیں۔"

"دوست کب تھے؟۔" وہ تلخی سے بولی۔"اور اماں آپ خوامخواہ کے اندیشوں میں مت گھریں۔ آپ میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں کہ آخر مجھے بھی زندگی گزارنی ہے اور میں اس طرح ساری زندگی نوکری تو نہیں کر سکتی۔ اگر میرے شوہر نے میرے لیے کچھ چھوڑا ہے تو اسی لیے ناں کہ آڑے وقت میرے کام آئے۔ اس لیے تو نہیں کہ میں اُسے بڑے آرام سے دُوسروں کے حوالے کر کے خود تہی دامن رہ جاؤں؟۔ کیوں مہروز بھائی، میں غلط کہہ رہی ہوں کیا؟۔"

آخر میں اُس نے مہروز کو مخاطب کیا تو وہ جو حیران سا ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا، سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا اور اس کی تائید کرتا ہوا بولا۔

"بالکل نہیں۔ آپ غلط نہیں کہہ رہیں بلکہ آپ کو تو بہت پہلے اپنے حق کے لیے لڑنا چاہیے تھا۔"

"یہی بات آپ اماں کو سمجھائیں، میری بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ مہروز کو اشارہ کر کے وہاں سے اُٹھ گئی۔

کچن میں آئی تو ہما شامی کباب بناتے ہوئے خاصی جھنجھلا رہی تھی۔ وہ چھوٹے موٹے کام تو خوشی سے کیا کرتی تھی لیکن جہاں کوئی محنت کا کام ہوا، اُس کی شکل پر مسلسل بیزاری چھائی رہتی تھی۔

"لاؤ میں بنا دوں۔" اُس نے جیسے ہی اپنی خدمات پیش کیں، ہما خوش ہوگئی۔ لیکن پھر خیال آیا تو کہنے لگی۔

"آپ پہلے ہی تھکی ہوئی آئی ہیں۔"

"نہیں، ساری تھکن بس کی وجہ سے ہوتی ہے اور میں آج رکشے سے آئی ہوں۔"

"بڑے عیش ہیں۔"

"ابھی کہاں؟۔ عیش کے دن تو اَب آئیں گے۔"

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

"کیا مطلب؟۔" ہما ایک دم چونک کر پوچھنے لگی۔

"کوئی مطلب نہیں۔ چلو ہما گو یہاں سے۔" وہ اُسے کچن سے نکال کر خود اُس کی جگہ بیٹھ گئی۔ سارا کام ہو ہی گیا تھی، اب تو بس ٹکیاں بنا کر تلنا باقی تھیں۔ وہ جلدی جلدی ٹکیاں بنا کر ٹرے میں رکھنے لگی پھر اس سے فارغ ہو کر ایک چولہے پر کڑاہی میں گھی گرم کرنے کے لیے رکھا اور دوسرے چولہے پر توا رکھ کر کڑاہی کے نیچے اُس نے آنچ دھیمی کر دی تاکہ سہولت سے دونوں کام ایک ساتھ کر سکے۔ اور ابھی اس نے پہلی روٹی ڈالی ہی تھی کہ صوفیہ اُسے ڈھونڈتی ہوئی آگئی۔

"ارے، تم آتے ہی کام میں بھی لگ گئیں؟۔"

"زیادہ کام نہیں ہے، بس تھوڑی سی روٹیاں ڈالنی ہیں۔ باقی سب تو ہما کر ہی چکی ہے۔" اُس نے پلٹتے ہوئے کہا۔ پھر کڑاہی میں کباب ڈالنے لگی۔

"لاؤ، کباب میں تل دوں۔" صوفیہ آگے بڑھ آئی۔

"ارے نہیں چھوٹی آپا۔ میں کر لوں گی۔" اُس نے روکنا چاہا۔"آپ بیٹھیں اندر جا کر۔ بس میں ابھی لگاتی ہوں۔"

"اِس طرح جلدی ہو جائے گا اور پھر میں تم سے باتیں بھی کرنا چاہ رہی ہوں۔"

"اچھا۔" وہ یونہی ہنسی اور صوفیہ کے لیے جگہ چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

پھر کچھ دیر کام میں مگن رہنے کے بعد صوفیہ اس سے کہنے لگی۔

"سُنو۔ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں زندگی گزارنی ہے اور تم ساری عمر تو نوکری نہیں کر سکتیں۔"

"کچھ غلط کہا میں نے۔؟" وہ سادگی سے پُوچھنے لگی۔

"نہیں غلط تو نہیں کہا لیکن تمہیں اپنے لیے دُوسرے انداز سے بھی سوچنا چاہیے۔"

"دُوسرے انداز سے۔؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں، تمہیں سوچنا چاہیے کہ پہاڑ سی زندگی تم تنہا نہیں گزار سکتیں۔ خواہ کتنا پیسہ حاصل کر لو، اپنے محل تعمیر کر لو پھر بھی ساتھی کی ضرورت۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ درمیان میں بول پڑی۔"میں آپ کی بات جھٹلا نہیں سکتی لیکن کیا اب اس انداز سے سوچنا مجھے زیب دیتا ہے؟۔"

"کیوں؟۔ کون سا تمہاری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے یا تمہارے بچے بڑے ہوگئے ہیں۔"

"بات عمر کی نہیں ہے چھوٹی آپا۔ حالات کی ہے۔ اور حالات نے دو بار مجھ سے سائبانی چھینی ہے کہ اب ایک تو میرا دل ڈرتا ہے، دُوسرے لوگ کیا کہیں گے کہ مجھے شادیاں کرنے کا شوق ہے۔ نہیں چھوٹی آپا، میں خواہ اپنے آپ کو کتنا ہی مضبوط کیوں نہ بنا لوں۔ پھر بھی لوگوں کے مذاق کا نشانہ نہیں بن سکتی۔" وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتی گئی۔

"لوگوں کی بات مت کرو ربیعہ۔ لوگ صرف باتیں کرتے ہیں۔"

"پھر بھی نہیں۔" وہ بات ختم کرنے کی غرض سے بولی جب کہ صوفیہ کو اصل بات اب شروع کرنی تھی۔

"یہ ناممکن نہیں ہے ربیعہ۔ تم لوگوں کی پروا مت کرو۔"

"چلیے میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ پھر اَب کون ایسا جی دار ہے جو مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوگا۔" اپنے تئیں اُس نے صوفیہ کو لاجواب کر دیا تھا لیکن وہ بڑے آرام سے بولی۔

"شہروز احمد۔"

"کیا۔ ؟" وہ پتا نہیں حیران تھی، غیر یقین یا متاسف۔ جیسے صوفیہ نے اس کا مذاق اُڑایا ہو۔

"ہاں، میں شہروز بھائی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ خود۔"

"بس کریں چھوٹی آپا۔" وہ دبے دبے لہجے میں چیخ پڑی۔ "اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔"

"لیکن ربیعہ۔"

"بس چھوٹی آپا۔ بس، مجھے اس سے زیادہ ذلیل مت کریں۔" وہ بے پناہ دُکھ کے احساس میں گھر کر بولی اور چولہا بند کر کے اندر چلی گئی۔

آفس میں لنچ ٹائم میں فرناز کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے اُس نے آج کل ثاقب کے آفس جانے اور وہاں کی تمام تفصیل کہہ سنائی۔ آخر میں کہنے لگی۔

"آج اسد صاحب نے مجھے اپنے آفس بلایا ہے۔ میرا خیال ہے تمام کارروائی تو اس تمام عرصے میں عاقب مکمل کر ہی چکا ہے۔ اب صرف رقم کا چیک وصول کرنا باقی ہے۔ اور میرا خیال ہے، اگر چیک وصول کرنا عاقب کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کا وصول کر چکا ہوتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔" فرناز نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کچھ اور عرصہ اُن کے سامنے نہ جاتیں تو وہ یہ رقم بھی ہضم کر چکے ہوتے۔ بہرحال اب تم دیر مت کرو۔"

"ہاں میں سوچ رہی ہوں، تین بجے تک چھٹی لے کر چلی جاؤں لیکن۔" وہ پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔

"لیکن کیا ؟" فرناز نے اس کا کندھا ہلایا۔

"لیکن یہ کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیوں ؟ میرا مطلب ہے کس سے ؟"

"پتا نہیں۔" پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "شاید عاقب کی طرف سے دھڑکا ہے۔ اصل میں کل اس کا عجیب سا رُوپ دیکھا۔ مجھے لگتا ہے، وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔ ویسے بھی وہ جانتا ہے کہ آج میں اسد صاحب کے آفس جانے والی ہوں۔"

"تمہارا اندیشہ صحیح ہے۔"

"پھر کیا کروں ؟" اُس نے پوچھا تو فرناز سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"ایسا کرو، چھٹی لے کر جانے کے بجائے سر سے کہو تمہیں کسی ضروری کام سے جانا ہے، وہ اپنے ڈرائیور کو تمہارے ساتھ بھیج دیں۔"

"اگر اُنہوں نے ضروری کام کے بارے میں پوچھ لیا تو ؟"

"کم آن۔ انہیں اتنی فرصت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی وہ دُوسروں کی ذاتیات میں کم ہی دخل دیتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔"

"بس تو پھر ابھی چلی جاؤ۔"

"ابھی ؟" وہ سوچنے لگی۔

"ہاں ابھی۔ اسی وقت چلو اُٹھو۔" فرناز نے زبردستی اسے اُٹھا کر ایم ڈی اسفندیار کے کمرے کی ـت دھکیل دیا اور وہ چلی تو آئی لیکن اَب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اُن سے کیا کہے۔

"جی بی بی۔ ؟" اسفندیار نے اُسے خاموش کھڑے دیکھ کر مخاطب کیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سر۔ وہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ایک دم کہہ گئی۔

"چھٹی چاہیے۔ ؟"

"جی۔" بلا ارادہ اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔

"صرف ابھی کی یا کچھ دِنوں کی۔ ؟"

"بس ابھی کی۔"

"او کے۔ اگر کوئی ضروری فائل ہو تو وہ بھجوا دیں، پھر آپ جا سکتی ہیں۔"

"تھینک یو سر۔"

وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور باہر آتے ہی خیال آیا کہ ڈرائیور اور گاڑی کی بات تو رہ ہی گئی۔ لیکن اب بارہ اُن کے پاس نہیں جا سکتی تھی، اس لیے خوامخواہ فرناز پر بگڑنے لگی۔

"تم نے اِتنی جلدی میں دھکیل دیا کہ میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔"

"تو اب جا کر کہہ دو۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی، تم جاؤ۔"

وہ اس سے ہاتھ مِلاتی ہوئی آفس سے نکل کر آئی تو شہروز احمد کی گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ وہ خود ی اس میں موجود تھے۔ اُن کے ساتھ پتا نہیں کون تھا جسے وہاں اُتار کر وہ گاڑی بڑھانا چاہتے تھے اُسے دیکھ کر نہ صرف رُکے بلکہ دروازہ کھول کر پکار بھی لیا۔

"ربیعہ۔ آئیے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گئی اور اُنہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو پوچھنے لگے۔

"کہاں جانا ہے ؟"

"میں صدر کی طرف جاؤں گی۔"

اُنہوں نے گاڑی اسی راستے پر ڈالی پھر کیسٹ آن کر کے آواز قدرے دھیمی کر دی۔ مدھم سُروں ں مہناز کی آواز جادُو سا جگانے لگی تھی۔

تم کو میرے سوا، او میرے ساجنا!
اب نہ دیکھے کوئی دُوسرا
میں تیری دھوپ ہوں تو ہے سایا میرا
زندگی کے عوض پیار پایا تیرا
تو رہے ہمسفر، تو یہ لمبی ڈگر
بنتی جائے گی پھولوں بھرا راستہ
رات دن کا جو یہ اجنبی کھیل ہے
ہے جُدائی کہیں اور کہیں میل ہے
غم فانی وہی، یہ کہانی وہی
لوگ رُکتے ہیں، رُکتا نہیں قافلہ

آخری بولوں پر اُسے ثاقب حسن یاد آنے لگا اور اُس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔

"مجھ پر نہیں تو اپنے آپ پر رحم کرتے ثاقب حسن۔" اُس نے سوچا۔ "ایک عمر اچھی زندگی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور جب مِلی تو اپنی نادانی میں کھودی۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

"ارے رُوٹھنا ہی تھا تو مجھ سے رُوٹھتے، ساری دُنیا سے کیوں روٹھ گئے؟"

"کِس طرف جانا ہے؟" شہروز احمد پُوچھ رہے تھے۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور شیشے سے باہر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔

"بس یہیں روک دیں۔" مطلوبہ جگہ دیکھ کر رُکنے کے لیے کہا تو وہ پُوچھنے لگے۔

"یہاں کسی کام سے جا رہی ہیں؟"

"جی۔"

"واپسی کتنی دیر میں ہوگی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"او کے۔ جتنی دیر بھی لگے، میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ ایک نظر اُن پر ڈال کر اُتر گئی۔ بلڈنگ میں داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اسد صاحب کے آفس پہنچی تو وہ جیسے اُس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"سوری۔ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔" وہ اُن کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔" کہتے ہوئے ـــــ اُنہوں نے ایک فائل کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر کہنے لگے۔

"آپ کے شوہر ثاقب حسن نے دس لاکھ روپے کی پالیسی لی تھی۔ جس میں اُنہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ اُن کے بعد اس کی حقدار آپ ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس فائل پر سے نظریں ہٹا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"ثاقب حسن کے انتقال کو غالباً ڈیڑھ سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران اُن کے بھائی عاقب حسن کئی بار میرے پاس آئے۔ اور اُنہوں نے ہی بتایا کہ آپ مُلک سے باہر چلی گئی ہیں۔ پھر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہم یہ رقم اُن کے حوالے کر دیں لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ آپ کے شوہر نے اپنے بعد آپ کو اس کا وارث ٹھہرایا تھا۔" وہ خاموش ہو کر دیکھنے لگے کہ شاید وہ کچھ کہے گی لیکن وہ اُسی طرح خاموش رہی۔

"بہرحال یہ چیک آپ کی امانت کے طور پر میرے پاس تھا۔ آپ یہ کچھ کاغذات سائن کر دیں، پھر یہ چیک آپ کا۔" اُنہوں نے چیک اور کاغذات دونوں ایک ساتھ اُس کی طرف بڑھا دیے تو اُس نے پہلے کاغذات لے کر سائن کیے، اُس کے بعد چیک وصول کیا۔

"آپ کے لیے چائے منگواؤں؟" وہ اُسے یوں چُپ چاپ دیکھ کر پُوچھنے لگے۔

"نہیں شکریہ۔ اصل میں میں نیچے کسی کو انتظار کرتا ہوا چھوڑ کر آئی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا۔" وہ اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے تو وہ الوداعی کلمات کہہ کر اُن کے آفس سے نکل آئی۔ راہداری اُس نے تیز قدموں سے عبور کی لیکن سیڑھیوں پر قصداً سُست روی اختیار کی۔ اصل میں وہ شہروز احمد کے ساتھ یونہی نہیں آگئی تھی۔ رات صوفیہ نے جس انداز سے اُن کا پروپوزل دینا چاہا تھا، اس سے اسے زیادہ تو نہیں، تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوا تھا کہ صوفیہ نے شہروز سے بات کرنے کے بعد اس سے کہا ہے یا غالباً اُن کے کہنے پر۔ اور اُس وقت تو اُس نے صوفیہ کو بِنا سوچے سمجھے

ختی سے منع کر دیا تھا۔ لیکن جب رات میں اُس نے سنجیدگی سے سوچا، تب بھی اُسے یہ بات انتہائی یر مناسب لگی تھی۔ اور ابھی وہ یہ سوچ کر اُن کے ساتھ آئی تھی کہ اگر اُنہوں نے خود ایسی کوئی بات چھیڑی تو ہ اُنہیں بھی صاف منع کر دے گی۔

آہستہ قدموں سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ مسلسل اپنے آپ کو ایسی کسی قِسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ آخر میں اُس نے یہ بھی سوچ لیا کہ اگر شہروز احمد نے ایسی کوئی بات بھی چھیڑی، تب بھی وہ اپنے طور پر اپنی کسی بات یا کسی انداز سے اُن پر واضح کر دے گی کہ وہ گم گشتہ ستوں کو کھوجنے اور پھر اُن پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ آخری سیڑھی پر رُک کر اُس نے اسد صاحب کا یا ہوا لفافہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، پھر جب آ کر شہروز احمد کے برابر بیٹھی تو لفافے کو یوں اپنی گود میں رکھا کہ اُس کے اوپر انشورنس کمپنی کا نام بڑے حرفوں میں چھپا ہوا اور نیچے لکھا ہوا اُس کا نام "مسز ربیعہ ثاقب حسن" صاف نظر آ رہا تھا۔ اس مصروف شاہراہ پر بے پناہ رش کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ وہاں سے نکلتے نکلتے کوئی آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اس دوران وہ نہ تو اُس کی طرف متوجّہ ہوئے، نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کی بتہ جیسے ہی مین روڈ پر آئے، پوچھنے لگے۔

"آپ کہاں جائیں گی؟۔ گھر یا آفس؟"

"گھر جاؤں گی۔ اور آپ مجھے کسی ایسی جگہ اُتار دیجیے جہاں سے مجھے سواری آسانی سے مل جائے۔"

"گھر تک چھوڑنے میں کیا قباحت ہے؟" اُنہوں نے ذرا سی گردن موڑی تو اُس کی طرف اُٹھنے سے پہلے نظر اس لفافے پر جا ٹھہری۔ تو جو سمجھے، اُسی حساب سے پُوچھنے لگے۔

"یہ آپ کا پارٹ ٹائم جاب ہے؟"

"کون سا؟" وہ سمجھ کر انجان بنی۔

"انشورنس کمپنی میں۔" اُنہوں نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ پارٹ ٹائم کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"پھر غالباً آپ نے پالیسی لی ہوگی۔" وہ یونہی باتیں کرتے رہنے کی غرض سے پُوچھنے لگے۔ کیونکہ انتے تھے کہ یہ موضوع ختم ہو گیا تو پھر کوئی اور موضوع سوچنے میں سفر ہی تمام ہو جائے گا اور جبکہ وہ چاہ ی تھی یوں ہی باتوں باتوں میں کوئی بات نکلے جسے وہ گرفت میں لے سکے اور یہی موقع اُس نے اسب سمجھا۔ کہنے لگی۔

"یہ پالیسی میں نے نہیں ثاقب حسن نے لی تھی اور اُنہوں نے اپنے بعد اس کا وارث مجھے ٹھہرایا ھا۔" یہ کہنے کے بعد اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔ جبھی خاموش ہو گئی۔ اور وہ کچھ دیر انتظار رنے کے بعد کہنے لگے۔

"آپ نے اِسے اُسی وقت کیوں نہ وصول کیا؟۔ اِتنے عرصے بعد کیوں؟"

"پہلے مجھے خیال تو آیا لیکن میں نے سوچا جب ثاقب حسن ہی نہیں ہے تو پھر یہ سب لے کر کیا کروں ا اور اب میں سوچتی ہوں، جس چیز پر میرا حق ہے، وہ مجھے لینی چاہیے۔ پھر یہ تو میرے شوہر کی طرف ے میرے لیے آخری تحفہ ہے۔"

اسٹیئرنگ پر اُن کے ہاتھوں کی مضبوط ہوتی گرفت اُس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھی، پھر کہنے لگی۔

"یہ رقم میں نے لی ہی اِس لیے ہے کہ اسے کسی اچھے کام میں لگا کر ثاقب حسن کے نام کر دوں تاکہ ا نیک عمل کی بدولت اللہ میاں اس کے درجات بُلند کرتے جائیں۔ یہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے ا تحفہ ہوگا جو اِس دُنیا میں ہی نہیں، اُس دُنیا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔"

"گویا وفاشعاری کی مثال قائم کرنا چاہتی ہیں آپ۔؟" انہوں نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"شاید۔" وہ آہستہ سے بولی تو پتا نہیں کیسے اُن کا لہجہ ایک دم بدل گیا، کچھ سخت ہونے کے

ساتھ ساتھ طنز آمیز بھی۔

"ایک بات بتائیں مسز ربیعہ کہ آپ جو ایک غیر مرد کے پہلو میں بیٹھ کر وفا شعاری کی بات کر رہی ہیں تو اس سے آپ کسے دھوکا دے رہی ہیں، اُس مرحوم کو یا خود اپنے آپ کو۔" اُس کے اندر باہر ایک دم سناٹوں کا راج ہو گیا۔ دل چاہا صاف گوئی سے کہہ دے۔

"تمہیں۔ صرف تمہیں شہروز احمد۔"

لیکن آواز نے تو ساتھ چھوڑا ہی، حواس بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ بس اتنا ہوا کہ ان کی طرف سے ذرا سا رُخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ اپنی بات پر اُس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مِرر کا سہارا بھی لیا لیکن وہ کچھ ایسے رُخ سے بیٹھی تھی کہ وہ باوجود کوشش کے اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ تب مایوس ہو کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی اور اُس کے گھر کے سامنے جا کر ہی رُکی۔ وہ اُترنے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔

"ایک منٹ۔" اُس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

"ایک بات کا آپ نے جواب نہیں دیا لیکن اب میں ہر صورت جواب چاہتا ہوں کہ آپ کس ناتے میرے ساتھ یہاں تک آئیں ہیں؟"

وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ براہِ راست اُن کی آنکھوں میں تو نہ دیکھ سکی، پھر بھی نظریں اُن کے وجود پر بھٹکتی چھوڑ دیں اور قدرے اعتماد سے کہنے لگی۔

"آپ نے کس ناتے سے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی آفر کی تھی؟"

"آپ صوفیہ کی بہن ہیں اس لیے۔"

"اور آپ مہروز کے بھائی ہیں۔ میں اس لیے آپ کے ساتھ آ گئی۔" وہ برابر سے جواب دے کر اُتر گئی اور جب چکر کاٹ کر گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو وہ پکار کر بولے۔

"سُنیں۔ کیا مہروز کا بھائی یونہی دروازے سے واپس چلا جائے؟"

وہ رُک کر انہیں دیکھنے لگی۔ بظاہر سنجیدہ نظر آ رہے تھے لیکن آنکھوں میں ہلکی شوخی کا رنگ چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے وہ پل بھر میں پیچھے سفر کر گئی۔

"کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟" وہ اکثر اسے یہاں چھوڑنے آتے تو پوچھتے تھے۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"لیکن میں زیادہ دن رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔" ایک بار خاصی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"کیا۔۔؟" وہ چیخی تھی۔

"ہاں۔ جب تک کچھ حق رکھتا ہوں، اسے استعمال بھی کروں گا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئے تھے اور وہ جھنجلاتی ہوئی اندر آئی تھی۔

"میں نے مشکل بات کہی ہے یا میری بات نے آپ کو مشکل میں ڈال دیا ہے؟" انہوں نے اُس کے خاموش رہنے پر پوچھا تو وہ چونک گئی اور جاتے جاتے بولی۔

"مہروز کے بھائی میں اگر جرأت ہے تو خود ہی اس دروازے پر دستک دے لے۔" یہ کہتے ہی وہ اندر چلی گئی۔

"جرأت بھی ہے اور دستک بھی دوں گا۔" وہ قدرے اونچی آواز میں بڑبڑائے اور گاڑی بیک کرتے ہوئے اُن کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آن ٹھہری جو گھر آنے تک ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق سے پہلے ہی مرحلے پر صوفیہ سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد صوفیہ چائے لے کر آئی تو پوچھنے لگے۔

"آپ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"بچہ کہاں ہے؟"

"اُسے ابھی مہروز باہر لے گئے ہیں۔" پھر شرارت سے بولی۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"پہلے آرام سے بیٹھ جائیں پھر مجھے بتائیں کہ آپ نے ربیعہ سے بات کی یا نہیں؟" انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اصل بات پوچھ ڈالی تو وہ کیونکہ ستانے کے موڈ میں تھی، اس لیے انجان بن گئی۔

"کون سی بات؟"

"صوفیہ۔" انہوں نے فوراً بڑائی کے رعب کے ساتھ تنبیہی لہجہ اختیار کیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ سے مذاق کرنے کی۔"

"میں کہاں مذاق کر رہی ہوں۔"

"پھر بتائیے، اُس سے کیا بات ہوئی؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ وہ کچھ روٹھی روٹھی سی ہے۔ منانے میں کچھ وقت لگے گا۔" وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ پھر ذرا سی پلکیں اُٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا کہا اُس نے؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے جیسے ہی آپ کا نام لیا، اُس نے ٹوک دیا تھا اور سختی سے منع کر دیا کہ میں ہی کوئی بات نہ کروں۔ وہ کچھ بھی سننے پر تیار نہیں تھی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے، وہ ڈرتی ہے۔ اندر سے خوفزدہ ہے کہ دنیا والے کیا کہیں گے۔"

"آپ نے اُسے سمجھایا نہیں۔؟"

"کوشش کی تھی لیکن۔" وہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ جو پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھے۔

"لیکن کیا۔؟" صوفیہ کی مسلسل خاموشی پر شہروز احمد قدرے بے قراری سے پوچھنے لگے۔

"میں کچھ نہیں جانتی شہروز بھائی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ آپ کے نام پر وہ بہرحال سنتے ہی اُکھڑ گئی تھی۔" وہ بات ختم کرنے کی غرض سے کچھ جھنجلا کر بولی۔ انہوں نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے، آپ امی سے بات کریں۔ پہلے بڑوں کے درمیان بات ہو جائے، اس کے بعد سے کوئی بھی سمجھا سکتا ہے۔ اماں، ابا میاں، بڑی آپا۔ اور ہو سکتا ہے، وہ کسی ایک کی بات مان بھی جائے۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔" وہ طویل سانس لے کر کھڑے ہو گئے اور یونہی چلتے ہوئے کمرے کے آخری سرے تک چلے گئے۔ اُن کا انداز سوچنے والا تھا اور جب پلٹے تو کہنے لگے۔

"لیکن ابھی تو وہ زیادہ اُکھڑی ہوئی نہیں تھی۔"

"کون؟" صوفیہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔

"ربیعہ۔"

"کیا مطلب؟ کیا آپ ابھی اس سے مل کر آ رہے ہیں؟" صوفیہ کو یقیناً حیرت ہوئی، کیونکہ کل تو وہ اُس کا نام بھی سننے کی روادار نہیں تھی اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ اس سے مل کر آ رہے ہیں۔

"میرا مطلب ہے اُس سے ملاقات کہاں ہوئی؟"

"یونہی۔ سرِ راہ۔ پھر میں نے اُسے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی جو اُس نے قبول کر لی۔"

"حیرت ہے۔" صوفیہ نے برملا حیرت کا اظہار کیا۔

"کس پر؟" وہ رُک کر پوچھنے لگے۔

"آپ دونوں پر۔" اُس نے دانستہ صرف ربیعہ کا نام نہیں لیا، پھر کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے، آپ

دونوں سارے معاملات طے کرلیں، آخر میں ہمیں بُلا لیجیے گا، ہم آکر چھوہارے کھالیں گے۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بہت اچھے لگ رہے ہیں ہنستے ہوئے۔"

اُن کی ہنسی قہقہے کی شکل اختیار کرگئی تو وہ اُنہیں گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کو تھی کہ مہروز بچے کو لیے ہوئے غالباً اُسے ڈھونڈتا ہوا وہیں آگیا۔ بڑے بھائی کو جو یوں ہنستے دیکھا تو پہلے متعجب ہوا، پھر پوچھنے لگا۔

"کیا صوفیہ نے کوئی لطیفہ سُنایا ہے؟"

"جی نہیں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "لطیفہ انہوں نے خود سُنایا ہے اور ہنس بھی خود رہے ہیں۔"

"اچھا۔" مہروز محظوظ ہوکر ہنسا پھر بچّہ اُس کی گود میں دے کر اطمینان سے بیٹھتا ہوا بولا۔ "کیا لطیفہ تھا۔ میں بھی سُنوں۔"

"یہ اپنی شادی کی بات کر رہے تھے۔" صوفیہ نے یوں کہا جیسے لطیفہ ہو۔

"سچ۔" مہروز ابھی بیٹھا تھا، اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "سچ شہروز بھائی؟"

"اِن سے کیا پوچھ رہے ہیں، مجھ سے پوچھیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ یہ شادی کرنا کس سے چاہ رہے ہیں۔"

"کِس سے؟" مہروز فوراً اُس کی طرف مڑا۔ اُس کے لہجے میں تجسّس، اشتیاق اور نہ جانے کیا کچھ تھا اور شہروز احمد اُسے نہ بتانے کا اشارہ کرتے رہ گئے لیکن وہ خاموش نہیں ہوئی۔

"ربیعہ سے۔"

"کیا؟" مہروز دوبارہ صوفے پر ڈھے گیا۔ "یارو، مجھے ہوش میں لاؤ، یہ میں نے کیا سُنا؟"

"مہروز۔" پھر وہی بڑائی والا رعب کہ مہروز فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

"آئی ایم سوری۔" پھر سر کھجاتا ہوا بولا۔ "اِرادہ تو نیک ہے اور میرا خیال ہے نیک کام میں دیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

"اب تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں۔" اُنہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو صوفیہ مُنہ پھُلائے ہوئے فوراً اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ مہروز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اگر ساری خوشیاں صرف پیسے کی مرہونِ منت ہوتیں تو دُنیا میں سارے پیسے والے بہت خوش ہوتے اور وہ جس نے اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھ لیا تھا اور اب اپنا حق دس لاکھ کی صورت وصول بھی کر آئی تھی، اُسے بھی خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ اس کے برعکس ایک اضطراری کیفیت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کیا کرے۔ دل بوجھل سا تھا۔ کہتے ہیں، کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ اور وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی۔

پھر جب سے وہ انشورنس کی رقم وصول کر کے آئی تھی، اماں نے بھی اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں، جو دل چاہے کرو۔ اور یہ صورتِ حال اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے کب اپنی مرضی کی۔ ہمیشہ تو دُوسروں کی مرضی پر چلتی رہی۔ زندگی اُس کی اور لگامیں دُوسروں نے تھام کر کٹھ پتلی بنائے رکھا۔ وہ کب تک چک پھیریاں کھاتی، سب کے سامنے تماشا بنی رہتی۔ آخر کہیں نہ کہیں تو اُس نے اپنے وجود کے گرد بندھے دھاگوں سے نجات حاصل کرنی ہی تھی اور اب جب وہ آزاد تھی، اپنی سوچ سوچنے لگی تھی، تب بھی سب خفا، جیسے وہ نادان ہو، غلطیوں پر غلطیاں کر رہی ہو۔

"کیا میں غلطی پر ہوں؟" اُس روز وہ ہُما سے پوچھنے لگی۔ "اگر نہیں تو پھر میرا دل بھاری بوجھ تلے کیوں دب گیا ہے۔ ہر پل ایک مجرمانہ سا احساس۔ جیسے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوگیا ہو مجھ سے۔ میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔

نہ کسی کی حق تلفی کی ہے۔

یقین کرو ہما، مجھے ثاقب حسن کے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محض اُس کے گھر والوں کو یہ بتلانے کی خاطر کہ میں اب کمزور نہیں ہوں، اپنا حق وصول کیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو جانتی ہو کیا ہوتا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ لوگ مجھے ڈرا دھمکا کر وہ پلاٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو ثاقب نے میرے نام سے خریدا تھا۔ اُس کے بعد بھی وہ لوگ چین سے نہ بیٹھتے۔ اور میں تمہیں بتاؤں میں ہر چیز سے دستبردار ہوسکتی تھی اگر جو ثاقب حسن کے والدین میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ اپنے گھر میں نہ رکھتے لیکن کبھی کبھار یہاں آکر میرا حال احوال پوچھ لیتے۔ اس کے برعکس اُس کی اماں نے بھری برادری میں مجھے منحوس اور نہ جانے کیا کچھ کہہ کر نکال باہر کیا۔ اس کے بعد بھی میں اپنے آپ کو سمجھاتی رہی، جو ہوا اُسے بھول جانا اچھا ہے۔ لیکن جب سرِراہ انیلا سے مُلاقات ہوئی تو اُس کا منہ موڑنا میرے دل میں ترازو ہوگیا۔ اُسے مُنہ اس وقت موڑنا چاہیے تھا، جب ایک بار پہلے اس سے اسی طرح سامنا ہوا تھا اور اس وقت میں شہروز احمد کی منکوحہ تھی لیکن اس وقت وہ نہ صرف بڑے تپاک سے ملی بلکہ بعد میں گھر تک آئی تھی۔ اُس وقت تو میرا اُس سے کوئی ناتا نہیں تھا اور اب جب کہ میں اُس کے مرحوم بھائی کی بیوہ ہوں تو وہ صرف اس لیے مُنہ موڑ گئی کہ میں کچھ لینے کی بات نہ کرنے لگوں۔ چہ چہ، اِس قدر تنگ نظری اور تنگ دلی۔ بہرحال میں نے یہ سب اپنے لیے حاصل نہیں کیا۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں ثاقب حسن نے یہ سب میری محبت میں نہیں کیا۔ اور نہ ہی ہماری اولاد تھی جو وہ سوچتا کہ کل کو اولاد کے کام آئے گا۔ اُس نے محض ٹیکس بچانے کی خاطر میرے نام سے پلاٹ خریدا اور انشورنس کراتے ہوئے وراثت کے خانے میں میرا نام بھی اُس نے یونہی بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہوگا یا اس وقت کوئی اور نام اس کے ذہن میں نہیں آیا ہوگا۔ اور پھر اُس وقت اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اِتنی جلدی دُنیا سے اس کا ناتا ٹوٹ جائے گا۔ بہرحال اگر وہ یہ سب میری محبت میں کرتا، تب بھی مجھے یہ سب حاصل کر کے خوشی نہ ہوتی۔"

"پھر اَب آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی تھی کہ ہُما پوچھنے لگی۔

"میں کیا چاہتی ہوں؟" اُس نے جیسے خود سے سوال کیا۔ پھر کہنے لگی۔

"اصل میں، میں خود فریبی میں مُبتلا ہوں۔ اپنے طور پر یہ سمجھ لیتی ہوں کہ عہدِ رفتہ سے مکمل طور پر ناتا توڑ کر اپنے حال سے مطمئن ہوگئی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر دُوسرے قدم پر کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے، جو مجھے ماضی میں دھکیل دیتی ہے۔ اور پتا ہے ہُما، سب سے زیادہ مجھے ثاقب حسن کے وہ آخری لمحات یاد آتے ہیں۔ جب وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے جا رہا تھا۔ اُس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں دُکھ کی گہری پرچھائیوں کے ساتھ حسرتیں تھیں، التجائیں تھیں جیسے وہ کچھ وقت کی مہلت مانگ رہا ہو۔ اور ہُما! کسی غیر کو بھی اس حالت میں دیکھ لو تو دل درد سے پھٹنے لگتا ہے اور وہ تو میرا شوہر تھا۔ وہ اپنی غلطیوں کے اعتراف کے بعد مجھ سے معافی چاہتا تھا۔ میں نے اُسے معاف کر دیا لیکن پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے جس طرح میں نے محض زندگی کو پُرسکون رکھنے کی خاطر اس سے محبت کا اعتراف کیا اور اُس نے یقین نہیں کیا۔

اِسی طرح اُن آخری لمحوں میں جب میں اُس سے کہہ رہی تھی کہ میں نے کبھی اُس کی باتوں کا بُرا نہیں منایا، اُس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں غیر یقینی سِمٹ آئی تھی جیسے کہہ رہا ہو، اب وقتِ رُخصت میرے ساتھ

مذاق مت کرو ربیعہ۔

مجھے فریب مت دو۔

بس مجھے معاف کردو۔

اور میں چیخ چیخ کر اُس کی جھولی میں معافی ڈال کر اسے اطمینان دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کے سانسوں کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد سے اب تک وہ جب بھی مجھے یاد آیا، جب بھی اُس کا خیال آیا، میں نے یہی کہا۔ میں نے تمہیں معاف کیا ثاقب حسن۔ اور وہ جیسے میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے، میرے ہونٹوں سے نکلے لفظوں کا یقین لینے۔"

اسے اپنے روانی سے بہتے آنسوؤں کا بالکل احساس نہیں تھا۔ جب آواز ساتھ چھوڑ گئی تب اُس نے پہلے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں پھر دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا، پھر کہنے لگی۔

"میں اسے محبت کا یقین نہیں دینا چاہتی کیونکہ نادانی کی عمر کو چھوڑ کر اس کے بعد مجھے اس سے محبت رہی ہی نہیں تھی۔ اور کسی زندہ شخص کو تو مصلحتاً محبت کا فریب دیا جا سکتا ہے لیکن اسے نہیں البتہ میں اسے معافی کا یقین ضرور دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں نے اسے دل سے معاف کر دیا ہے۔ جانتی ہو، میں اسے یہ یقین کس طرح دوں گی؟"

ہُما جو بے حد حیران ہو کر اُس کی باتیں سُن رہی تھی، بہت آہستہ سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں ان سارے پیسوں کو ثاقب حسن کے نام سے کسی اچھے نیک کام میں لگا دوں گی۔ یہی اس کے لیے میری معافی کا یقین ہوگا۔"

"آپی۔" ہما اس کی بات سُن کر کہنے لگی۔ "میں آپ کو ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کو اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔"

"اپنے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں جبھی تو ایسا کر رہی ہوں۔ میں آزاد ہونا چاہتی ہوں، ہر بوجھ اور خلش سے اور ان سے نجات کا یہی ایک راستہ میری سمجھ میں آتا ہے۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ہما مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"بیوقوف۔ ماضی سے نکلوں گی، تب ہی تو آج اور آئندہ کے بارے میں سوچ سکوں گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ماضی کی ہر شے کو اُس کے صحیح مقام پر چھوڑ کر آگے نکل آؤں۔ دوسری صورت میں آوازیں پیچھا کرتی ہیں۔ اور آوازوں کی بازگشت میں، میں اپنے آپ کو بھلا دیتی ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟" آخر میں اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو ہُما مُسکرا کر بولی۔

"کُچھ کُچھ۔"

"چلو۔ اِتنا ہی کافی ہے۔" وہ بھی مُسکرائی پھر موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔

"کافی دِنوں سے کلثوم نہیں آئی۔ صبح امّاں سے کہنا اُس کی طرف ہو آئیں۔"

"ہاں، صبح امّاں بھی اُسے یاد کر رہی تھیں۔ ویسے آپی، اُس کے جانے سے میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں۔"

"کیوں؟ اِبتہاج ہوتا تو ہے تمہارے پاس۔"

"لیکن اِبتہاج سے میں باتیں تو نہیں کر سکتی۔ کرتی بھی ہوں تو وہ جواب نہیں دیتا۔"

"ابھی چھوٹا ہے ناں۔" وہ شفیق سی مُسکراہٹ کے ساتھ سوتے ہوئے ابتہاج کو دیکھنے لگی۔ اسی وقت امّاں آ گئیں۔ غالباً ایک نیند لے کر اٹھی تھیں۔ سوئی سوئی آنکھیں اور سوئی ہوئی آواز میں پوچھنے لگیں۔

"تم دونوں ابھی تک سوئی نہیں؟"

"بس اب سو رہے ہیں۔"

وہ دونوں ایک دُوسرے کو اشارہ کر کے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کرنے لگیں۔

"ایک بج رہا ہے۔" امّاں جلتے جاتے بولیں۔ "صبح دفتر کی چھٹی تو نہیں ہے، پھر کیوں اس وقت تک جاگ رہی ہو؟"

"بس سو رہی ہوں۔" وہ ہُما کو لائٹ آف کرنے کا اشارہ کر کے خود جلدی سے لیٹ گئی۔

اگلے دن وہ پھر عاقب کے آفس چلی گئی۔ اس وقت وہ کسی میٹنگ میں مصروف تھا۔ وہ اُسے اپنی آمد کی اطلاع کروانے کے بجائے اطمینان سے بیٹھ کر اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی اور جب وہ آیا تو اُسے دیکھتے ہی ناگواری سے بولا۔

"اب کیا لینے آئی ہو؟"

"میں پہلے بھی تم سے کچھ لینے نہیں آئی تھی۔" وہ سُکون سے بولی۔ "اور تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو؟ تمہارے پاس تمہارا اپنا ہے ہی کیا؟"

"بہت کچھ۔" وہ گردن اکڑا کر بولا۔ "دس لاکھ تو میرے ہاتھوں سے یوں نکل جاتا ہے اور تم۔ غالباً اِتنی رقم حاصل کر کے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہی ہوگی۔"

"نہیں۔" اُس کے سُکون میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ "وہ دس لاکھ روپے میرے پاس ثاقب حسن کی امانت ہیں اور اسی سلسلے میں مجھے تمہاری رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ جو ریوالونگ چیئر کو مسلسل دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے اُس کے وجود سے لاتعلقی اور بیزاری کا مظاہرہ کر رہا تھا، ایک دم سیدھا ہو بیٹھا تو وہ کہنے لگی۔

"میں اس سلسلے میں کسی اور سے بھی بات کر سکتی تھی لیکن تمہارا انتخاب میں نے یوں کیا کہ۔ تم ثاقب حسن کے بھائی ہو اور پُورے خلوص سے مجھے مشورہ دو گے۔"

"کیا چاہتی ہو تم؟" وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا۔

"میں ان سارے پیسوں کو ثاقب حسن کے نام سے کسی ایسے فلاحی کام میں لگانا چاہتی ہوں جس کا اجر ثاقب حسن کو مِلتا رہے۔"

"تم۔" بس ہونٹوں کی بے آواز جنبش ہوئی اور وہ جس طرح بغور اسے دیکھ رہا تھا، کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔

"کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو گے؟" اُس نے پوچھا تو وہ پہلے چونکا پھر طویل سانس لے کر دوبارہ کُرسی کی بیک سے سر ٹِکا لیا۔

کِتنے ہی پَل بیت گئے۔ وہ کچھ نہیں بولا، شاید کچھ سوچنے میں لگ گیا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" وہ مسلسل خاموشی سے اُکتا کر بولی۔

"پہلے تم میری بات کا جواب دو۔" اُس نے اپنی گردن کو حرکت نہیں دی، بس نظریں ترچھی کر کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں کہو۔" وہ سوالیہ نظریں اُس پر جما کر اُس کے بولنے کی منتظر تھی اور وہ کہنے لگا۔

"پیسہ اِنسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ خاص کر آج کے دور میں اور جب کہ ہر شخص اسے جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس کی دوڑ میں ایک دُوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں بھی ہے، پھر تم اسے اپنی آسائش کے لیے استعمال کرنے کے بجائے۔"

"عاقب۔" وہ اُس کی بات پُوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ "یہ ساری آسائشیں یہیں تک ہیں اور اصل زندگی یہ نہیں، وہ ہے۔ پھر ہم یہاں کی بجائے وہاں کا سامان کیوں نہ کریں؟"

"پھر بھی — ؟"
"پھر بھی —" اُس نے دُہرایا۔ پھر سوچتے ہوئے بولی "اگر ہماری کوئی اولاد ہوتی تو میں شاید بلکہ یقیناً اُس پر خرچ کرتی اور جہاں تک میری ذات کا سوال ہے تو میں نے خود اپنے لیے جدوجہد کرنا سیکھ لیا ہے۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی "غالباً تم مجھے مشورہ دینے کے موڈ میں نہیں ہو، اس لیے میں چلتی ہوں۔"
"بھابی —"
وہ دروازے تک گئی تھی کہ اُس نے پکار لیا لیکن وہ پلٹی نہیں، اُسی طرح کھڑی رہی۔ جانتی تھی جب اُس نے بھابی کہہ کر پکارا ہے تو اُٹھ کر بھی ضرور آئے گا۔ اور وہ اُٹھ کر اُس کے سامنے تو آ کھڑا ہوا لیکن سر نہیں اُٹھایا، نہ ہی کچھ کہہ سکا۔
"کیا بات ہے ؟" وہ اُس کے ندامت سے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"آ — آپ —" اُس کی زبان لڑکھڑائی اور پھر وہ اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا۔
"ارے — رے۔" اس نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ "پاگل مت بنو، چلو اُٹھو۔"
"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں ؟" وہ اُونچا پورا مرد اُس کے سامنے رو پڑا۔ "ہم نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، یہاں تک کہ بھائی جان —"
"تم کیا جانو تمہارے بھائی جان نے میرے لیے کیا کچھ کیا ؟" وہ فوراً بول پڑی۔
"کیا کِیا انہوں نے ؟"
"اب وہ ساری باتیں تمہیں بتانے والی نہیں ہیں —" اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی تو پلکیں بھیگ گئیں۔ اچانک جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ ایک ساتھ کئی روپ، جن سے دانستہ نظریں چرانے کی خاطر پہلے ذرا سا رُخ موڑا پھر آواز پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
"بس اب میں جاؤں گی — شام اُترنے لگی ہے، سواری مُشکل سے ملے گی۔"
"لیکن پہلے آپ میرے ساتھ جائیں گی —"
"کہاں ؟"
"گھر — ابا آپ کا بہت پوچھتے ہیں —" پھر بڑی آس سے بولا۔ "چل رہی ہیں ناں ؟"
"چلو —" وہ کچھ سوچ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔
وہی گھر جہاں ثاقب حسن سب کی مخالفتیں مول لے کر اُسے لایا تھا اور اُس کے بعد قدم قدم پر اُس کے لیے آزمائشیں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ عاقب کے ساتھ یہاں آ تو گئی تھی لیکن اب اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ شاید دل نے اس حقیقت کو اب تسلیم کیا تھا کہ اس گھر سے اُس کا کوئی ناتا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ویسے وہ کوئی ناتا جوڑنے یا پُرانے رشتوں کو یاد دلانے نہیں آئی تھی بلکہ پُرانے تعلق کا اگر کوئی تصور رہ گیا تھا تو اُسے بھی مٹانے آئی تھی، اس خوبصورتی سے کہ دِلوں میں کوئی کدورت نہ رہے۔
عاقب اسے سیدھا ابا کے پاس لے گیا۔ وہ انہیں دیکھ کر کتنی دیر تک چُپ چاپ کھڑی رہی، جوان اولاد کے غم نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔
"ابا —" وہ اُن کے پاس بیٹھی اور اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر یوں دیکھنے لگے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔
"ابا — یہ بھابی ہیں — ربیعہ بھابی —" عاقب نے قدرے اُونچی آواز میں انہیں بتایا پھر اماں کو بُلانے چلا گیا۔
"بیٹی —" ابا کا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کے سر پر آن ٹھہرا۔ "کیسی ہو بیٹی ؟"
وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔
"میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کروں جوان اولاد کے غم نے ایسی کمر توڑی ہے کہ چارپائی

سے لگ کر رہ گیا ہوں۔"
اُس کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ دل کسی نامعلوم احساس سے سہما ہوا سا لگ رہا تھا۔ بہت ہستگی سے اُس نے ابا کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے ہونٹوں پھر آنکھوں سے لگا لیا۔ اُسی وقت اقب اپنی اماں کو لے آیا۔ وہ یقیناً انہیں اس کے ارادوں کے بارے میں بتا آیا تھا جبھی انہوں نے تے ہی اُسے گلے لگا لیا تھا۔ اور وہ ہر بوجھ، ہر خلش سے ایک دم آزاد ہو گئی۔
وہ اپنی عادت یا فطرت سے مجبور تھی کہ کسی کو خفا نہیں کر سکتی تھی اور یہ گھر جہاں اُسے نہ محبت لی اور نہ وہ مقام جو گھر کی بڑی اور پہلی بہو کی حیثیت سے مِلنا چاہیے تھا۔ پھر بھری برادری میں جس رح ساس نے گھر سے نکالا تھا، اُس وقت کو بھی وہ اب تک نہیں بھولی تھی، اس کے باوجود اُس کے ل پر بوجھ سا رہا۔ کوئی اُس سے خفا ہے تو کیوں ؟ ۔ اور جب تک دل پر بوجھ رہتا، وہ خلش محسوس رتی رہتی اور اب — کیونکہ وہ گُزری ہر بات کی خلش سے نجات حاصل کر کے پُرسکون ہو کر رہنا چاہتی تھی، س لیے خود ہی چلی آئی تھی۔ کیونکہ تھوڑا بہت یہ یقین تھا کہ وہ ثاقب حسن کے پیسوں کو جس طرح اُس کے نام کر رہی ہے، اس سے اُس کے گھر والے اگر خوش نہ بھی ہوئے تو خفا بھی نہیں رہیں گے۔
ور یہی ہوا۔ عاقب اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا اور اماں نے نہ صرف گلے لگایا بلکہ اپنے گزشتہ ویے پر ندامت بھی محسوس کرتی رہی تھیں۔ اس کا مقصد ان سب کو ندامتوں میں دھکیلنا یا اپنے ملمنے ہاتھ جُڑوانا ہرگز نہیں تھا۔ وہ بس صلح چاہتی تھی۔ اور جب اماں نے گلے لگا لیا تو اُس کے ل سے گزرے وقت کی تمام اذیتیں اور کدورتیں آپ ہی آپ دُھل گئیں۔
اس کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکی۔ ابا، عاقب کے ساتھ ساتھ اماں بھی خاص طور پر اُسے ات کے کھانے کے لیے روکتی رہ گئیں لیکن اس کے پاس معقول جواز موجود تھا کہ وہ گھر میں کہہ ر نہیں آئی، دیر ہو جانے کی صورت میں سب پریشان ہوں گے۔
"اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو چلیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

انہوں نے جب صوفیہ کی بات کو سنجیدگی سے سوچا تو انہیں اس کا مشورہ معقول اور مناسب لگا داُس نے کہا تھا کہ آپ ربیعہ کے سلسلے میں امّی سے بات کریں۔ پہلے بڑوں کے درمیان بات ہو ئے، اس کے بعد اسے کوئی بھی سمجھا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے صوفیہ کے مشورے پر عمل کرنے سوچ تو لیا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امّی سے کس طرح بات کریں۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا ربیعہ کا نام سُن کر امّی کا کیا ردِعمل ہو گا ؟
وہ جانتے تھے، ربیعہ امّی کو بہت عزیز تھی اور اُس کی وجہ سے اکثر امّی انہیں بھی سخت سست کہہ یا کرتی تھیں اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ جب انہوں نے ربیعہ کو طلاق دی تھی تو امّی صدمے سے نڈھال ڈگئی تھیں۔ پھر اگلے کئی دن تک اُن سے خفا بھی رہی تھیں۔
اور جب صوفیہ اور مہروز دوبارہ ربیعہ کو اس گھر میں لانے کی بات کرنے لگے تھے تو امّی بھی اُن ے متفق تھیں۔ لیکن یہ سب اس وقت کی باتیں تھیں اور وہ جانتے تھے کہ جب اچانک کوئی غیر متوقع ت ہو جائے تو فطری اور فوری طور پر انسان ایسی ہی باتیں سوچتا ہے کیونکہ اس وقت انسان مکمل طور بذبات کے تابع ہوتا ہے۔ لیکن پھر جب وقت کی گردش جذبات میں وہ شدت نہیں رہنے دیتی نسان کی سوچیں بھی بدل جاتی ہیں۔ ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور اب وہ نہیں جانتے تھے کہ تین، چار ل کا عرصہ گزرنے کے بعد اب امّی، ربیعہ کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہیں اور پتا نہیں اب وہ اس ت کو مناسب سمجھتی ہیں یا نہیں۔ بہرحال تین چار روز تک تو وہ امّی سے بات کرنے کے لیے خود کو رکرتے رہے۔
پھر یہ اِتفاق تھا کہ اس وقت وہ امّی کے پاس جانے کا سوچ رہے تھے کہ امّی خود اُن کے کمرے میں

آگئیں۔

"میں ابھی آپ کے پاس ہی آرہا تھا۔" وہ کھڑے ہوئے تو بلا ارادہ منہ سے نکل گیا۔

"اچھا۔" امّی ہلکے سے مسکرائیں پھر بیٹھتے ہوئے شکوہ کرنے لگیں۔ "تمہیں ہمارے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ گھر میں بھی بہت کم نظر آتے ہو؟"

"اصل میں جب سے نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے تب سے۔"

"میں جانتی ہوں۔" امّی اُن کی بات کاٹ کر بولیں۔ "اب تم مجھے نئے پروجیکٹ کی تفصیلات مت بتانے بیٹھ جانا۔"

"نہیں۔" اُنہوں نے بے ساختہ ہنسی کو نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر روکا پھر بھی پورا چہرہ گہری مسکراہٹ کی گرفت میں آگیا۔

"بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" امّی نے صوفے پر اپنے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی۔" وہ بیٹھے تو پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔ اور اب کافی وقت گزر گیا ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے شادی سے متعلق کیا سوچا اور کیا فیصلہ کیا ہے؟" امّی نے بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع چھیڑا تو وہ فوری طور پر یہی کہہ سکے۔

"فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔"

"میرا فیصلہ سنو گے؟"

"جی۔" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ سوچ کر بولیں۔

"اگر تم اپنی گزشتہ غلطی پر نادم ہو اور اُس کی تلافی بھی کرنا چاہتے ہو تو میں کہوں گی ربیعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"جی۔" انہیں بے تحاشا حیرتوں نے آن گھیرا تھا۔ جس بات کو کہنے کے لیے وہ اتنے دنوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے، وہ امّی نے اتنی سہولت سے کہہ دی تھی، گویا اُن کی خواہشوں تک اُن کی رسائی ہو گئی تھی، امّی نے ایک نظر اُن کے چہرے پر ڈالی پھر کہنے لگیں۔

"بعض لوگ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے ہیں کہ دل آپ ہی آپ اُن کی طرف کھنچتا ہے۔ اور پھر وہ اتنے عزیز ہو جاتے ہیں کہ کہیں بھی رہیں، محبت میں کمی نہیں آتی کیونکہ اُن کی ہر ادا دل پر نقش ہو چکی ہوتی ہے۔ ربیعہ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"وہ بچی ربیعہ اپنے اچھے کردار و عمل کے ایسے نقوش چھوڑ گئی ہے جسے مٹانے کی سوچنا میرے نزدیک حماقت کے ساتھ ساتھ کم ظرفی بھی ہے۔ میں نے جب جب تمہاری شادی کے بارے میں سوچا مجھے اُسی کا خیال آیا، اگر تم کہو تو۔"

امّی خاموش ہو کر اُن کی طرف دیکھنے لگیں تو وہ سر جھکا گئے۔ گو کہ امّی نے اُن کے دل کی بات کہی تھی، پھر بھی وہ فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکے۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا۔" امّی پتا نہیں کیا سمجھیں، کہنے لگیں۔ "میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے، تم اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہو۔"

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگے۔

"کیا نہیں؟"

"میرا مطلب ہے مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے۔ اور ابھی آپ نے ٹھیک کہا، میں اپنی گزشتہ غلطی پر نادم ہوں۔ اور صرف تلافی کی خاطر نہیں امّی، تلافی تو کسی بھی طرح ہو سکتی ہے بلکہ اس سے شادی میری خواہش ہے۔" اُنہوں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا تو امّی کچھ دیر تک

اُن کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"اچھی بات ہے۔ میں جلد صوفیہ کے ساتھ جاؤں گی۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولیں۔ "ایک بات یاد رکھنا کہ بظاہر یہ بات جتنی آسان ہے، اتنی ہی مشکل بھی ہے کیونکہ پہلے تم اس لڑکی کے ساتھ جو سلوک کر چکے ہو، اُس کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے اُس کے والدین یا وہ خود آمادہ نہ ہو۔"

"جی۔" وہ بس اسی قدر کہہ سکے۔ پھر امّی کمرے سے چلی گئیں تو صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے قدرے اُونچی آواز میں بڑبڑائے۔ "اُسے آمادہ ہونا پڑے گا۔"

صوفیہ کو شہروز احمد پہلے ہی بتا چکے تھے کہ امّی اُن کی ربیعہ سے شادی کے لیے جی جان سے تیار ہیں پھر بھی جب امّی نے صوفیہ سے بات کی تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

"آپ نے شہروز بھائی سے پوچھ لیا ہے۔"

"ہاں، وہ بھی ایسا ہی چاہتا ہے۔"

"اچھا۔" صوفیہ اچھا کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی کہ پھر اب کیا مسئلہ ہے اور امّی سمجھ کر بولیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے، پہلے تم اپنے گھر والوں سے بات کرو گی یا میں پیغام لے کر جاؤں؟"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" اُس نے اپنا دامن بچا لیا۔ پھر امّی کے خاموش رہنے پر سوچتے ہوئے بولی۔ "آپ چلیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ بہرحال شام میں تیار رہنا، چلیں گے۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر شام میں صوفیہ اور مہروز کے ساتھ امّی کو اپنے گھر میں دیکھ کر امّاں حیران تو ہوئیں لیکن اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی۔

"آج میں پھر سوالی بن کر آئی ہوں۔" امّی نے بیٹھتے ہی کہا تو امّاں چونک کر صوفیہ کو دیکھنے لگیں۔ اشارے سے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ ہلکے سے کندھے اُچکا کر رہ گئی، تب امّاں خود ہی قیاس کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"ربیعہ نظر نہیں آ رہی؟" امّی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"وہ ابھی آفس سے نہیں آئی۔"

"کب تک آتی ہے؟"

"بس آنے والی ہو گی۔"

"اچھا۔" امّی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔ "مجھے آپ کی بیٹی ربیعہ بہت عزیز ہے اور میں دوبارہ اُسے مانگنے آئی ہوں۔"

امّاں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُن کی طرف سے یوں منہ موڑا جیسے انہیں یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

"آپ نے شاید میری بات کا بُرا مانا۔" امّی کچھ مایوس ہو کر بولیں۔

"بُرا ماننے کی بات نہیں ہے بہن۔" امّاں کہنے لگیں۔ "آپ خود سوچیں، پہلے آپ کے بیٹے نے بغیر کسی قصور کے اُسے طلاق دی پھر اب۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھر بھی میں کہوں گی، آپ سوچیں ضرور۔"

امّاں کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ صوفیہ نے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا، پھر چائے کے بہانے وہاں سے اُٹھ گئی اور کچھ دیر بعد امّاں اُس کے پیچھے چلی آئیں۔

"کیا بات ہے؟"

"امّاں، ایسا رویہ اختیار نہ کریں کہ امّی بالکل مایوس ہو کر چلی جائیں۔ آپ نہیں جانتیں شہروز بھائی نے

ربیعہ کو طلاق کیوں دی تھی ؟۔"
آخری الفاظ بلاارادہ اُس کے منہ سے نکل گئے اور اماں فوراً پوچھنے لگیں۔
"تم جانتی ہو ؟۔"
"ہاں، لیکن یہ وقت ان باتوں کو دہرانے کا نہیں ہے بس آپ میری بات کا یقین کرلیں کہ غلطی ربیعہ ہی کی تھی ورنہ شہروز بھائی بہت اچھے ہیں۔"
"کیا مطلب ؟۔ یعنی تم اپنی بہن کو۔"
"اماں ۔" وہ فوراً بول پڑی "بہن غلطی کرے تو کیا وہ غلطی نہیں ہوتی ؟۔"
"کیا کیا تھا اُس نے ؟۔" اماں چُبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگیں۔
"اِس بات کو چھوڑیں۔ آپ اندر جاکر بیٹھیں۔ اور خدا کے لیے پچھلی کوئی بات مت دہرائیے گا۔"
وہ زبردستی اماں کو اندر دھکیل کر خود کچن میں آگئی جہاں ہما ٹرے میں کپ رکھ رہی تھی۔
"صرف چائے ۔؟" وہ دیگر لوازمات کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔
"کیا کروں چھوٹی آپا۔ ؟۔ اِتفاق سے اس وقت اور کچھ ہے بھی نہیں اور کوئی لانے والا بھی نہیں ہے۔"
"ٹھہرو میں مہروز سے کچھ منگواتی ہوں۔ خالی چائے مت لے جانا۔"
صوفیہ وہیں سے پلٹ کر اندر چلی گئی تو ہما چولہا دھیما کرکے وہیں بیٹھ گئی۔ اور ابھی وہ اس نئے سِرے سے جُڑنے والے رِشتے کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ ربیعہ کو آتے دیکھ کر اشارے سے اپنے پاس بُلا لیا۔
"کون آیا ہے ؟۔" وہ ـــــ ٹرے میں سجی پیالیاں دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"آپ کی ساس ۔" ہما شرارت سے کہہ گئی۔
"کون ؟۔ ثاقب کی والدہ ؟۔"
"ارے نہیں، میں ہونے والی ساس کی بات کر رہی ہوں۔"
"کیا مطلب ؟۔ وہ پیشانی پر بل ڈال کر پوچھنے لگی۔
"میرا مطلب ہے شہروز بھائی کی والدہ آئی ہیں۔" ہما اگر صوفیہ کی ساس کہتی تب بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن اُس نے شہروز کا نام لیا تھا ـــــ وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ رہی تھی۔
"کیوں آئی ہیں ؟۔" اب کے لہجے میں ناگواری بھی سمٹ آئی تھی۔
"پُرانے رشتے جوڑنے ۔"
"ناممکن ـــــ" وہ دانت پیس کر بولی۔ اور پیر پٹختے ہوئے اسٹور کے راستے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے بے حد غصّہ آرہا تھا، دل چاہا جس طرح کبھی صوفیہ سارے لحاظ بُھلا کر اُن کے سامنے جاکھڑی ہوئی تھی، وہ بھی ایسا ہی کرے، صاف اُن کے مُنہ پر کہہ دے کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں اور آئندہ آپ ایسی کسی نیت سے یہاں آنے کی زحمت مت کیجیے گا لیکن اس میں صوفیہ جیسا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی اُن سب کے جانے کے بعد اُس نے اماں کو ضرور گھیر لیا۔
"اماں ۔ جو آپ سوچ رہی ہیں، وہ قطعی ناممکن ہے۔"
"کیا ۔ کیا ناممکن ہے ؟۔" اماں اُلٹا اُس سے پوچھنے لگیں۔
"میری شادی ۔" وہ بلا جھجک بولی۔
"کیوں ناممکن ہے ؟۔ ابھی تمہاری کوئی اتنی عُمر ۔"
"عُمر کی بات مت کریں اماں ۔" وہ زچ ہوکر بولی "بس مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں پہلے بھی بار بار آپ سے کہہ چکی ہوں، اب آخری بار کہہ رہی ہوں کہ اگر میری شادی کی بات کریں گی تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"یہ اچھی بات کرتی ہو تم ۔ آخر کہاں جاؤ گی؟ ذرا میں بھی تو سُنوں ۔" اماں کو بھی غصہ آنے لگا۔
"خُدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا۔"
"ہاں ۔ لیکن عورت کا اصل ٹھکانا اُس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اکیلی عورت کا ہمارے معاشرے میں کیا مقام ہوتا ہے ؟۔ میں اور تمہارے ابا میاں ہمیشہ ـــــ تمہارے پاس نہیں بیٹھے رہیں گے ۔ آخری عمر ہے، چل چلاؤ کا وقت ہے، کون جانے کب آنکھ بند ہو جائے۔"
"بس کریں اماں ۔ آپ کی ایسی باتیں مجھے شادی پر مجبور نہیں کرسکتیں۔ پھر آپ خود سوچیں جس گھر سے میں ایک بار نکل کر آئی ہوں، دوبارہ اُسی گھر میں کیا میں کوئی مقام بنا سکوں گی ؟۔ یا وہ لوگ مجھے ویسی ہی محبت اور عزت دے سکیں گے ؟۔"
"کیوں نہیں ۔ جب وہ لوگ اتنی چاہ سے تمہیں مانگنے آئے ہیں اور اپنی پہلی غلطی پر نادم بھی ہیں ۔" اچانک اماں کو صوفیہ کی بات یاد آگئی تو کہنے لگیں "ہم پہلے کا سارا الزام اُن پر نہیں رکھ سکتے، یقیناً تم سے بھی کوئی غلطی ہوئی ہوگی ۔"
"مُجھ سے ۔ ؟۔" وہ حیران ہوئی ۔ اب سے پہلے تو اماں نے ایسی بات کبھی نہیں کی تھی اور اب اتنے یقین سے کہہ رہی تھیں۔
"بہرحال غلطی تمہاری ہو یا شہروز احمد کی ۔ میں گُزری باتیں نہیں دہرانا چاہتی ۔ اور آئندہ کے لیے تم سُن لو کہ مجھے تمہاری شادی کرنی ہی ہے ۔ شہروز احمد سے نہ سہی کوئی اور اچھا رشتہ مل جائے گا۔"
اماں اپنا فیصلہ سُنا کر چلی گئیں اور وہ سُن سی بیٹھی رہ گئی۔ کتنی دیر بعد ہما اندر آئی اور اسے یوں بیٹھے دیکھ کر قدرے پریشانی سے پوچھنے لگی۔
"کیا ہوا آپی ۔ ؟۔"
اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چُھپا کر رو پڑی۔
"آپی ۔" ہما اس کے پاس آبیٹھی اور اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر بولی "کیوں رو رہی ہیں آپ، بتائیں ناں ۔"
وہ اور شدت سے رونے لگی۔
"آپی پلیز ـــ ورنہ میں بھی رونے لگوں گی۔"
"اماں سے پوچھو جاکر جن کا ہمیشہ مجھ پر ہی بس چلتا ہے۔" وہ اُسی طرح روتے ہوئے بولی۔
"کیا کہا ہے اُنہوں نے ؟۔"
"کہنا کیا ہے، اپنا فیصلہ سُنا گئی ہیں کہ میری شادی ضرور کریں گی۔"
"اور آپ اس طرح رو رہی ہیں جیسے ابھی رُخصتی ہو رہی ہے۔" ہما اُس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے قدرے شرارت سے بولی تو وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔
"آپ بھی عجیب ہیں ۔" ہما اپنے ہاتھوں سے اُس کا چہرہ صاف کرنے لگی "کہاں تو اپنے آپ کو چٹان کہتی ہیں اور کہاں ذرا ذرا سی بات پر رونے بیٹھ جاتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے، آپ اب بھی ویسی ہی ہیں، اندر سے ڈری سہمی ہوئی اور بُزدل سی۔"
"نہیں ۔" وہ بچوں کی طرح مُنہ پُھلا کر بولی تو ہما کو ہنسی آگئی۔
"بالکل ۔ میں آپ کو بزدل کہوں گی ۔ اس تمام عرصے میں آپ کی بہادری صرف اتنی ہے کہ آپ ثاقب بھائی کے آفس پہنچ گئیں ۔ اور عاقب کی دھمکیوں کے باوجود انشورنس کی رقم حاصل کرلی۔ اس کے بعد بزدلی کی انتہا یہ کہ صُلح کا جھنڈا لہراتی ہوئی، اُن کے گھر پہنچ گئیں۔ میں پوچھتی ہوں، کیا ضرورت تھی آپ کو وہاں جانے کی ؟۔"
"میں ہر بوجھ سے آزاد ہوکر جینا چاہتی تھی۔"

"ہوگئیں آپ پُرسکون ؟"

"ہاں ۔ کیونکہ اب اُن کا گزشتہ رویہ مجھے یاد نہیں آتا۔ کسی وقت خیال آئے بھی تو میرے اندر غم و غصّہ نہیں بھرتا۔ اس کے برعکس میں بڑی سہولت سے اُن دِنوں کو ذہن سے جھٹک دیتی ہوں۔ اور ہُما! بہادری لڑنے میں نہیں معاف کر دینے میں ہے۔ میں نے معافی کا جو یقین ثاقب حسن کو دیا ہے' اُس سے تو لگتا ہے، میں گرداب سے نکل آئی ہوں۔ شاید تم یقین نہ کرو لیکن میں تمہیں بتاؤں، اُس روز ثاقب حسن کا خیال آنے پر جب عادت کے مطابق میں نے کہا "میں نے تمہیں معاف کیا" تو وہ جیسے مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔" وہ کسی نادیدہ نقطے پر نظریں مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

"میں نے آپ کی بات پر یقین کر لیا۔ اور اب آپ یہ بتائیں کہ شہروز بھائی کو معافی کس طرح مِلے گی ؟" ہُما نے مُسکراہٹ دبا کر ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ؟" وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھئی ۔ شہروز بھائی بھی اپنے گزشتہ رویے پر نادم ہیں اور ۔"

"بس ۔" وہ فوراً بول پڑی "انہیں نادم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ تم میرے سامنے اُن کا نام مت لینا۔ ورنہ میں اماں سے کہہ دوں گی کہ اگر شہروز احمد کو اس گھر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کا اِتنا ہی شوق ہے تو تم موجود ہو۔"

"آپی ۔" ہُما کو جیسے شاک سا لگا۔ انتہائی تاسف سے اسے دیکھے گئی تو وہ ندامت محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"آئی ایم سوری ۔"

عجیب اِتفاق تھا کہ کبھی وہ امّی کے ساتھ صوفیہ کے لیے مہروز کا پروپوزل لائی تھی تو صوفیہ نے اُس پر دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے ساتھ الزام بھی لگایا تھا کہ اُس نے اپنی ساس سے میرے بارے میں بات کی ہوگی۔ اور اب وہ اس انداز سے سوچ رہی تھی اور اُسے رہ رہ کر صوفیہ پر غصّہ آ رہا تھا۔ جب کسی طرح وہ اپنے غصّے کو نہیں دبا سکی تو آفس سے ہی اسے فون کر ڈالا۔ اب یہ اُس کی قسمت کہ ہمیشہ کی طرح دُوسری طرف سے ریسیور اُٹھتے ہی وہی آواز سنائی دی۔

"شہروز احمد اسپیکنگ ۔" اُس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے' اِس وقت اُن کی گھر میں موجودگی اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ہیلو کون ؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ پہلے اُس نے سوچا، فون بند کر دے لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور قدرے آواز بدل کر بولی۔

"صوفیہ ہیں ؟"

"کون ربیعہ ؟" بدلی ہوئی آواز کے باوجود وہ پہچان گئے تو وہ جھنجھلا کر بولی۔

"آپ کو اِس سے کیا، میں ربیعہ ہوں یا کوئی بھی۔ بس آپ صوفیہ کو بُلا دیں۔"

وہ اُس کی جھنجھلاہٹ پر خاصے محظوظ ہوئے اور سوچ کر بولے۔

"آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کِتنا انتظار ؟"

"بس اِتنا کہ میں صوفیہ کے کمرے میں جا کر انہیں بُلا لاؤں۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہی ہوں ۔"

"کِس کا ؟" وہ چھیڑنے کی غرض سے بولے "میرا مطلب ہے میری واپسی کا یا ۔"

اُس نے پوری بات سُنے بغیر ہی سلسلہ مُنقطع کر دیا اور اندر ہی اندر کھولتے ہوئے میز پر

پیشانی ٹکائی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو ۔" اُس نے ریسیور اُٹھا کر بے دلی سے کہا۔

"فون کیوں بند کر دیا تھا ؟" شہروز احمد اپنے مخصوص لہجے میں پُوچھ رہے تھے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

شہروز احمد کے رِنگ بیک کرنے پر اسے واقعی حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے فوری طور پر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر اندر ہی اندر جھنجھلائی ہوئی بھی تھی' اس لیے قصداً کچھ دیر اور خاموش رہی، اس خیال سے کہ کہیں کوئی غلط بات مُنہ سے نہ نکل جائے۔

"ہیلو ربیعہ ۔" اُس کے خاموش رہنے پر وہ پُکار کر کہنے لگے۔ "میری بات کا جواب تو دیں۔"

"کون سی بات کا ؟" وہ کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا کر نارمل لہجے میں پُوچھنے لگی۔

"گویا آپ اعتراف کر رہی ہیں کہ میری بہت سی باتوں کا آپ کو جواب دینا ہے ؟"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟" وہ اُلجھ کر بولی۔

"چلیے یہ بتائیے، صوفیہ سے کیا کام ہے ؟"

"مجھے اُن سے جو کام ہے، ان ہی سے کہوں گی۔"

"اچھی بات ہے پھر بلاؤں انہیں ؟"

"نہیں رہنے دیں۔"

"کیوں ؟"

"کیوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس ؟۔ اور اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ برائے مہربانی مجھے دوبارہ رِنگ مت کیجیے گا۔"

اِس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر کچھ دیر تک ٹیلی فون کو یوں دیکھتی رہی جیسے پھر بیل بجنے لگے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا، تب وہ طویل سانس لے کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

پھر کتنے ہی سارے دن گزر گئے اور وہ جو گزشتہ ہر بوجھ اور خلش سے نجات حاصل کر کے پُرسکون ہونا چاہتی تھی، بُری طرح ڈسٹرب ہوگئی تھی۔ اور یہ ساری ڈسٹربنس شہروز احمد کے پروپوزل کی وجہ سے تھی، گو کہ اپنی طرف سے اُس نے اماں کو صاف منع کر دیا تھا لیکن ایک تو اماں نے اس کا انکار شہروز احمد کی امّی تک نہیں پہنچایا تھا۔ دُوسرے خود شہروز احمد ہر دوسرے دن یا تو اُسے آفس میں فون کر لیتے یا خود چلے آتے تھے۔ اور پھر اُن کی شخصیت اتنی عام سی بھی نہیں تھی کہ مسلسل نظرانداز کی جاتی بلکہ اُن کے بارے میں خود ربیعہ کا کہنا تھا کہ وہ شخص سب سے بڑا ساحر ہے۔ اُس کی آنکھوں میں فتح کر لینے والی ایسی قوت ہے کہ مقابل مفتوح ہو کر بھی خوش رہتا ہے۔ اور وہ جہاں کھڑا ہو جائے، آس پاس کے ماحول کو بھی اپنے آپ پہ رشک آنے لگتا ہے۔

اُس نے اماں سے کہا تھا، میں نے زندگی کے دو رُخ دیکھے ہیں، ایک جتنا خوبصورت تھا دوسرا اُتنا ہی بدصورت ۔ پھر یہ بھی کہا تھا کہ ویسی خوبصورتیاں اب میرا مقدر نہیں ہو سکتیں۔ اگر اُس نے اپنا مقدر دیکھا ہوتا تو ایسی بات نہ کرتی کیونکہ اب وہی خوبصورتیاں اس کے راستوں کو سجانے لگی تھیں' اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا' یہ سب کیا ہے ؟

وہ خوابوں کی دُنیا میں بھٹک رہی ہے یا حقیقت میں اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے ؟

زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسے اپنی طرف بُلا رہی تھی ۔ اور اگر جو وہ نادان ہوتی تو پگلی کی طرح آنکھیں بند کر کے ان راستوں پر چل پڑتی ۔ لیکن اب وہ نادان نہیں تھی ۔ گردشِ دوراں نے اُسے بہت کچھ سکھا اور سمجھا دیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ ہر خوبصورت نظر آنے والی شے درحقیقت خوبصورت نہیں ہوتی ۔

اسی لیے شروع میں شہروز احمد کی آواز سنتے ہی وہ فون بند کر دیتی۔ اس کے بعد جھنجھلانے لگی تھی پھر کوئی سخت جملہ کہہ دیتی کہ شاید وہ یہ سلسلہ ترک کر دیں لیکن اُنہوں نے بھی جیسے طے کر رکھا تھا، اس کی کسی بات کا بُرا نہ مناتے۔ آفس آتے تو خاص طور سے اس کی ٹیبل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہلکے سے کھانس کر اُسے متوجہ کرتے یا اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے، وہ قصداً سر کو اس قدر جھکا لیتی جیسے کوئی بہت ضروری کام کر رہی ہو۔

لیکن بہت جلد اُسے اندازہ ہو گیا کہ اس طرح وہ مزید ڈسٹرب ہو رہی ہے۔ وہ لاکھ اُن کی آواز سنتے ہی فون بند کر دے لیکن اس کے بعد بہت دیر تک لاشعوری طور پر وہ یہی سوچتی رہتی ہے کہ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ پھر اُن کی آمد پر سر جھکا لینا بھی اپنے آپ کو فریب دینا لگا کیونکہ پہلے وہ اُن کے قدموں کو شمار کرتی ہے، پھر اس کا دھیان آپ ہی آپ اسفندیار کے کمرے کی طرف رہتا ہے، جہاں شہروز احمد داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اُن کے نکلنے کا بھی انتظار کرتی ہے۔

یہ ساری صورتحال اُسے بے حد پریشان کر رہی تھی۔ اور ایک طویل مدت بعد وہ ایک بار پھر فرار کا سوچنے لگی۔ پہلے اُس نے سوچا یہ جاب ہی چھوڑ دے لیکن اب جاب اس کی ضرورت تھی اور دوبارہ اتنی اچھی جاب ملنا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئی۔

"بزدل۔" شہروز احمد کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک مہینے کی چھٹی پر چلی گئی ہے تو وہ مسلسل اُسے بزدل کہہ رہے تھے، یہاں تک کہ گھر آنے پر جب صوفیہ سے سامنا ہوا تو اُسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"وہ بزدل گھر بیٹھ گئی ہے۔"

"کون؟" فوری طور پر صوفیہ بالکل نہیں سمجھی۔

"آپ کی بہن اور کون۔ پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل فون کر رہا ہوں، کئی بار آفس بھی گیا، نظر نہیں آئی، آج اسفندیار سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک مہینے کی چھٹی پر گئی ہوئی ہے۔"

"اچھا۔" صوفیہ ہنسنے لگی۔ "آپ جانتے تو ہیں، فرار حاصل کرنے میں وہ ماسٹر ہے۔"

"لیکن اب زیادہ دیر فرار ممکن نہیں ہے۔" وہ اُس کی گزری ہوئی کوئی بات یاد کر کے ہلکے سے مسکرائے، پھر کہنے لگے۔

"آخر وہ چاہتی کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔" صوفیہ کندھے اُچکا کر بولی۔ "میں تو اس دن کے بعد سے دوبارہ گئی ہی نہیں ہوں۔"

"لیکن اب آپ کو جانا پڑے گا۔"

"نہیں بھئی، میں جانتی ہوں اس کے اندر جتنا غبار بھرا ہو گا، وہ مجھ پر نکالے گی۔ اور یہ جو اتنے دنوں سے آپ اُسے تنگ کر رہے ہیں، اس کا حساب بھی مجھ سے لے گی۔ اور معاف کیجیے گا شہروز بھائی۔ مجھے آپ کی خاطر جان قربان کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ارے۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ "کیا وہ اتنی ہی خونخوار ہو چکی ہے۔"

"بالکل۔ اور میری مانیں تو اس کا خیال چھوڑ دیں۔"

"ناممکن۔" پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ "کل آپ کو ہر صورت میں میرا میسج اُس تک پہنچانا ہے۔"

"بات سنیں بھائی۔" صوفیہ پیچھے سے پکارتی رہ گئی لیکن وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

صوفیہ کا خیال تھا اسے دیکھتے ہی ربیعہ شروع ہو جائے گی اور وہ ساری باتیں جو کبھی اُس نے اس سے کہی نہیں، اب وہ کہے گی۔ لیکن اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر ایک جامد چپ تھی۔ صوفیہ کو دیکھ کر وہ اس کے سامنے سے ہٹی بھی نہیں اور نہ ہی ہمیشہ کی طرح کسی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ بس ایک

نظر اس پر ڈال کر جس طرح ابتہاج کے ساتھ مصروف تھی، اسی طرح مصروف رہی۔ اور اس صورتِ حال کا مقابلہ صوفیہ کو خاصا مشکل نظر آیا کیونکہ اگر وہ کہہ سن کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تو پھر اس کی بات بھی سن سکتی تھی لیکن اب اس کی بے نیازی دیکھ کر صوفیہ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیسے بات کرے؟

کچھ دیر تک وہیں امّاں اور ہُما کے پاس بیٹھی رہی، پھر جب امّاں اُٹھ کر کچن میں گئیں تو صوفیہ بھی بچے کو ہُما کی گود میں دے کر امّاں کے پیچھے چلی آئی۔

"امّاں۔ پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔

"ربیعہ کے لیے؟" امّاں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"ہاں۔ ابھی جب میں آ رہی تھی تو امّی نے خاص طور سے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ سے معلوم کروں۔"

"میں کیا کروں آگے وہ ربیعہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟"

"کچھ نہیں، بس صاف انکار۔ زیادہ بات کروں تو کہتی ہے، گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" امّاں فکرمندی سے بولیں۔

"آپ خوامخواہ اس کی دھمکیوں میں مت آئیے۔ آخر کہاں جائے گی، اتنی تو بزدل ہے۔ پتا نہیں نوکری کیسے کر رہی ہے؟" پھر پیڑھی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ نے ابا میاں سے بات کی؟"

"ہاں۔"

"کیا کہا انہوں نے؟"

"انہیں تو پہلے بھی شہروز احمد بہت پسند تھے اور اب بھی وہ کوئی اعتراض نہیں کر رہے لیکن اُن کا کہنا ہے پہلے ربیعہ سے پوچھ لو۔ اور وہ ہے کہ شہروز احمد کے لیے صاف انکار کر رہی ہے۔" قدرے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگیں۔

"ویسے اس کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ جس گھر سے ایک بار نکل آئی ہے دوبارہ وہاں جانا۔" امّاں نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"امّاں۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ آخر آپ کو کہیں نہ کہیں تو اس کی شادی کرنی ہی ہے، اور میں سمجھتی ہوں، بجائے اِس کے کہ نئے سرے سے رِشتہ تلاش کیا جائے۔ اور پتا نہیں، کیسے لوگ ملیں، اس سے بہتر ہے شہروز بھائی کے بارے میں سوچیں۔"

"میں نے خود یہی سوچا ہے لیکن کیا کروں، وہ کچھ سنے تب ناں۔"

"میں بات کروں اُس سے؟"

"کر دیکھو۔" امّاں نے کہا تو وہ اسی وقت اُٹھ کر اندر چلی آئی۔

ہُما دونوں بچوں کی ریسلنگ کروا رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ، بار بار کہے جا رہی تھی۔

"خیال کرو ہُما، کہیں کوئی نیچے نہ گر جائے۔"

"تم آج آفس نہیں گئیں؟"

"نہیں میں چھٹی پر ہوں۔" اُس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ جب کہ پورا دھیان بچوں کی طرف تھا۔

"اچھا کتنے دِن کی چھٹی لی ہے؟"

"ایک مہینے کی۔"

خیریت ہے۔ کوئی اور کام ہے یا یونہی ؟"

"بس یونہی۔"

"چلو اچھا ہے، کچھ دن آرام کرلو۔" پھر اچانک جیسے یاد آیا تو کہنے لگی "ارے ہاں! اگلے مہینے بچوں کی سالگرہ ہے ناں ؟"

"مجھے یاد ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

"ایک ساتھ سالگرہ منائیں گے۔ میرا مطلب ہے ایک ہی جگہ۔" صوفیہ نے کہا تو وہ یونہی اس کی طرف دیکھنے لگی تب صوفیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"تم سب ہمارے گھر آجانا، وہیں دونوں بچوں کی سالگرہ۔"

"نہیں چھوٹی آپا۔" وہ پوری بات سُنے بغیر بول پڑی۔ "ہم ابتہاج کی سالگرہ اپنے گھر میں منائیں گے، یہ صحیح ہے کہ ہم آپ کی طرح بہت زیادہ دھوم دھام نہیں کرسکیں گے لیکن جو ہماری حیثیت ہے، اس کے مطابق ضرور کریں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ؟" صوفیہ نے ٹوکا۔ "میں تو اپنی خواہش بتا رہی تھی کہ سالگرہ والے دن دونوں بچے ساتھ ہوں۔ اور تم حیثیتوں کا فرق لے بیٹھیں۔ اگر ایسی بات ہے تو اُس دن ہم سب یہیں آجائیں گے۔" پھر سرگوشی میں بولی۔ "شہروز بھائی سمیت۔"

وہ ان سُنی کر کے منہ دُوسری طرف موڑنا چاہتی تھی کہ صوفیہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اُس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔

"تمہیں شہروز بھائی کی آمد پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ؟"

"میں کیوں اعتراض کروں گی ؟" وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔

"تو سنو، اس وقت بھی اعتراض مت کرنا جب وہ دو گواہوں کے ساتھ آئیں۔"

"چھوٹی آپا۔" وہ اپنی کمر سے اس کا ہاتھ نکال کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہُما کو بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صوفیہ نے سوچا، جب بات شروع ہوگئی ہے تو ادھوری نہیں رہنی چاہیے، اور فوراً اُٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

"چھوٹی آپا۔" وہ اُسے اپنے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کہنے لگی۔

"میں شہروز احمد کے بارے میں کوئی بات نہیں سُنوں گی۔"

"کیوں ؟"

"اس لیے کہ میں اماں کو اپنا فیصلہ سُنا چکی ہوں اور اگر انہوں نے آپ لوگوں تک میرا جواب نہیں پہنچایا تو سُن لیجیے۔ میں شہروز احمد سے شادی نہیں کروں گی۔"

"اماں کی زبانی تمہارا انکار سُن چکی ہوں۔" صوفیہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اور اب تمہاری زبانی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"وجہ ؟" وہ تلخی سے ہنسی۔

"میں وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوں۔ بس میرا دل نہیں مانتا۔"

"ہمیشہ دل کی مانتی ہو اور ہمیشہ پچھتاتی ہو۔"

"اب نہیں پچھتاؤں گی۔" وہ یقین سے بولی۔ تو صوفیہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی، پھر سمجھانے کی غرض سے بولی۔

"دیکھو ربیعہ، یہ تو نہیں ہے کہ تم شہروز احمد کو نہیں جانتیں۔"

"بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ اس کے لہجے میں طنز سمٹ آیا تھا۔ "یہ وہی شخص ہے ناں جس نے ثاقب حسن کے کہنے پر ایک معاہدے کے تحت مجھ سے شادی کی، پھر اُس

کے کہنے پر طلاق بھی دے دی اور اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب اُس نے کس کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ کل کو وہ کسی کے کہنے پر مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

"ربیعہ۔" صوفیہ واقعی بہت حیران تھی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ ہی بتائیے میں کیسے شہروز احمد کا اعتبار کرلوں ؟۔ اور یہ باتیں تو آپ کو بھی سوچنا چاہئیں، پھر آپ کیوں ان کی وکالت کرتی ہیں ؟"

"اِس لیے کہ میں جانتی ہوں، تمہارے بغیر اُن کی زندگی ادھوری ہے۔"

"بس کریں چھوٹی آپا۔ کوئی کسی کے بغیر ادھورا نہیں ہوتا۔"

"لیکن وہ ادھورے ہیں۔ اور تمہیں اس سے بڑھ کر اور کیا یقین چاہیے کہ تمہارے بعد اُنہوں نے پھر کسی کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اور اس تمام عرصے میں تم جس طرح سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہی ہو، یہ سب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اب میں تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ کبھی کبھی تو میں خود اُن سے اُلجھ پڑتی تھی کہ جب کوئی ناتا نہیں رہا تو پھر کیوں انہیں تمہارا خیال ہے ؟۔" قدرے توقف کے بعد سوچ کر بولی۔

"اور یہ بچہ، ابتہاج۔ ہم سب نے نہیں شہروز بھائی نے تمہاری گود میں ڈالا تھا۔ اُنہوں نے اس وقت تمہاری بات سُن لی تھی، جب تم مجھ سے بچہ مانگ رہی تھیں۔ پھر اُنہوں نے مہروز سے کہا کہ بچہ ربیعہ کو دے دو۔"

"چھوٹی آپا۔" اُس کے ہونٹ بے آواز جنبش کے ساتھ نیم وا ہوئے اور وہ پوری کُھلی آنکھوں سے دیکھے گئی۔ تب صوفیہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ حالات نے تمہیں منفی انداز سے سوچنا اور ہر ایک کو شبہے کی نظر سے دیکھنا سِکھا دیا ہے، پھر بھی میں تم سے کہوں گی کہ تم ازکم شہروز بھائی کے جذبوں پر شبہ مت کرو، وہ کل بھی تمہارے ساتھ مخلص تھے اور آج بھی مخلص ہیں۔"

"اگر وہ اپنے خلوص کی یہ قیمت چاہتے ہیں کہ میں۔"

"نہیں میری بہن۔" صوفیہ نے فوراً ٹوک دیا۔ "خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ اُن کی تو بس یہ خواہش ہے کہ اُن کی بے آب و رنگ زندگی میں تمہارے نام، تمہارے وجود اور تمہاری محبت سے بہار آجائے۔"

"میرے وجود سے۔ ارے چھوٹی آپا، میں تو خود۔" اُس کی آواز بھرّا گئی تو وہ خاموش ہوگئی۔ صوفیہ نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا پھر کہنے لگی۔

"سُنو، کبھی تم لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ خوشیاں دروازے پر دستک دیں تو دروازے بند نہیں کر لینے چاہئیں۔ پھر اب تم کیوں دروازے بند کر رہی ہو ؟"

"میں کیا کروں ؟" اُس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"صرف آخری بار اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار مجھے دے دو۔ یقین کرو میں تمہارے راستوں میں بہاروں کے قافلے اُتار دوں گی۔"

"مجھے بہاریں راس نہیں آتیں۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔ اس طرح مت سوچو۔ بلکہ اب تم کچھ بھی مت سوچو۔ میری جھولی میں فقط ایک ذرا سی 'ہاں' ڈال کر ہر فکر سے آزاد ہوجاؤ۔"

وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی، کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اور صوفیہ اس کی کیفیت محسوس کر کے کہنے لگی۔

"چلو میں اصرار نہیں کرتی، پہلے تم خود اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن مثبت انداز سے۔ میں پھر تم سے بات کروں گی۔"

جس روز سے صوفیہ اسے سمجھا کر گئی تھی، اسی روز سے وہ اس نہج پر سوچنے لگی تھی لیکن ہر بار اس کی سوچ کا اختتام اس بات پر ہوتا کہ لوگ کیا کہیں گے، خاص طور سے ثاقب حسن کے گھر والے۔ پھر اسے خود بھی بڑا عجیب سا لگتا تھا کہ وہ دوبارہ اس گھر میں داخل ہو۔ اس کے علاوہ اسے شہروز احمد پر بھی کچھ زیادہ بھروسا نہیں تھا اور یہ بے اعتباری اسے ثاقب حسن کے رویے نے دی تھی۔ جس نے غالباً اس کے حصول کو ہی مقصد جانا تھا۔ اور اگر شہروز احمد بھی حاصل کرنے کے بعد اسی کی طرح رنگ بدل گئے تب ۔۔؟۔ اس سے آگے وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر تو لیا لیکن مسئلہ شہروز احمد کا تھا جو بار بار اُس کے راستے میں آنے لگے تھے اور بعض اوقات اتنی بے باکی کا مظاہرہ کر جاتے کہ وہ حیران رہ جاتی۔ گو کہ ان کا سامنا ہونے پر وہ بہت ریزرو ہو جاتی تھی، کبھی پیشانی پر شکنیں بھی ڈال لیتی۔ لیکن اُنہوں نے جیسے تہیہ کر لیا تھا اُسے رام کرنے کا۔ اُس کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود معنی خیزی سے مُسکراتے جاتے، جس سے وہ مزید جھنجھلا جاتی۔

ان ہی کی وجہ سے وہ مہینے بھر کی چھٹی لے کر گھر بیٹھی تھی تاکہ وہ اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اور پتا نہیں وہ مایوس ہوئے تھے یا نہیں، البتہ وہ ضرور پریشان تھی۔ جیسے جیسے چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور دوبارہ آفس جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اُسے ان کا سامنا کرنے کا خیال پریشان کر رہا تھا۔

اس وقت وہ سوچ رہی تھی، ناحق اتنے دِن یونہی بے کار بیٹھ کر گزار دیے، اس دوران وہ کسی دُوسری جگہ جاب تلاش کر سکتی تھی۔ اگر اس سے اچھی نہیں تو ایسی جاب تو مل ہی جاتی اور وہ بہت خاموشی سے ریزائن دے کر اپنا راستہ الگ کر لیتی۔ لیکن یہ خیال اسے پہلے نہیں آیا تھا اور اب جب کہ اس کی صرف تین چھٹیاں باقی تھیں تو اتنے کم وقت میں تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"مجھے بتائیے، کیا مسئلہ ہے؟" ہما نے اُسے چونکایا۔ "میں اتنے دِنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے سوچنے کا انداز بتاتا ہے کہ کسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ مجھے بتائیے، کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" اُس نے مُسکرا کر ٹالنا چاہا۔

"چلیے عام بات ہی بتا دیں۔" ہما مصر ہوئی تو وہ سرسری انداز میں بولی۔

"میں سوچ رہی ہوں، یہ جاب چھوڑ کر کہیں اور کوشش کروں۔"

"کیوں؟"

"اصل میں جب سے شہروز احمد کا ہمارے آفس میں آنا جانا ہوا ہے، تب سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی تو ہما حیران ہو کر کتنی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟" اُس نے ٹوکا۔

"سوچ رہی ہوں جب شہروز بھائی کا اس گھر میں آنا جانا شروع ہو گا۔ تو کیا آپ کا یہاں سے بھی دل اچاٹ ہو جائے گا۔" ہما نے کہا تو وہ ناگواری سے بولی۔

"تمہیں کِس نے کہا کہ وہ یہاں آئیں گے؟"

"خاص طور سے تو کسی نے نہیں کہا لیکن سب کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

اگلے دن سے اُس نے اخبار میں "ضرورت ہے" کے اشتہار دیکھنا شروع کر دیے۔ اور ابھی اسی مرحلے میں تھی کہ ادھر چھٹیاں ختم ہو گئیں۔

پورے ایک مہینے بعد آفس میں داخل ہو رہی تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر شہروز احمد سے سامنا ہو گیا، وہ جی ایم کے ساتھ کھڑے تھے۔ پہلی غیر ارادی نظر کے فوراً بعد اُنہوں نے چونک کر اسے دیکھا تو بس ایک پَل کو دل زور سے دھڑکا، فوراً سنبھلی تھی کہ وہ کسی کا خیال کیے بغیر اُس کے پاس چلے آئے۔

"کیسی ہیں آپ ربیعہ؟" لہجے میں نہ اختیار تھا' نہ بے اختیاری۔ قدرے جتانے والا انداز تھا جیسے باور کرا رہے ہوں کہ وہ بھرے مجمعے میں بھی پکارنے کا حق رکھتے ہیں۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اپنی ٹیبل پر آ گئی۔ اور انٹرکام پر اسفندیار کو اپنی آمد کے بارے میں بتانے لگی۔ انہوں نے کچھ دیر رُک کر اُسے دیکھا پھر آفس سے نکلتے چلے گئے۔

شام میں جب وہ آفس سے لوٹی تو گھر میں بڑی آپا کو دیکھ کر اس نے پہلے خوشی کا اظہار کیا پھر شکوہ کرنے لگی۔

"کمال ہے بڑی آپا، اِتنے دنوں سے میں چھٹی پر تھی تو آپ آئی نہیں اور آج۔"

"میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ اور آج مجھے پتا تھا کہ تم گھر پر نہیں ہو گی، اس لیے اماں وغیرہ سے ملنے آ گئی۔" بڑی آپا نے کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

"آپ مُجھ سے کیوں خفا ہیں؟"

"تم نے سب کو پریشان جو کر رکھا ہے۔"

"میں نے؟" اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے امّاں کو دیکھا۔

"ہاں تم نے۔" بڑی آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا پھر کہنے لگیں۔

"کیا تمہیں ذرا احساس نہیں ہے کہ امّاں اور ابا میاں تمہارے لیے کتنے فِکرمند ہیں؟ مُجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ صوفیہ کی ساس تمہیں بہو بنانا چاہتی ہیں لیکن تم۔"

"ہاں، میں منع کر رہی ہوں۔ مجھے منظور نہیں ہے۔" وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی اور مزید کچھ کہے سُنے بغیر اندر چلی گئی۔ اُسے سچ مچ بہت غصّہ آ گیا تھا کہ آخر سب لوگ شہروز احمد کی طرف داری کیوں کرنے لگے تھے۔ اُن کے گزشتہ رویّے کو کیوں نہیں سوچتے۔ اور جب وہ خود سوچنے بیٹھی تو کسی خوبصورت لمحے نے چُپکے سے دامن تھام لیا۔ اس کے بعد بے شمار لمحات تھے، وہ کِس کِس سے نظریں چُراتی۔

وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔ بڑی آپا جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اُس نے پیچھے سے آ کر اُن کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا دیا اور اُن کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکا کر بولی۔

"بڑی آپا، آپ مجھ سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہیں؟"

"تمہیں میری ناراضگی کی پروا ہے؟"

"کیوں نہیں، آپ ناراض ہو کر جائیں گی تو مجھے بہت دُکھ ہو گا۔"

"اچھا۔" بڑی آپا نے خود کو اس کے بازوؤں کے حلقے میں سے نکالا اور پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا کر بولیں۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں ربیعہ۔ بس تم میری ایک بات مان لو۔"

"جی۔۔؟" وہ مجسّم سوالیہ نشان بن گئی۔

"گزشتہ ساری باتیں بھُلا دو۔"

"آپ اِسے آسان سمجھ رہی ہیں۔"

"نہیں، میں جانتی ہوں، یہ بہت مُشکل ہے، پھر بھی تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ اور اب جب کہ تم میں کافی تبدیلی آ گئی ہے، میرا مطلب ہے تلخ تجربات سے تم بہت کچھ سمجھ اور سیکھ گئی ہو، تو تمہیں گزشتہ حالات کو خود پر طاری یا حاوی نہیں رکھنا چاہیے۔ جب نئے انداز سے چلنا سیکھا ہے تو نئی راہوں پر چلنے کی اُمنگ بھی پیدا کرو۔"

"جن راہوں کی طرف آپ کا اشارا ہے بڑی آپا، وہ نئی تو نہیں ہیں۔ وہی پرانے راستے، وہی پرانے لوگ اور کوئی بعید نہیں کہ حالات بھی۔"

"ایسا مت سوچو۔" بڑی آپا نے ٹوک دیا۔ "اس کے برعکس یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُن پُرانے راستوں کو اُن ہی پُرانے لوگوں نے نئے انداز سے سجایا ہو۔ تم ایک بار اس انداز سے سوچ کر تو دیکھو۔"

وہ خاموش رہی، اب انہیں کیا بتاتی کہ وہ ہر انداز سے سوچ چکی ہے، کبھی دل آمادہ ہوتا ہے اور کبھی صاف انکاری۔

اُس روز صوفیہ نے اپنے اور ربیعہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو شہروز احمد کے گوش گزار کر دی تھی جس سے انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اُن کی طرف سے نہ صرف کبیدہ خاطر بلکہ خاصی بے اعتبار سی بھی ہے اور اس کے بعد سے اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اُسے یقین دلائیں کہ وہ محض اپنی گزشتہ غلطی یا زیادتی کی تلافی کے طور پر نہیں بلکہ اپنی بے پایاں محبت کے ساتھ اسے ایسا سائبان دینا چاہتے ہیں جس پر وہ فخر کر سکے۔

اُس روز کے بعد سے وہ مسلسل یہ کوشش کر رہے تھے کہ وہ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر ان کی بات سن لے۔ آفس میں بارہا سامنا ہوا، کئی بار اُنہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ لیکن وہ سہولت سے منع کر گئی۔ اس کے انداز میں خفگی نہیں ہوتی تھی بلکہ یوں جیسے کسی معمولی جان پہچان رکھنے والے شخص نے اُسے ساتھ چلنے کی پیشکش کی ہو۔ اور اُس کا یہ انداز انہیں اُس کے گزشتہ تمام رویوں کی نسبت عجیب سا لگا۔ کچھ توہین کا احساس بھی ہوتا تھا۔ دل چاہتا تھا، تمام لوگوں کے درمیان اُسے جھنجھوڑ ڈالیں۔ بمشکل خود پر ضبط کرتے رہے، کبھی کبھی اپنے آپ سے لڑنے لگتے لیکن کبھی بھی وہ خود کو اس سے الگ رکھ کر نہیں سوچ سکے۔

اُس روز جب امّی نے انہیں بتایا کہ وہ آج پھر ربیعہ کے گھر گئی تھیں۔ اور یہ کہ ابھی اُنہوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو وہ بے حد جھنجلائے۔ اسی وقت اس سے براہِ راست بات کرنے کا سوچا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گزشتہ کئی روز سے وہ انہیں زیادہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کرتے، مختصراً جواب دے کر فوراً دُوسری طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ جبھی اسی وقت اُنہوں نے اس کے سامنے جانے کے بجائے ٹیلی فون کا سہارا لیا۔ اور اُس کی آواز سنتے ہی مضبوط لہجے میں بولے۔

"آپ فون بند نہیں کریں گی۔"

"جی۔" اُس کا 'جی' نہ اثبات میں تھا اور نہ سوالیہ۔ غالباً فوراً وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر وارننگ دینے والا کون ہے؟۔ اور جب سمجھی تو اسی قدر کہہ سکی۔

"فرمائیے۔"

"ایک بات بتائیں ربیعہ، آپ کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آپ کے والدین کو ہے یا۔؟" وہ قصداً خاموش ہو گئے۔ اور وہ اُن کا مطلب سمجھ کر بولی۔

"سوری۔ میں آپ کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔"

"لیکن میں ہر صورت جاننا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ میرے پروپوزل کو آپ ریجیکٹ کر رہی ہیں یا آپ کے والدین۔؟"

"کیا واقعی آپ کے پروپوزل کو ریجیکٹ کر دیا گیا ہے۔" وہ بلا ارادہ بہت جلدی پوچھ گئی تو وہ کچھ دیر اس کے لہجے پر غور کرنے کے بعد بولے۔

"گویا آپ ایسا ہی چاہتی ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس، میں مناسب نہیں سمجھتی۔"

"اچھا۔" وہ ذرا سا ہنسے۔ "یہ مناسب اور نامناسب کی تمیز کب سے ہو گئی آپ کو؟"

"سننا چاہتے ہیں؟"

"ضرور۔"

"اُس روز سے شہروز احمد جب حجلۂ عروسی میں آپ نے مجھے ایک نامحرم کا خط تھمایا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک میں مناسب اور نامناسب کے بھنور میں چکر کھا رہی ہوں۔"

"پلیز ربیعہ، گزری کوئی بات مت دہرائیں۔" وہ عاجزی سے بولے تو وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ پھر سوچ کر قدرے تاخیر سے بولی۔

"ایک بات مانیں گے؟"

"کہیے۔"

"آپ اپنا پروپوزل واپس لے لیں۔" وہ اطمینان سے انہیں حیران کر گئی۔

"کیوں؟"

"کیوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس۔"

"ٹھیک ہے، جب آپ کے پاس جواب ہو، تب کہیے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں بغیر کسی وجہ کے آپ کی بات نہیں مان سکتا اور وجہ بھی ٹھوس ہونی چاہیے۔" اُن کے حتمی انداز پر وہ جھنجلا اُٹھی۔

"آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"کیا نہیں سمجھتا ہوں؟"

وہ خاموش ہو کر اپنے آپ سے اُلجھنے لگی اور وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولے۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"کچھ نہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ سلسلہ منقطع کر گئی۔

اُنہوں نے ریسیور کو یوں دیکھا جیسے شکوہ کر رہے ہوں، پھر کریڈل پر رکھ کر جیسے ہی پلٹے، صوفیہ کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ شوخ و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ ان کے متوجہ ہونے پر ہلکے سے کندھے اُچکا کر بولی۔

"میں نے کچھ نہیں سنا۔"

"سن کر بھی کیا کر لیتیں۔؟" وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے جب کہ صوفیہ پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"کیا کہہ رہی تھی ربیعہ؟"

"یہ آپ اُسی سے پوچھ لیجیے گا۔" وہ صوفیہ کے اشتیاق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت عجلت میں ظاہر کر رہے تھے۔

"آپ کو بتانے میں کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض تو کوئی نہیں بس اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ریک میں رکھی فائلوں میں جانے کیا تلاش کرتے ہوئے بولے۔

"آپ کی واپسی کب تک ہوئی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اُنہوں نے اپنے کام میں مصروف رہ کر کہا، پھر جانے کیا خیال آیا، اُسے

دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کو کوئی کام ہے کیا؟"

"کام تو نہیں البتہ آپ سے ایک بات کہنی تھی۔ چلیئے پھر اطمینان سے۔" آخر میں وہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے جانے لگی کہ اُنہوں نے پکار لیا اور اُس کے رُکنے پر پہلے ہاتھ میں پکڑی فائل رکھی، پھر آ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کہیے کیا بات ہے؟"

"میں نے ایک پلان بنایا ہے۔" صوفیہ کے رازدارانہ لہجے اور انداز پر وہ چونکے اور پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"میں نے سوچا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چلی جاؤں اور ربیعہ سے یہ کہوں کہ جب تک وہ آپ سے شادی کے لیے ہامی نہیں بھرے گی، میرے لیے بھی اس گھر کے دروازے نہیں کھلیں گے یعنی میری واپسی اس صورت۔"

"شٹ اپ صوفیہ۔" وہ اُسے خاموش کروا کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں اس کی بات سخت ناگوار گزری تھی، بمشکل خود پر ضبط کر کے بولے۔

"محبت اور دھاندلی میں فرق ہوتا ہے صوفیہ، اگر دھاندلی ہی کرنا ہوتی تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔" پھر جاتے جاتے بولے۔

"خبردار، ایسی کوئی بات سوچنا بھی مت، جس سے اس کے ساتھ ساتھ میرے پندار کو بھی ٹھیس پہنچے۔"

صوفیہ نے بہت خاموشی سے انہیں کمرے سے نکلتے دیکھا، اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی تھی۔

ابتہاج کی سالگرہ میں بس دو دن تھے۔ کافی دن پہلے جب صوفیہ آئی تھی تو اُس نے کہا تھا کہ وہ دونوں بچوں کی سالگرہ ایک ہی جگہ یعنی ایک ہی گھر میں کرے گی، اماں کے گھر یا اپنے گھر، اس کے بعد سے وہ نہ تو خود آئی تھی اور نہ ہی فون پر اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تھا، پھر بھی اُس نے اپنے طور پر ساری تیاری تو مکمل کر لی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی طرف سے کسی کو مدعو کرے یا نہیں، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری تھا کہ سالگرہ کہاں ہوگی۔؟

اُس شام وہ اسی اُلجھن میں بیٹھی تھی کہ صوفیہ اور مہروز آ گئے، بہت عجلت میں تھے، بس کھڑے کھڑے ہی صوفیہ نے بتایا کہ وہ سالگرہ کا اہتمام اپنے گھر پر کر رہی ہے۔ مہروز نے سب کو آنے کی تاکید کی اور خاص طور سے اس سے کہا کہ وہ ابتہاج کے ساتھ ضرور آئے، اُس نے مروتاً سر ہلا دیا۔

"سچ آپی، آپ بھی چلیں گی؟" صوفیہ اور مہروز کے جانے کے بعد ثمامہ نے بہت خوش ہو کر اُس سے پوچھا تو اچانک وہ بے پناہ آزردگیوں میں گھر گئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ وہاں جا نہیں سکتی تھی بلکہ اس لیے کہ سب جانتے تھے کہ وہ صوفیہ کے گھر نہیں جائے گی، اس کے باوجود ابتہاج کی پہلی خوشی اس کے بغیر منانے کا سوچ لیا تھا۔

اُسے یاد تھا کہ وہ جب بچے کو لے کر آئی تھی تو کتنی خوش تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اب بقیہ تمام عمر اُسے ساری خوشیاں اسی بچے کے حوالے سے ملیں گی۔ لیکن پہلی ہی خوشی پر اُسے نظرانداز کر دیا گیا تھا وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

اور سالگرہ والے دن جب سب صوفیہ کے گھر چلے گئے، ابتہاج کو لے کر یہاں تک کہ ابا میاں بھی تو وہ بالکل اکیلی رہ گئی۔ اور اُداس تو وہ تھی ہی، اپنی تہی دامنی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

اس طرح تو اس نے نہیں سوچا تھا اور اُسے صوفیہ سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی کہ جب خوشی منانے کا وقت آئے گا تو وہ ابتہاج کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔

کم از کم چھوٹی آپا کو میرا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اُس نے بے حد آزردہ ہو کر سوچا تو آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا اور چھلکنے کو تھا کہ کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور جا کر دروازہ کھولا تو سامنے شہروز احمد کو کھڑے دیکھ کر اُس کے پورے وجود میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" اُس کی بھیگی پلکیں دیکھ کر اُن کی مُسکراہٹ معدوم ہو گئی اور لہجہ آپ ہی آپ سنجیدہ۔

وہ منع کرنا چاہتی تھی، ہونٹوں کو حرکت بھی دی لیکن آواز جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اندر ہی اندر اپنی بے بسی پر کڑھتی ہوئی اُن کی طرف سے رُخ موڑ گئی تو وہ دہلیز پار کر آئے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"آیئے۔" وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ لیکن اتنی سی دیر میں کتنی دیر ہو گئی تھی کہ وہ اس سے چند قدم آگے تھے، مجبوراً اُن کے پیچھے چلنا پڑا۔ اور جب اُنہوں نے تخت کی طرف اشارا کر کے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ اُن کے گھر آئی ہو۔ خاصی دلچسپ صورتحال تھی یعنی مہمان میزبانی کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔

"کیا اَب مجھے آپ سے چائے وغیرہ کا بھی پُوچھنا پڑے گا۔" وہ اُسے تخت کے کنارے خاصے تکلف سے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر مسکرا کر بولے۔ اور دیوار کے پاس سے کُرسی کھینچ کر اس انداز سے بیٹھے کہ وہ اگر یہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کرے بھی تو فوراً عمل نہ کر سکے۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ پلکیں اٹھائے بغیر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، یہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ضرور جانتے ہوں گے لیکن۔"

"اس بحث کو چھوڑیں۔ اور اگر پوچھنا ہی ہے تو یہ پوچھیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" اُنہوں نے ٹوک کر کہا تو وہ فوراً کچھ نہیں کہہ سکی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"میں آپ کی آمد کا مقصد جانتی ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ وقت کی بچت ہو گئی۔" وہ اطمینان سے بولے تو وہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر رہ گئی۔

"پھر کیا خیال ہے آپ کا؟" اُنہوں نے اُس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو کر کہا۔

"کِس بارے میں؟"

"ارے۔" اُن کی مسکراہٹ ہلکی سی ہنسی کا روپ دھار گئی۔ "ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد جانتی ہیں۔"

"جی۔ اور میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔" وہ آہستہ آہستہ خود پر قابو پا رہی تھی۔

"کہنے سُننے کو تو اب کچھ رہا ہی نہیں ربیعہ بیگم۔ اب تو سمجھنے اور عمل کرنے کا وقت ہے۔ چاہیے تو یہ کہ ہم بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس شاہراہ پر قدم رکھ دیں جہاں ایک نئی زندگی ہماری منتظر ہے۔"

اُس کی پیشانی پر ہلکی سی لکیر نمودار ہوتے دیکھ کر کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں، آپ کو مجھ سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ غالباً آپ مجھ سے متنفر بھی ہیں اور شاید میرا اعتبار بھی نہیں کر رہیں۔ آپ کچھ نہ بھی کہیں ربیعہ تب بھی میں جانتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں آپ

میرے بارے میں کس انداز سے سوچتی رہیں اور میں آپ کے سامنے کوئی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتا پھر بھی یہ ضرور چاہتا ہوں کہ جن باتوں نے آپ کو مجھ سے متنفر کیا ہے، ان کی وضاحت کردوں۔"

"مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" وہ رُوٹھے رُوٹھے لہجے میں بولی۔

"لیکن مجھے ضرورت ہے۔" وہ فوراً زور دے کر بولے۔ "اس لیے کہ میں صرف تلافی کی غرض سے آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ وہ محبت جو میری شریانوں میں گردش کر رہی ہے، وہ مجھے آپ تک لائی ہے اور یہ وہ محبت نہیں جو اپنی ہی آگ میں چپ چاپ سلگتی رہے۔ اس کے برعکس یہ تمہارے دل تک رسائی چاہتی ہے۔"

وہ بڑی خوبصورتی سے آپ سے تم پر آکر درمیانی فاصلہ سمیٹتے ہوئے اپنی بے نام سی خواہشوں کا اعتراف کرنے لگے۔

"میں تمہیں چاہوں اور بدلے میں تم مجھے ٹوٹ کر چاہو۔
میں روٹھوں تو تمہاری جان پر بن آئے۔
اور۔
میں مسکرا کر دیکھوں تو ہر طرف تمہاری ہنسی کی جھنکار سنائی دے۔
اور ایسا تو جب ہی ممکن ہے ربیعہ جب تمہیں میرا اور میری محبتوں کا اعتبار ہو۔"

انہوں نے لمحہ بھر رُک کر اس کے وجود کو سناٹوں کے حصار میں دیکھا، پھر کہنے لگے۔

"شاید تم جانتی ہو، میرے دل کی نرم زمین پر تمہاری محبت کا بیج اس روز گرا تھا جب تم برف سے گھروندا بنا رہی تھیں، اس کے بعد پہلے تو یہ خودرو پودے کی طرح بڑھی، پھر میں نے خود اس کی آبیاری کی، یوں کہ تمہیں خبر نہ ہو۔ کیونکہ درمیان میں ثاقب حسن موجود تھا۔ گوکہ مجھے تم پر شرعی اور قانونی حق حاصل ہو چکا تھا، تم میری منکوحہ تھیں، اگر میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں اپنا پابند کر سکتا تھا اور ایسی صورت میں تو یہ اور بھی آسان تھا کہ تم بھی ایسا ہی چاہ رہی تھیں۔ اور بارہا میں نے سوچا کہ تمہیں بیوی کا مقام دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لوں۔ لیکن اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

اس لیے نہیں کہ میں کسی وعدے یا معاہدے کا پابند تھا، میرے لیے ان سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی، میں نے صرف اس کے بعد کے حالات کو سوچ کر تمہاری طرف پیش رفت نہیں کی، اس لیے کہ مجھے محبت کی موت منظور نہ تھی اور نہ ہی میں سمجھوتا کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں اس وقت اپنا حق استعمال کر لیتا تو اس وقت تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟" انہوں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا اور اس کے پلکیں جھکا لینے پر کہنے لگے۔

"میں شروع ہی سے حقیقت پسند رہا ہوں۔ اور تمہارے بارے میں جذباتی فیصلہ کرنے کے بجائے میں نے حقائق کو سامنے رکھ کر سوچا تھا اور حقائق بڑے تلخ تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو محبت کی جذباتی عمر کتنی کم ہوتی ہے۔ سال، دو سال یا اس سے کچھ زیادہ۔ اور اس دوران یا تو واقعی ایک دوسرے کی خامیاں نظر نہیں آتیں یا دانستہ نظر انداز کی جاتی ہیں۔

بہرحال اس کے بعد زندگی معمول پر آتی ہے اور اصل زندگی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اور میں نے اصل زندگی ہی کا تصور کیا تھا تو جانتی ہو اس میں کیا تھا۔ ہر طرف بے اعتباری اور غیر یقینی۔ مجھے یوں لگا جیسے جذباتی دور سے نکل کر میں سطحی سی سوچ رکھنے والا بہت عام سا مرد بن جاؤں گا یعنی تمہارے ہر انداز میں مجھے ثاقب حسن کی پرچھائیں نظر آئے گی۔

تم خاموش ہو تو کیوں؟۔
تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ کس کی یاد کی مرہونِ منت ہے؟۔
تم تنہا کیوں بیٹھی ہو؟۔

اچانک تمہارا ہاتھ گرم کیتلی سے کیوں چھو گیا ہے؟۔
یعنی ہر بات میں کیوں۔ اور اس کیوں کے ساتھ ثاقب حسن۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دو تین گہرے کش لینے کے بعد بولے۔

"ایسی ہی بے شمار باتیں سوچ کر میں تم سے دستبردار ہو گیا۔ میرے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ میرا دل جس میں تمہاری محبت کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، آئندہ چند سالوں میں صرف شکوک و شبہات کا گھر بن کر رہ جائے۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ میں تم سے ہمہ وقت شاکی رہتا اور تم مجھ سے متنفر۔ اور عین ممکن تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے ہوئے الگ ہو جاتے یا پھر دوسری صورت سمجھوتے کی تھی یعنی جبراً ایک دوسرے کو برداشت کرنا۔

محبت مر جائے تو یہی دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اور میرے لیے یہ دونوں صورتیں ناقابلِ قبول تھیں۔ جبھی یہ جاننے کے باوجود کہ میری طرح تم بھی اس بندھن کو قائم رکھنا چاہتی ہو، خود کو وعدے کی زنجیر میں جکڑا ہوا پابند شخص ظاہر کر کے راستے الگ کر لیے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے

"ایسا کر کے میں خوش نہیں تھا۔ کبھی بھی خوش نہیں ہوا۔ اس کے باوجود یہ اطمینان تو رہا کہ ہم ایک دوسرے کی نظروں سے گرے نہیں۔ تم مجھ سے لاکھ متنفر سہی لیکن میرے کردار سے شاکی نہیں ہو سکتیں۔ اگر تمہیں یاد ہو تو ابھی کچھ دن پہلے تم نے صوفیہ سے کہا تھا کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اب میں تمہیں کسی کے کہنے پر چھوڑوں گا نہیں؟۔ تو اب تمہیں جان لینا چاہیے کہ پہلے بھی میں نے کسی کے کہنے پر تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ وہ فیصلہ میرا اپنا تھا۔ اور ابتدا میں، میں پچھتایا بھی لیکن پھر تمہاری شادی اور اس کے بعد ثاقب حسن کا جو روپ سامنے آیا تو مجھے اپنا فیصلہ انتہائی مناسب لگا۔ جس کی بدولت میں نے خود کو ثاقب حسن بننے سے بچا لیا تھا۔

میں بڑا آدمی نہیں ہوں لیکن بڑا آدمی بننے کی خواہش تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھے برا بھلا کہہ سکتی ہو، ملامت بھی کر سکتی ہو لیکن نظروں سے نہیں گرا سکتیں، اس لیے کہ میں آج بھی اس مقام پر کھڑا ہوں، جس مقام پر تم نے میری ہمراہی کی خواہش کی تھی۔ اور تم یہ یقین کر لو کہ میں اس مقام سے آگے تو جا سکتا ہوں، نیچے نہیں آ سکتا۔ اگر نیچے آنا ہوتا تو قدرت بہت پہلے مجھ سے جذباتی فیصلہ کروا چکی ہوتی۔ تم سن رہی ہو ناں۔ میری طرف دیکھو، یہ میں ہوں شہروز احمد، جس کے بارے میں تم نے صوفیہ سے کہا تھا کہ کبھی موقع ملے تو اس کا محاسبہ کر دیکھنا، بہت پارسا ہے ناں وہ؟۔"

اس کے پہلو بدلنے پر بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولے۔

"اپنی پارسائی کا کیا ثبوت پیش کروں؟۔ دو سال تک تم میرے بیڈروم میں رہیں اور۔" وہ قصداً خاموش ہو گئے لیکن نظریں اس پر سے نہیں ہٹائیں۔

"میرے خدا۔" من میں ایسی ہلچل تو کبھی اس نے بھی نہیں مچائی تھی جس نے بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔ اور وہ کہنے لگے۔

"اس کے علاوہ بھی میں ہر بات کی وضاحت کروں گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تم اپنی کہی بات پر قائم ہو یا نہیں؟" اس نے ایک لحظہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وضاحت کرتے ہوئے وہ بولے۔

"کیا تم نے ہر مقام پر یہ نہیں کہا کہ تم نہ تو کسی کو خفا کر سکتی ہو اور نہ خود کسی سے خفا ہو سکتی ہو اور اب میں دیکھ رہا ہوں ربیعہ کہ تم خود تو رُوٹھی رُوٹھی ہو ہی، مجھے بھی رُوٹھنے پر مجبور کر رہی ہو، گویا تم اپنی بات پر قائم نہیں رہیں۔ ہے ناں؟۔"

اسے مسلسل خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا تو وہ یہاں سے اُٹھنے کا سوچنے لگی لیکن پیچھے دیوار

تھی اور سامنے وہ۔ اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولے۔

"بس کرو ربیعہ، کہاں تک مجھ سے بھاگنے کی فضول سی کوشش کرتی رہو گی جب کہ اچھی طرح جانتی ہو کہ ہر راستے پر سب سے پہلے تمہارا سامنا مجھ سے ہو گا۔"

وہ اب بھی خاموش تھی اور پتا نہیں اس کی خاموشی میں کیا اسرار تھا، وہ سمجھ نہیں سکے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے کہ اب کیا کہنا چاہیے لیکن اچانک احساس ہوا کہ مسلسل بول کر وہ اپنا وقار خود مجروح کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ انہیں بے حد عزیز تھی، ہر پل اُسے رگِ جاں سے قریب محسوس کیا تھا اُس کی خاطر جان دی جا سکتی تھی لیکن عزتِ نفس کو داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے، پھر اُنا بھی آڑے آ گئی تو ایک گہری نگاہ اُس پر ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی لیکن یہ میری آخری کوشش تھی۔" اپنے لہجے کی شکستگی خود اُنہوں نے بھی محسوس کی اور فوراً پلٹ گئے لیکن دو قدم کے بعد ہی رُکے اور اُس کی طرف پلٹے بغیر بولے۔

"شاید تمہیں یاد ہو، جب میں آخری بار تمہیں اس گھر کے دروازے پر چھوڑنے آیا تھا تو تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم اپنے گھر والوں سے کیا کہو گی اور میں نے کہا تھا، سارا الزام میرے سر رکھ دینا۔" اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگے۔

"اور ابھی یہاں آتے ہوئے میں سب سے کہہ آیا تھا کہ واپسی میں تم میرے ساتھ ہو گی، اب تم بتاؤ سب لوگ جو ہماری راہ تک رہے ہوں گے، میں تنہا اُن کے سامنے جا کر کیا کہوں؟"

اور وہ قصداً خاموش نہیں تھی۔ بہت دیر سے بولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُن کی محبت جواب نہیں بلکہ بہت پہلے سے اس کے دل تک رسائی حاصل کر چکی تھی اور پھر بدلتے حالات سے مجبور ہو کر جسے اس نے اندر کہیں دفن بھی کر دیا تھا۔ وہ اچانک یوں بیدار ہو کر اپنا آپ عیاں کرنے پر اصرار کر رہی تھی کہ اُسے ڈر تھا جہاں ہونٹ کھلے پہلی بات اعتراف کی ہو گی، جبھی اتنی دیر سے وہ ہونٹ سیئے بیٹھی تھی اور اب جب کہ وہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر جا رہے تھے تو اس نے ساری احتیاطوں کا دامن چھوڑ دیا۔ اور اُن کی پشت پر نظریں جما کر بولی۔

"آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے شہروز احمد اس لیے کہ۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔" اُنہوں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

وہ بدلے میں ٹوٹ کر چاہنے کا اعتراف اور عزم لیے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں پر عہدِ رفتہ کی پرچھائیں نہیں تھی، اس کے برعکس پلکوں سے ڈھلکتا قطرہ قطرہ اُن کی محبت کو خراج پیش کر رہا تھا۔

احساسِ طمانیت میں گھر کر انہوں نے گہری سانس لی اور بڑھ کر وہ سارے قطرے اپنی انگلیوں پر سمیٹ لیے۔

اور کچھ دیر بعد وہ اُن کے ساتھ، اُن ہی پرانے راستوں پر چل رہی تھی جنہیں خاص طور پر اُس کے لیے نئے انداز سے سجایا گیا تھا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤